شمالی ہند کے قدیم ترین علمی ادارے کا ادبی مجلّہ

دِلّی کالج میگزین

اُردو

[ایوننگ کلاسز]

میر نمبر

۱۹۶۲ء

مجلسِ ادارت

نگراں: عظمت اللہ خاں نظر

ایڈیٹر: نثار احمد فاروقی

معاون: سید حامد عظیم

مرتبہ

نثار احمد فاروقی

مجلس ادارت

ایڈیٹر : نثار احمد فاروقی (متعلم ایم۔اے۔ عربی)

نگراں : عظمت اللہ خاں نظر (لکچرار شعبۂ اردو)

معاون : سیّد حامد عظیم (متعلم بی۔اے۔ سال دوم)

ناشر : شعبۂ اُردو ، دلّی کالج (ایوننگ کلاسز) دلّی

مہتمم : جناب سید حسن ایم۔اے (استاد شعبۂ تاریخ)

طابع : کوہ نور پریس ، لال کنواں ، دلّی

سال : نومبر ۱۹۶۲ء

تعداد : پانچ سو

سید حسن، ایم۔اے، استاد شعبۂ تاریخ، دلّی کالج، اجمیری گیٹ، دلّی ۶ ، نے کوہ نور پریس، لال کنواں ، دلّی میں چھپوا کر شعبۂ اُردو، دلّی کالج (ایوننگ کلاسز) دلّی سے شائع کیا۔

انتساب

مادرِ درس گاہ

دلّی کالج کے نام

مُحتویات

باب اول : حیاتِ میر

باب دوم : میر کا فن

(الف) عمومی مطالعہ

(ب) مثنویاتِ میر

(ج) میر کی فارسی

(د) لسانیاتی مطالعہ

باب سوم: تصانیفِ میر

باب چہارم: خراجِ عقیدت

(ضمیمہ)

باتیں ہماریاں

رَبِّ اشْرَحْ لِیْ صَدْرِیْ وَیَسِّرْلِیْ اَمْرِیْ وَاحْلُلْ عُقْدَۃً مِّنْ لِّسَانِیْ یَفْقَهُوْا قَوْلِیْ

یہ دلی کالج اُردو میگزین (ایوننگ کلاسز) کا شمارۂ خصوصی ہے جو خدائے سخن میر محمد تقی میر دہلوی (متوفی ۱۸۱۰ء) کے حالات و کمالات کا جائزہ پیش کرتا ہے۔ اس میں میر کی زندگی اور شاعری کے بیشتر اہم پہلوؤں سے بحث ہوگئی ہے اور اب اِس کی حیثیت محض کسی میگزین کے شمارۂ خصوصی کی نہیں بلکہ میر پر ایک مستقل کتاب کی ہوگئی ہے۔ اسی لیے ہم نے اسے کتابی ترتیب کے ساتھ پیش کیا ہے؛ یعنی اس میں مضامین کی ترتیب، لکھنے والوں کے مراتب کے لحاظ سے نہیں، بلکہ موضوع کے اعتبار سے رکھی گئی ہے۔ ہم نے اسے چار ابواب میں تقسیم کردیا ہے:

باب اول : حیاتِ میر

باب دوم : میر کا فن (عمومی مطالعہ، مثنویاتِ میر، میر کی فارسی اور لسانیاتی مطالعہ)

باب سوم : تصانیف میر

باب چہارم : خراجِ عقیدت

ان ابواب میں ہر مضمون اسی جگہ رکھا گیا ہے جہاں موضوع کا تقاضا تھا، اِس طرح معنوی ربط و تسلسل بھی پیدا ہوگیا ہے اور یہ نمبر بجائے خود ایک کتاب بھی بن گیا ہے۔ اسی لیے ہم نے اس کا نام "میر تقی میر: احوال و آثار" تجویز کیا ہے۔

ان مضامین کی فراہمی اور ترتیب میں راقم الحروف کو جن صبر آزما مرحلوں سے گزرنا پڑا ہے

اس کا اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جنھوں نے کبھی کسی خاص نمبر کی تیاری کا تجربہ کیا ہو۔ یہ مضامین حاصل کرنے کے لیے میں نے اتنے خطوط لکھے ہیں اور اتنا وقت صرف کیا ہے کہ اُتنے کاغذ پر اور اِتنے وقت میں یہ پورا نمبر اپنے قلم سے لکھ سکتا تھا۔ میں نے اِن مضامین کی فراہمی کا آغاز ۱۹۵۸ء میں کیا تھا اور سلسلہ طباعت کے وقت تک جاری رہا تا آنکہ اتنے مضامین جمع ہو گئے کہ اُن میں سے انتخاب کرنا دشوار ہو گیا۔ ایک مشکل یہ بھی پیش آئی کہ بعض مضمون نگاروں سے چار سال کا یہ طویل انتظار برداشت نہ ہو سکا اور انھوں نے مایوس ہو کر اپنے مضامین دوسرے رسالوں میں چھپوا دیے۔ ایسے بہت سے مضامین عین وقت پر مجھے خارج کرنے پڑے لیکن پھر بھی دو ایک مضامین موضوع کی اہمیت اور افادیت کے پیشِ نظر باقی رکھے گئے۔

میں نے ان عملی دشواریوں کی طرف مجمل اشارہ اس لیے کر دیا ہے کہ تنقیدی نظر سے ملاحظہ فرمانے والے حضرات، اس کی خامیوں کا احتساب کرتے ہوئے، میری دشواریوں کو بالکل ہی نظر انداز نہ کر دیں :

زاہد از ما خوشۂ تا کے بچشمِ کم مبیں
ہیں نمی دانی کہ یک پیمانہ نقصان کردہ ایم

اب چند باتیں مشمولات کے سلسلے میں عرض کر دوں :

اِس شمارے کا پہلا مضمون "میر کے حالاتِ زندگی" اُردو کے نامور محقق اور مستند عالم قاضی عبدالودود صاحب نے لکھا ہے؛ اس میں اختصار کے ساتھ اور مستند مآخذ کی مدد سے، میر کی زندگی کے اہم واقعات کا احاطہ کیا گیا ہے ـــ حیاتِ میر پر دوسرا مضمون جناب کلب علی خاں فائق رام پوری کا لکھا ہوا ہے۔ اُنھوں نے بعض بحث طلب امور پر روشنی ڈالی ہے۔ حیاتِ میر کے ان پہلوؤں پر اُن کا مضمون غور و فکر کی دعوت دیتا ہے۔

میر کے اساتذہ، اقربا، اخلاف اور تلامذہ پر بھی تحقیق کی بہت گنجایش ہے، سراج الدین علی خاں آرزو، میر کے اُستاد اور مربی تھے، علاوہ ازیں اُن کی سوتیلی ماں کے بھائی بھی ہوتے تھے۔ ڈاکٹر منوہر سہائے انور نے، جو زبان و ادبیات فارسی کے جیّد عالم ہیں اور خانِ آرزو پر تحقیقی مقالہ لکھ کر پنجاب یونی ورسٹی سے پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری لے چکے ہیں، اختصار کے ساتھ خانِ آرزو کی

علمی خدمات کا جائزہ لیا ہے۔ اِس سے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ میر کی تعلیم و تربیت جس شخص کی نگرانی میں ہوئی تھی وہ خود کس مرتبے کا انسان تھا۔

میر نے اپنے خود نوشت حالات (ذکرِ میر) میں سید سعادت علی کا حوالہ بھی دیا ہے کہ اُن کی ترغیب سے میں نے ریختہ گوئی شروع کی۔ سعادت کے بارے میں مختلف قلمی اور مطبوعہ مآخذ سے جو کچھ مواد فراہم ہو سکا ہے اُسے راقم الحروف نے ایک مضمون کی شکل میں یک جا کر دیا ہے۔

محمد حسین تجلی دہلوی میر کے ہمشیر زادے اور شاگرد تھے اُن پر محبِ مکرم ڈاکٹر مختار الدین احمد آرزو (ریڈر شعبۂ علوم اسلامی، مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ) نے قلم اُٹھایا ہے اور دیوان تجلی کے ایک قلمی نسخے سے کچھ انتخاب بھی پیش کیا ہے۔ عہدِ حاضر کے محققوں میں بہت کم لوگوں کو لکھنے کا اتنا اچھا سلیقہ ہے جیسا آرزو صاحب کو ہے۔ انھوں نے تجلی کے بارے میں تمام ضروری معلومات یکجا کر دی ہیں۔

میر کلّو عرش، میر کے چھوٹے صاحبزادے تھے اُن کا یہ شعر تو کہاوت بن گیا ہے:

آسیا کہتی ہے ہر صبح بآوازِ بلند
رزق سے بھرتا ہے رزّاق دہن پتھر کے

جناب ایم حبیب خاں (ناظم کتب خانہ انجمن ترقی اُردو (ہند) علی گڑھ) نے عرش کے دیوان (مطبع کارنامہ لکھنؤ) سے اشعار کا مختصر انتخاب بھی پیش کیا ہے۔ تلامذۂ میر کا تذکرہ جناب فاضل زیدی نے لکھا ہے جو میر مہدی مجروح کے نواسے ہیں۔ انھوں نے میری درخواست پر اختصار کو ملحوظ رکھا ہے کیونکہ اگر یہ تذکرہ تفصیل سے لکھا جاتا تو شاید اس نمبر میں نہ سما سکتا۔

کسی فارسی شاعر نے کہا تھا:

جنوں را کارہا باقیست با مشتِ غبارِ ما
کہ بازی گاہِ طفلاں می شود خاکِ مزارِ ما

یہی معاملہ میر کی قبر کے ساتھ ہوا۔ آج اُن کے مدفن کا بھی ہمیں علم نہیں، لیکن یقین ہے کہ بقولِ میر وہ 'خراب' ہو کر بھی 'خرابات' ہوا ہوگا:

کشتوں کا تیری چشمِ سیہ مست کے مزار ہوگا خراب بھی تو خرابات ہووے گا

جناب نادم سیتاپوری نے 'مدفن میر' کی تلاش کے سلسلے میں مختلف قیاس آرائیوں کا جائزہ لیا ہے۔

بابِ دوم میں میر کے فن کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اسے ہم نے چار حصّوں میں تقسیم کر دیا ہے (الف) عمومی مطالعہ (ب) میر کی مثنوی نگاری (ج) میر کی فارسی (د) میر کا لسانیاتی مطالعہ۔ ان میں سے ہر مضمون میر کی شاعری کے کسی اہم پہلو پر روشنی ڈالتا ہے۔ مخدومی حضرت میرزا جعفر علی خاں اثر لکھنوی مدظلہ، میر کے سب سے بڑے پرستار ہیں انھوں نے اپنی عالمانہ تنقیدوں سے میر کے خلاف بدگمانیوں کا طلسم توڑا کہ وہ محض ایک مبتذل شاعر ہے یا یہ کہ اس کے کلام کا بڑا حصّہ ناقابلِ اعتنا ہے، انھوں نے طرح طرح سے کلام میر کی تشریح و تعبیر کی۔ اس کی فنّی نزاکتوں کے راز سمجھائے، معانی کی تہوں کو کھولا، اور کلامِ میر کا ایک نہایت پاکیزہ انتخاب "مزامیر" کے نام سے شائع کیا جس کا فاضلانہ مقدمہ میر کو سمجھنے کی پہلی مثبت کوشش ہے۔ اس طرح میر کے نقّادوں میں حضرت اثر لکھنوی کو تقدّمِ زمانی کا شرف بھی حاصل ہے۔ یہاں یہ اعتراف دل چسپی سے خالی نہ ہوگا کہ ابتدا میں راقم الحروف غالب سے مغلوب تھا اور میر کا کلام تعصب کی عینک لگا کر پڑھتا تھا۔ ۱۹۵۳ء میں میر اور بعض دوسرے شعراء کے سلسلے میں حضرت اثر سے میری طویل خط و کتابت ہوئی جو کئی سال تک جاری رہی، اُنھوں نے مجھ پر طرح طرح سے میر کی عظمت کے راز منکشف کیے۔ یہ انھیں کا فیضان ہے کہ مجھے میر کو سمجھ کر پڑھنے کا موقع ملا! اس نمبر کے لیے کبرسنی اور علالت کے باوجود، حضرت اثر نے میر کی متصوفانہ شاعری پر مفصّل مضمون لکھا ہے اور میر کے متصوفانہ کلام کا ایسا جامع انتخاب بھی پیش کر دیا ہے جو اُس کے تمام صوفیانہ افکار کو محیط ہے۔ یہ میر کے کلام کے ایک اہم پہلو کو سمجھنے کی پہلی منصفانہ اور عالمانہ کوشش ہے۔

باب دوم کے مضمون نگاروں کی فہرست میں ایک نام شاید بالکل نیا سا معلوم ہو، یہ ہیں سید محمد ایم۔ اے ــــ لیکن اگر اس کے ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا جائے کہ یہ "ارباب نثر اردو" کے مصنّف، مثنویاتِ میر اور تذکرہ گلشنِ گفتار کے مُرتّب بھی ہیں تو پھر علمی حلقوں میں شاید کسی مزید تعارف کی ضرورت نہ رہے، وہ عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد کے شعبۂ اردو میں ریڈر تھے اور ابھی دو سال پہلے ریٹائر ہوئے ہیں، اُنھوں نے ایک مدّت سے مضمون نگاری کا مشغلہ ترک کر دیا تھا، لیکن زیرِ نظر

شمارے کے لیے مثنویاتِ میر کے سوانحی پہلو پر قلم اٹھایا ہے اور بڑے شگفتہ انداز میں اس موضوع کا حق ادا کیا ہے۔

ڈاکٹر گیان چند، "اردو میں نثری داستانیں" کے مصنف ہیں اور ڈی لٹ کے لیے شمالی ہندوستان کی اُردو مثنویوں پر بھی تحقیقی مقالہ لکھ چکے ہیں، انھوں نے مثنویاتِ میر کے سلسلے میں اگرچہ اختصار کے ساتھ لکھا ہے مگر فکر انگیز باتیں کہی ہیں۔ عالمانہ سنجیدگی اور منکسرانہ وقار توان کی تحریروں کا وصفِ خاص ہے۔

میر کی فارسی شاعری پر محمود حسن قیصر امروہوی نے لکھا ہے جو اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ علی گڑھ کی لائبریری سے متعلق ہیں اور اس سے پہلے رضا لائبریری رام پور میں رہ چکے ہیں، میر کے جس مخطوطۂ فارسی کا انھوں نے تعارف کرایا ہے وہ رضا لائبریری رام پور کا نسخہ ہے۔ ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی کا مضمون دیوانِ فارسی کے اس نسخے سے بحث کرتا ہے جو آزاد لائبریری علی گڑھ (سبحان اللہ کلکشن) میں محفوظ ہے۔ میر کی فارسی نثر کے بارے میں ایک ہی مضمون ہے، لیکن اس سے میر کے سبک فارسی کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔ لکھنے والے دہلی یونی ورسٹی کے شعبۂ فارسی کے ریڈر ڈاکٹر سید امیر حسن عابدی ہیں جنھوں نے ہند ایرانی فارسی تصانیف پر متعدد تحقیقی مضامین لکھے ہیں۔ ڈاکٹر عابدی ادبیاتِ فارسی کے قدیم و جدید سرمائے پر گہری نظر رکھتے ہیں، انھوں نے فارسی نگاری میں میر کا مقام متعین کرنے کی منصفانہ کوشش کی ہے۔

میر کی لسانیاتی خصوصیات کے سلسلے میں ڈاکٹر تیواڑی کا مضمون خاصے کی چیز ہے وہ ہندی ادبیات کے عالم اور ماہرِ لسانیات ہیں، آج کل تاشقند یونی ورسٹی میں ہندی کے وزٹنگ پروفیسر کی حیثیت سے تشریف لے گئے ہیں، انھوں نے اُردو نہ جانتے ہوئے بھی میر کی لسانی خصوصیات کا جائزہ بہت گہری نظر سے لیا ہے اور نہایت سلجھے ہوئے انداز میں لکھا ہے۔

باب سوم میں بھی چند اہم مضامین ہیں۔ مولانا امتیاز علی خاں عرشی اس دور میں صفِ اول کے محقق ہیں۔ انھوں نے کلیاتِ میر کے ایک نادر قلمی نسخے کا تعارف کرایا ہے جو رضا لائبریری رام پور میں محفوظ ہے۔ اس مضمون میں سب سے زیادہ قابلِ قدر یہ بات ہے کہ "مثنوی دریائے عشق" کا قصہ جو میر نے فارسی نثر میں بھی لکھا تھا، اور اب تک نایاب سمجھا جاتا تھا، یہاں اس کا مکمل متن پیش کیا جا رہا ہے۔ یہ بھی میر نمبر کا طرۂ امتیاز ہے۔

قاضی عبدالودود صاحب کا دوسرا مضمون کلیات میر کی اشاعتِ اولیں کے بارے میں ہے جو ۱۸۱۱ء میں کلکتہ سے چھپی تھی، اس کے نسخے بہت کم یاب ہیں، ہمارے علم میں صرف چھ نسخے ہیں جن میں دو ناقص ہیں۔ اس طرح یہ مطبوعہ کتاب بھی قلمی سے زیادہ نادر ہے کیونکہ میر کے قلمی نسخے تعداد میں اس سے زیادہ مل جاتے ہیں۔ یہ نسخہ فورٹ ولیم کالج نے چھاپا تھا، اس کی اشاعت میر کی وفات سے تقریباً ۶ ماہ بعد ہوئی، لیکن ترتیب و تصحیح کا کام میر کی زندگی ہی میں شروع ہو چکا تھا، اور عجب نہیں کہ اس کی بنیاد ان نسخوں پر ہو جو خود میر کی نظر سے گزر چکے تھے۔

میر کے تذکرۂ نکات الشعراء کے صرف چند قلمی نسخوں کا ہمیں علم ہے، ان میں کوئی اہم اختلافات نہیں ہیں، اور جو کچھ ہیں ان کا مطبوعہ متن سے مقابلہ نہیں ہوا، یہ شبہ ہوتا ہے کہ متداول تذکرہ یقیناً بعض اہم تبدیلیوں سے گزر چکا ہے۔ اس شبہے کو تقویت اس بات سے بھی پہنچتی ہے کہ قدرت اللہ خاں قاسم نے، جو میر کے ہم عصر بھی ہیں، اپنے تذکرہ مجموعۂ نغز میں یہ بیان کیا ہے کہ میر نے ولی کو "وے شاعریست از شیطان مشہور تر" لکھا تھا۔ لیکن یہ عبارت مطبوعہ متن میں نہیں ملتی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ قاسم کے سامنے نکات الشعراء کی کوئی اور روایت رہی ہوگی لیکن اب اس تذکرے کی وہ ابتدائی شکلیں ناپید ہو چکی ہیں۔ راقم الحروف نے تذکرۂ نکات الشعراء کی ایک ایسی ناقص روایت کے کچھ اوراق کا سراغ لگایا ہے جو متداول تذکرے کے مقابلے میں بعض اہم اختلافات کی حامل ہے۔ اس میں میرزا مظہر جان جاناںؒ کی ایک غیر مطبوعہ غزل کے ۵ اشعار بھی ملتے ہیں جو اب تک میرزا مظہر پر تحقیقی کام کرنے والوں کی نظر سے اوجھل رہے ہیں۔

جناب نصیر الدین ہاشمی دکنیات کے عالم اور مشہور اہل قلم ہیں، انھوں نے حیدرآباد کے کتب خانوں میں تصانیف میر کے مخطوطات کی نشان دہی کی ہے یہ تحقیقی کام کرنے والوں کے لیے مفید اطلاع ہے، محبی سید مبارز الدین رفعت (گورنمنٹ کالج گلبرگہ) نے انتخاب کلام میر کے اس نسخے کا تعارف کرایا ہے جسے مدراس یونی ورسٹی کی فرمایش پر نواب عماد الملک سید حسین بلگرامی مرحوم نے مرتب کیا تھا۔

—— یہ تین باب تو تحقیقی اور تنقیدی نوعیت کے تھے، چوتھا باب خالص تخلیقی قسم کا ہے

اس میں سب سے پہلے ہمارے پرنسپل مرزا محمود بیگ صاحب کا لکھا ہوا ایک ریڈیائی فیچر ہے۔ بیگ صاحب بھی میر امّن کی طرح دتی کے روڑے ہیں اور اسی کی سی سادہ، شیریں، شگفتہ اور دل نشیں نثر لکھتے ہیں۔ ان کی تعلیمی اور انتظامی مصروفیات اتنی بڑھی ہوئی ہیں کہ ایک خاص حلقے کے سوا بہت کم لوگ یہ جانتے ہیں کہ بیگ صاحب اُردو کے بڑے اچھے انشائیہ نگار ہیں اور اپنا منفرد اسلوب رکھتے ہیں۔ انھیں اردو ادب سے کتنا گہرا شغف ہے، اس کا ایک منہ بولتا ثبوت تو یہی میر نمبر ہے، اور دوسری شہادت ان کی ادبی تحریریں ہیں، وہ اپنی بے پناہ مصروفیات میں بھی ادبیات کا مطالعہ کرنے اور لکھنے کے لیے کچھ وقت ضرور نکال لیتے ہیں، اور خدا بھلا کرے آل انڈیا ریڈیو والوں کا، جو بیگ صاحب کی ارمغانِ علمی و ادبی کا افادہ عام کرتے رہتے ہیں۔ ریڈیو پر شاید ہی کسی شخص کی تقریر اور فیچر اتنی دل چسپی سے بار بار سُنا جاتا ہو، جتنا بیگ صاحب کی تقریر کو سُنا جاتا ہے۔

اسی باب میں ایک حصّہ منظوم خراجِ عقیدت کا بھی ہے۔ اس میں رضا علی وحشت مرحوم کی نظم مطبوعہ ہے باقی تمام نظمیں خاص طور سے اسی نمبر کے لیے لکھی گئی ہیں۔ میں خاص طور سے حضرت روش صدیقی، جناب شمیم کرہانی اور جناب فضا ابن فیضی کا شکرگزار ہوں کہ انھوں نے ایسی اچھی نظمیں لکھ کر ہمارے نمبر کی شان کو دوبالا کیا۔

۲

اب مجھے ایک اہم اور خوش گوار فریضہ ادا کرنا ہے ـــــ رسماً نہیں تہِ دل سے ـــــ اس شمارۂ خصوصی کی اشاعت کے لیے دتی کالج کے شعبۂ اُردو کو عموماً اور راقم الحروف کو خصوصاً، دہلی کالج کے پرنسپل جناب مرزا محمود بیگ کا شکریہ ادا کرنا چاہیے، اگرچہ شکر و سپاس کے یہ چند الفاظ ان کی عنایتوں کے حقوق ادا نہیں کر سکتے، نہ ہمارے احساس کی ترجمانی کر سکتے ہیں۔ بیگ صاحب نے جس عالی حوصلگی اور فراخدلی کے ساتھ، اس نمبر کی اشاعت کے سروسامان مہیّا کیے، اُس سے اُن کا غیر معمولی عزم و ارادہ اور اُردو زبان و ادب سے گہرا شغف ظاہر ہوتا ہے۔ دتی کالج

اور بیگ صاحب ایک ہی وجود کے دو روپ ہیں یعنی اگر دہلی کالج جسم و جاں میں منتقل ہو جائے تو اس کا نام مرزا محمود بیگ ہی ہوگا۔

مجھے فخر ہے کہ میں دہلی کالج کا طالب علم اور بیگ صاحب سے تربیت پذیر رہا ہوں بقول عرفی :

فلاں مربی و من تربیت پذیر، این بس
ز فضلِ خود چہ زنم لاف ہائے طولانی

یہ شمالی ہندستان کا سب سے قدیم تعلیمی ادارہ ہے، اس کا ماضی بہت شاندار رہا ہے اور اس کے گہوارۂ تربیت میں الطاف حسین حالی، محمد حسین آزاد، ڈاکٹر نذیر احمد، مولوی ذکا اللہ پیارے لال آشوب اور ماسٹر رام چندر جیسی شخصیتوں نے پرورش پائی ہے، جن کے افکار کی مشعلوں سے مستقبل کے راستے روشن ہوئے، اور جن کی مصلحانہ کوششوں سے ۱۸۵۷ء کے بعد سیاسی اور سماجی اعتبار سے ایک زندہ و بیدار ہندستان وجود میں آیا، جنھوں نے اپنی علمی خدمات سے اردو زبان کا دامن وسیع اور اس کے ادبی خزانوں کو معمور کیا اور اُسے دوسری زبانوں کے سامنے شرمندہ نہ ہونے دیا۔ اور دلی کالج ہی وہ ادارہ ہے جس نے سب سے پہلے مادری زبان کو ذریعۂ تعلیم بنانے کا تجربہ کیا تھا۔ اِسی کالج سے علوم طبیعی اور سائنس کی متعدد کتابیں اُردو میں چھپی تھیں اور اسی ادارے سے مولوی کریم الدین، مولانا مملوک العلی، مولوی امام بخش صہبائی اور مفتی صدر الدین خاں آزردہ جیسے عبقری کسی نہ کسی حیثیت میں وابستہ رہے ہیں جو اپنی فراست اور علمی بصیرت سے اُنیسویں صدی کے ہندستان کی ذہنی تربیت کا فرض انجام دے رہے تھے۔ آج وہی منصب مرزا محمود بیگ صاحب کے حصے میں آیا ہے، جو علم و فضل کے ساتھ اعلا درجے کی انتظامی صلاحیت بھی رکھتے ہیں، اور اِن سب پر مستزاد اُن کی مقناطیسی شخصیت ہے۔ اللہ نے اُنھیں اس کالج کے حق میں آیۂ رحمت بنا کر بھیجا ہے :

لیسَ علیَ اللّٰہِ بمُستَنکَرٍ   اَن یَّجمَعَ العالَمَ فی واحِدِ

۱۹۴۷ء کے بعد ایک بڑے ہی نازک دور میں مرزا محمود بیگ صاحب نے کالج کی عنانِ انتظام سنبھالی تھی۔ وہ اگر ان غیر معمولی صفات کے انسان اور عزمِ راسخ کے مالک

نہ ہوتے اور اقبال کے لفظوں میں :

" نگہ بلند، سخن دلنواز، جاں پُر سوز "

نہ رکھتے تو شاید اُن نامساعد حالات میں کالج اتنی آبرومندی سے باقی نہ رہ سکتا تھا۔ بیگ صاحب نے اپنے شب و روز اس کی ترقی اور رفاہ کے لیے وقف کر دیے ہیں۔ اور یہ اُن کی اَن تھک جدّ و جہد کا ثمرہ ہے کہ آج دلّی کالج اپنی بعض خصوصیات کے اعتبار سے دہلی کا بہترین کالج سمجھا جاتا ہے اور شمالی ہند کے چند اہم کالجوں میں سے ایک ہے :

چوں شمع سربلندیٔ عشّاق مفت نیست

آخر بقدرِ سوختن است آبروے ما

چناں چہ یہ امتیاز بھی دلّی کالج ہی کے ساتھ مختص ہے کہ اس کے اُردو میگزین کے تین خصوصی شمارے اب تک شائع ہو چکے ہیں یعنی قدیم دلی کالج نمبر، دلّی نمبر اور دلّی کا دبستان شاعری نمبر ــــــ یہ **میر نمبر** اس سلسلہ طلاے ناب کی چوتھی کڑی ہے۔

میر نمبر ایک خواب ہی رہتا اگر بیگ صاحب کی خصوصی توجّہات شاملِ حال نہ ہوتیں۔ اس لیے اُن کا شکریہ ادا کرنے کے بعد اب مجھے سیّد حسن صاحب (استاد شعبۂ تاریخ) کا شکریہ ادا کرنا ہے جو میگزین کے انتظامی معاملات کے نگراں بھی ہیں۔ اُنھوں نے میر نمبر کی طباعت و اشاعت میں گہری دل چسپی کا اظہار کیا اور انتظامی معاملات میں بہت سی دشواریوں کے دُور کرنے میں میری مدد کی۔ شعبۂ اُردو کے اساتذہ میں جناب عظمت اللہ خاں میر نمبر کی اسکیم کا ابتدائی خاکہ تیار کرنے، پھر اُسے منظور کرانے کی جد و جہد اور ترتیب و تہذیب کی ہر منزل میں، ہمدردی و دل چسپی کے ساتھ میرے شریک رہے۔ اُن کی دل چسپی سہ گونہ تھی، ایک تو یہ کہ وہ ایوننگ کلاسز میں شعبۂ اُردو کے نگراں ہیں، اور اس کی ترقی کے لیے دل و جان سے کوشاں رہتے ہیں، چناں چہ یہ میر نمبر بھی ہمارے شعبۂ اُردو کی علمی و ادبی دل چسپیوں کا شاہد عادل ہے؛ دوسرے یہ کہ اُنھیں میر سے خاص شغف ہے، تیسرے یہ کہ وہ میرے دوست اور دیرینہ کرم فرما ہیں۔

ڈاکٹر تنویر احمد علوی (شعبۂ اردو) نے باوجودیکہ ایوننگ کلاسز کے میگزین سے اُن کا بلا واسطہ کوئی تعلق نہ تھا، اس کی ترتیب، طباعت، اشاعت اور انتظامی معاملات میں جتنی دل سوزی اور دل چسپی کا اظہار کیا اُس کا شکریہ ادا کرنا ممکن ہی نہیں۔ فجزاہ اللہ۔

دلی کالج (ایوننگ) کے طالب علم سید حامد عظیم صاحب نے اس نمبر کے کتابت شدہ اجزا پڑھنے میں میرا ہاتھ بٹایا، اُن کا شکریہ بھی مجھ پر واجب ہے۔

از نگہ چشم تہی گشت و تماشا ماندست
در زبان حرف نماندست و سخن ہا ماندست

دہلی:
یکم نومبر ۱۹۶۲ء

نثار احمد فاروقی

دلّی کالج میگزین کا شمارۂ خصوصی

میر تقی میر

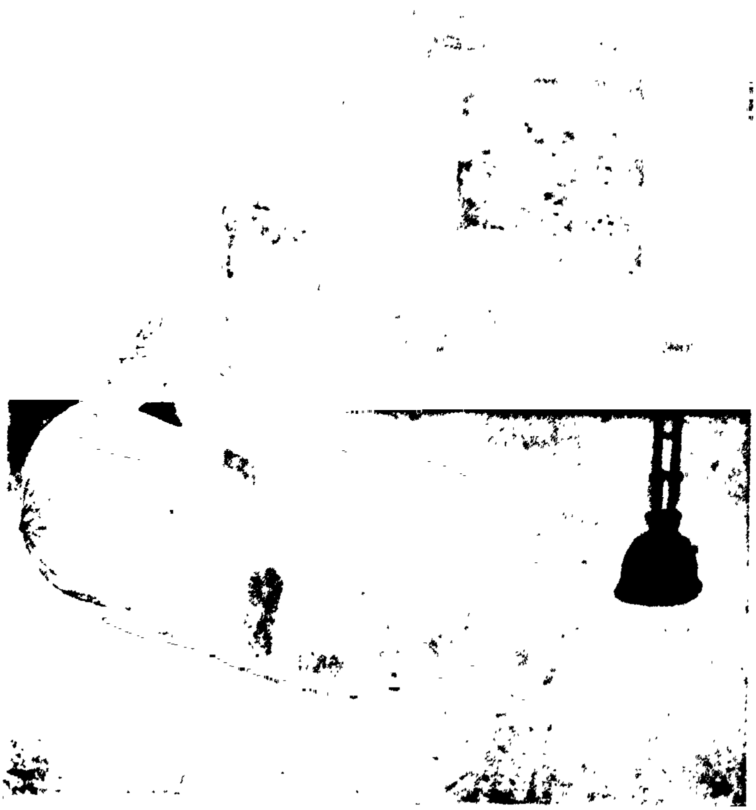
احوال و آثار

مُرتبہ

نثار احمد فاروقی

بارے دنیا میں رہو، غم زدہ یا شاد رہو
ایسا کچھ کر کے چلو یاں کہ بہت یاد رہو

(میرؔ)



میر تقی میر

رشید احمد صدیقی

۲۸ دسمبر ۱۹۵۸ء

ذکاءاللہ روڈ، یونیورسٹی علی گڑھ

مشفقی تسلیم۔ خط ملا۔ میرے سپرد کوئی ایسا کام نہ کیجیے جو میں انجام نہ دے سکوں۔ اس کی مجھے بڑی ندامت ہوگی۔ اپنے خوردوں سے نادم ہونا گوارا نہیں ہوتا۔ برابر کا ہو یا بڑا ہو اس کی بات دوسری ہے! میر کے بارے میں آپ کا گمان صحیح نہیں ہے کہ میں نے ان پر کچھ لکھا نہیں اس لیے ان کی بڑائی کا معترف نہیں ہوں۔ میں خدا کی تسبیح و تمجید کے بغیر خدا کی عظمت کا قائل ہوں اور شاید ان لوگوں سے زیادہ جو ایسا کرتے رہتے ہیں! ناسخ کی شاعری کا نہیں بلکہ ناسخ کا جو تھوڑا بہت لحاظ کرتا ہوں تو اسی وجہ سے کہ انھوں نے میر کے بارے میں یہ آخری بات کہہ دی یعنی "آپ بے بہرہ ہے جو معتقدِ میر نہیں"۔ ناسخ نہ کہتے تو اب تک معلوم نہیں کتنے اور لوگ کہہ چکے ہوتے جن میں ایک یقیناً میں بھی ہوتا۔ میر کے حضور میں ہمارے اچھے سے اچھے لکھنے والوں نے نذرِ عقیدت پیش کی ہے اور کرتے رہیں گے۔ میر۔ غالب۔ حالی۔ انیس اور اقبال ہمارے وہ شعرا ہیں جن پر لکھنے والے لکھنے سے کبھی نہیں تھکیں گے چاہے (بالفرض محال) اردو شعر و شاعری کا چرچا باقی نہ رہے۔ آپ تو جانتے ہیں، غزل گو شعرا میں میر اور غالب سے بڑا درجہ کسی اور کا نہیں مانا جاتا۔ اعتراض یا مذاق کرنے والوں نے غالب یا غالب کے کلام کو اپنا نشانہ بنایا لیکن آج تک میر سے بے تکلف ہونے کی کسی کی ہمت نہیں ہوئی۔ یہاں تک کہ آج اُس پُرانی زبان کی بھی نقل کی جاتی ہے جس کے نمونے جہاں تہاں میر کے کلام میں ملتے ہیں لیکن اب متروک ہیں۔ بربنائے عقیدت کسی کے نقص کی بھی پیروی کی جائے تو بتایئے وہ شخص کتنا بڑا ہوگا۔ اُردو کے مشہور شعرا کی پیروڈی PARODY کی گئی۔ میر کی کسی نے نہیں کی۔ میر جس زمانے میں تھے وہ زمانہ جاگیرداری کا رہا ہو یا زبوں حالی و زیاں کاری کا، ان کی شاعری ہر زمانے کے ذوق و ظرف کی آبرو رہے گی اگر اس زمانے کو آبرو دے رہنے کی توفیق یا حوصلہ ہوگا!

جہاں میر کا یہ کہنا صحیح ہے کہ "عشق بن یہ ادب نہیں آتا" وہاں یہ بھی غلط نہیں ہے کہ میر بن یہ ادب نہیں آتا!۔

خیر طلب
رشید احمد صدیقی

(۲)

ذکاء اللہ روڈ، مسلم یونیورسٹی۔ علی گڑھ
۲۴ فروری ۱۹۶۲ء

محترمی تسلیم، عنایت نامہ آج شام موصول ہوا۔ اور میر پر چند سطریں لکھنے کا وعدہ بھی یاد آیا۔ لیکن سوء اتفاق سے ایسے وقت جب میں اس کے لیے اپنے آپ کو تیار نہیں پاتا۔ بہرحال جو کچھ سمجھ میں آسکا عرض کر دیتا ہوں۔ میر پر تھوڑا کہنا اور جلد کہہ ڈالنا میرے لیے اتنا ہی مشکل ہے جتنا دوسروں کے لیے بہت کہنا اور کہتے رہنا آسان! اس کے لیے کوشش کرنا پڑے گی کہ تھوڑی دیر کے لیے میں خود میر بن جاؤں۔ ممکن ہے کوئی اور ایسا کر سکے میرے لیے یہ بہت مشکل ہے اس لیے کہ میں خود اپنا میر بن چکا ہوں۔ اپنے بنائے ہوئے خول سے نکلنا مشکل ہے چہ جائیکہ میر کے خلوت کدے میں باریاب ہونے کا حوصلہ کروں، میر کی فضا میں سانس لینا اور ان کی بارگاہ میں دم مارنا آسان نہیں۔

ان کے کلام کی تاثیر عالمگیر ہے۔ بظاہر یہ بڑا فرسودہ اور بندھا ٹکا فقرہ معلوم ہوتا ہے، شاید ہو بھی۔ بے احتیاطی اور بے دردی سے استعمال میں آنے سے اپنی معنویت بھی کھو بیٹھا ہے۔ لیکن اگر اسے صحیح مان لیا جائے کہ میر کی شاعری کی تاثیر مسلّم ہے تو پھر یہ تسلیم کر لینا آسان ہو جاتا ہے کہ یہی اور اسی طرح کی تاثیر شاعر اور اس کی شاعری کو ابد مدت بنا دیتی ہے!

میر جیسا بڑا اور اچھا شاعر ہر قوم، ہر ملک، ہر زمانے اور ہر زبان کا محبوب اور قابلِ فخر شاعر ہوتا ہے۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ میر ہمارے ہی لیے نہیں ہیں۔ تمام دوسرے اقوام اور ممالک کے یکساں محبوب شاعر ہیں۔ میر ہماری تہذیب کے ترجمان اور حسن کار ہیں۔ "تہذیب رسم عاشقی" کا فقرہ اور دعویٰ

تو حسرت کا ہے لیکن میرے نزدیک اس کی روایت میر سے شروع ہوتی ہے۔ میر اور حسرت کی "تہذیب رسم عاشقی" میں نمایاں فرق بھی ہے۔ میر کی زبان منفرد و ممتاز ہے۔ اردو بڑی عشوہ طراز ہے اور آسانی سے ہر کس و ناکس کی گرفت میں نہیں آتی۔ اس کے "دم بدم با من و ہر لحظہ گریزاں از من" کی اداؤں سے سب واقف نہیں ہیں۔ یہ بات اور زبانوں کے بارے میں بھی کہی جا سکتی ہے لیکن اردو کی تخلیق توانائی تازگی و طرفگی کے عوامل دوسری زبانوں کو کم نصیب رہے ہیں۔ جتنی زبانوں، تہذیبوں قوموں اور تحریکوں سے اس نے ترکیب پائی ہے اور ان کے حسن کو اپنے میں جس طرح اس نے نکھارا سنوارا، مقبول و مستحکم کیا ہے اس کو نظر میں رکھیں تو اردو کا صحیح تصور اور مقام سامنے آتا ہے۔ میر کی اردو دوسرے شعراء کی اردو سے اس اعتبار سے علیحدہ اور اہم ہے کہ دوسرے شعرا اکثر و بیشتر عربی فارسی اور دوسری زبانوں کے الفاظ تراکیب، بندش محاورہ روزمرہ یا انواع و اقسام کے علوم و فنون یا نعروں کے سہارے چلتے ہیں میر صرف ــــ اردو اور اپنے مخصوص لب و لہجہ سے کام لیتے ہیں۔ دوسرے ممتاز شعرا کی جو مخصوص زبان ہوتی ہے اس میں اتنی "اردویت" یا "اردو پن" نہیں ہوتا جتنا میر کے یہاں ہے۔ میر نے ہر طرح کی بات اور ہر شاعر کی بات اپنی خاص زبان اور مخصوص لہجے میں ادا کر دی ہے۔

ہر شاعر کی زبان اور لب و لہجہ مختلف و مخصوص ہوتا ہے۔ لیکن میر اور دوسرے شعرا میں یہ فرق ہے کہ میر کی زبان و لہجہ کی تقلید کرنے والوں کا ہم احترام کرتے ہیں، دوسروں کی زبان کی نقالی پر ہم برہم اور بد حظ ہوتے ہیں اور ایسے شاعر اور اس کی شاعری دونوں کو مضحکہ خیز و ناقابل التفات سمجھتے ہیں۔ ایسا کیوں ہے؟ شاید اس لیے کہ میر کی زبان میں "منافقت" نہیں کی جا سکتی۔ اردو پر کتنا ہی زمانہ کیوں نہ گزر جائے اور یہ زبان زمانے کے ساتھ کتنی ہی ترقی کیوں نہ کرلے میر کی اردو ہمیشہ مقبول رہے گی اس لیے کہ میر کی زبان حسن و عشق کے ہر تصور کو واضح اور دلنشیں بنا دیتی ہے خواہ وہ تصور ارضی ہو یا ماورائی، ہمارا ہو یا آپ کا، روس کا یا امریکہ کا: جہاں تک حسن و عشق کا تعلق ہے میر نے ہمعصر نہیں بلکہ ہمہ عصر روح کو گرفت میں لے لیا ہے۔ یہ امتیاز دنیا کے چند ہی شاعروں کے نصیب میں آیا ہے۔ کیا تعجب میر جیسا شاعر پیدا کرنے میں 'فلک' کو برسوں سے زیادہ "پھرنا" پڑا ہو!

اس وقت اتنا ہی، بقیہ کبھی پھر بشرط حیات فریقین۔

مخلص: رشید احمد صدیقی

عبدالماجد دریابادی

(دریاباد ضلع بارہ بنکی یو۔پی)
۲۴ نومبر ۶۲ء

میگزین کا میرؔ نمبر جو آں عزیز کی رہبری میں نکلے گا۔ انشا اللہ سب میگزینوں کا "میرؔ" ہی ہو گا۔ مضامین تحقیقی ہوں گے لیکن خشک نہیں عمیق ہوں گے لیکن دقیق نہیں۔ لطیف و شگفتہ ہوں گے لیکن سپاٹ اور بے مغز نہیں ندرت رکھیں گے لیکن غرابت نہیں۔

یہ سب باتیں بہ طور ایمان بالغیب پہلے ہی سے فرض کیے ہوئے ہوں۔ اور خدا نخواستہ یہ سب نہ سہی، جب بھی یہ جرأت کیا کچھ کم قابل داد و مستحق آفریں ہے کہ میر تقی جیسے پُرانے شاعر کی یاد آپ اس دورِ جدّت پرستی میں منانے نکلے ہیں!

ایسے باکمال کی یاد منانا خود اپنے حُسن ذوق کا ثبوت پیش کرنا ہے۔

والسلام
عبدالماجد

بابِ اوّل

حیاتِ میر

خوش ہیں دیوانگیٔ میرؔ سے سب
کیا جنوں کر گیا شعور سے وہ

قاضی عبد الودود

میر کے حالاتِ زندگی

[اس مقالے میں حوالے بہت کم ہیں، اور اجمال سے کام لیا گیا ہے۔ سند اور تفصیل درکار ہو تو عیارستان (اس میں ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی کی کتاب متعلق "میر" کا طویل تبصرہ شامل ہے) "عبدالحق بحیثیت محقق" (شائع کردہ معاصر، اس میں ذکرِ میر، نکات الشعرا اور انتخاب کلام میر از ڈاکٹر عبدالحق کا مفصّل تبصرہ شامل ہے)، اور معیار و نقوش میں میر سے متعلق میرے مضامین دیکھے جائیں۔ میر نہ منصف ہیں، نہ راست گفتار، اور اُن کا حافظہ بھی زیادہ مضبوط نہیں۔ اُنھوں نے اپنی ذات، اپنے بزرگوں اور اپنے مخالفین کی نسبت جو کچھ تحریر کیا ہے، وہ لازمًا قابلِ قبول نہیں۔

مقالۂ ہذا (۵) ابواب پر مشتمل ہے:

(۱) آگرہ (۲) دہلی (۳) کمبھیر وغیرہ (۴) دہلی میں دوبارہ قیام اور (۵) لکھنؤ۔]

(۱) آگرہ

کچھ لوگ (" بزرگانِ من" ذکرِ میر ص۱۰) جن کی فاطمیت[۱] کا دعویٰ کیا گیا ہے، اپنے "دارو دستہ[۲]" کے ساتھ حجاز سے واردِ ہند ہوئے، اور اُن میں ایک شخص، جن کا نام معلوم نہ ہو سکا، آگرہ میں توطّن گزیر ہوئے۔ کہا جاتا ہے کہ اُن کے بیٹے، جو باپ کی طرح مجہولُ الاسم ہیں، فوجداری نواح آگرہ[۳] پر فائز ہو گئے تھے۔ اُن کے دو بیٹے تھے، بڑے جو "خللِ دماغ" سے خالی نہ تھے، جوان مرے۔ چھوٹے جن کا نام محمد علی تھا، سنہ ۱۱۳۷ھ کے لگ بھگ پیدا ہوئے۔

---

[۱] میر نے کلیات میں ایک اور شخص کی زبان سے اپنے کو "بنی فاطمہ" کہوایا ہے۔ میری رائے میں اُن کی فاطمیت مشتبہ ہے۔

[۲] "دارو دستہ" = قوم و قبیلہ، غالبًا مراد یہ ہے کہ ایک خاندان کے کچھ لوگ آئے۔ [۳] میرے نزدیک صحیح نہیں۔

اُنھوں نے علومِ ظاہر کی تحصیل شاہ کلیم اللہ اکبر آبادی (متوفی ۱۱۴۰ھ) سے کی، اور ظاہراً اُنھیں کے مرید بھی ہوئے۔ اُن کی پہلی بیوی خانِ آرزو کی بہن تھیں، دوسری کس خاندان کی تھیں اس کا پتا نہیں، اور ممکن ہے کہ وہ اس عہد کے معیارِ شرافت پر پوری نہ اُترتی ہوں۔ کہا جاتا ہے کہ محمد علی کو علی متقی[3] کا لقب ملا تھا۔

محمد تقی دوسری بیوی سے اواخرِ ۱۱۳۵ھ میں متولد ہوئے۔ اسے چند سال گزرے تھے کہ علی متقی ایک دن بعد عصر کے گھر پہنچے، کھانا پکنے میں دیر ہوئی تو اُنھوں نے اضطراب ظاہر کیا، ماما نے کہا کہ یہ فقیروں کی روش نہیں۔ علی متقی بولے کہ تم اطمینان سے کھانا پکاؤ، میں ایک درویش سے ملنے لاہور جاتا ہوں، ماما نے بہت روکا مگر نہ رُکے۔ لاہور میں خفشاں نود سے ملاقات ہوئی، جس نے اُن سے کہا کہ میں دینِ محمدی کی تائید کرتا ہوں مگر "بے حقیقت" لوگ مجھے "مُنوی" جانتے ہیں۔ اُنھوں نے جواب میں کہا کہ مجھ بُوجھ کر باتیں کرو، ورنہ میرے ہاتھوں سے قتل[4] ہو جاؤ گے۔ دینِ محمدی تمھاری تائید کا محتاج نہیں۔ لاہور سے دہلی آئے اور شیخ عبدالعزیز عزت، دیوان صوبہ کے بیٹے قمرالدین خاں کے یہاں، جن سے "قرابت قریبہ" تھی، ٹھہرے۔ اُمراء نے ملنا چاہا، مگر انکار کر دیا۔ امیرالامرا صمصام الدولہ نے جو اُس زمانے میں میر بخشی تھے، "حقوقِ سابق"[5] کی بنا پر اصرار کیا، مگر یہ نہ مانے۔ کہلا بھیجا کہ ملاقات کے لیے "مناسبت شرط" ہے[6]۔ دہلی میں معتقدین کا اتنا ہجوم رہتا تھا کہ یہ تنگ آ کر ایک دن آدھی رات کے وقت چل کھڑے ہوئے۔ بیانہ آگرہ کی راہ میں تھا، وہاں ایک خوبصورت سید زادہ، امان اللہ جس کی شادی اُسی دن ہونے والی تھی، ملا۔ اسے کچھ اس طرح دیکھا کہ وہ بیہوش ہو گیا۔ لوگوں نے کہا کہ اِس پر رحم کیجیے؛ اُنھوں نے اُسے کچھ پڑھ کر پانی پلایا اور وہ اپنی اصلی حالت پر آ گیا۔ اُس کی استدعا پر یہ اُس کے یہاں گئے، اور اُسے مخاطب کر کے ازدواج کے خلاف تقریر کی جس میں یہ بتایا کہ "کد خدائی مانعِ خدا پرستی" ہے[7] اور اس امر پر اطمینان ظاہر کیا کہ اُنھیں اِس سے نجات مل چکی ہے۔

---

۳ قرینہ ہے کہ یہ لقب خود میر کا دیا ہوا ہے۔ ذکر میر میں یہ ایک درویشِ کامل کی حیثیت سے پیش ہوئے ہیں جو "شہرۂ آفاق" بھی تھے۔ اُن کی ولایت کا حال ولی جانیں، "شہرۂ آفاق" ہونا غلط محض ہے۔ ذکرِ میر نہ ہوتی تو آج اُن کے نام سے بھی کوئی واقف نہ ہوتا۔ آباء و اجداد سے تعلق فسانہ طرازی پہلے بھی ہوتی تھی اور اب بھی ہوتی ہے۔ ۴ میر اثنا عشری تھے، لیکن قرائن اس پر دلالت کرتے ہیں کہ علی متقی سُنّی تھے۔ میر کے تبدیلِ مذہب کے کیا اسباب تھے، ان کا علم نہیں۔ میر کی وسعتِ مشرب، جس پر ڈاکٹر فاروقی نے زور دیا ہے، فرضی ہے۔ ۵ تفصیل نامعلوم ۶ مشتبہ ۷ میر کا اختراع معلوم ہوتا ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ عقیدت مندوں سے گھبرانے والا، ایسی حرکت کرے۔ ۸ یہ بات دو عورتوں سے نکاح کے بعد سوجھی۔ یہ اور بہت سی باتیں جو علی متقی سے منسوب ہیں، صحیح ہیں تو ان میں تو ازن کی نمایاں کمی معلوم ہوتی ہے۔

امان اللہ کی برات روانہ ہونے کے بعد یہ عازمِ آگرہ ہوئے۔ دولہا دولھن کو لے کر گھر واپس آیا، تو انھیں نہ پاکر بہت پریشان ہوا، اور اُسی وقت اُن کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا، لیکن نہ لوٹا۔ شاید اُسے اُن کا نام معلوم تھا اور نہ یہ جانتا تھا کہ وہ کہاں کے ہیں اور کہاں گئے ہیں۔ ایک صحرا میں پہنچ کر خضر سے مدد چاہی، اور ایک بڈھے نے "پسِ پشت" سے نمودار ہو کر کہا: "اے جوان کرامی جوئی؟ وا ہیہا چیست کہ میگوئی؟ علی متقی در اکبرآباد است، دست با چہ مشو" (ذکرِ میر صفحہ ۱۷) امان اللہ آگرہ پہنچے، تو علی متقی نے اُن کی بڑی آؤ بھگت کی اور بجائے اِس کے کہ سمجھا بجھا کر رخصت کر دیتے، اُن کی تربیت میں مصروف ہو گئے۔ یہاں تک کہ تھوڑی سی مدت میں یہ فقیرِ کامل ہو گئے

"کارش بجائے کشید کہ اگر چشمک زدے مہ با تابش نمودے و اگر آستیں افشاندے کرامت ظاہر شدے"

(ذکرِ میر صفحہ ۱۸) علی متقی اُنھیں "برادرِ عزیز" کہا کرتے تھے۔ اِدھر یہ حضرت تو درویشی کے مراحل طے کر رہے تھے اُدھر اُن کی دلھن دق میں مبتلا ہو کر راہیِ عدم ہوئی۔ قیامِ آگرہ کو ایک سال گزرا تھا کہ علی متقی نے اُنھیں کہہ بھیجا کہ "اکنون درِ فیض بروے عالمیان باید کشاد" (ذکرِ میر صفحہ ۱۹)۔ محمد تقی اِس زمانے میں (۱۱۴۲ھ یا ۱۱۴۳ھ ہوگا) ہفت سالہ تھے، امان اللہ نے جو ابھی خود نوجوان تھے، اُنھیں اپنی فرزندی[۱۱] میں لیا۔ یہ اُن کے ساتھ رہنے لگے اور اُن سے قرآن پڑھنے لگے۔ امان اللہ، آگرہ میں ایک "جوان چرب" (پسرِ روغن فروش" ذکرِ میر صفحہ ۲۳) پر مائل ہوئے۔ پیر کو اِس کا علم ہوا تو اُنھوں نے حکم دیا کہ آٹھ شبانہ روز اپنے حجرے سے باہر نہ نکلو شاید خدا اُسے بھیج دے۔ ایک ہفتہ گزرا تھا کہ وہ خود چلا آیا، اور علی متقی نے اسے "جوانِ عزیز" کا لقب دیا۔ اکابرِ شہر اُس کی عزت کرنے لگے اور مریدانِ خاص کو اُس پر رشک ہونے لگا۔

محمد تقی، امان اللہ کے ساتھ فقیروں[۱۲] کی ملاقات کو جایا کرتے اور اُن کی باتیں سنا کرتے۔ ان میں سے ایک احسان اللہ تھا۔ اس نے محمد تقی کو دیکھ کر کہا تھا: "این بچہ ہنوز سوختہ بال است،

---

۱۰ "با مادر و پدرم نگذاشت" ذکرِ میر صفحہ ۲۷ یہ اِس پر مشعر ہے کہ ماں زندہ تھیں، لیکن محمد علی جس وقت لاہور چلے ہیں صرف اماں روکتی ہے۔ بیبی کا اس موقع پر ذکر نہیں۔ اور ازدواج کی زحمت کے وقت اس کی قید سے اپنی رہائی کا ذکر کرتے ہیں، یہ اُمور خبر دیتے ہیں کہ بیبی پہلے ہی مر چکی تھیں۔ میرا خیال ہے کہ پہلے حافظ محمد حسن کی ماں فوت ہوئیں اور امان اللہ کے ورودِ آگرہ سے قبل ہی میر کی ماں مر چکی تھیں۔

۱۱ علی متقی میر کو بھی مشورہ دیا کرتے تھے کہ "عشق بورز" اور کھیل کود سے مانع آتے تھے۔

۱۲ فیضِ میر صفحہ ۲ میں ایک فقیر احسان اللہ نامی سے آگرہ میں ملنے کا ذکر ہے، مگر امان اللہ کا ساتھ ہونا مرقوم نہیں۔

آنا چنیں معلوم می شود کہ اگر بخوبی پر برآورد، بیک پرواز آن طرف آسمان خواہد بود "۔ اُس نے انھیں سوکھی روٹی کا ایک ٹکڑا پانی میں تر کر کے دیا تھا جس سے لذیذ تر چیز اُنھوں نے کبھی نہ کھائی تھی اور جس کا ذائقہ انھوں نے فراموش نہیں کیا۔ محمد تقی اور امان اللہ بیٹھے ہی ہوئے تھے کہ "صوبہ دار" نصرت یار خاں احسان اللہ کے یہاں آیا اور پانچ اشرفیاں نذر دے کر چلا گیا۔ یہ اشرفیاں اُس کی موت کا باعث ہوئیں۔ ایک گویّے کے لڑکے نے جسے اُس نے اپنا مہمان کیا تھا، اُسے زہر دے کر مار ڈالا، اور اشرفیاں لے کر چمپت ہوا۔ دوسرا فقیر جس سے یہ لوگ ملے، بایزید تھا، جو علی متقی کے بڑے مدّاحوں میں تھا۔ ایک دن علی متقی اور امان اللہ ساتھ بیٹھے تھے کہ اسد اللہ نامی ایک "سیرابہ پز" کبود جامہ سے آیا۔ میر کی زندگی میں علی متقی نے اُن سے کہا تھا کہ اِس کی کیا صورت ہو سکتی ہے کہ موت سے قبل مجھے معلوم ہو جائے کہ جلد مرنے والا ہوں۔ اُنھوں نے جواب دیا تھا اسد اللہ کو دیکھو تو یقین جانو کہ سال بھر سے، زیادہ زندہ نہ رہو گے۔ علی متقی نے امان اللہ کو اس سے آگاہ کیا، تو وہ بہت رنجیدہ ہوئے اور بولے کہ اس دن کے دیکھنے کے لیے میں نہیں رہوں گا۔ امان اللہ نے جو کہا تھا وہی ہوا اور اوائل شوال (۱۱۴۵ھ ہونا چاہیے) میں اُن کی وفات ہو گئی۔

علی متقی کو بہت رنج ہوا اور اُنھوں نے اپنا لقب "عزیز مردہ" رکھا۔ محمد تقی اس وقت دہ[۱] سال کے تھے۔ اُن کا بھی امان اللہ کے غم میں بُرا حال ہوا۔ علی متقی ایک دن باہر گئے تھے (جمادی الاخریٰ کا آخری عشرہ ہوگا) کہ "حرارتِ آفتاب" کے اثر سے بیمار ہو گئے اور تپ آنے لگی۔ ایک مہینا گزرا تھا کہ یہ تشخّص ہوا کہ "تپ متشبّث بقلب" ہے اور "استخوانی" ہو گئی ہے۔ اُنھوں نے دوا و غذا ترک کر دی اور جب موت قریب نظر آئی (۱۰ رجب یقیناً ۱۱۴۶ھ ہونا چاہیے)، تو اپنے بڑے بیٹے حافظ محمد حسن (میر کے سوتیلے بھائی) کو بُلوایا اور کہا کہ میں فقیر ہوں اور میرے پاس (۳۰۰) کتابوں کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ کتابیں میرے پاس لے آؤ اور آپس میں تقسیم کر لو۔ (حصّۂ برادرانہ کردہ بگیرید" ذکر میر ص۵۹) حافظ محمد حسن نے جواب دیا کہ میں" طالب علم" ہوں اور بھائی چھوٹے ہیں یہ کتابوں کو ضائع کر دیں گے۔ اُن کا حصّہ میرے پاس امانت رہے تو اچھا ہے۔ علی متقی جو اُس کے "مزاجِ ناساز" سے آگاہ تھے کہنے لگے:

"چہ شد[۲] کہ ترکِ لباس کردہ، لیکن کج پلاسی تو ہنوز نرفتہ است، می خواہی کہ طفلانِ بے

---

[۱] یہاں پر بیٹی کا ذکر نہیں۔ محمد حسین کلیم میر کے بہنوئی تھے، مگر یہ پتا نہیں کہ اُن سے حقیقی بہن بیاہی گئی تھیں یا سوتیلی، محض رشتے کی بہن۔

[۲] مجھے بہت شبہ ہے کہ میر نے اس موقع پر راست گفتاری سے کام لیا ہے۔

چارہ ما بازی دہی و بس از مرگ، دل بخرابیٔ ایشاں نہی، دانستہ باش کہ حق تعالیٰ غیور است و غیور را دوست می دارد، غالب کہ میر محمد تقی دست نگر تو نشود۔ اگر بنوع دیگر پیش خواہی آمد، کاسہ بر سرت خواہد شکست و نقشِ عزتِ تو پیشِ ایں ہا نخواہد نشست۔ خواہی دید اگر بمراد خواہی رسید برائے یک جلد کتاب پوستِ تو خواہد کشید۔ خوب است کتاب ہا را بہ او نگاہدارے" (ذکر میر ص۵۹)

اس کے بعد محمد تقی سے کہا کہ میں تین سو روپوں کا قرضدار ہوں، جب تک یہ رقم ادا نہ ہو میرا "مردہ" نہ اٹھانا۔ محمد تقی نے جواب دیا کہ کتابیں آپ نے بڑے بھائی کے حوالے کر دیں، گھر میں کوئی دوسری چیز جس سے ادائے قرض ہو سکے، ہے نہیں۔ علی متقی نے کہا کہ ہنڈی راہ میں ہے، چاہتا تھا کہ اس کے پہنچنے تک زندہ رہوں لیکن اس کی کوئی صورت نہیں۔ یہ کہہ کر میر کے حق میں دعا کی اور انھیں خدا کے حوالے کیا اور جاں بحق تسلیم ہوئے۔

علی متقی کی وفات کے بعد حافظ محمد حسن نے بڑی بے مروّتی کی۔ کہنے لگے کہ "کسانیکہ ہمگیرِ ناز و نعم بودند، آنہا دانند و کارِ آنہا، من در حیاتِ پدر دخیلِ کارے نگشتم، از وقفِ اولادی؎۱ ہم گزشتم، سجادہ نشینانِ او سلامت باشند، سر راہی کنند و جبہ رامی خراشند، آنچہ مصلحتِ وقت خواہد بود، خواہند نمود" (ذکر میر ص۶۰)
"بزالانِ بازار" دو سو روپے لائے، مگر محمد تقی کو علی متقی کی وصیت کا پاس تھا، انھوں نے قبول نہ کیا۔ یہی حال تھا کہ سید مکمل خاں (مرید امان اللہ) کا آدمی پانچ سو کی ہنڈی لایا، اور محمد تقی نے قرض ادا کر کے علی متقی کو اُن کے پیر کے پہلو میں دفن کیا۔ باپ کی موت کے بعد محمد تقی نے کسی کو اپنے سر پر ہاتھ رکھنے والا نہ پایا، تو اپنے معاملات چھوٹے بھائی کے سپرد کر کے "اطرافِ شہر" میں نوکری تلاش کرنے لگے۔ اس میں کامیابی نہ ہوئی تو دہلی کی راہ لی۔ وہاں پہلے یہ حال ہوا کہ "بسیار گردیدم، شفیقے ندیدم" (ذکر میر ص۶۲) مگر بالآخر قسمت نے یاوری کی، اور خواجہ محمد باسط، برادر زادہ صمصام الدولہ کو اُن پر مہربان کر دیا۔ وہ انھیں لے کر اپنے چچا کے پاس گئے اور اُنھوں نے ایک روپیہ روزانہ کا مقرر کر دیا۔ تیر عرضی ساتھ لے گئے تھے، مستدعی ہوئے کہ اس پر دستخط کر دیے جائیں کہ متصدیوں کو کچھ کہنے کا موقع نہ رہے۔ خواجہ محمد باسط کی زبان سے نکل گیا کہ

؎۱ جائداد، ۳۰۰ کتابوں سے قطع نظر، تھی ہی نہیں، تو وقفِ اولاد کہاں سے آگیا؟

"یہ قلم دان کا وقت نہیں"۔ محمد تقی قہقہہ مار کر ہنسے[16]۔ صمصام الدولہ نے اس کا سبب دریافت کیا، اُنھوں نے کہا "ایں عبارت را نفہمیدم اگر ایشاں می گفتند، قلم دان بردار حاضر نیست ایں حرف گنجایش داشت، یا آنکہ وقت دستخط نواب نیست باتی دارد۔ "وقتِ قلمدان نیست" انشاے تازہ است قلم دان چوبے بحس نمی باشد۔ وقت و غیر وقت نمی داند، بہر نفرے کہ اشارت رود بر داشتہ بیارد" (ذکر میر ص۲۲) صمصام الدولہ ہنس کر بولے کہ معقول بات ہے، اور قلمدان منگوا کر دستخط کر دیے۔ یہ روزینہ صمصام الدولہ کی وفات (۱۱۵۱ھ/۱۷۳۹ء) تک انھیں ملتا رہا۔ بند ہوا تو بڑی پریشانی کا سامنا ہوا۔ اُن لوگوں نے بھی جو علی متقی کی زندگی میں اُن کی خاکِ پا کو کحل الجواہر سمجھتے تھے، بے توجہی کی اور یہ ستّرہ[17] برس کے تھے (۱۱۵۲ھ ؟) کہ دوبارہ عازم دہلی[18] ہوئے۔

(۲) دہلی میں قیام

دہلی پہنچے تو خان آرزو کے یہاں مقیم ہوئے۔ تذکرہ نگاروں کا بیان ہے کہ محمد تقی نے خان آرزو سے استفادہ کیا تھا نکات الشعرا میں محمد تقی انھیں "استاد و پیر و مرشد بندہ" بھی کہتے ہیں۔ اور محسن پسر حافظ محمد حسن و شاگردِ میر انھیں تلامذۂ آرزو میں شمار کرتا ہے۔ لیکن "ذکر میر" میں مطلقاً کسی نوع کے علمی و ادبی استفادے کا ذکر نہیں، اور یہ لکھتے ہیں کہ "چندے بخدمتِ او ماندم و کتابے چند از یارانِ شہر خواندم" (ذکر میر ص۶۳) کچھ دنوں میں یہ اس قابل ہوئے کہ کسی کے "مخاطبِ صحیح" ہو سکیں تو حافظ محمد حسن نے اپنے ماموں کو لکھا کہ محمد تقی "فتنۂ روزگار" ہے، دوستی کے پردے میں اِس کا خاتمہ کر دینا چاہیے[19]۔ اس کے بعد خان آرزو اُن سے بدسلوکی کرنے لگے جس کا اثر یہ ہوا کہ:

"وحشتے پیدا کردم[20]، در حجرہ کہ می بودم درش می بستم و با یں کثرتِ غم تنہا می نشستم،

---

[16] بلند پایہ اور معمر اشخاص کے سامنے ایک بچّے کا قہقہہ مار کر ہنسنا اور لفظی گرفت کرنا حد درجہ مستبعد ہے۔

[[18] پہلی بار میر حملۂ نادر شاہ (۱۱۵۱ھ/۱۷۳۹ء) سے قبل دہلی آئے تھے، مگر اُنھوں نے اس حملے کا ذکر نہیں کیا، اس سے مخدومی قاضی عبدالودود صاحب نے یہ شبہ ظاہر کیا ہے (رجوع بہ عیارستان) کہ بخوبی ممکن ہے صمصام الدولہ نے میر کا روزینہ آگرہ ہی میں ملنے کا انتظام کر دیا ہو۔ حملۂ نادر شاہ کے بعد میر دہلی میں مستقل قیام کی نیت سے دوبارہ آئے تھے۔ نثار احمد فاروقی]

[19] یہ میر کا بیان ہے، دوسرے فریق کا بیان ہمارے سامنے نہیں کہ میر کے قول کی تصدیق یا تکذیب ہو سکے۔ یہ امر کہ دشمنی اس حد تک تھی کہ جان لینے کے درپے تھے، قرینِ قیاس نہیں۔

[20] مثنوی خواب و خیال (مشمولہ کلیات) میں میر نے اس بیماری کا حال لکھا ہے، لیکن اس میں آرزو کی بدسلوکی کا ذکر نہیں۔

چوں ماہ بری آمد قیامت بر سرِ می آمد ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ در شبِ ماہ پیکرے خوش صورت ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ از جرمِ قمر انداز طرفِ من می کرد و موجبِ بے خودیِ من می شد بہر طرف کہ چشم می افتاد برآں رشکِ پری می افتاد ۔ بہر جا کہ نگاہ می کردم تماشائے آں غیرتِ حور می کردم، در و بام و صحنِ خانۂ من ورقِ تصویر شدہ بود ۔ یعنی آں حیرت افزا از شش جہت رو می نمود، گاہے چوں ماہِ چہاردہ مقابل ۔ گاہے سیرگاہِ او منزلِ دل ۔ اگر نظر بر گلِ مہتاب می افتاد آتشے در جانِ بے تاب می افتاد ۔ ہر شب با وصحبت، ہر صبح بے او وحشت ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تمام روز جنوں می کردم، دل دریا وار خوں می کردم ۔ کف بر لب چوں دیوانہ و مست، پارہ ہائے سنگ در دست ۔ من افتان و خیزاں، مردم از من گریزاں ۔ تا چار ماہ آں گلِ شب افروز رنگِ تازہ می ریخت ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ناگاہ موسمِ گل رسید، داغِ سودا سیاہ گردید، ۔ ۔ ۔ ۔ بناچار کنارہ گیری شدم زندانی و زنجیری شدم۔" (ذکر میر ص۶۳)

فخرالدین کی بیبی نے، کہ علی متقی کی مرید اور اُن سے قرابتِ قریبہ رکھتی تھیں، محمد تقی کے علاج میں بہت روپے صرف کیے؛ موسمِ خزاں آیا تو اُنھیں صحت حاصل ہوئی اور اُنھوں نے "ترسّل" پڑھنا شروع کیا ــــ کچھ دن میر جعفر عظیم آبادی سے، جو ایک مجہول الاحوال شخص ہیں، درس لیا، اور سعادت امروہوی سے ملاقات ہوئی تو اُن کی ترغیب سے، ریختہ گوئی شروع کی ۔ اُنھوں نے میرؔ تخلص اختیار کیا اور جبدِ بلیغ سے "مستند شعرا" میں محسوب ہونے لگے اور اُن کی شاعری کا شہر میں چرچا ہونے لگا ۔

ایک دن خان آرزو نے میرؔ کو کھانے پر بلایا ۔ اور کچھ ایسی گفتگو کی کہ وہ کھانے کو یوں ہی چھوڑ، گھر سے نکل کھڑے ہوئے ۔ موضع قاضی میں ایک شخص سے ملاقات ہوئی، جو اُنھیں رعایت خاں پسرِ ظہیرالدولہ عظیم اللہ خاں و خواہرزادۂ قمرالدین خاں وزیر کے یہاں لے گیا ۔ رعایت خاں نے میر کو اپنا رفیق بنا لیا اور انھوں نے "قیدِ تنگ دستی" سے رہائی پائی ۔

درّانی کے حملۂ اول کی خبر آئی (۱۱۶۱ھ مطابق ۱۷۴۸ء) تو قمرالدین خاں اور احمد شاہ اُس کے مقابلے کے لیے دہلی سے نکلے رعایت خاں بھی ساتھ تھے ۔ میر اُن کے ہم سفر تھے اور خدمتیں بجا لاتے تھے ۔ سرہند میں میرؔ کی ملاقات یقین کے دادا سے ہوئی تھی جس کا ذکر نکات الشعرا میں ہے ۔ افغانوں کی شکست اور قمرالدین خاں کی موت (۱۱۶۱ھ / ۱۷۴۸ء) کے بعد رعایت خاں، معین الملک پسرِ قمرالدین خاں کی رفاقت ترک کر کے، صفدر جنگ کے ہمراہ، جو آگے چل کر

قمرالدین خاں کی جگہ وزیر ہوئے، روانۂ دہلی ہوئے۔ میر دہلی پہنچے تو اس کے کچھ بعد راجہ نگت سنگھ، رعایت خاں کا اپنے ساتھ راجپوتانہ لے گیا، میر بھی ساتھ تھے۔ اس کے بعد سادات خاں ذوالفقار جنگ میر بخشی عازمِ اجمیر ہوئے۔ مگر معاملات نے وہ رخ اختیار نہ کیا جو یہ چاہتے تھے اور بعض مصالح کی بنا پر یہ ناکام دہلی لوٹے۔ اس سفر میں میر کو خواجۂ اجمیرؒ کی درگاہ کی زیارت کا اتفاق ہوا۔ راجہ اور رعایت خاں میں نزاعِ لفظی ہوئی اور دونوں کے تعلقات خراب ہو گئے۔ میر نے رعایت خاں کی طرف سے راجہ کے پاس جاکر قسم کھائی کہ آیندہ ایسا نہ ہوگا، لیکن اُس نے معذرت قبول نہ کی اور "مردمانِ رسالہ" کی زیرتن خواہ رعایت خاں کو بھیج دی۔

رعایت خاں (اور ان کے ساتھ میر بھی) دہلی واپس آ گئے۔ ایک دن رعایت خاں نے میر سے فرمایش کی کہ اپنے کچھ اشعار ایک قوال بچے کو سکھا دیجے کہ یہ گائے، میر اس پر راضی نہ ہوتے تھے۔ لیکن خان نے اپنے سر کی قسم دی، تو مجبور ہو گئے اور وہ شعر اسے یاد کرائے ("آموختم" ذکرِ میر ص۷۰) اس کا اثر اُن پر ایسا ہوا کہ چند دنوں کے بعد "خانہ نشین" ہو گئے اور نوکری چھوڑ دی۔ خان نے اُن کی "رفاقت" کا خیال کر کے اُن کے بھائی محمد رضی کو نوکر رکھ لیا۔ اور انھیں ایک گھوڑا عنایت کیا۔ مدتِ مدید کے بعد ملاقات ہوئی تو خان نے بہت عذر کیا۔ اس پر کچھ دن گزرے تھے کہ میر، جاوید خاں خواجہ سرا کے یہاں نوکر ہوئے اسد یار خاں بخشیِ فوج نے میر کا حال بتا کر گھوڑا اور "تکلیف نوکری" معاف کرادی۔ مطلب یہ کہ برائے نام سپاہی تھے، کام کچھ نہ تھا۔

صفدر جنگ، قائم خاں کے مقتول ہونے کے بعد اُس کا گھر ضبط کرنے چلے تو نجم الدولہ (شجاع الدولہ کی بیگم کے بڑے بھائی) ہمراہ تھے۔ میر بھی ساتھ ہولیے۔ صفدر جنگ اور احمد خاں، برادرِ خُرد قائم خاں میں جنگ ہوئی جس میں صفدر جنگ کو شکست ہوئی اور نجم الدولہ مقتول ہوئے۔ میر شکست خوردہ لشکر کے ساتھ دہلی واپس آئے۔ ذوالفقار جنگ کی معزولی اور میر بخشی کے عہدے پر غازی الدین خاں کا تقرر جس زمانے میں ہوا ہے، میر نے دوستوں سے ملنا جلنا ("ملاقات عزیزاں" ذکرِ میر ص۷۲) ترک کر دیا تھا اور مطول پڑھنے میں مشغول تھے۔ جاوید خاں کو صفدر جنگ نے قتل کرا دیا تو میر بے کار ہو گئے۔ مہانراین دیوان صفدر جنگ نے اپنے دارو غہ دیوان خانہ نجم الدین علی سلام پسر شرف الدین علی پیام کی معرفت میر کو کچھ بھیجا اور طلب کیا۔ میر کے چند مہینے فراغت کے ساتھ گزرے۔ ۱۱۶۵ھ میں میر کا تذکرۂ شعرائے اردو، جس کا آغاز اس سے کچھ قبل ہوا تھا اور جس کی نسبت اُن کا دعویٰ ہے کہ اپنی قسم کی پہلی کتاب ہے، منظرِ عام پر آیا۔ قاسم کا بیان ہے کہ میر نے دہلی کے بارے میں لکھا تھا کہ "شاعریست از شیطان مشہور تر" اور اس پر خفا ہو کر بیبر خاں کمترین نے اُن کی ہجو کہی تھی۔

آتش کہنہ کہ بے سبب افروختہ ...... خود میر کا قول ہے کہ فغاں نے "علی الرغم ایں تذکرہ، تذکرۂ نوشتہ
چوں کباب بو می دہد" فتح علی گردیزی مولف تذکرۂ شعرائے صراحتہً نکات الشعرا کا ذکر نہیں کیا گو وہ میر سے
خفا معلوم ہوتا ہے۔ میر نے نکات میں جا بجا دوسروں کے کلام پر اصلاحیں دی ہیں، سودا کے ایک قطعے میں
غالباً اس کی طرف اشارہ ہے۔ کچھ باتوں کا جو اس تذکرے میں ہیں ذکر ہو چکا ہے، کچھ امور کا ذکر ذیل میں کیا جاتا ہے۔
(۱) سعادت علی سعادت امروہوی سے "ربط بسیار" تھا۔ (۲) سودا کے بارے میں لکھا ہے کہ "ملک الشعرائی
ریختہ او را شاید ..... اکثر اتفاقِ طرحِ غزل با ہم می افتد۔" (۳) درد کے متعلق مرقوم ہے: "خلف الصدق
خواجہ ناصر ..... تا یکہ فقیر بخدمت آں بزرگوار شرف اندوز می شد از زبانِ مبارکش می فرمود کہ
میر محمد تقی تو میرِ مجلس خواہی شد ..... حرفِ آں سلسلۂ خدا پرستان مؤثر افتاد ..... مجلس ریختہ
کہ بخانہ بندہ بتاریخ پانزدہم ہر ماہ مقرر است ..... بذات ہمیں بزرگ است، زیراکہ پیش ازیں ایں
مجلس بخانہ اش مقرر بود۔ از گردشِ روزگار ..... برہم خورد، از بسکہ باایں احقر اخلاص دلی داشت،
گفت کہ ایں مجمع را شما اگر بخانۂ خود معیّن بکنید بہتر است، ..... عمل کردہ آمد۔"
(۴) فغاں کی نسبت لکھا ہے: "بندہ بخدمتِ او بسیار مربوطم"
(۵) حاتم کی مذمت کی ہے اور انھیں اپنا "آشنائے بیگانہ" بتایا ہے۔
(۶) یقین کی فرعونیت کی شکایت کی ہے اور یہ کہا ہے کہ "ذائقۂ شعر فہمی مطلق نہیں رکھتے۔ لوگوں کے
اس گمان کا ذکر بھی کیا ہے کہ خود شعر نہیں کہتے۔
(۷) محمد علی حشمت کی نسبت تحریر کیا ہے کہ "اکثر بہ شعرِ مرداں اعتراض می کرد و جوابِ باصواب می یافت
..... ریختہ ..... بسیار بیجا یانہ می گفت"
(۸) تاباں کے متعلق مرقوم ہے: "با فقیر یک صفائی داشت از چندے بسبب کم اختلاطی ایں ہیچمدان کدورتے
بمیاں آمدہ، اجلش مہلت نداد کہ تلافیش کردہ آید"
(۹) میر عبدالرسول "از یارانِ ..... مولف است چنانچہ شعر بمشورتِ من میگوید"
(۱۰) محسن، برادر زادہ و شاگردِ میر
(۱۱) بندرا بن راقم، "مشقِ شعراز مرزا رفیع می کند، قبل ازیں با فقیر نیز مشورتِ شعری کرد۔"
(۱۲) محمد میر، میر ..... "از خوش کردنِ تخلص من نصف دلم از و خوش است"

(۱۳) میاں جگن ..... دعویٰ شاگردی فقیری کند"

(۱۴) کمبھیر وغیرہ

اسی زمانے میں یا اس سے کچھ قبل میر نے آرزو کی "ہمسایگی" چھوڑ دی اور امیر خاں انجام کی حویلی میں رہنے لگے۔ صفدر جنگ کی وفات کے بعد اُس کا بیٹا شجاع الدولہ اُس کا جانشین ہوا، خانِ آرزو اس امید میں کہ نجم الدولہ کے بھائی وہاں ہیں اور "حقوقِ سابق" پر نظر کرکے اُن کے ساتھ رعایت کریں گے، اودھ گئے، لیکن وہیں وفات پا گئے۔ (۱۱۶۹ھ، ۱۷۵۶ء) اس کے چند ماہ بعد راجا جگل کشور میر کو اپنے گھر لے گئے اور اپنے اشعار اصلاح کے لئے پیش کیے، میر کہتے ہیں کہ قابلیتِ اصلاح ندیدم براکثر تصنیفات او خط کشیدم (ذکرِ میر ص۸۵)، انھیں کی وساطت سے میر مہاراجہ ناگر مل کے نوکر ہوئے اور دوسرے حملۂ درانی کے بعد لواحق کو ہمراہ لے کر نکل کھڑے ہوئے کوئی خاص جگہ مدِ نظر نہ تھی، راجہ جگل کشور کی بیبی ملی، اُس کے ساتھ برسانہ گئے اور وہاں سے "فرد اسے عاشورہ" روانہ ہوئے اور کمبھیر پہنچے۔ جو راجا سورج مل کے قلعوں میں سے ایک تھا اس عہد میں راجا ناگر مل نے اسے اپنا مستقر بنا لیا تھا۔ اور میر بھی وہاں اس کے زیرِ سایہ رہے ——— یہاں بہادر سنگھ پسر راد ھاکشن خزانچی صفدر جنگ) جو اس زمانے میں راجہ کے ساتھ تھا بحُسنِ سُلوک پیش آیا میر کا بیٹا فیض علی بھی اُن کے ہمراہ تھا مگر یہ پتا نہیں چلتا کہ اس وقت اس کی عمر کیا تھی۔ ظاہر ہے کہ میر کی شادی اس سے قبل ہو چکی تھی۔ میر نے اس کا مطلقاً ذکر نہیں کیا اور بالکل خبر نہیں کہ ان کی بیبی کون تھیں؟ - میر کمبھیر میں تھے کہ ماجا آ گئے، میر اُن کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اجازت چاہی کہ وہاں سے کہیں چلے جائیں۔ راجہ نے کہا کہ آپ تو "بیابان مرگ" ہونا چاہتے ہیں، مگر میں کب اس کا موقع دوں گا۔

پانی پت میں مرہٹوں کی شکست کے بعد راجہ ناگر مل، میر کو ساتھ لے کر دہلی گئے۔ وہاں درانی کے وزیر نے راجہ سے کہا کہ شجاع الدولہ کی روش ٹھیک نہیں، آپ اور نجیب الدولہ اُسے سمجھائیں، ورنہ کہیں ایسا نہ ہو کہ درانی سے اُسے کچھ نقصان پہونچے۔ یہ لوگ گئے اور اُسے درانی کے پاس لائے اور کدورت صفائی میں مبدل ہوئی۔ میر اس سفر میں راجہ کے ساتھ تھے۔ میر نے حملۂ درانی سے جو دہلی کی تباہی کا حال لکھا ہے اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن کا مکان بھی لُٹا تھا۔ ذکرِ میر میں جو مشاہدات لکھے ہیں وہ ذیل میں نقل کئے جاتے ہیں اس سے میر کے طرزِ زندگی پر بھی روشنی پڑتی ہے:

"ناگاہ در محلّہ رسیدم کہ آں جا می ماندم، صحبت می داشتم، شعری خواندم، عاشقانہ

می نشستم، شبہا می گریستم، بعشق با خوش قداں می باختم. ایشاں را بلند می انداختم، بالسلہ خوباں می بودم، پرستشِ نکویاں می نمودم، اگر دمے بے ایشاں نشستم، تمنا بر تمنا می شکستم بزمے می آراستم، خوباں را می خواستم، مہمانی می کردم، زندگانی می کردم، دوست روی نیامد کہ باو نفس خوش آمدم، مخاطب صحیح نیافتم کہ صحبت دارم"

سورج مل نے آگرہ پر قبضہ کر لیا تھا۔ خبر تھی کہ شاہ عالم "لشکرِ بے شمار" کے ساتھ عازمِ آگرہ ہیں۔ سورج مل نے ناگر مل کو وہاں بلایا۔ وہ چلے تو میر بھی ساتھ ہو لئے۔ آگرہ میں علی متقی اور امان اللہ کے مزاروں کی "زیارت" کی، وہاں کے شعرا سے ملاقات رہی۔ ایک سُنّی عالم کے یہاں گئے جس نے انھیں شیعہ سمجھ کر گفتگو کی اور کہا کہ "اگر فی الواقع چنیں است، مرا بحالِ من واگزارید" میر نے جواب دیا "مرا نیز ہمیں تردد بود، الحمد للہ کہ صاحب سُنّی برآمدند" میر لکھتے ہیں کہ "مغز خر خوردہ، کنایہ نفہمید و بسیار خوش گردید" (ذکرِ میر ص۱۰۳) میر آگرہ سے کمبھیر واپس گئے۔ عماد الملک بھی بعض اوقات قلعہ جاتِ سورج مل میں آکر رہے تھے، معلوم ہوتا ہے کہ یہیں میر اُن سے ملتے رہے اُن کے بارے میں فرماتے ہیں:

"یگانۂ عصر است، اوصافِ پسندیدہ دارد، چناں چہ پنج شش خط بخوبی می نویسد، شعرِ ریختہ و فارسی ہر دو با مزہ می گوید، بحالِ فقیر عنایتے بیش از بیش می کند ہرگاہ بخدمت شریف او حاضر بودہ ام حظے برداشتہ" (ذکرِ میر ص۱۱۳)

راجہ ناگر مل دوسری بار آگرہ گئے تو میر پھر اُن کے ساتھ تھے۔ اور وہاں پندرہ دن قیام کے بعد کمبھیر واپس گئے سورج مل اور جواہر سنگھ کے مقتول ہونے کے بعد اہلِ دہلی سے جاٹوں کا سلوک اچھا نہیں رہا۔ یہ دیکھ کر راجہ نے اُن لوگوں سے کہیں اور جانے کی اجازت چاہی، جاٹ لیت و لعل کرتے رہے، راجہ کو یقین ہو گیا کہ بخوشی نہ جانے دیں گے تو مردانہ وار اپنے دونوں بیٹوں کے ساتھ قلعہ سے باہر نکلے اور کل اہلِ دہلی کو اپنے ساتھ لے گئے۔ یہاں سے یہ قافلہ کاماں پہنچا۔

"وہاں یہ خبر معلوم ہوئی کہ شاہ عالم فرخ آباد میں ہیں، راجہ ناگر مل نے میر کو حسام الدین خاں کے پاس جو شاہ عالم کے مزاج میں تصرف رکھتے تھے، "عہد و بیان درست" کرنے کے لئے بھیجا اور میر نے وہاں جا کر اُن سے سب باتیں طے کر لیں، لیکن راجہ کے چھوٹے بیٹے نے اس بنا پر کہ اس کے برادرانِ کلاں سے "ربط" تھا۔ باپ کو سمجھایا کہ مرہٹوں کے پاس جانا بہتر ہے۔ میر اس سے بہت آزردہ ہوئے لیکن چارہ کار نہ تھا۔ اپنے لواحق کے ساتھ، راجہ کی معیت میں روانہ ہوئے۔ دہلی پہنچے تو "زن و فرزند" کو عرب سرائے میں

چھوڑ کر راجہ سے علیحدہ ہو گئے۔

(۴) دہلی میں دوبارہ قیام

چند دنوں کے بعد میر، رائے بہادر سنگھ (پسر راجہ ناگرمل) سے ملے اور حقیقتِ حال بیان کی وہ اپنے مقدور کے موافق اُن کے ساتھ سلوک کرتا رہا، مگر بعض وجوہ سے کچھ دن کے بعد اُسے اس کا موقع نہ رہا۔ دہلی میں میر پر جو کچھ گزری اُس کا ذکر انھوں نے ان الفاظ میں کیا ہے:

"من بگدائی برخاستہ بدرِ ہر سرکردۂ لشکرِ شاہی رفتم، چوں بسببِ شعر شہرتِ من بسیار بود، مردمان رعایتِ گونہ بحالِ من مبذول داشتند، بارے بحالِ سگ و گربہ زندہ ماندم و با وجیہہ الدین خاں برادرِ خُردِ حسام الدولہ (حسام الدین خاں) ملاقات نمودم۔ آں مرد نظر بر شہرتِ من داہلیتِ خود، قدرے قلیل معین نمود و بسیار دلدہی نمود" (ذکر میر ص۱۳۲)

یہ ابتدا کا حال ہے، کچھ دن کے بعد لکھتے ہیں:

"فقیر دراں ایام خانہ نشین بود، بادشاہ اکثر تکلیف کرد، نرفتم۔ ابوالقاسم خاں پسر ابوالبرکات خاں کہ صوبہ دارِ کشمیر بود و بنی عم عبدالاحد خاں مختار است مراعاتِ گونہ بکار می بُرد۔ گاہ گاہ با اُو ملاقات می شد، گاہے پادشاہ ہم چیزے بچیزے می فرستاد"

(ذکر میر ص۱۳۵)

اس بار جو میر دہلی آئے تو سودا، قائم و سوز وہاں نہ تھے، درد و مظہر و حاتم تھے۔ مگر ان میں سے درد و مظہر پیشہ ور شاعر نہ تھے، میر کا اگر کوئی حریف تھا تو حاتم۔ اُن کے ایک شاگرد بقا سے جھگڑا ہوا اور طرفین نے ہجویں کہیں۔ میر نے جو ہجو کہی تھی وہ اُن کے کلیات میں موجود ہے، اس میں بقا کا نام یا تخلص نہیں آیا لیکن اس کے باوجود یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ کس کی ہجو ہے۔ میر نے اس زمانے میں ایک مثنوی "اژدر نامہ" لکھی جس میں معاصرین کی خبر لی تھی، قاسم کا بیان ہے کہ اسی مشاعرے میں حاتم کے شاگرد نثار نے یہ شعر پڑھا:

حیدر کرار نے وہ زور بخشا ہے نثار ایک دم میں دو کروں اژدر کے کلّے چیر کر

آئینہ دار کی مذمت میں جو مثنوی کلیات میں ہے وہ بھی اسی دور کی ہے اور آئینہ دار سے یقین ہے کہ عنایت اللہ حجام شاگرد سودا کی طرف اشارہ ہے کہ اس مثنوی میں سودا سے متعلق اشعار ذیل ہیں[۱]۔

---

۱ "ہجو عاقل نام کسیکہ بگاں انسے تمام داشت" کلیات میں ہے، عجب نہیں سودا کی ہجو تبدیلی اسم ہو (میار ستان ص۱۴۵)

مجھ میں مرزا میں تفاوت ہے بہت — یاں تاتی واں خجالت ہے بہت
جس جگہ میں نے رکھی منہ میں زباں — ہوتے اُس جاگہ جو مرزا بے گماں
اُسترے کانوں میں اپنے باندھ کر — کب کے اب تک گھس گئے ہوتے اُدھر

ادارۂ ادبیاتِ اردو کے کتب خانے میں میر کے دیوانِ اوّل کا ایک نسخہ ہے جس میں ایک ہجو یہ، مثنوی "دم الفضول" شامل ہے جس کی نسبت بعض اصحاب کا خیال ہے کہ حاتم کے حق میں ہے، لیکن قرائن اس کے مؤید نہیں۔ نسخۂ مذکور ۱۱۹۲ھ میں تمام ہوا ہے۔ اس سے یہ تو ثابت ہے کہ مثنوی لکھنؤ جانے سے قبل کی ہے مگر کب لکھی گئی ہے اس کا ٹھیک ٹھیک پتا نہیں ملتا۔ میرا قیاس ہے کہ یہ بھی اسی دور کی ہے۔ مثنوی معاملاتِ عشق بھی جس میں اپنی ناجائز محبت کا ذکر کیا ہے اسی زمانے کی معلوم ہوتی ہے۔ ننگ نامہ کا بھی اسی سے تعلق ہے، اگر معاملاتِ عشق اِس عہد کی ہے تو یہ بھی اُسی زمانے کی ہے۔

(۵) لکھنؤ

سودا کی وفات رجب ۱۱۹۵ھ میں ہوئی تو آصف الدولہ کو خیال آیا کہ میر کو بلوانا چاہیئے، انھوں نے اپنے ماموں سالار جنگ سے اپنی خواہش کا اظہار کیا۔ سالار جنگ اس "ربطِ قدیم" کی بنا پر جو اُنھیں آرزو سے تھا بولے کہ اگر زادِ راہ جائے تو ضرور آئیں گے۔ اُنھوں نے اخراجاتِ سفر آصف الدولہ سے لے کر ایک خط کے ساتھ بھجوا دے۔ یہ اوائلِ ۱۱۹۶ھ کی بات ہے۔ میر بیکار تھے اور "بے اسبابی" کی وجہ سے کہیں باہر جانا بھی ممکن نہ تھا، فوراً چل کھڑے ہوئے۔ راستے میں فرخ آباد پڑتا تھا۔ مظفر جنگ رئیس فرخ آباد نے چاہا کہ کچھ دن وہاں ٹھہریں لیکن میر اس پر راضی نہ ہوئے، ایک دو روز کے بعد روانۂ لکھنؤ ہوئے وہاں پہنچتے ہی سالار جنگ کے یہاں گئے۔ جو اُن سے بہت اچھی طرح ملے اور آصف الدولہ کو اطلاع کرائی کہ میر آگئے ہیں۔ چار پانچ دن کے بعد "اتفاقاً" آصف الدولہ مرغ بازی کے لیے آئے، تو میر نے "ملازمت" حاصل کی۔ وہ میر سے بغل گیر ہوئے اور اپنے اشعار سنائے۔ میر نے کہا سبحان اللہ کلام الملوک، ملوک الکلام۔ اُنھوں نے میر کا کلام سننے کی خواہش ظاہر کی تو میر نے بھی غزل کے چند شعر سُنائے۔ آصف الدولہ کی رخصت کا وقت آیا تو سالار جنگ نے کہا کہ یہ آگئے ہیں، ان کے لیے کوئی جگہ مقرر ہو جائے اور جب جی چاہے بلا لیا کیجئے۔ چند دنوں کے بعد آصف الدولہ نے اُنھیں بلوایا، انھوں نے قصیدہ مدحیہ سُنایا، اور نواب کے ملازمین میں داخل ہو گئے۔ صاحب

سفینۂ ہندی کا بیان ہے کہ ماہانہ تن خواہ دو سو روپے تھی

آصف الدولہ شکار کے لیے بہرائچ گئے تو میر بھی ہمرکاب تھے۔ شکار نامہ موزوں کیا جو کلیاتِ مطبوعہ میں شامل ہے۔ دوسری بار شکار کے لئے "دامن کوہ شمالی" تک گئے اور تین مہینے کے بعد واپس آئے۔ ذکرِ میر میں صراحتہً میر کے ساتھ جانے کا ذکر نہیں، لیکن دوسرے شکار نامے کے بعض اشعار سے مترشح ہوتا ہے کہ اس بار بھی میر ساتھ گئے تھے۔ آصف الدولہ نے دوسرے شکار نامے کی دو غزلوں کو مخمس کیا۔ دوسرے شکار نامے کے آخری دو شعر توجہ طلب ہیں:

جواہر تو کیا کیا دکھایا گیا — خریدار لیکن نہ پایا گیا

متاعِ ہنر پھیر کر لے چلو — بہت لکھنؤ میں رہے گھر چلو

یہ اشعار اگر واقعی میر نے آصف الدولہ کے سامنے پڑھے تھے یا اُنھیں دکھائے تھے تو تعجب کی جگہ ہے یہ اشعار جس طرح ذکرِ میر میں اُن کی قدردانی کا ذکر ہے اُس سے میل نہیں کھاتے۔ ناصر و آزاد نے جو حکایتیں میر و آصف الدولہ سے متعلق بیان کی ہیں، وہ ایسے لوگوں کے بیانات ہیں[1] جنھوں نے آصف الدولہ کا زمانہ نہیں پایا۔

یکتا، صاحبِ دستور الفصاحت کا معاملہ مختلف ہے، یہ آصف الدولہ کے ہم عصر ہیں۔ اُن کا بیان ہے:

"آصف الدولہ..... از خاطر داری و پاسِ مشارٌ الیہ ہیچ دقیقہ فرو نمی گذاشت حالانکہ جناب میر بغرورِ کمال و استغنائے تصوّف کہ مُضمر بخاطرش بودہ، اکثر کم التفاتی و بے اعتنائی بحالِ مردم می نمود، بلکہ گاہ گاہ با امرا ہم، چناں چہ باید، راہِ التفات و مبالغت نمی پیمود، چناں چہ نقل است کہ روزے میر صاحب قصیدۂ تازہ گفتہ بدربار آوردند۔ نواب وزیر، کہ از چاشت فراغت کردہ، متوجہ شنیدن شد۔ میر صاحب شروع بخواندن کردند و طول دادند، اتفاقاً آں روز ملّا محمد مغلے را کہ تازہ از ولایت آمدہ و شاعر ہم بودہ برائے ملازمت آوردہ می خواست کہ آں ہم چیزے در مدحِ حضور بخواند و تطویل قصیدۂ میر وقت نگذاشت، ملّا محمد تنگ آمدہ گفت کہ "میر صاحب قصیدہ خوب است امّا طولانی۔ اگر دماغِ نواب وفا نمی کرد، کہ می شنید؟ میر..... بیاض از دست انداختہ و منغّض شدہ گفت

[1] ناصر ممکن ہے، میر کی وفات سے قبل پیدا ہوئے ہوں، مگر اس وقت تک ایسی عمر نہ تھی کہ ذاتی علم سے کسی حکایت کے راوی ہو سکیں۔

کہ: اگر داغِ نواب دو فانی کرد، داغِ من کجا دفا می نماید؟" مطلق پاسِ حضور نہ نمود۔ نواب، کہ خود خلقِ مجسّم بود، استمالۂ مزاجِ میر بکمالِ مہربانی ومنتہا نمودہ، بقیہ قصیدہ ہم تمام شنید وخاطرِ او ہیچ نکرد۔ باوصف ایں کہ او با نواب صیغۂ اُخوت داشت"

(دستور الفصاحت ۲۵-۲۶)

ناصر کا بیان ہے کہ میر نے لکھنؤ میں شادی کی، یہ صحیح ہوگا۔ میر کے دوسرے بیٹے حسن عسکری (عرشؔ) اور بڑے بیٹے فیض علی فیضؔ کی عمروں میں بڑا تفاوت تھا، دونوں کا ایک ماں کے بطن سے ہونا خلاف قیاس ہے آصف الدولہ کے زمانے میں مشاہرہ برابر ملتا رہا، سعادت علی خاں کے عہد میں، جیسا کہ تذکرۂ کمال میں ہے بند ہو گیا۔

صاحب نادر الکلام نے میر کے آخری ایام کا حال اس طرح لکھا ہے:

"در سالے مایۂ ناز، پروردۂ آغوشِ ناز دخترے، و سالے دیگر۔۔۔۔ خلفِ کامگار و در سالے دیگر اہلیۂ عفّت شعار۔۔۔۔۔ بکنجِ عافیتِ مزار آسودند۔ در حواس و مزاج اختلالِ کلی راہ یافت، برداشتگیٔ خاطر از دنیاے ناپایدار از حد افزوں و شوقِ جاں سپردگی از اندازہ بیروں رفت۔ دامانِ عزلت مستحکم گرفتند۔ مجالس و محافل را وداع نمودند۔ مدتے ہمیں نوع گذشت آں چہ گذشت۔ آخر در شہرِ ربیع الثانی عوارضِ مُزمنہ رو بترقّی آوردند، دردِ قولنج کہ جلیسِ قدیم و ہمراز و ندیم بود، ساعتے نگذاشت، و جمیع مفاصل قواے جسمانی را مختل ساختہ، پزشکانِ شاہی کہ شناساے قدیم بودند، ہجوم آوردند، راے ہمگناں بر آں قرار یافت کہ چارۂ کار داتعی باید نمود و دارو سے باید استعمال آورد کہ قبضِ طبیعت بر طرف شود۔ تلینے دادند، اسہال بود کہ پیامِ مرگ، جُثّۂ نحیف مُضعَفِ ضعیف و اسہال یک روزہ یک صد و پنجاہ۔ واویلا آہ آہ۔ دو سہ روز ہمیں نوبت بود، آزار بمرگ انجامید، فرشتۂ موت جام ہلاہل "کُلُّ مَنْ عَلَیْہَا فَانٍ" بپیش نمود۔ بیا شامید"

دیوان چہارم مذکور کے ساتھ عبارتِ ذیل محمد محسن مخاطب بہ زین الدین احمد خاں کی ہے:

"بروز جمعہ بستم شعبان۔۔۔۔ وقتِ شام ۱۲۲۵ھ۔۔۔۔۔ بود کہ میر۔۔ صاحب۔۔۔۔ در شہر لکھنؤ در محلہ سٹھی

.... بجولمرحمت ایزدی پیوستند بروز شنبہ... وقتِ دو پہر در اکھاڑۂ بھیم کہ قبرستانِ مشہود است، نزدِ قبورِ اقربائے خویش مدفون شدند۔"

سرورق

ہمارے سرورق کی تصویر دلّی کی جامع مسجد کو ایک اچھوتے زاویے سے پیش کرتی ہے۔ محمد حسین آزاد کا بیان ہے کہ میر تقی میرؔ جامع مسجد کی سیڑھیوں کے محاورے کو سند جانتے تھے۔ یہ روایت صحیح ہو یا غلط، لیکن اس میں شک نہیں کہ یہ جامع مسجد عہدِ شاہ جہانی سے آج تک، دلّی کی ادبی و تہذیبی سرگرمیوں کا مرکز رہی ہے، اور اس علاقے کا محاورہ ہمیشہ فصیح سمجھا گیا ہے۔ میرؔ کی شاعری میں بھی "جامع مسجد" کا ذکر ملتا ہے۔ خود میرؔ کا گھر بھی اسی علاقے میں سڑک کے کنارے واقع تھا، جسے ابدالی کی فوجوں نے لوٹ کر مسمار کر دیا تھا۔ میرزا مظہرؔ بھی جامع مسجد کی پُشت پر اُس مکان میں رہتے تھے جو اُن کے لیے کیول رام بانیہ نے بنوایا تھا۔ میرزا غالبؔ کے خطوط میں بھی جامع مسجد کی سیڑھیوں پر انڈے، مرغی، کباب، کبوتر، اور بٹیروں کا ذکر ملتا ہے۔ اسی طرح کے اور بہت سے رابطے ہیں جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ خاص تہذیبی اور ثقافتی فضا جس میں اُردو شاعری نے سانس لیا، جامع مسجد کے آس پاس ہی کی تھی۔ میرؔ ہمارے ادبی سرمائے کے سب سے بڑے امین ہیں اور اُن کی شاعری اور زندگی، نیز اس تہذیبی فضا اور ماحول کی نمائندگی کے لیے جامع مسجد دلّی سب سے زیادہ بلیغ علامت ہے۔ اسی لیے ہم نے اسے سرورق کے لیے انتخاب کیا ہے:

[مصوّر: سراج انور، دہلی ۶]

کلب علی خاں فائق

حیاتِ میر

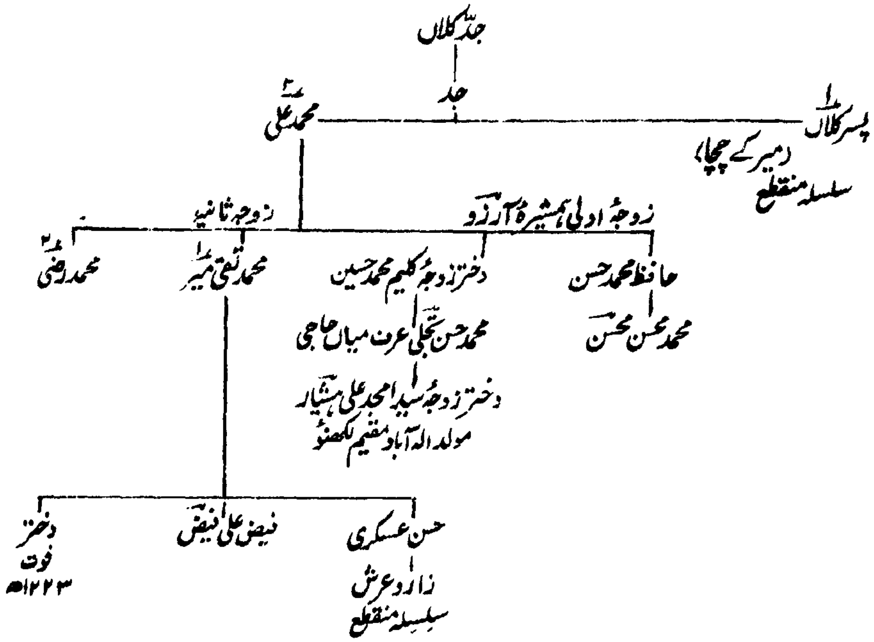
خاندان میر کا بیان ہے (ذکرِ میر ص۳۳) کہ میرے بزرگ حالات کی ناسازگاری سے مجبور ہو کر حجاز سے دکھن کی سرحد پر پہنچے اور وہاں سے مصیبتیں اٹھا کر احمد آباد آئے، کچھ وہیں گزر گئے، اور بعض ہمت کر کے آگے بڑھے، چنانچہ میرے پردادا نے آگرہ میں قیام کیا، یہاں آب و ہوا کی ناموافقت سے بیمار ہو کر دنیا سے چل بسے، اُن سے میرے دادا یادگار رہے، وہ (دادا) بڑی تلاش کے بعد نواحِ اکبرآباد کی فوجداری پر سرفراز ہوئے، معقول طور پر زندگی گذارتے تھے، جب پچاس سال کی عمر ہوئی، مزاج اعتدال سے بگڑا، چند دن علاج کیا، ابھی مکمل صحت نہ ہوئی تھی کہ گوالیار کا سفر کیا، کمزوری میں اس سخت محنت نے زہرِ قاتل کا کام کیا، اور جہانِ فانی کو وداع کیا، ان (دادا) کے دو لڑکے رہے، بڑے لڑکے کو خللِ دماغ تھا جوان مر گئے اور اُن کا سلسلہ منقطع ہوا۔

چھوٹے لڑکے میرے والد (محمد علی) تھے ترک لباس کیا اور گوشہ نشینی اختیار کی، علمِ ظاہری کی تکمیل (جس کے بغیر عالمِ معنی تک پہنچنا دشوار ہے) شاہ کلیم اللہ اکبرآبادی سے کی، جو وہاں کے اولیا کاملین میں سے

ا۔ تاریخ محمدی ص۱۳۱، شیخ کلیم اللہ اکبرآبادی، جامع المعقول و المنقول در ۱۱۶۱ھ در اکبرآباد فوت شد۔ منعم خاں، خان خاناں کی نسبت مجمع النفائس میں لکھا ہے کہ اس کا اصلی نام منعم بیگ ہے سلطان بیگ کوتوال آگرہ کا بیٹا، حضرت شیخ کلیم اللہ قدس سرہ، کے مدرسہ میں تحصیل علوم کی، یہ مدرسہ مجھے یاد آتا ہے، کہ مسجد محرم خاں خواجہ سرائے شاہ جہانی میں تھا (حوالہ یاد نہیں رہا) اسی طرح شیخ محمد ظاہر مصنف بحر العلم ترجمہ عین العلم کی نسبت لکھا ہے کہ شاہ عالم اوّل کے عہد میں مسجد بیگم اکبرآبادی میں مدرس تھے۔

تھے' ریاضت شاقہ سے حقیقت تک پہنچ گئے۔ اور ان کی رہنمائی سے درویشی کے مقام تک رسائی ہوئی' جوان صالح عاشق پیشہ تھے' علی متقی کے خطاب سے پیر نے سرفراز کیا۔

میر کے بیان کی روشنی میں شجرۂ نسب ملاحظہ کیجئے:



مولانا عبدالباری آسی مرحوم نے تجلی کو میر کا داماد لکھا ہے باقی تذکرہ نویس بھانجا لکھتے ہیں' شاہ کمال نے لکھا ہے کہ پانچ سال پہلے (۱۲۱۸ھ سال تالیف مجمع الانتخاب) میر صاحب کے مکان میں (۱۲۱۴ھ) لکھنؤ میں وفات پائی۔ میر کے پردادا جہانگیر کے عہد[ع] میں آگرے آئے ہونگے' اور یہیں میر کے دادا کی ولادت ۱۰۵۰ھ کے لگ بھگ ہوئی ہوگی' اتفاقاً میر کے دادا کے قریبی رشتہ دار عبدالعزیز عزت خلف مولانا عبدالرشید صدیقی اکبر آبادی ۹ رذی حجہ ۱۰۸۰ھ میں ہمت خاں کی سفارش سے چہارصدی' ہفتاد سوار کے منصب پر سرفراز ہوئے' چوتھے دن داروغگی ملی' ۱۰۸۳ھ میں داروغۂ عرض مکرر ہو کر منصب ہفت صدی دوصد سوار پر پہنچے۔ غالباً ان ہی کے ذریعہ میر کے دادا نواحِ آگرہ کے نائب فوجدار ہوئے ہوں' میر نے فوجدار ہونا لکھا ہے' لیکن ہم اس روایت کو صحیح تسلیم نہیں کرتے' اس کی وجہ یہ ہے کہ نصرت یار خاں کو میر

ع میر کے بیان کی روشنی میں' ورنہ شیخ عبدالعزیز عزت خلف مولانا عبدالعزیز صدیقی اکبر آبادی کے یک جدی ہونے کی بنا پر ان کا قیام علاقۂ آگرہ میں اس سے پہلے ثابت ہے' ملاحظہ ہو گل رعنا شفیق مخطوطہ لائبریری پنجاب یونیورسٹی ذکر عزت۔

نے صوبہ دار آگرہ لکھا ہے اور وہ نائب صوبہ دار تھے (تاریخ فرخ آباد صفحہ ۱۲۱ مؤلفہ آردل)۔ اسی طرح میر کو روایت صحیح نہیں پہنچی۔ ربیع الاول ۱۱۵۰ھ ہجری میں عزت دُنیا سے رخصت ہوئے۔ عزت کے متعلق سراج الدین علی خاں آرزو مجمع النفائس (مخطوطہ رضا لائبریری رامپور صفحہ ۲۹۴) میں لکھتے ہیں:-

اُن کے والد شریف شیخ عبدالرشید تھے جو آگرہ میں بسلسلہ تدریس علوم بادشاہ کی سرکار سے وظیفہ پاتے تھے۔ وطن اصلی ان کا قصبہ ڈبھائی مضافات آگرہ سے ہے۔ محمد بن ابوبکرؓ کی اولاد سے ہے .... ان کا چھوٹا بھائی شیخ عطاء اللہ مرحوم ...... اور عزت کے لڑکوں میں سے فخرالدین خاں مرحوم ہے کہ باوجود امیری کے علم میں فضیلت تھی۔ حکومتوں کی نظر میں محترم تھا، اور امرا سے مساویانہ ملتا، اپنی جائداد کا پانچواں حصہ مستحقوں کو ہر سال دیتا، اور اس کی برکت سے ہر سال اس کی ساٹھ ہزار روپیہ آمدنی ہوتی، نیتجتہً مختصر راقم حروف (آرزو) کی ان سے رشتہ داری ہے، اور میرے والد (شیخ حسام الدین) کی شیخ عبدالعزیز سے انتہائی خلوص کی دوستی، چنانچہ عزت کے لکھے ہوئے خط میرے والد کے نام، میرے پاس موجود ہیں۔ آرزو لکھتے ہیں کہ والد شیخ حسام الدین، شیخ کمال الدین ہمشیرہ زادہ شیخ نصیرالدین چراغ دہلوی کی نسل سے ہیں اور والدہ شیخ حمید الدین عرف شیخ محمد غوث گوالیاری بنیرۂ شیخ فریدالدین عطار کی اولاد میں ہیں اور میرے والد کی والدہ سیدانی تھیں۔ شیخ حفظ اللہ آثم کو ماموں زاد بڑا بھائی لکھا ہے اور شاہ مبارک آبرو کو اپنا قرابتی بتایا ہے، والدہ کی وجہ سے گوالیار کے قیام کا دوبارہ ذکر کیا ہے۔

مذکورہ بالا افراد سے قرابت کی وجہ سے ہم میر کو صدیقی شیخ ماننے پر مجبور ہیں۔ میر نے فخرالدین خلف عزت مرحوم سے اپنے والد کی قریبی رشتہ داری بتائی ہے (ذکر میر)۔ آرزو کی حقیقی بہن ان کی سوتیلی والدہ تھیں، آرزو بھی شیخ ہیں لیکن تعجب ہے کہ میر کو اپنی سیادت پر ہمیشہ فخر رہا۔ اور معاصرین شیخ ہونے کا طعنہ دیتے رہے، اِس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ میر کو ماں کی جانب سے سیادت حاصل ہوگی، جیساکہ شیخ حسام الدین کو ماں کی جانب سے سیادت کا شرف تھا، میر کے بھائی حافظ محمد حسن کو اور ان کے بھتیجے محمد محسن کو معاصرین نے سیّد نہیں لکھا، خود محمد محسن نے محاکمات الشعرا میں سیادت کا دعویٰ نہیں کیا، پھر میر باپ کی جانب سے کس طرح سیّد ہو سکتے ہیں؟

میر کے دادا کا سنہ ۱۱۱۱ھ ہجری کے متصل پچاس برس کی عمر میں انتقال ہوا، میر کا بیان ہے کہ

گوالیار کے سفر کی وجہ سے انتقال ہوا، یہ یقینی نہیں کہا جاسکتا کہ وہ گوالیار کسی سرکاری خدمت پر گئے تھے یا رشتہ داری میں، آرزو کی والدہ گوالیار میں رہتی تھیں اگر یہ سفر محمد علی کی شادی کے سلسلے میں ہوا ہو تو کچھ بعید نہیں، محمد علی کی ولادت سنہ ۱۰۸۲ھ ہجری کے متصل ہوئی ہوگی اور سنہ ۱۰۹۹ھ میں یہ سفر شادی کے لئے بھی ہوسکتا ہے مگر قرینہ یہی ہے کہ وہ کمزوری کی حالت میں سرکاری خدمت کی وجہ سے سفر پر مجبور ہوئے ہوں گے، اس لئے دوبارہ علیل ہوکر سنہ ۱۱۰۰ھ ہجری میں دُنیا سے سدھار گئے۔

محمد علی کی تعلیم مسجد محرم خاں میں (جہاں شاہ کلیم اللہ اکبرآبادی درس دیا کرتے تھے) ہوئی، وہ اپنے والد کی زندگی میں فارغ التحصیل ہو چکے تھے، معلوم ہوتا ہے باپ کا اندوختہ کچھ مدت میں برباد کردیا، اس کا سبب مسلسل ناکامی ہوسکتی ہے، کچھ شاہ کلیم اللہ کی ترک دنیا کی تعلیم، اس لئے امارت وثروت سے دست کشی اختیار کی ہوگی، اسی مسجد کی ایک گفتگو میر صاحب نے نقل کی ہے جو محمد علی نے اپنے پیر سے حاکم شام[2] کے بارے میں کی تھی، اُس وقت تک محمد علی کے غلام تھے، یعنی اسباب امارت مہیا تھے، اگر میر کا یہ روایتی سرمایہ درست ہے، (ہماری نظر میں مذہبی اختلاف کی روایت خود ساختہ ہے) میر کے تمام رشتہ دار اہل سنت والجماعت تھے، سنہ ۱۱۰۹ھ ہجری میں پیر کا انتقال ہوا، محمد علی کی شادی اس سے پہلے ہوئی ہوگی، یہ شادی سنہ ۱۱۰۰ھ اور سنہ ۱۱۰۹ھ ہجری کے مابین قیاس کی جاسکتی ہے، آرزو کی ولادت سنہ ۱۰۹۹ھ ہجری میں ہوئی، آرزو کی بہن اُن سے عمر میں کافی بڑی ہوں گی، معلوم ہوتا ہے کہ پیر کے مرنے سے اُن پر بھی اثر پڑا اور تصوف میں دلچسپی بڑھتی گئی۔ ان کی ہمشیرِ آرزو سے کتنی اولادیں ہوئیں یہ واضح نہیں ہوتا، البتہ سنہ ۱۱۱۵ھ کے متصل محمد حسن پیدا ہوئے اور پھر سنہ ۱۱۱۸ھ میں آرزو کی بہن زوجہ کلیم سنہ ۱۱۱۸ھ میں یا کچھ دنوں بعد دُنیا سے رخصت ہوگئیں، اب محمد علی کی دُنیا اُجڑ گئی اور تصوف نے ان کو اپنے دامن میں پناہ دی، ان کی دماغی الجھن کا ایک واقعہ میر نے (ذکر میر ص ۱۰۰۹) نقل کیا ہے۔

ایک دن بیقرار گھر میں آئے، ملازمہ سے کہا روٹی کا ٹکڑا دے، میں بہت بھوکا ہوں ورنہ جان

ع۲ درحق حاکم شام چہ می فرمایند۔ گفت۔ نام او در مدت العمر بزبان من نیامدہ است زبان ندارم کہ شکر این بجا آرم۔

نکل جائے گی' اُس نے کہا سامان نہیں ہے میں کھانا تیار کرتی ہوں ذرا صبر کرو' محمد علی نے اور بے صبری کا مظاہرہ کیا' ملازمہ نے ان کی فقیری پر طنز کیا' بولے میں لاہور جاتا ہوں تو کھانا پکا' میں ایک درویش سے مِل آؤں ــــــ کچھ مدت بعد لاہور پہنچے اور اس ریاکار فقیر (میر محمد حسین نمو و اللہ نمود و انمود خفشان نمود بانی فرقۂ نو' امیر خاں صوبہ دار کابل کی کسی رشتہ دار عورت سے نکاح کیا' اور کابل سے کچھ تحفے تحائف عالمگیر بادشاہ کے واسطے لے کر چلا' لاہور میں پہنچ کر عالمگیر کے مرنے کی خبر سنی (ذی قعدہ سنہ ۱۱۱۸ھ) تو سامان بیچ کر ایک نیا مذہب پیغمبری اور امامت کے درمیان درجۂ ہیگوگیت کا اختراع کیا' قدیم فارسی متروک الفاظ میں امالہ واشباع سے کام لے کر ایک کتاب" اجزاء مقدسہ" لکھی' آپ ہیگوگ اول بنا' شاہ عالم کے لاہور آنے سے پہلے (۶ ربیع الاول سنہ ۱۱۲۱ھ کو لاہور آیا) دہلی چلا گیا' محمد حسین کی تاریخ وفات ربیع الاول سنہ ۱۱۳۲ھ ہے دہلی میں فوت ہوا (تاریخ محمدی صفحہ ۱۰۶۷) - اختراع مذہب میں بدنام تھا مشہور حق نما) سے سنہ ۱۱۲۰ھ میں راوی کے کنارے پر ملاقات کی' گفتگو میں برہمی ہو گئی' رات ایک تکیہ میں گزاری' صبح کو خفشان نمود (محمد حسین) معذرت کو آیا' محمد علی راضی نہ ہوئے' پھر لاہور سے دل برداشتہ ہو کر واپسی کا ارادہ کیا اور دس بارہ دن میں دہلی پہنچ گئے' اور قمر الدین خاں (صحیح فخر الدین نسخہ ذکر میر مملوکہ رضا لائبریری رامپور) پسر شیخ عبد العزیز عزت جو صوبہ دار (دہلی) کے دیوان تھے' اور قریبی رشتہ دار تھے' کے یہاں ٹھہرے' آخر وہاں سے متنفر ہو کر بیانہ آئے اور سید امان اللہ (جن کی شادی اُسی دن ہوئی تھی) کو ترک دنیا کی تعلیم دے کر آگرہ آئے' امان اللہ بھی بیوی کو چھوڑ کر ان کے پاس آگرے آ گئے' اس سے ان کی آزادہ روی کا اندازہ ہوتا ہے' لیکن کچھ مدت بعد انہوں نے اپنے اصول کو خیرباد کہہ کر دوسرا نکاح سنہ ۱۱۳۱ھ کے متصل کیا۔
یہ بیوی کسی غریب سیّد خاندان سے تھیں' جن کا ذکر خود میرؔ نے بھی مناسب نہ سمجھا۔

ہاں حافظ محمد حسن کی ایک بہن بھی تھیں' جو عمر میں ان سے دو سال چھوٹی تھیں اور ان کا نکاح میر محمد حسین کلیم سے ہوا' کلیمؔ میر سے رشتے میں بڑے تھے ذکر میر حصہ لطائف میں برادر بزرگ لکھا ہے۔

ح۱۳ تاریخ ہندوستان جلد نہم - از مولوی ذکاء اللہ ص۲۰۳ تا ص۲۰۶ تفصیل ملاحظہ ہو سیر المتاخرین ص۶۷ ج۲ میں مزید تفصیل ہے۔

محمد علی کی کرامات کا بیان میر نے تفصیل سے کیا ہے، ہم ان سے درگذر کرتے ہوئے اب میر کے حالات سے بحث کرتے ہیں:

ولادت میر آگرے میں ۱۱۲۶ھ میں پیدا ہوئے، یہ نظریہ جسٹس سلیمان مرحوم کا ہے، ڈاکٹر عبدالحق صاحب نے ۱۱۳۷ھ سال ولادت مقرر کیا اور مولانا عبدالباری آسی مرحوم نے مقدمۂ کلیات میر (نولکشور پریس ۱۹۴۰ء) میں نوادر الکملا و دیوان چہارم میر مملوکہ راجہ محمود آباد صاحب کی مندرجہ عبارت پر اواخر ۱۱۳۵ھ سال ولادت مقرر کیا ہے، ہم دوسری روایات کو نظر انداز کرتے ہوئے صرف معاصرانہ روایات اور میر کے بیان کو پیشِ نظر رکھ کر ان تینوں سنین کی صداقت کو جانچیں گے۔

۱ — آسی مرحوم کی روایت کا انحصار دیوان چہارم میر اور نوادر الکملا کی عبارت پر ہے کہ نوے سال عمر گذار کر وفات پائی۔

۲ — ڈاکٹر عبدالحق صاحب نے ذکر میر کے آخر میں جو قطعہ تاریخ ہے اُس سے ۱۱۳۷ھ سنہ ولادت متعین کیا ہے۔ قطعہ:—

مسمّٰی با سمے شد اے باہنر — کہ ایں نسخہ گردد بعالم سمر
ز تاریخ آگہ شوی بے گماں — فزائی عدد، بست و ہفت ار براں

ذکر میر کے اعداد (۱۱۷۰) ہوتے ہیں (۲۷) عدد اضافہ کرنے سے ۱۱۹۷ھ ہو جاتے ہیں، کتاب کے خاتمہ میں میر نے اپنی عمر ساٹھ سال لکھی ہے، اس طرح ۱۱۳۷ھ سال ولادت میر کے بیان سے متعین کیا ہے۔

۳ — جسٹس سلیمان مرحوم نے بھی ذکر میر ہی سے استفادہ کیا ہے، مولوی محمد شفیع صاحب (چیئرمین بورڈ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام) کی ملکیت میں "ذکر میر" کا جو نسخہ ہے، اس کے آخر میں قطعہ کا چوتھا مصرع ہے:—

فزای عدد دہ و شش ار براں، — ۶۰ برس کے بجائے ۵۰ برس عمر ہو جانے کا ذکر ہے اور قلمی نسخے میں آخر میں چند لطائف ہیں، اُن سے پہلے یہ عبارت جو مطبوعہ نسخے کے ص۱۲۸ سطر ۳ پر ختم ہوتی ہے، درج ہے، اِس مصرع میں: ایں شامتِ اعمال قیامت اسبر

آورد' اور اس کے بعد یہ سطور ہیں:- انچہ از اسلوب معلوم می شود حسام الدین در اصل از درمیان رفت چرا کہ بدست دشمنان جانی افتادہ است تا مقدور زندہ نخواہند گذاشت'
یہ عبارت مطبوعہ نسخے میں اس مقام پر نہیں ہے اور اس کے بعد یہ عبارت ہے:- وگرنہ اختیار بدست اوست' نسخہ لاہور کا سال تصنیف ۱۱۸۶ھ ہے مگر اس کا سال آغاز نسخہ اٹاوہ سے مختلف نہیں ہو سکتا' اور سال انجام کے متعلق یہ بات توجہ طلب ہے کہ اس میں ۱۱۸۷ھ کا بھی ایک واقعہ درج ہے (حسام الدین خاں کا دشمنوں کے حوالے کیا جانا شہادت کیونکل کے مطابق ۵ رجون ۱۷۷۳ء کا ہے) (نقوش اکتوبر نومبر ۱۹۵۳ء "کچھ میر کے بارے میں"۔ از قاضی عبد الودود) -

نسخہ ذکر میر مخطوطہ رضا لائبریری رام پور بھی مولوی شفیع صاحب کے نسخے کے مطابق ہے۔ صرف قطعۂ تاریخ اس میں نہیں۔ عمر ساٹھ نہیں' پچاس لکھی ہے' اس لئے ہر دو نسخے اولین نسخے کی نقل ہیں۔ مطبوعہ نسخے کا صفحہ ۱۱۶ ۱۱۸۶ھ کے واقعات کا حامل ہے' صرف حسام الدین خاں کا مخلوں کے حوالے ہونے کا واقعہ ۱۴ ربیع الاول ۱۱۸۷ھ (۵ رجون ۱۷۷۳ء) کا ہے۔

اگر میر کے حالات کی ابتری کا جائزہ لیا جائے تو بھرت پور سے کاماں جانے کا واقعہ آخر ۱۱۸۴ھ کا معلوم ہوتا' پھر فرخ آباد شاہ عالم ثانی کے لشکر میں پہنچنا اور ناکام آنا' راجہ ناگر مل کا آنکھیں پھیرنا (۱۱۸۵ھ) اور میر کا دوسرے امرا کا سہارا تلاش کرنا' اور مصائب اٹھانا نسخہ رام پور میں اس مدت کو تین سال میں مقید کیا ہے۔

فقیر تین سال سے (نسخہ رام پور میں لفظ "سہ ساہ" ہے' جو کتابت کی غلطی معلوم ہوتی ہے) (چونکہ کوئی قدردان درمیان میں نہیں' اور عرصۂ روزگار تنگ ہے) خدائے کریم پر بھروسا کرکے کہ وہ رازق مطلق ہے' گھر میں بیٹھا ہوا ہوں ظاہرا اسباب میں چند عزیز مثل ابوالقاسم خاں برادر خورد عبدالاحد خاں مجد الدولہ اور وجیہ الدین خاں برادر حسام الدین خاں اور بیرم خاں ہیں ...... بڑھاپا آگیا یعنی عمر پچاس کو پہنچ گئی' اکثر اوقات میں بیمار رہتا ہوں"

یہ عبارت آخر ۱۱۸۶ھ میں لکھی گئی ہوگی' حسام الدین خاں کے محبوس ہونے پر وجیہ الدین خاں

کی امارت بھی درہم برہم ہو گئی ہوگی، اس لئے پچاس سال عمر سنہ ۱۱۸۶ھ میں ہو گئی تھی اور تین سال کی مدت کا آغاز اگر سنہ ۱۱۸۵ھ سے کریں، تب ربیع الاول سنہ ۱۱۸۷ھ میں عمر پچاس برس ہو جاتی ہے، اور اس طرح سنہ ولادت سنہ ۱۱۳۷ھ رہے گا، لیکن اس سے یہ نقص پیدا ہوتا ہے کہ میر کے دوسرے بیانات کی تردید ہو جاتی ہے، مثلاً میر نے سید امان اللہ کے مرنے پر اپنے والد کا قول نقل کیا ہے "تم دس برس کے ہو"۔ پھر باپ کے انتقال پر میر کی عمر یقیناً گیارہ سال کی تھی۔ اگر ہنگامہ نادری سے ایک سال پہلے میر نے دہلی جاکر امیر الامرا سے مل کر روزینہ مقرر کرایا ہو اور میر کی ولادت آغاز سنہ ۱۱۳۷ھ میں فرض کر لیں تو سید امان اللہ کا انتقال شوال یا ذی حجہ سنہ ۱۱۴۶ھ کو ہونا تسلیم کرنا پڑیگا۔ پھر رجب سنہ ۱۱۴۲ھ کے بعد محمد علی کا انتقال، اور دہلی کا سفر سنہ ۱۱۵۱ھ میں چودہ سال کی عمر میں۔

—— اس پر یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ میر نے جب ایک سال ہنگامۂ نادری سے قبل دہلی جانے کا ذکر نہیں کیا ہے پھر ہم کیوں تعین کریں، میر صرف اس قدر لکھتے ہیں (ذکر میر ص ۶۳)

"اس عہد تک کہ نادر شاہ، محمد شاہ پر غالب آیا اور امیر الامرا لڑائی میں مارا گیا، وہ روزینہ میں پاتا تھا، اور گذر بسر کرتا تھا"

ہمارا روزینہ کو ایک سال کے اندر محدود کرنا بے جا ہے، پھر سنہ ۱۱۵۲ھ میں ہنگامۂ نادری کے بعد میر دہلی آکر سراج الدین علی خاں کے یہاں مقیم ہوئے اور دیوانگی میں مبتلا ہوئے، مثنوی خواب و خیال اس واقعہ کو ظاہر کرتی ہے، اور اس سے یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ چاند میں جس حسینہ کی تصویر جلوہ گر پاتے تھے وہ اُن کے تحت الشعور کی پیداوار تھی اور آغاز جوانی کی حد کی نشاندہی کرتی ہے، سولہ سال عمر کو آغاز جوانی نہیں کہا جاسکتا، میر کی ایک غزل پر دیوان زادہ میں حاتم نے غزل کہی ہے جس کا سنہ ۱۱۵۴ھ (نسخہ رام پور) یا ۱۱۵۵ھ (نسخہ حسرت موہانی) ہے، ع

کیا طرح ہے آشنا گاہے، گہے نا آشنا   یا تو بیگانہ ہی رہیئے ہو جیئے یا آشنا

دیوانگی

آغاز بہار ۲۱ مارچ سے ہوتا ہے اور پائیز یا خزاں کا ۲۴ ستمبر کو دَور دَورہ ہوتا ہے۔ میر ذکر میر (ص ۶۵) میں لکھتے ہیں خزاں آئی اور بہار گئی، سلسلۂ دیوانگی ختم ہوا، اس سے پتہ چلتا ہے کہ آغاز سنہ ۱۱۵۳ھ (مارچ ۱۷۴۰ء) میں خلل دماغی پیدا ہوا، رجب سنہ ۱۱۵۳ھ (ستمبر ۱۷۴۰ء) میں صحت ہوئی، صحت کے بعد ہی شاعری کا شوق ہوا، اور جلد ہی شہرت پیدا کر لی، اسی زمانے میں محمد شاکر ناجی

سے ملاقات ہوئی‘ قائم نے بھی شاگرد کو بچپن میں دیکھنے کا بیان کیا ہے‘ اس طرح میر کی دوبارہ دہلی میں آمد سنہ ۱۱۵۳ھ میں متعین ہو جاتی ہے اور سنہ ۱۱۳۷ھ میں ولادت کو تسلیم کرتے ہوئے دوبارہ ۲؍ پندرہ یا سولہ سال کی عمر میں ہوتی ہے‘ پھر پہلا سفر کس عمر میں قرار دیں گے یعنی ایک سال قبل ہنگامۂ نادری چودہ سال ہوتی ہے اور دو سال پہلے یعنی سنہ ۱۱۴۹ھ میں تیرہ سال عمر ہوگی‘ اور تین سال پہلے سنہ ۱۱۴۳ھ میں بارہ سال‘ پہلے سفر کے متعلق ذکر میر (ص ۱۰۳) میں میر وضاحت کرتے ہیں‘ اس سے عمر کے تعین میں بھی مدد ملتی ہے :-

"میں اس تقریب پر (شجاع الدولہ‘ شاہ عالم ثانی کو ساتھ لے کر فرخ آباد چلا‘ تاریخ فرخ آباد میں (ص ۱۱۰ اردو) ہے کہ نواب احمد خاں نے عماد الملک سے جو بھرت پور میں سورج مل کے پاس مقیم تھا‘ امداد چاہی‘ سورج مل نے عماد الملک کے ہمراہ فوج کر دی‘ (یکم محرم ۱۱۷۶ھ مطابق ۲۲؍ جولائی ۱۷۶۳ء) راجہ ناگر مل کے ہمراہ سورج مل کے بلانے پر آگرہ تیس سال بعد گیا‘ اور والد اور چچا (امان اللہ) کے مزارات کی زیارت کی۔"

میر کا یہ بیان اگر صحیح مان لیں تو ۱۱۵۳ھ کے بعد پہلی مرتبہ قریباً ۲۵ سال بعد آگرہ آئے اور اس طرح قریباً پانچ سال کی مدت زیادہ بتائی۔ وہاں پہلے اور دوسرے سفر کی درمیانی مدت کو اگر نظر انداز کر دیا جائے تو ۱۱۴۶ھ میں پہلا سفر متعین ہو سکے گا اور ۱۱۳۷ھ سال ولادت کے لحاظ سے نو سال کی عمر میں پہلا سفر قرار پائے گا‘ اور میر کے بیانات کی روشنی میں بعد وفات محمد علی سفر دہلی متحقق ہے۔

مصحفی نے بھی میر کی عمر کا اندازہ کیا ہے (تذکرۂ ہندی ص ۲۰۴ میں جس کا آغاز سنہ ۱۲۰۶ھ میں ہوا اور اختتام ۱۲۰۹ھ میں) اس کی عمر اسّی برس کے قریب ہے۔

لفظ قریب سے واضح ہوتا ہے کہ ۷۵ سال سے زائد اور ۸۰ برس سے کم عمر تھی‘ اگر ۱۲۰۹ھ میں میر کا حال لکھا گیا‘ اور اس وقت عمر ۷۵ سال تھی تو سال ولادت ۱۱۳۴ھ اور ۷۶ سال کے حساب سے ۱۱۳۳ھ سنہ تولد رہے گا‘ اس سے ثابت ہوا کہ مصحفی کا اندازہ صحیح نہ تھا‘ ورنہ یہ اختلاف نہ ہوتا‘ جب میر کے بیانات میں اختلاف ہو تو مصحفی یا اور معاصرین کے بیانات پر انحصار کرنا صحیح نہ ہوگا‘ میر حسن تذکرۂ شعرائے اردو (صفحہ ۵۱‘ ۵۲ طبع جدید) میں لکھتے ہیں:-

جوانِ محمد شاہی، اس وقت دہلی میں ہے، اس کی عمر ساٹھ کے قریب ہو گئی۔ بقول حبیب الرحمٰن خاں مرحوم (مقدمۂ تذکرۂ شعراے اُردو ص۲) آغاز تذکرہ ۱۱۸۸ھ میں ہوا، اور اختتام ۱۱۹۲ھ میں اور عرشی صاحب کی رائے ہے (مقدمہ دستور الفصاحت صفحہ ۶۴ تا ۶۵):۔

"میر حسن نے ۱۱۸۴ھ/۱۷۷۰ء میں یا اس سے کچھ پیشتر تذکرہ شروع کر کے ۱۱۹۱ھ/۱۷۷۷ء میں ختم کر دیا تھا، بعد کے اضافوں میں صرف شاہ فصیح کی تاریخ وفات ہے جو ۱۱۹۲ھ میں واقع ہوئی تھی"۔

اس سے دو رائیں پیدا ہوتی ہیں۔ پہلی رائے کے موافق ۱۱۸۸ھ میں اگر حسن نے میر کا حال لکھا تو ۵۶ سال عمر کے لحاظ سے ولادت ۱۱۳۳ھ میں ہوتی ہے اور ۱۱۹۱ھ یا ۱۱۹۲ھ کے حساب سے ۱۱۳۵ھ یا ۱۱۳۶ھ سال تولد قرار پاتا ہے، اور دوسری رائے کے موافق ۱۱۸۴ھ اور ۱۱۹۲ھ کے سنہ ولادت بحساب ۵۶ سال ۱۱۲۸ھ یا ۱۱۳۶ھ قرار پائے گا، میر ۱۱۸۴ھ میں دہلی میں نہ تھے، آخر ۱۱۸۵ھ میں دہلی آئے، حسن نے میر کا حال یقیناً ۱۱۸۵ھ کے بعد لکھا ہوگا، عرشی صاحب نے تذکرۂ میر حسن کا آغاز ۱۱۸۴ھ میں ہونا مرزا مظہر کے حال سے کہا ہے، لیکن مرزا مظہر کے یوپی میں چند سال تک متواتر سالانہ سفر ہوتے رہے ہیں جس کا ذکر کلمات طیبات ص۱۴۱ میں ملتا ہے، رقعہ نمبر ۲۷ قابلِ غور ہے۔

چونکہ از ضعف پیری و کثرت تعلیم طریقہ کہ روزے صد کس را بل زیادہ ازاں توجہ اتفاق می افتد قویٰ آں قدر بہ تحلیل رفتہ کہ طاقت قیام در نماز فرض ماندہ است و بس، و گرنہ بمجرد استماع ایں خبر زندگی اثر بسر می دویدم، انشاء اللہ تعالیٰ در ماہ صفر ارادہ سنبھل دارم، کہ از چندیں سال ہر سال اتفاق می افتد و از ورود خود دراں اطلاع می دہم، یقین است کہ باحیاے ایں مردہ خواہند پرداخت۔

یہ خط ۱۱۸۶ھ کے بعد لکھا گیا ہے، اس میں بڑھاپے کا ذکر ہے، اور بے طاقتی کا، اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ چند سال سے ہر سال سنبھل وغیرہ کا سفر ہوتا ہے، اس سے پہلے رقعہ ۲۶ میں نواب ارشاد خاں سنبھلی نبیرۂ، نواب امین الدولہ کا ذکر ملتا ہے اور ۱۳ ربیع الاول کو دہلی میں انتقال کرنے کا حوالہ ہے، یہ رقعہ ۱۱۸۶ھ کا ہے، اس میں بادشاہ سے حدود مراد آباد میں ملاقات کا بیان ہے شاہ عالم ثانی نے ۱۱۸۵ھ کے آخر میں ضابطہ خاں کے خلاف فوج کشی کی تھی، مرہٹوں نے ضابطہ خاں کو شکست دی اور روہیل کھنڈ کے تمام رئیس دامن کوہ (نانک منہ ضلع پیلی بھیت)

میں پناہ گزیں ہو گئے، فرح بخش کے مؤلف کے بقول بادشاہ اور مرہٹے تین مہینے تک مُراد آباد کے علاقے میں رہے، برسات کے قریب آ جانے کی وجہ سے بغیر نامہ و پیام دہلی چلے گئے، جام جہاں نما میں ہے کہ مرہٹے نجیب آباد کو لوٹ کر صفر ۱۱۸۶ھ میں مراد آباد کے علاقے میں گھس آئے، آخر چالیس لاکھ روپوں پر سمجھوتا ہوا، ربیع الاول میں بادشاہ اور مرہٹے گنگا سے اتر گئے مرزا مظہر کا رقعہ[1] بھی اس کی تائید کرتا ہے (اخبار الصنادید جلد اول ص۱۶ تا ص۲۲)۔

چالیسویں رقعہ (ص۴۳) میں نواب ارشاد خاں کو سلمہ ربہ لکھا ہے، یہ خط ۱۱۸۶ھ سے پہلے کا ہے۔ اس میں لکھتے ہیں:-

"جذب قسمت اور احباب کی کشش سے فقیر دہلی سے سنبھل پہنچا اور امروہہ، مراد آباد بھی دیکھا کہ کس جگہ متعلقین کو بلا کر رکھے، دہلی کے روزانہ خطرات سے تنگ آ گیا ہوں، اور دہلی شاہجہاں پور آپ دور ہیں آخر یہاں پہنچا، سنبھل، امروہہ، مراد آباد تینوں جگہ ملاقات کے لوگوں نے منت سماجت کی کہ اُن کے یہاں رہیں، نواب ارشاد خاں سلمہ ربہ کے حقوق نے اجازت نہ دی کہ کسی دوسری جگہ کا ارادہ کروں، اور طالبان طریقہ بھی اس شہر میں بہت ہیں اقامت کا ارادہ کر کے آدمی متعلقین کو بلانے بھیجا، انھوں نے عذرات مسموع لکھے مجبوراً دہلی واپسی ہوئی۔

میر حسن نے مرزا مظہر کا حال بوجوہ مذکورہ بالا ۱۱۸۴ھ میں نہیں لکھا ہے بلکہ ۱۱۸۶ھ کے بعد لکھا ہے، اس طرح ۱۱۸۷ھ میں بھی اندراج حال ہو سکتا ہے، اگر ۱۱۸۷ھ میں حسن نے ذکر میر قلم بند کیا، اور اس وقت حسن نے میر کی عمر کا اندازہ ساٹھ کے قریب کیا یعنی ۵۸ یا ۵۹، تو سنہ ولادت ۱۱۳۵ھ یا ۱۱۳۶ھ رہے گا، اس تخمینے کی صحت میر کے بیانات سے اگر ہو جائے تو میر حسن کا اندازہ صحیح ٹھہرے گا، ورنہ غلط، ۱۱۹۱ھ یا ۱۱۹۲ھ میں سنبھل کے سفر کے ہم قائل نہیں، چونکہ ۱۱۸۵ھ اور ۱۱۸۶ھ میں اپنی ناطاقتی اور بڑھاپے کا ذکر کرتے ہیں، بعد میں سفر کا

---

[1] کلمات طیبات ص۲۴ مکتوب بست و ششم:- فقیر روز شنبہ نہم جمادی الاخریٰ روانہ دہلی گردید خدا برساند، وداغ جدائی با خود ہمراہ می برد، خدا قادر است کہ با ایں ضعف پیری ہا سے طرفین باز ہم سعادات ملاقات سراپا برکات میسر سازد ــــــ نیز نواب ارشاد خاں مغفور ازیں جا اواخر صفر، سفر کردہ، در حدود مراد آباد بادشاہ را دریافتند، و ہمراہ لشکر قصد دہلی کردند، و سیزدہم ربیع آخر داخل شہر شدہ بعد توقف دو گھڑی آب سرد سے خوردند و سرد شدند، و جاں بحق سپردند۔

امکان نہیں؛

عرشی صاحب نے نعیم کے حالات میں بھی قیاس کیا ہے کہ نعیم اُس وقت حیات تھا، اور ۱۱۸۸ھ میں اس کی رحلت شوق نے بیان کی ہے، لیکن نعیم کی موت سے لاعلمی بھی ہو سکتی ہے، اس لئے آغاز تذکرۂ حسن ۱۱۸۸ھ میں ہوا، اور مظہر کا حال بھی اسی زمانے میں قلم بند ہوا، میر کا حال آغاز میں لکھنے کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ حسن نے مشہور اُردو شعرا کے حالات پہلے قلم بند کئے ہوں گے، میر کی طرز حسن کو پسند تھی جس کا ذکر اس نے دیباچۂ دیوان میں کیا ہے۔ اس طرح سنہ ولادت ۱۱۳۵ھ یا ۱۱۳۶ھ ہو سکتی ہے، ہاں اگر میر کا حال ۱۱۸۸ھ میں قلم بند کیا ہو تو ۵۸ اور ۵۹ سال کی عمر سے ولادت کے سنین ۱۱۳۶ھ اور ۱۱۳۷ھ ہوں گے، اس کا ثبوت احسن اور سودا کے حال سے ملتا ہے، جن کی ملازمت شجاع الدولہ (متوفی ۲۴ ذی قعدہ ۱۱۸۸ھ) کی سرکار میں حسن نے لکھی ہے، ان کا احوال ۱۱۸۸ھ میں یا اس سے پہلے حیات شجاع الدولہ میں درج تذکرہ کیا ہے یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ ۵۸ یا ۵۹ کے بجائے عمر ۵۶ یا ۵۷ کیوں نہ تسلیم کی جائے، اعتراض معقول ہے لیکن قریب ساٹھ سے مراد ۵۸ یا ۵۹ اولیٰ ہے، اگر ۵۶ یا ۵۷ عمر تسلیم کریں تو سال ولادت ۱۱۳۴ھ اور ۱۱۳۵ھ یا ۱۱۳۵ھ اور ۱۱۳۶ھ رہے گا، اور یہ بیانات میر کے بیانات سے کچھ دور کرتے ہیں۔

اب میر کے بیان کا تجزیہ ہی حقیقت حال سے باخبر کر سکے گا، ذکر میر کے ہر دو نسخوں (رامپور اور لاہور) کے آخر میں پچاس سال ہونے کا ذکر ہے، نسخہ لاہور میں قطعۂ تاریخ سے ۱۱۸۶ھ برآمد ہوتے ہیں، نسخہ رام پور اس کی نقل ہے، صرف کاتب نے قطعۂ تاریخ نہیں لکھا ہے۔ آخری عبارت مطابق ہے اور لطائف بھی اس نسخے میں مطابق نسخہ لاہور ہیں۔ صرف حسام الدین خاں کا واقعہ دونوں نسخوں میں ۱۱۸۷ھ کے اضافہ کا انکشاف کرتا ہے، اگر نسخہ میں تین سال سے حالات کی ابتری کا جائزہ لیں تو ایک صورت میں ۱۱۸۵ھ سے ۱۱۸۷ھ تک مراد لیں گے اور ۱۱۸۶ھ میں اگر اختتام کتاب مان لیں تو ۱۱۸۴ھ سے ۱۱۸۶ھ تک، کاماں کی روئداد سفر سے ہم ابتری حالات کا اندازہ کر سکتے ہیں جو ۱۱۸۴ھ کا واقعہ ہے۔ شاہ عالم ثانی کے پاس بطور سفیر جب راجہ ناگرمل نے روانہ کیا تو میر نے فرخ آباد جا کر بادشاہ سے ملاقات کی اور وہاں کے حالات سے

متاثر ہو کر مخمس ہجو یہ لکھا' یہ سنہ ۱۱۸۵ھ کا ہے' واپسی پر راجہ ناگرمل سے تعلقات منقطع ہو گئے اور عرب سرائے میں مقیم ہو گئے' بہرحال نسخۂ لاہور اور رام پور کو اصل مان کر سنہ ۱۱۳۶ھ سال ولادت قرار پاتا ہے' اور اگر اضافہ شدہ عبارت کی روشنی میں سنہ ۱۱۸۷ھ میں اختتام ذکر میر تسلیم کریں تو سال ولادت سنہ ۱۱۳۷ھ رہے گا' جو ڈاکٹر عبدالحق صاحب نے تسلیم کیا ہے۔ حسن کا نظریہ میر کے بیانات سے مطابق نظر آتا ہے۔ ہماری نظر میں سنہ ۱۱۳۷ھ سال ولادت میر کا بیان کردہ ہے اور پچاس برس کی عمر میں لکھا گیا تھا جب کہ دماغی قوتیں صحیح تھیں' حافظہ قوی تھا اس لئے سنہ ۱۱۳۵ھ سال ولادت قابل تسلیم نہیں۔

میر اور سیادت کا دعویٰ میر نے نثر میں اپنی سیادت کا اشارہ کیا ہے اور نظم میں دعویٰ' آغاز ذکر میر (ص۳) میں لکھتے ہیں :- می گوید فقیر میر محمد تقی المتخلص بہ میر۔

صفحہ ۶۲ پر ہے :- چوں مرا دید' پرسید کہ ایں پسر از کیست ؟ گفت از میر محمد علی است' میر کو دیکھ کر صمصام الدولہ نے خواجہ باسط سے دریافت کیا کہ یہ کس کا لڑکا ہے ؟ کہا میر محمد علی کا ہے۔

نظم میں سیادت کا دعویٰ بہت شد و مد سے کیا گیا ہے۔ اشعار ذیل سے اندازہ کیا جا سکتا ہے :-

اے غیر میر تجھ کو گر جوتیاں نہ مارے
سیّد نہ ہووے پھر تو' کوئی چمار ہووے

کب افترا ہو مجھ سے کسی کی سوائے میر
بندہ ہوں دل سے میں اُسی سیّد امام کا

سید ہیں میر صاحب و درویش دردمند
سر رکھئے اُن کے پاؤں پہ جائے ادب ہے یہ

غیرت سے تنگ آئے غیروں سے لڑ مریں گے
آگے بھی میر سیّد کرتے گئے ہیں ساکا

منکر نہیں ہے کوئی سیادت کا میر کی
ذاتِ مقدس اُن کی ہی ذات ہو تو ہو

پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں
اس عاشقی میں' عزّتِ سادات بھی گئی

رکھتی ہے میری شرافت اشتہار
گو یہ ناسیّد کہے' ہے کیا چمار

میر کی سیادت

جانتے تھے کہ ہے یہ دلدادہ ✦ سید خستہ، خاک افتادہ

میر نے سیادت کا دعویٰ کن وجوہ پر کیا وہ نامعلوم ہیں، آگرہ میں انہیں یہ جتانے کی ضرورت نہ تھی کہ وہ سید ہیں، ہر شخص اُن کے حالات سے باخبر تھا، دہلی میں جب انہوں نے سید ہونے کا چرچا کیا تو بے خبر اصحاب نے تسلیم کیا، لیکن واقف حال کس طرح تسلیم کر لیتے، سراج الدین علی خان آرزو، میر کے والد کے سالے تھے، انہیں علمی دُنیا جانتی تھی، انہوں نے اجداد پدری میں شیخ کمال الدین خواہر زادۂ نصیر الدین چراغ دہلوی اور اجدادِ مادری میں شیخ فرید الدین عطار کو لکھا ہے (مجمع النفائس) اور ماں کی طرف سے شرف سیادت کا اظہار کیا ہے، اسی طرح انکے والد شیخ حسام الدین کو ماں کی جانب سے سادات سے انتساب کا فخر حاصل تھا، پھر بھی آرزو نے یا ان کے والد نے سیادت کا دعویٰ نہیں کیا۔ بقول میر[1] ان کے والد محمد علی کی فخر الدین خاں پسر شیخ عبدالعزیز عزت سے قرابت قریبہ تھی (ذکر میر میں قمر الدین خان نام ہے جو غلط ہے، تاریخ محمدی میں ہے کہ فخر الدین خان بن شیخ عبدالعزیز بن شیخ عبدالرشید اکبرآبادی، امرائے عصر سے، اواخر شوال یا آغاز ذی قعدہ ۱۱۴۳ھ میں فوت ہوا اور اس کی عمر قریب ستر کے تھی، علم و فضل اور طلاقت لسانی سے موصوف تھا اور اس کا باپ ۱۰۸۹ھ میں فوت ہوا)۔ جب میر ۱۱۵۳ھ میں دیوانے ہوئے تو فخر الدین خاں کی بیوی نے میر کا علاج کیا تھا، (ذکر ص ۲۵) آرزو کی بہن میر کی سوتیلی ماں تھیں اور نسباً شیخ، آرزو کے والد اور شیخ عبدالعزیز عزت میں دوستی بھی تھی اور قرابتِ قریبہ بھی، اور عزت کی میر کے والد سے بھی قرابت قریبہ تھی،

قرابتِ قریبہ کی تشریح بے سود ہے، شیوخ سے قرابت ان کے شیخ ہونے پر دال ہے، اسی وجہ سے معاصرین نے نہ صرف سیادت پر شبہ کیا بلکہ اعتراض بھی کئے، آرزو نے آبحیات میں سودا کا ایک قطعہ نقل کیا ہے ؎

بیٹھے تنورِ طبع کو جب گرم کر کے میر ✦ کچھ شیرمال سامنے، کچھ نان، کچھ پنیر
میری کے اب تو سالے مصالح ہیں مستعد ✦ بیٹا تو گندنا سے بنے، اور آپ کو ننہ میر

---

[1] ذکر میر ص ۱

کلیات قائم مملوکہ ڈاکٹر عبدالحق صاحب صفحہ ۲۰۵ میں یہ رباعی قائم کی ملتی ہے ؎

رو ٹی کے لئے کہائے تم میر جی میر کہئے تو بجا ہے آپ کو میر خمیر
پر میر ہوئے یہ اوس طرح کے جیسے ساگوں میں ہے کوتہ میر راگوں میں جمیر

صاحب تذکرۂ مسرت افزا (مطبوعہ معاصر پٹنہ) کا بیان ہے :-

مَیں نے سنا ہے کہ میرؔ سید نہیں ہے، خواجہ میر دردؔ کے والد خواجہ میر ناصر مرحوم نے محمد تقی میرؔ کی ذکاوتِ طبع آغاز جوانی میں دیکھ کر کہا کہ: میرؔ میدانِ سخنوری ہوگا، اس دن سے اپنے آپ کو میرؔ سے ملقب کیا۔ اس سلسلے کی روایت نقل کرتے ہیں کہ حضرت مصیبؔ فرماتے تھے:- ایک شخص میرا ہمسایہ تھا جو شیخ تھا۔ کچھ مُدت سعیٔ معاش کر کے جب واپس آیا تو اپنے آپ کو میر مشہور کیا، ایک دن مذاق کے طور پر مَیں نے اس سے پُوچھا کہ شیخی میں کیا نقصان تھا جو میر بن گئے کہا۔ پیر نے مجھے میر کا خطاب دیا ہے۔

غلام حسین شورش عظیم آبادی (متوفی ۱۱۹۵ھ) اپنے تذکرۂ شورش (اقتباس میر تقی میرؔ حیات اور شاعری ص۶۴ تا ص۶۶) میں روایت کرتے ہیں :-

اور تذکرہ (نکات الشعرا) میں خود کو سید لکھا ہے، لوگ کہتے ہیں شیخ ہے چنانچہ کسی نے کہا ہے۔ مصرع :-

شیخ تقی نام ہوا اور میر کہادے، دوسرا کہتا ہے: دِلّی میں اک شیخ زادہ گنجفے کا میر ہے۔
سیّد فتح علی گردیزی نے اپنے تذکرہ میں تقی میر کو سید لکھا ہے، پھر انہوں (میرؔ) نے اپنی جھوٹی سیادت کے استحکام کے لئے میرؔ تخلّص کر لیا ہے۔

اِس جھگڑے کا تصفیہ اس طرح ہو سکتا ہے کہ ہر دو فریق کے دلائل کو پرکھا جائے، میرؔ نے نکات الشعرا اور ذکرِ میر میں محمد تقی سے پہلے لفظ میر استعمال کیا ہے اور امیر الامرا کی زبانی اپنے والد محمد علی کے نام میں میر کی شمولیت ظاہر کی ہے، اور اُردو اشعار میں بھی سیّد ہونے کا بار بار ادّعا ہے، اور بقاؔ کے حق میں جو ہجو یہ مثنوی (کلیات میر ص۹۱۹) کہی ہے اُس میں بقاؔ کے الزام (ص۹۲۲) کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ میری شرافت اشتہار رکھتی ہے، اگر یہ نا سید کہے تو اس چمار کے کہنے سے کیا ہوتا ہے۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ میر کی شہرت کے ساتھ ساتھ ان کے سید ہونے کے دعویٰ کو سودا، قائم اور بقا وغیرہ نے جھٹلایا، مگر میر اپنے دعویٰ پر مصر رہے، معاصرین نے جن الفاظ میں ذکر کیا ہے ان سے بھی نتیجہ نکالا جا سکتا ہے: میر محمد تقی کے ساتھ حسب ذیل تذکروں میں ذکر ہے:۔

تذکرۂ گردیزی (ص۱۴۷) عقد ثریا (ص۵۳) مقالات الشعرا (ص۱۴۴) تذکرۂ شعرا علاؤ الدولہ مخطوطہ ص۲۳۲) تذکرۂ ہندی (ص۲۰۴) گلشن ہند۔ تذکرۂ تکملۃ الشعرا۔ شوق (مخطوطہ ورق ۲۸۸ ب) گلشن سخن (۸۷ ب)۔

قائم نے صرف محمد تقی نام لکھا ہے، میر حسن نے میاں محمد تقی اور محسن کے ذیل میں برادر زادۂ میر محمد تقی ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ میر حسن کو یقین نہیں کہ میر سید ہیں محسن کو شیخ محسن لکھا ہے، حکیم قدرت اللہ قاسم مجموعۂ نغز (ص۲۳۹، ص۲۳) لے آغاز میں میر محمد تقی لکھا ہے اور درمیان میں محمد تقی۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ قاسم بھی مشتبہ ہیں، حسینی نے میر کا ذکر میر محمد تقی سے کیا ہے، اور محسن کا نام محمد حسن لکھا ہے نام غلط لکھا ہے لیکن میر کا اضافہ کیوں نہیں کیا، اس سلسلے میں میر کا نام بھی صرف محمد تقی لکھا ہے (ص۱۳۸ تذکرۂ ریختہ گویاں) کیا میر کا تب تذکرہ کا تو اضافہ نہیں ورنہ دونوں جگہ میر نام سے پہلے لکھنا تھا، پھر اگر حسینی میر کے خاندان سے باخبر ہیں تو انہوں نے محسن کا نام محمد حسن کیوں لکھا اور لفظ میران کے نام کے ساتھ بھی شامل کرنا تھا، بہتر یہی ہوگا کہ محسن کے متعلق معاصرین سے استناد کریں؛ اگر معاصرین نے انہیں میر یا سید سے موسوم کیا ہو تو معاملہ صاف ہو جاتا ہے، آخر محمد علی ہی کی نسل ہے، میر سید بن جائیں اور محسن شیخ، ذرا میر کا بیان دیکھیے (ص۵۵ ذکر میر) پھر حافظ محمد حسن میرے بڑے بھائی کو جو دوسری ماں سے تھا، بلایا۔ یہاں میر نے حافظ محمد حسن کے نام سے پہلے لفظ میر نہیں لکھا ہے، اور اپنے والد کی گفتگو میں اپنے نام کے ساتھ لفظ میر نقل کیا ہے (ذکر میر ص۵۹) کہ میر محمد تقی بنزادست نگرنہ ہوگا۔

اب حافظ محمد حسن کے بیٹے محسن کا حال نکات الشعرا (ص۱۴۸) میں پڑھیے:۔

محمد محسن محسن تخلص کرتا ہے فقیر مؤلف کا بھتیجا ہے۔

قائم مخزن نکات (ص۵۵) میں لکھتے ہیں: "محمد محسن محسن نوجوان ہے خلف الرشید میاں حسن خان آرزو کا بھانجا۔"

تذکرہ شعراے اُردو (صفہ ۱۵۱) میں میر حسن وضاحت سے لکھتے ہیں :

"شیخ محمد محسن المتخلص بہ محسنؔ، ایک جوان ہے صاحب علم و حلم، شیخ سراج الدین علی خاں آرزوؔ کے رشتہ داروں میں سے، خان مذکور کی صحبت میں تربیت پائی، علم شعر میں بہت مہارت رکھتا ہے، اس وقت نواب سالار جنگ کی سرکار میں سرفراز ہے، مصائب زمانہ کی وجہ سے اُس کا مزاج شاعری کی طرف راغب نہیں ہوتا۔"

صاحب مجموعۂ نغز (جلد ۲ صفہ ۱۸۴) لکھتے ہیں :

"محسن تخلص محمد محسن مرحوم کا ہے، سراج الدین علی خان آرزوؔ کے قریبی رشتہ داروں میں تھا، شاعر بے نظیر محمد تقی میرؔ سے بھی رشتہ داری تھی ـــــــ بعد رحلت خاں مرحوم اس کے ترکہ پر قابض ہو کر حسب دلخواہ تصرف کیا۔"

اب میرؔ کے بھتیجے محمد محسن کی بھی رائے دیکھیے، شیخ علی حزیںؔ پر آرزوؔ نے اعتراضات کئے "اور تنبیہہ الغافلین" نام رکھا، آرزوؔ کے اعتراضات کی ادبی حلقوں سے تردید کی گئی، محسنؔ نے ۱۱۸۰ھ میں آرزوؔ کی تائید میں رسالہ "محاکمات الشعرا"[۲] لکھا، محسن اپنا ذکر آغاز میں اس طرح کرتا ہے :

"فقیر محمد محسن ولد ـــــــ حافظ محمد محسن (محمد حسن) اکبرآبادی از فرزندان قدوۃ العلماء رئیس السالکین حضرت نصیر الدین الملقب بہ چراغ دہلوی و شاگرد و نبیرۂ سراج المحققین حضرت آرزو است۔"

اس سلسلے میں میرؔ کا ذکر بھی ہے اور نام سے پہلے میرؔ شامل کیا گیا ہے، غالباً یہ کاتب رسالہ کا اضافہ ہے جیسا کہ محسنؔ کے نام سے نوٹ میں اضافہ کیا گیا ہے۔ میر کا ذکر یہ ہے :

رئیس الشعراے ریختہ گویاں عموی راقم میر محمد تقی میرؔ تخلص از فیض ترتیب آں حباب (آرزو) در فن ریختہ صاحب کمال شدہ، و در زبان فارسی نیز از اثر صحبت سراج المحققین استعداد کلی پیدا نمودہ۔"

آخر محسن کو اپنے والد کے نام سے پہلے لفظ میرؔ لکھنے میں کونسی چیز مانع تھی، اگر محسن سید

۲۔ اورینٹل کالج میگزین ماہ فروری ۱۹۵۱ء۔ محاکمات الشعرا (میر محسن اکبرآبادی) از ڈاکٹر سید عبداللہ۔

تھا تو اس نے سید یا میر اپنے نام سے پہلے کیوں نہ لکھا؟ اس کا سبب واضح ہے، محسن کو اپنا نسب معلوم تھا، وہ سادات سے انتساب پسند نہیں کرتا تھا، اور جو بات میر صاحب پھیلا چکے تھے، اس سے محسن نے فائدہ اٹھانا گوارا نہیں کیا۔

اس بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ میرؔ نسباً شیخ تھے اور شیخ بھی صدیقی۔ شیخ عبدالعزیز کا خاندان مکہ معظمہ سے ہجرت کر کے ہندوستان آیا تھا، میر صاحب بھی یہی بات کہتے ہیں، شفیقؔ کا بیان ہے کہ عزتؔ کے اجداد میں سے ایک قصبہ ڈبھائی میں آکر مقیم ہوا۔ میرؔ کہتے ہیں کہ سرحد دکھن، وہاں سے احمد آباد، گجرات اور پھر آگرہ آئے، ڈبھائی قصبہ بلند شہر آگرہ سے قریب ہے، میرؔ نے کوتاہ قلمی سے کام لیا اور اپنے دادا کا نام بھی لکھنے سے گریز کیا، یہی محسنؔ نے محاکمات الشعرا میں کیا ہے، عزتؔ محمد بن ابوبکرؓ کی اولاد سے تھے اور میرؔ ان سے قرابت قریبہ ظاہر کرتے ہیں، ان حالات میں عزتؔ اور میرؔ کا ایک خاندان سے ہونا ثابت ہوتا ہے، اب سوال یہ ہے کہ میرؔ کو سیدؔ کہلانے پر کیوں اصرار تھا، اس کا جواب یہ ہے کہ میرؔ کی والدہ سیدانی تھیں جس طرح آرزوؔ کی والدہ اور دادی سیدانی تھیں، آرزوؔ نے سید کہلانے کے دلائل کمزور پائے، اس لئے یہ دعویٰ نہیں کیا، اور یہ حقیقت ہے کہ رواج زمانہ کے موافق خاندان باپ سے منسوب ہوتا ہے میرؔ نے اپنی جدت طبع کے تحت شرافت مادری سے فائدہ اٹھایا اور سید کہلانے پر مصر رہے۔ اگرچہ وہ جانتے تھے کہ خاندان شیوخ سے ہیں، یہ میرؔ کی ذاتی رائے تھی جس کو اکثریت نے آخر میں تسلیم کر لیا

ڈاکٹر عبدالحق

میر کا سفرِ لکھنؤ

آزاد نے میر صاحب کے متعلق لکھا ہے کہ جب لکھنؤ چلے تو ساری گاڑی کا کرایہ بھی پاس نہ تھا ناچار ایک شخص کے ساتھ شریک ہو گئے اور دلی کو خدا حافظ کہا۔ تھوڑی دور آگے چل کر اس شخص نے کچھ بات کی۔ یہ اس کی طرف سے منہ پھیر کر ہو بیٹھے۔ کچھ دیر کے بعد پھر اس نے بات کی۔ میر صاحب چیں بجبیں ہو کر بولے ــــــ "صاحب قبلہ آپ نے کرایہ دیا' بے شک گاڑی میں بیٹھے مگر باتوں سے کیا تعلق؟" اس نے کہا: "حضرت! کیا مضائقہ ہے' راہ کا شغل ہے' باتوں میں ذرا جی بہلتا ہے"۔
میر صاحب بگڑ کر بولے ــــــ "خیر آپ کا شغل ہے' میری زبان خراب ہوتی ہے"۔

آزاد نے یہ نہیں بتایا کہ گاڑی میں ان کا ساتھی کون تھا؟ اس کا پتا ہمیں ایک دوسری جگہ سے ملتا ہے:

خواجہ امیر احرار قادری' لکھنؤ کے امرا میں سے تھے' ان کے والد خواجہ بادشاہ خاں' نواب سعادت علی خاں کے مدار المہام تھے' چنانچہ جب نواب صاحب گورنر ہسٹنگز سے ملنے کلکتہ گئے تو یہ ان کے ہمراہ تھے۔ خواجہ امیر کی یادگار ایک کتاب "معدن الجواہر" ہے جو انھوں نے ۱۲۳۵ھ میں تالیف کی' جبکہ ان کی عمر ۵۵ سال تھی' یہ کتاب فارسی زبان میں ہے۔ اس کے

پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ خواجہ امیر صاحبِ علم شخص تھے۔ ان کی تحریر منشیانہ ہے۔ کتاب بہت دلچسپ ہے۔ کتاب کے نام کی مناسبت سے فصل یا باب کو "جوہر" کے نام سے موسوم کیا ہے۔ کُل کتاب میں بیس[2] جوہر ہیں اور ہر جوہر کسی خاص طبقے کے واقعات و حکایات پر مشتمل ہے۔ یہ بڑی دلچسپ اور عجیب کتاب ہے۔ مؤلف نے اس میں ایسی حکایتیں یا نقلیں یا واقعات جمع کر دیے ہیں جو اس نے اپنے بزرگوں اور معتبر اشخاص سے سُنے یا بچشمِ خود دیکھے اور بہت سی ایسی ظریفانہ اور عجیب و غریب حکایتیں ہیں جو بقول مؤلف "دروغ ہائے راست مانند" اور پڑھنے والے کے لیے "باعث معلومات و سرمایۂ علم مجلس و موجب افراحِ متوافر" ہیں - یہ کتاب ۱۳۱۱ھ میں حیدر آباد دکن کے مطبع گلزار احمدی میں طبع ہوئی تھی۔

کتاب کے "جوہر دہم اور بیانِ صفاتِ بد و بخت زبونِ ہر کس" میں یہ واقعہ لکھا ہے:

نقل: "تقی تخلص میر کہ سرآمد شعرائے ہند بود و عمرش قریب بصد سال رسیدہ در عہدِ وزارتِ نواب سعادت علی خاں بہادر اکثر اوقات در خانۂ ما می آمد۔ غزلہائے آبدار خود خواندہ مستمعاں را محظوظ ساخت۔ والد بزرگوار راقم آثم باوے سلوک ہائے نمایاں می کرد۔ زبانی چند کس معتمد بہ فرحِ سمع گردید کہ یک بار میر تقی و میر ضیاء الدین کہ او ہم شاعر زبر دستے بود، ہر دو بیک عرابہ بنشستہ عازم سفر بودند و قریب یک ماہ ہم سفر بودند۔ اما ہر دو کس مذکور شدہ بغرورِ شاعریٔ خویشاں دریں مدت ہم کلام نشدند۔ یکے بہ یک پہلوے عرابہ و روئے دیگرے بہ پہلوے دیگر عرابہ بود و پشتہائے ہر دو ملاصق ہمدیگر۔ ایں بد خلقیہا را لحاظ باید کرد کہ چہ قدر تنگ خو بودند۔ چنانچہ مولوی معنوی جلال الدین رومی ہم دریں معنی فرماید ؎

اے بسا ہندو و ترک ہم زباں

اے بسا دو ترک چوں بیگانگاں"

ترجمہ نقل: "تقی تخلص میر جو شعرائے ہند کے سرتاج تھے اور ان کی عمر تقریباً سو سال تھی نواب سعادت علی خاں کے عہدِ وزارت میں اکثر ہمارے گھر آیا کرتے تھے اور اپنی دلآویز غزلیں پڑھ کر سننے والوں کو محظوظ کرتے تھے۔ راقم آثم کے والد بزرگوار ان سے

بہت عمدہ سلوک فرماتے تھے۔بعض لوگوں کی زبانی یہ بات تفریح سے سنی گئی کہ ایک بار میر تقی اور میر ضیاء الدین جو خود ایک زبردست شاعر تھے' دونوں ایک گاڑی میں بیٹھے سفر کر رہے تھے' اور ایک مہینا اکٹھے سفر کرتے رہے۔ لیکن دونوں اشخاص مذکورہ اپنی شاعری کے گھمنڈ میں اس تمام عرصہ ایک دوسرے سے ہم کلام نہ ہوئے۔ ایک کا رخ گاڑی کے ایک طرف اور دوسرے کا دوسری طرف تھا اور وہ پشت بہ پشت بیٹھے تھے۔
یہ بدخلقی ملاحظہ فرمائیے کہ وہ کس قدر تنگ دل تھے۔ چنانچہ مولوی معنوی مولانا جلال الدین رومی نے بھی اس بارے میں بجا ارشاد فرمایا ہے کہ:

"کتنے ہی ہندو اور ترک ہیں کہ ہم زبان ہیں' اور کتنے ہی ترک ہیں جو ایک دوسرے سے بیگانہ ہیں۔"

میر ضیاء الدین ضیاء اردو کے مشہور شاعر اور استاد گزرے ہیں۔ میر حسن کو بھی ان سے تلمذ تھا میر حسن نے اپنے تذکرے میں ان کی بہت تعریف لکھی ہے۔ان کے تلامذہ کی تعداد کچھ کم نہیں۔ خواجہ امیر نے یہ واقعہ خود میر صاحب یا اپنے والد کی زبانی نہیں سنا بلکہ چند معتمد اشخاص کی زبانی سنا۔ یہ بھی نہیں معلوم کہ یہ اشخاص کون تھے۔ اس کی تصدیق کسی اور تذکرے وغیرہ سے بھی نہیں ہوتی۔ اس لیے صرف خواجہ امیر کے بیان کی بنیاد پر اس واقعہ کی صحت یا عدم صحت کے متعلق کچھ کہنا دشوار ہے۔ مگر بہر حال یہ بیان ایسا نہیں جو نظر انداز کر دیا جائے۔ ممکن ہے آئندہ تحقیق اس پر کچھ روشنی ڈالے

ڈاکٹر منوہر سہائے انورؔ
ترجمہ: عتیق احمد صدیقی

سراج الدّین علی خانِ آرزوؔ اور اُن کی تصانیف

اس مختصر سے مقالے میں خانِ آرزو کی ہمہ گیر زندگی اور ان کی وقیع تصانیف کا احاطہ کرنا بہت مشکل ہے۔ اس کا سبب ایک یہ بھی ہے کہ ہم اس سلسلے میں مغلوں کے دورِ انحطاط کی تاریخ کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔

یہ یگانۂ روزگار ادبی شخصیت اپنے دامن میں مختلف النّوع کمالات سمیٹے ہوئے تھی۔ آرزو ہندی نژاد فارسی نویس اور کئی ایک زبانوں کے عالم تھے۔ تاریخ پر اُن کی گہری نظر تھی۔ وہ بیک وقت شاعر، سماجی لسانیات کے ماہر، لغت نویس، شارح اور نقاد تھے۔ ان کی کثیر التعداد تصانیف علم کی مختلف شاخوں میں مستقل اضافے کی حیثیت رکھتی ہیں اور ان تصانیف کی بدولت آرزو کو علما کی صف میں ممتاز مقام حاصل ہے۔

ان کا پورا نام اور تخلص شیخ سراج الدین علی استعداد خان آرزو تھا۔ اکبر آباد میں ۱۶۸۷ء/۱۰۹۹ھ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد شیخ حسام الدین کا پیشہ سپہ گری تھا۔ عہد اورنگ زیب میں وہ متقدر عہدوں پر مامور رہے۔ آرزو کا پدری سلسلۂ نسب شیخ نصیر الدین چراغ دہلی کے بھانجے شیخ کمال الدین سے ملتا تھا۔ ننہالی سلسلہ شیخ محمد غوث گوالیاری کے واسطے سے شیخ فرید الدین عطار نیشاپوری تک پہنچتا تھا۔

خانِ آرزو کی عربی و فارسی کی تعلیم بہت کم عمری میں شروع ہوئی اور جلد ہی انھوں نے ان علوم میں کمال حاصل کر لیا۔ انھوں نے ہندی زبان اور ہندوستانی موسیقی پر بھی عبور حاصل کیا۔ ان کی تصانیف سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ وہ سنسکرت سے بھی واقفیت رکھتے تھے۔ غالباً اسی بنا پر وہ سنسکرت اور فارسی کے لسانی رشتے کو دریافت کر سکے۔

٭ سابق صدر شعبہ اُردو فارسی، پنجاب یونی ورسٹی (کیمپ کالج)، نئی دہلی

انھیں کے قول کے مطابق ۱۴ سال کی عمر میں ان کا شاعرانہ ذوق اُجاگر ہو چکا تھا۔ متھرا کی عشق انگیز اور نغمہ آفریں فضاؤں نے ان کے شاعرانہ ذوق کو بیدار کیا۔ انھوں نے غزل گوئی شروع کر دی۔ ایام طالب علمی ہی میں انھوں نے فارسی کی بعض تصانیف پر شرحیں لکھنا شروع کر دی تھیں۔

۱۷۱۹ء میں محمد شاہ نے تخت و تاج پر قبضہ کیا اور اسی سال خانِ آرزو مستقل قیام کے لیے دہلی آئے۔ دہلی آنے کے بعد ہی ان کی علمی اور ادبی سرگرمیوں کا آغاز ہوا جو ۳۷ سال تک برابر جاری رہیں۔ نواب قمر الدین خاں اُس زمانے میں وزیر اعظم تھے۔ یہاں آنے کے بعد جلد ہی اُن کے وکیل رائے رایاں آنند رام مخلص سے خان آرزو کے گہرے تعلقات ہو گئے۔ مخلص نے آرزو کی بہت مدد کی اور اُن کو ہفت صدی منصب کے ساتھ جاگیر اور خطاب بھی دلا دیا۔

۱۷۲۰ء میں مؤتمن الدولہ نواب اسحاق خاں شوستری نے خان آرزو کی سرپرستی کی۔ جس کا سلسلہ نواب کی وفات تک جاری رہا۔ ان ۱۴ برسوں میں ہندستان بڑے سیاسی انقلابوں سے دوچار ہوا۔ لیکن آرزو یک سوئی کے ساتھ اپنے کام میں منہمک رہے۔ انھوں نے دہلی کی تباہی کو دیکھا۔ دہلی والوں کا قتل عام، نادر شاہ کے مظالم اپنے دوستوں اور کرم فرماؤں کی بے حرمتی یہ سب دردناک مناظر نگاہوں کے سامنے گزرے مگر ان تمام صبر آزما مراحل میں وہ بدستور اپنے کام میں مصروف رہے۔ چناں چہ ۴۸ سال کی عمر تک پہنچتے پہنچتے وہ مندرجہ ذیل تصانیف پیش کر چکے تھے۔

۱۔ سراج اللغۃ : لغت کی یہ ضخیم کتاب اُن کا وسیع تحقیقی کارنامہ ہے۔ ٹیک چند بہار نے اپنا لغت کا مجموعہ مرتب کیا تو اس میں سراج اللغۃ کو بھی شامل کیا۔ قدیم فارسی زبان کے طلبا اور محققین کے لیے یہ مفید کتاب ہے۔

اس میں برہان قاطع اور فرہنگ رشیدی کی شرح اور تنقید بھی کی گئی ہے۔ اس لیے اس کی اہمیت اور زیادہ ہو جاتی ہے۔ سنسکرت اور فارسی کے باہمی رشتے پر بھی اس کتاب میں روشنی ڈالی گئی ہے۔

۲۔ چراغِ ہدایت : اس کا موضوع بھی لغت نویسی ہے۔ اس میں ان تمام الفاظ اور محاوروں کو یک جا کر دیا گیا ہے جو جامی کے بعد فارسی شعرا کے یہاں استعمال ہوئے ہیں اور فرہنگ جہانگیری، مجمع الفرس سروری یا برہان قاطع میں شامل نہیں ہیں۔

۳۔ دیوانِ قصائد و غزلیات۔

۴۔ دیوان اثر شیرازی: یہ شفیعای اثر شیرازی کے دیوان کا جواب ہے جو اس وقت بہت مقبول ہوا۔

۵۔ شورِ عشق یا سوز و ساز: یہ زلالی کی مثنوی محمود و ایاز کے جواب میں لکھی گئی۔

۶۔ خیابان: گلستان سعدی کے مشکل الفاظ اور محاورات کی توضیح و تشریح نیز ملا نوراللہ احوائی ملا سعد وغیرہ جیسے فاضل علما کی شرحوں پر تنقید بھی کی گئی ہے۔

۷۔ شگوفہ زار: نظامی کے سکندر نامے پر خود شرح لکھی اور سابقہ شرحوں کا محاکمہ کیا گیا ہے۔

۸۔ شرحِ قصائد عرفی: ملا منیر اور دیگر شارحین نے جو اعتراضات قصائد عرفی پر کیے تھے، استدلال کے ساتھ اُن کا رد پیش کیا، اور اس کی قدر و قیمت کا تعین کیا ہے۔

۹۔ سراج منیر: ملا منیر کی تصنیف کارنامہ میں عرفی، طالب، زلالی اور ظہوری کے کلام پر جو اعتراضات کیے گئے تھے، ان کے رد میں یہ رسالہ لکھا ہے۔

۱۰۔ عطیۂ کبریٰ: اس کا موضوع علم بیان ہے اور یہ اس موضوع پر اپنے انداز کی پہلی کتاب ہے۔

۱۱۔ موہبت عظمیٰ: علم معانی و بیان پر یہ رسالہ بھی اولیت کا شرف رکھتا ہے۔

۱۲۔ سراج وہاج: حافظ کے ایک بند کی مدلل و مبسوط شرح ہے۔

۱۳۔ آدابِ عشق: موضوع عشق پر ایک چھوٹی سی کتاب ہے۔

۱۴۔ معیار الافکار: قواعد زبان پر ایک رسالہ۔

۱۵۔ جوش و خروش: نوعی کی مثنوی سوز و گداز کے طرز پر ایک مثنوی۔

۱۶۔ مہر و ماہ: یہ بھی مثنوی ہے۔ اس کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے لیے ایسی بحر اختیار کی گئی ہے جو عام طور پر مثنوی کے لیے رائج نہیں۔

۱۷۔ مثنوی: یہ حدیقۂ سنائی کی بحر میں ہے۔

۱۸۔ عالمِ آب: ظہوری کے ساقی نامے کے جواب میں۔

۱۹۔ پیامِ شوق: خطوط کا مجموعہ۔

۲۰۔ گلزارِ خیال: موسم بہار اور ہولی کے تیوہار کا بیان۔

۲۱۔ آبروے سخن: در صفت حوض و فوارہ و تاک۔

۲۲۔ شرح مختصر المعانی۔

۲۳۔ عبرت فسانہ: سلیم کی مثنوی قضا و قدر کے نمونے پر ایک نامکمل مثنوی۔

فارسی کے مستند عالم اور شاعر کی حیثیت سے ان کی شہرت ملک کے طول و عرض میں پھیل چکی تھی لیکن غرور ان کو چھو نہیں گیا تھا۔ وہ افہام و تفہیم کے لیے ہمیشہ تیار رہتے تھے۔ کسی لفظ یا محاورے کے صحیح استعمال یا اس کے معانی سے ناواقفیت کے اظہار پر ان کے مداحوں کو صدمہ پہنچا ہو لیکن اپنی لاعلمی تسلیم کر لینے میں انھیں کبھی باک نہ تھا۔ درحقیقت وہ یہ بات ادبی دیانت اور عالمانہ صاف گوئی کے منافی خیال کرتے تھے کہ آدمی اپنے مصنوعی وقار کو قائم رکھنے کے لیے غلط سلط تاویلات کا سہارا لے۔

موتمن الدولہ کی وفات کے بعد ان کے بیٹے نجم الدولہ مرزا محمد نے بھی خانِ آرزو سے وہی سلوک جاری رکھا جو اُن کے باپ کرتے تھے۔ انھوں نے آرزو کا ڈیڑھ سو روپے ماہانہ وظیفہ بھی مقرر کر دیا۔ اس امر کے کافی شواہد موجود ہیں کہ بعض دوسرے امرا نے بھی خان آرزو کی سرپرستی کی اور ان کو مالی امداد دیتے رہے جس سے وہ اپنی زندگی سکون و اطمینان اور فارغ البالی کے ساتھ گزار سکے۔ آرزو اپنے مکان پر اکثر مشاعرے منعقد کراتے تھے۔ ان کا مکان ہندوستانی اور فارسی علماء کا مرجع و مرکز بن گیا تھا

آرزو کے شاگردوں کی کثیر تعداد ہندوستان کے گوشے گوشے میں پھیلی ہوئی تھی۔ ان کے شاگردوں میں مخلص، خوش گو، واقف، مظہر وغیرہ نے تو استاد کی زندگی ہی میں اپنے دیوان مرتب کر لیے تھے مشہور ریختہ گو شعرا میں جن کی تربیت و اصلاح خوش گو اور مظہر نے کی، آبرو، یک رنگ، تمیر، سودا اور درد وغیرہ کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔

فارسی کے مشہور عالم اور بے مثل شاعر شیخ محمد علی حزیں نے ہندستان اور ہندستانیوں پر اعتراضات کیے۔ تو خانِ آرزو تڑپ اٹھے اور پوری قوت کے ساتھ حریف کو للکارا۔ انھوں نے ایک رسالہ موسوم بہ تنبیہ الغافلین لکھا، جس میں حزیں کے کلام کی تمام غلطیوں کو جمع کر کے ان پر سخت تنقید کی۔ اس سے پہلے ہندستان کی سیاحت کے دوران حزیں کو جو وقار اور منصب جلیل اس ملک کے علمی حلقوں میں حاصل ہو چکا تھا، اسے اس بے باک تنقید سے سخت صدمہ پہنچا۔

۱۷۳۴ء اور ۱۷۵۳ء کے درمیانی عرصہ میں انھوں نے مندرجہ ذیل تصانیف پیش کیں:

۱۔ تنبیہ الغافلین: حزیں کے اعتراضات کا جواب۔

۲۔ **غرائب اللغات:** ہندی فارسی لغت جس میں ہندی الفاظ کی فارسی میں تشریح کی گئی ہے۔

۳۔ **دادِ سخن:** اس میں شیدا اور قدسی کے مناقشے پر محاکمے کے علاوہ اس امر پر بھی طویل بحث ہے کہ زبان دانی میں ہندوستانی ایرانیوں کے برابر ہو سکتے ہیں یا نہیں؟

۴۔ **جواب دیوانِ سلیم**

۵۔ **جواب دیوان فغانی**

۱۷۵۰ء میں نجم الدولہ کو قتل کر دیا گیا اور ان کا چھوٹا بھائی نواب رشید خاں سالار جنگ جانشین ہوا۔ سالار جنگ شوستری خاندان میں درجۂ امارت پر فائز ہونے والا تیسرا اور آخری فرد تھا۔ اس نے بھی اس بات کا انتہائی خیال رکھا کہ خانِ آرزو کی فارغ البالی میں فرق نہ پڑے۔

۱۷۵۱ء میں خانِ آرزو نے اپنا ضخیم تذکرہ موسوم بہ مجمع النفائس مرتب کیا۔ انھوں نے اس کی ترتیب بہ لحاظ حروف تہجی کی۔ اور (۱۷۳۵) فارسی گو شعراء کے سوانحی حالات کے ساتھ اُن شعرا کے کلام کا وافر انتخاب بھی شامل کیا۔ تذکرہ کی ترتیب کے بعد وہ فارسی زبان کی طرف متوجہ ہوئے اور امام جلال الدین السیوطی کی شہرۂ آفاق عربی تصنیف مزہر کے نمونے پر فارسی زبان کی تاریخ، توافقِ لسانین، صوتیات اور صرف و نحو سے متعلق ایک کتاب موسوم بہ مثمر لکھی۔ یہ ایسا موضوع تھا جس پر قلم فرسائی کے لیے ایک طرف فارسی زبان و ادب پر عالمانہ قدرت، محققانہ بصیرت اور گہری واقفیت کی ضرورت تھی تو دوسری طرف سنسکرت سے شناسائی بھی لازم تھی۔ یہ کام خانِ آرزو کے سوا اور کسی کے بس کا نہ تھا۔ اسی زمانے کی ایک اور تصنیف شرح گل کشتی ہے جو دراصل میر نجات کی مشہور مثنوی متعلق بہ فن کشتی کی شرح ہے۔

اُس وقت خانِ آرزو کو وہ مقام حاصل تھا جو کم ہی لوگوں کو نصیب ہوتا ہے۔ ان کے شاعرانہ کمال اور عالمانہ فضیلت میں اُن کا کوئی حریف نہیں تھا۔ علم السنہ اور فن شاعری پر ان کے منہ سے نکلا ہوا ہر ہر لفظ مستند مانا جاتا تھا۔ ان کے بعض ہمعصر علما کی ان کے بارے میں کیا رائے تھی، ملاحظہ کیجیے۔

"آرزو کا قلم اقلیم سخن پر حکمرانی کرتا ہے۔ قلم کی روانی پکار پکار کر کہتی ہے کہ لکھنے والے کی تحریر پر حرف زنی نہیں کی جا سکتی۔" (فتح علی گردیزی)

"عہدِ حاضر میں اس (آرزو) سے اعلیٰ شاعر اور جید عالم کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔"

(قیام الدین قائم)

"شاعر اور عالم کی حیثیت سے اُسے (آرزو کو) جو تفوق حاصل ہے. اس کا ثانی نہیں" •

(حسین دوست)

"جس طرح حضرت موسیٰ نے اپنے اژدھے کی مدد سے ساحران فرعون کو مغلوب کر لیا تھا' اسی طرح آرزو نے اپنے زور قلم سے اپنے ہم عصر شعرا پر افضلیت حاصل کی ہے" (آزاد بلگرامی)

دربار شاہی میں سازشوں کا جال بچھا ہوا تھا۔ ۱۷۵۴ء میں نواب رشید خاں سالار جنگ کو اپنے متوسلین کے ساتھ لکھنؤ جانا پڑا۔ سالار جنگ اور خانِ آرزو کے درمیان یہ طے پا گیا تھا کہ آرزو اپنی زندگی کے باقی ایام اپنے مورث اعلیٰ شیخ کمال الدین کے وطن اجودھیا میں گزاریں گے۔

مذکورہ بالا تصنیفات کے علاوہ خان آرزو نے اپنا ایک اور دیوان بھی مرتب کیا۔ یہ دیوان اول سے زیادہ ضخیم تھا۔ اجودھیا کے قیام کے دوران اپنے ایام پیری میں' آرزو نے جواب دیوان کمال خجندی لکھنا شروع کیا۔ ایک اور رسالہ زوائد الفوائد کا بھی آغاز کیا تھا' جس میں فارسی کے غریب مصادر اور ان کے مشتقات سے بحث کی تھی لیکن ان دونوں کتابوں کی تکمیل نہ ہو سکی۔

سالار جنگ نے خانِ آرزو کے لیے تین سو روپیہ ماہانہ وظیفہ مقرر کرا دیا تھا۔ اس زمانے میں لکھنؤ اہل علم و فن کا مرجع بنا ہوا تھا۔ لوگ جوق درجوق ہندستان کے گوشے گوشے سے یہاں چلے آ رہے تھے۔ اس کی کشش سے آرزو بھی نہ بچ سکے اور وہ لکھنؤ چلے گئے۔ پنشن کے اجرا کو ابھی چند ہی ماہ گزرے تھے کہ آرزو سخت بیمار ہوئے۔ زندگی کی امید باقی نہ رہی تو انھوں نے یہ وصیت کی کہ موت کے بعد میرا جسم سپرد خاک کرنے کے لیے دہلی بھیج دیا جائے۔ بالآخر ۲۶ جنوری ۱۷۵۶ء کو پیام اجل آ پہنچا۔ اور ستر سال کی عمر پاکر واصل بحق ہو گئے۔ ان کی نعش دہلی بھیج دی گئی۔ دہلی میں جمنا کے نزدیک وکیل پورہ میں ان کا رہائشی مکان تھا۔ اسی مکان میں ان کو دفن کر دیا گیا۔

آرزو کی بدقسمتی تھی کہ وہ اس دور میں پیدا ہوئے جو مغل حکومت کا بدترین دور تھا۔ سلطنت رو بہ زوال تھی۔ ہر طرف بدنظمی اور شورش تھی۔ تخت کی جانشینی پر جنگیں ہو رہی تھیں۔ نوابین اور امرا تباہ ہو رہے تھے۔ مرہٹوں کی سرکشی نے ملک کی پرسکون زندگی کو ختم کر دیا تھا۔ جگہ جگہ صوبے دار بغاوت کر رہے تھے۔ مرکزی حکومت کی جڑیں اقتصادی طور پر بھی کمزور ہو چکی تھیں۔ بدیسی قوتوں کے حملے ہو رہے تھے۔ تاج شاہی میں سلطنت کو تباہی سے بچانے کی سکت باقی نہ رہی تھی۔ قتل و خونریزی کا بازار ہر طرف گرم تھا۔

اُن حالات نے ایک ایسی فضا پیدا کر دی تھی جس میں کسی ذہین آدمی کے لیے اپنی صلاحیتوں کا پورا پورا استعمال ممکن نہیں تھا۔ یہ امر کچھ کم تعجب خیز نہیں ہے کہ ایسے نامساعد حالات اور ایسی شور زمین میں خانِ آرزو نے جو گل کاری کی، وہ اپنی نوعیت میں بے مثال ہے۔

آرزو کی ذہنی ہمہ گیری کے اثر سے ان کی شاعری میں بھی بڑا تنوع ہے۔ ان کے پسندیدہ شعرا کے افکار اور اظہار بیان نے آرزو کی ذاتی خصوصیات کے ساتھ مل کر ان کے کلام کو بلندی کی معراج پر پہنچا دیا۔ آرزو کا خیال تھا کہ نادر تخیلات کا عمدہ پیرایہ میں اظہار ہی شاعری کا حسن ہے۔ غزل، قصیدہ، مثنوی وغیرہ اصناف سخن پر ان کو عبور حاصل تھا۔ ان کی شاعری اپنے عہد کے تمام ادبی رجحانات کا احاطہ کرتی ہے۔ ان کی پُر گوئی کا یہ عالم ہے کہ اس عہد کے ایک درجن شاعروں کا کلام بھی یک جا ہوکر اُن کے کلام کے برابر نہیں ہوسکتا۔ بلند پایہ شعرا کے دیوان کی جواب گوئی ایک کمال تصور کیا جائے تو بے خوف تردید کہا جاسکتا ہے کہ ہندستان میں فارسی شاعری کے آغاز سے آج تک جواب گوئی کے کمال میں آرزو کا ثانی پیدا نہیں ہوا۔

لغت نویسی میں بھی خانِ آرزو کا کوئی حریف نہیں۔ ان کے سامنے ان تمام لغت نویسوں کے چراغ گل ہو گئے، جنھوں نے اپنی ساری عمر قدیم لغات کے مطالعہ اور ان کی تصحیح میں صرف کر دی تھی۔ اس سلسلے میں خانِ آرزو کے تفوق کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ لغت نویس ہونے کے ساتھ ساتھ وہ ایک شاعر، نقاد اور کئی زبانوں کے ماہر بھی تھے۔ ان کی تحقیق و تدقیق، الفاظ و محاورات کی چھان بین، اور ان کی صحیح توجیہ و تطبیق نے علما کو یہ باور کرا دیا تھا کہ استناد کے لیے ان کے پیش رووں سے رجوع کرنا محض تضیع اوقات ہے۔

ہند ایرانی لسانیات کے باوا آدم اور سنسکرت فارسی کے قریبی رشتے کے دریافت کنندہ کی حیثیت سے ان کو اولیت کا شرف حاصل تھا۔ تحقیق کے اس میدان میں وہ پہلے شہسوار تھے خانِ آرزو کے ان کمالات کی بنیاد پر ہی محسن نے یہ کہا تھا کہ انھوں نے فارسی کو عربی کے ہم پلّہ بنا دیا ہے۔

فن شاعری اور اسلوب پر آرزو کی تخلیقات ادبیات کا درجہ رکھتی ہیں۔ چوں کہ وہ خود بھی اچھے شاعر تھے اس لیے انھیں لغت نویسی کے میدان میں دوسرے لوگوں پر برتری حاصل رہی۔

تنقید نگاری میں خانِ آرزو کی گہری بصیرت کا عام طور پر اعتراف کیا گیا ہے۔ انگریزی میں شیلے کو شاعروں کا شاعر کہا جاتا ہے، خانِ آرزو ناقدوں کے ناقد تھے۔ ان کے اعلیٰ جمالیاتی احساس نے ان کی معقولیت پسندی اور محاکمانہ استعداد کے ساتھ مل کر ان کے گرد عظمت کا ایک ہالا بنا دیا تھا۔ بعض اوقات وہ ہمیں بے جا حرف گیری بھی کرتے نظر آتے ہیں، لیکن اس وقت بھی ان کی بات بے معنی ہوکر نہیں رہ جاتی بلکہ ادبی تنقید میں اضافہ کرتی ہے۔

شارح کی حیثیت سے بھی خانِ آرزو کو تمام متقدمین پر فضیلت حاصل تھی۔ ان کی شرحیں مستقل تصنیف کا درجہ رکھتی ہیں۔ مدرسین، پیشہ ور اساتذہ اور دیگر حضرات نے بھی شرحیں لکھیں مگر ان لوگوں میں تخلیقی صلاحیتوں کا فقدان تھا، اسی لیے آرزو کی شرحیں ان کے مقابلہ میں ممتاز درجہ رکھتی ہیں۔ ان میں تشریح و تنقید کا ایک اعلیٰ نمونہ ملتا ہے جو لوگ اصل تصانیف کے ادبی محاسن سے بہرہ اندوز ہونا چاہتے ہیں، ان کے لیے یہ شرحیں بہت مفید اور ضروری ہیں۔ ایک مؤرخین کے الفاظ میں خانِ آرزو ہندی نژاد شارحین میں سب سے بلند مقام پر فائز ہیں۔

مجمع النفائس میں انھوں نے ۱۷۱۵ شعراء کے سوانح اور انتخاب کلام کے ساتھ ساتھ ناقدانہ رائیں بھی درج کی ہیں۔ مختلف فیہ مسائل کی بحث، دلچسپ لطیفے، زبان و ادب سے متعلق متعدد و متفرق سوالات کے بارے میں ان کی اپنی رائے ان کے خصوصی اوصاف ہیں۔ ضخامت میں بھی یہ اور تذکروں سے بڑھ کر ہے۔ درحقیقت اس تالیف میں خانِ آرزو کے علم کی وسعت اور ہمہ گیری بروئے کار رہی ہے اور انھوں نے اس کے ذریعہ اپنے لیے ممتاز مقام حاصل کر لیا ہے۔

خاکہ کشی، منظر نگاری اور خطوط نویسی میں بھی اُن کی انفرادی شان نظر آتی ہے اور اس میدان میں بھی ہمیں وہ اعلیٰ مرتبہ پر نظر آتے ہیں۔ اُن کے خاکے، مناظر اور خطوط پڑھ کر ہمیں احساس ہوتا ہے کہ نثر میں بھی شاعری کی جا سکتی ہے۔ ان تصانیف کا مطالعہ قاری کے ذہن کو فرحت و انبساط بخشتا ہے۔

غالباً اب یہ کہنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی کہ اپنی جودت طبع، اعلیٰ ذہانت، مختلف النوع اور کثیر التعداد تصانیف کی بدولت خانِ آرزو علم و فضل کے اس مقام پر نظر آتے ہیں جو خسرو اور فیضی جیسے جید علماء کو حاصل تھا۔

نثار احمد فاروقی

سیّد سعادت علی

میرؔ نے لکھا ہے کہ اپنے والد کی وفات (رجب ۱۱۴۶ھ مطابق دسمبر ۱۷۳۳ء) کے بعد اکبرآباد میں میرا کوئی شفیق و مہربان نہیں رہا۔ بڑے بھائی نے بھی تو ناچشمی اختیار کی تو میں اپنے چھوٹے بھائی (محمد رضی) کو گھر میں چھوڑ کر تلاش معاش کے لیے سرگرداں پھرتا رہا۔ جب وطن میں کوئی صورت نہ نکلی تو پردیس کا سفر اختیار کیا اور دہلی میں رخت اقامت کھولا۔ یہاں امیرالامرا صمصام الدولہ کے بھتیجے خواجہ محمد باسط نے دست گیری کی اور اپنے چچا سے کہہ کر ایک روپیہ روز مقرّر کرا دیا۔ ۱۷۳۹ء میں نادرشاہ سے مقابلہ کرتے ہوئے امیرالامرا مارے گئے اور یہ روزینہ بند ہوگیا۔ کچھ مدت کے بعد (جس کا تعیّن کرنا دشوار ہے) میرؔ دوبارہ دہلی پہنچے اور اس بار اپنے سوتیلے ماموں سراج الدین علی خاں آرزوؔ کے گھر قیام کیا۔ لیکن بقول میرؔ، حافظ محمد حسن نے خان آرزوؔ کو لکھا کہ "میر محمد تقی فتنۂ روزگار ہے۔ اس کی تربیت ہرگز نہ کرنی چاہیے بلکہ دوستی کے پردے میں کام تمام کر دینا چاہیے"۔ چنانچہ خان آرزوؔ نے "خصمی و حلاجی" اختیار کر لی اور دشمنوں کا سا برتاؤ کرنے لگے۔ میرؔ کہتے ہیں:

> "وہ عزیز (آرزو) پکّے دُنیادار تھے، اپنے بھانجے کی عداوت دیکھ کر میرا بُرا چاہنے لگے۔ اگر میں سامنے پڑتا تو پھٹکارنے لگتے اور بچ کر رہتا تو اُول فُول بکتے۔ ہر وقت اُن کی نگاہیں میری نگرانی میں رہتیں اور دشمنوں کا سا برتاؤ کرتے۔ میں کیا بیان کروں کہ ان

سلہ میرؔ کی آپ بیتی/۹۴

سے کیسا سلوک دیکھا اور کس طرح کہوں کیا رنج اٹھائے' میں ہر چند صبر و ضبط کرتا اور لاکھ احتیاج ہو مگر اُن سے ایک روپیہ بھی نہ مانگتا تھا۔ مگر وہ دشمنی سے باز نہ آتے تھے اگر اُن کی ایذا دہی کا معاملہ تفصیل سے بیان کروں تو ایک علیحدہ دفتر درکار ہے۔ میرا دکھا ہوا دل اور بھی زخمی ہو گیا اور میں پاگل ہو گیا...[1]"

اس بیان کے سوا میر کی اور کوئی تحریر ایسی نہیں ہے جس میں انھوں نے خان آرزو پر کوئی الزام لگایا ہو۔ اس کے برعکس نکات الشعرا میں انھیں "استاد و پیر و مرشد بندہ" لکھا ہے[2]۔ لیکن ذکر میر میں انھوں نے آرزو سے استفادۂ علمی کا مطلق اعتراف نہیں کیا۔ باعتبار قرائن یہ صحیح نہیں۔ انھوں نے آرزو سے پڑھا ہوگا مگر اپنے خود نوشت سوانح میں میر جعفر عظیم آبادی کا تذکرہ کیا ہے جن سے اتفاقاً راستے میں مڈبھیڑ ہو گئی تھی۔ انھوں نے کسی معاوضے کے بغیر میر کو درس دیا۔ "نہایت مہربانی سے پیش آتے یعنی اپنا دماغ کھپا کر مجھے کچھ سکھاتے میں بھی تابمقدور اُن کی خدمت کرتا یعنی جو کچھ میسر تھا اُن کے لیے خرچ کرتا۔ ناگاہ ان کے وطن یعنی عظیم آباد سے کوئی خط آیا اور وہ اُدھر چلے گئے"[3]

اس کے کچھ دنوں بعد میر کی ملاقات سید سعادت علی سعادت سے ہوئی۔ انھوں نے میر کو ریختہ میں شعر کہنے کی ترغیب دی:

"کچھ دنوں کے بعد سعادت علی نام کے ایک سید سے میری ملاقات ہوئی جو امروہہ کے رہنے والے تھے اور انھوں نے مجھے ریختہ میں شعر کہنے کی ترغیب دی (جو شعر فارسی کی طرح قلعۂ شاہی کی زبان میں شاعری ہے اور اس وقت بہت رواج پا رہی تھی) میں نے بھی بہت سخت محنت کی اور اپنی مشق اتنی کر لی کہ شہر کے شاعروں میں مستند سمجھا جانے لگا۔ میرے اشعار گلی کوچوں میں پڑھے جانے لگے۔ اور ادنیٰ و اعلیٰ کے کانوں تک پہنچ گئے۔"[4]

اس بیان کی روشنی میں یہ ادّعا تو نہیں کیا جا سکتا کہ سعادت نے میر کے کلام پر اصلاح بھی دی ہوگی۔ کیونکہ میر کے اصل الفاظ یہ ہیں:

---

[1] ماسبق/۹۴ [2] نکات الشعرا: طبع اوّل/۲ [3] میر کی آپ بیتی/۹۷

[4] میر کی آپ بیتی/۹۸

"بعد از چندے با سعادت علی نام سیّدے کہ از امروہہ بود برخوردم و آں عزیز مرا تکلیف موزوں کردن ریختہ ...... کرد، خود کشتی کردم و مشق خود بمرتبہ رسانیدم کہ موزونانِ شہر را مستند شدم، شعر من در تمام شہر می و دید و بگوشِ خورد و بزرگ می رسید"[1]

یہاں سارا مفہوم "تکلیف کردن" اور "برخوردن" میں گرہ ہے۔ اس کا یہ مطلب بھی ہوسکتا ہے کہ میں نے اُن سے فائدہ اُٹھایا اور انھوں نے مجھے ریختہ میں شعر کہنے کے لیے مکلّف کیا" اور دوسری سیدھی سی بات یہ ہے کہ اسی زمانے میں سعادت سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے ریختہ میں شعر کہنے کی ترغیب دی۔ بہ ضرور ہے کہ میر کا سعادت علی سے مشورۂ سخن کرنا کچھ اتنا مستبعد نہیں ہے کہ اُسے تسلیم کرنے سے لازماً انکار کیا جائے۔ ایسا اکثر ہوتا ہے کہ ایک شاعر کسی کا باضابطہ شاگرد نہیں ہوتا مگر اس سے مشورہ کرلیتا ہے جیسے رنگین نے اپنا پورا دیوان مصحفی کو دکھایا تھا مگر ضابطے میں اُن کے شاگرد نہیں تھے پھر بھی سیّد سعادت علی کی شخصیت اس لحاظ سے اہم ہے کہ انھوں نے میر کے جوہر طبع کا اندازہ لگالیا۔ اور انھیں ایک ایسے راستے پر ڈال دیا جہاں وہ اپنی صلاحیتوں کو پوری طرح بروے کار لاسکتے تھے۔

اپنے دور میں سیّد سعادت علی بہت ممتاز شاعر تھے اور بقول قائم چاندپوری "در اقران و امثال خود امتیازِ تمام داشت"[2] وہ دورۂ ایہام گویاں سے تعلق رکھتے ہیں، تقریباً تمام تذکروں میں اُن کا ترجمہ اور انتخاب کلام ملتا ہے۔ ان مختصر بیانات سے جو کچھ معلوم ہوسکا ہے یہ ہے کہ سیّد سعادت علی امروہہ (ضلع مراد آباد) کے رہنے والے تھے اور حضرت شاہ شرف الدین حسن المعروف بہ شاہ ولایت[3] (ولادت ۶۶۳ھ) کی اولاد میں تھے۔ وہ محلّہ حقّانی میں رہتے تھے[4] دِلّی آکر قلعہ پادشاہی میں ملازم ہوگئے تھے۔ غالباً "نوبت خانۂ پادشاہی" کی کوئی خدمت اُن کے سپرد تھی۔ ڈاکٹر اشپرنگر نے ان کے والد

[1] ذکرِ میر/۶۷ [نکات الشعرا میں بھی تعلقِ تلمذ کا ذکر نہیں کیا صرف اتنا لکھا ہے کہ "با بندہ ربط بسیار داشت" (ص ۲۹)]

[2] مخزن نکات/۱۸ [3] حضرت شاہ ولایت نقوی سیّد تھے۔ ابن بطوطہ جس زمانے میں امروہہ پہنچا ہے وہ بقید حیات تھے۔ اُن کی اولاد آج بھی امروہہ میں آباد ہے [تفصیل کے لیے رجوع کیجیے محمود احمد عباسی: تاریخ امروہہ۔ تذکرۃ الکرام اور تحقیق الانساب] بعض تذکرہ نویسوں نے جن میں میر حسن اور میرزا علی لطف بھی شامل ہیں، انھیں "ازمریدان شاہ ولایت" لکھا ہے جو غلط ہے۔

[4] اصغر حسین: تاریخ اصغری

کا نام غلام علی عشرت بتایا ہے[1] لیکن اسے مغالطہ ہوا ہے۔ غلام علی عشرت (مترجم بہادت) بریلی کے رہنے والے تھے اور سعادت کے انتقال کے وقت یہ پیدا بھی نہیں ہوئے ہوں گے۔ غلام علی عشرت کے بیٹے کا نام بھی سعادت علی مگر تخلص عیش تھا[2]۔ اسی التباس اسمی نے اشپرنگر کو دھوکے میں ڈال دیا۔

سعادت ایہام گو شاعر تھے۔ انھوں نے اپنا دیوان بھی مرتب کیا تھا مگر اب دستیاب نہیں ہے۔ اس کا مطلع سرِ دیوان یہ تھا:۔

واللہ جو سرِ لوحِ ترا نام نہ ہوتا　　　　ہرگز کسی آغاز کا انجام نہ ہوتا

نواب قمر الدین خاں وزیر کے زمانے (۱۱۶۱ھ/۱۷۴۸ - ۱۱۳۱ھ/۱۷۱۸) میں دہلی میں دو عاشق و معشوق گزرے ہیں۔ ان کی داستانِ معاشقہ "سیلی سجنوں" (بروزن لیلےٰ مجنوں) بھی سعادت نے نظم کی تھی۔ وہ اپنی خوش گوئی، تلاشِ معنی تازہ، اور چاشنی کلام کی وجہ سے اپنے ہم عصر شعرا میں ممتاز تھے۔ میر حسن کا بیان ہے کہ:[3]

"از ساداتِ امروہہ، مردِ سلیم الطبع، کم سخن، متواضع بود۔ فی الجملہ چاشنی و دلبستگی نیز داشت۔ از مریدانِ شاہ ولایت میلِ ایہام بندی بسیار داشت، یک مثنوی "سیلی سجنوں" کہ دو عاشق و معشوق گزشتہ اند گفتہ و نام او نیز بجائے لیلیٰ مجنوں، سیلی سجنوں گزاشتہ۔ اکثر مناقب او نیز مشہور است چناں چہ از دست:

سواری ہوئی امیر المومنیں کی"

قائم چاندپوری کا بیان ہے کہ ان کی عمر چالیس سال کی بھی نہ ہوئی تھی کہ تپِ محرقہ کے آزار میں مبتلا ہو کر انتقال کیا[4]۔ باعتبارِ قرائنِ داخلی قائم نے اپنا تذکرہ ۱۱۵۷ھ میں لکھنا شروع کر دیا تھا[5]۔ اگر سعادت کا انتقال اس سال کے آس پاس ہوا ہوتا تو قائم اپنی عادت کے مطابق مدت کی صراحت

---

[1] یادگار شعرا مترجمہ طفیل احمد　　[2] امیر مینائی: انتخابِ یادگار

[3] میر حسن: تذکرہ شعرائے اردو/ ۱۱۰

[4] مخزن نکات/ ۱۸

[5] تفصیلی بحث کے لیے ملاحظہ ہو: دیباچہ دستور الفصاحت/ ۵۱ و بعد

کردیتے کیونکہ قائم نے جس انداز میں سعادت کا حال لکھا ہے اس سے یہ ضرور مترشح ہوتا ہے کہ وہ سعادت سے ذاتی طور پر واقف تھے۔ میر حملۂ نادری (۱۱۵۱ھ) کے بعد دوبارہ دہلی آئے تھے۔ یہاں کچھ زمانے تک خان آرزو کے پاس رہے اور تقریباً چھ ماہ جنون کی کیفیت میں گزرے۔ اس کے بعد انھوں نے "ترسلات" پڑھنے شروع کیے۔ پھر میر جعفر سے استفادہ کیا۔ ان قرائن سے میں نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ میر کی ملاقات سعادت سے ۱۱۵۳ھ کے لگ بھگ ہوئی اور ۱۱۵۷ھ سے پہلے ہی کسی سال میں سعادت کا انتقال ہوا ہوگا۔ سعادت نے دہلی میں وفات پائی اور بقول صاحب تذکرۂ مسرت افزا "ہماں جا مدفنش گردیدہ"۔

سعادت کے حسن اخلاق اور درویشانہ وضع کی تعریف اکثر تذکرہ نگاروں نے کی ہے۔ مصحفی نے ایک واقعہ بیان کیا ہے کہ کسی مجلس میں دُردانہ نامی طوائف گا رہی تھی جہاں سعادت شریک تھے۔ جب محفل ختم ہوئی اور یہ چلنے لگے تو اپنا نیا جوتا غائب پایا۔ فی البدیہہ یہ شعر پڑھا:

سعادت شب تماشے میں اگر تیرا نیا جوڑا
گیا تو جانے دے دُردانہ کے کھڑ دولی کے صدقے

سعادت کی مثنوی لیلیٰ مجنوں، اُن کے سلام و مناقب یا دیوان اب نایاب ہو چکے ہیں لیکن یہ انیسویں صدی کے کم از کم ربع اول تک مل جاتے تھے۔ کریم الدین کا بیان ہے:

"سعادت ..... کی ایک مثنوی بنام لیلیٰ مجنوں (کذا) ہے۔ اس کے شعر تشبیہ مغلقہ سے پُر ہیں۔ کیونکہ اس عہد میں یہ اغلاق پسند تھا۔ مگر وہ تشبیہہ نئی اور قوی ہیں اور عبارت رنگین اور فصیح ہے۔ وہ اپنے عہد میں بڑی شہرت رکھتا تھا۔ ابھی اس کی کچھ شہرت موجود ہے۔ سعادت نے بہت مناقب لکھے ہیں ..... [1]"

سعادت کا جو کچھ کلام دستیاب ہوتا ہے وہ مختلف تذکروں سے جمع کر کے یہاں پیش کیا جاتا ہے۔

کس سے پوچھوں دل مرا چوری گیا زلفوں میں رات
ایک جو شانہ ہے سو وہ[2] تیل میں ڈالے ہے ہات (نکات الشعراء)

---

[1] کریم الدین :- طبقات الشعرائے ہند (طبع ۱۸۴۸ء) / ۱۳۸

[2] گردیزی :- سو تو تیل میں ڈالے ہے ہات

(۲) مثل آئینہ سادہ رویوں کی منہ ہی دیکھے کی آشنائی ہے (مخزن نکات)

(۳) ہوش کھو دیتی ہیں میر اُس کی آنکھیں سے پرست[۱]
بس کہ ہوں کم ظرف دو پیالوں میں ہو جاتا ہوں مست (نکات الشعراء)

---

(۴) شیخ تو جاتا ہے کیوں تسبیح کا واں دام لے وہ صنم کب رام ہوتا ہے خدا کا نام لے
(مخزن نکات)

---

(۵) مت دکھا اس طرح کی آن مجھے کوئی دم جینے دے جان مجھے
(مخزن نکات)

---

(۶) پپیہے کی طرح دارو کے شیشے زبانِ حال سے کہتے ہیں پی پی
(نکات الشعراء)

---

(۷) نہیں تجھ ہجر میں پیتے شراب ارغوانی ہم ارے ساقی ترے مارے نہیں مانگیں گے پانی ہم
(تذکرہ ریختہ گویاں)

---

(۸) لکھا چاہے ہے تیرے قد کی تعریف اِسی کو کیا ترا شا ہے قلم نے
(مخزن نکات)

---

(۹) یہ دانا ہیں دوانے جو مجھے زنجیر کرتے ہیں مرا کوئی دم میں جی نکلے ہے یہ تدبیر کرتے ہیں
(مخزن نکات)

---

(۱۰) اہلِ زر کے سیم تن ہوتے ہیں رام صید ہوں ہیں جس جگہ دیکھیں ہیں دام
(نکات الشعراء)

---

(۱۱) بے محابا زلف کے کوچے میں جاتا ہے چلا سر چڑھا ہے بہت تم نے میاں شانے کے تئیں

---

(۱۲) یار سے جو رقیب لڑتے ہیں یہ ہمارے نصیب لڑتے ہیں[۲]

---

[۱] قائم: ہوش کھوتی ہیں مرا یار دو وہ انکھیاں مے پرست ؎ بسکہ ہوں کم ظرف ہو جاتا ہوں دو پیالوں میں مست (مخزن نکات/ ۱۸)

[۲] کریم الدین: یہ بھی اپنے ارغ

(۱۳) کیا صید آہوئے دل، آسواری سے میاں تم نے | کمر کی ڈاب نہیں کھولی گویا چیتے کی ڈوری تھی
(نکات الشعراء)

---

(۱۴) واللہ جو سر لوح ترا نام نہ ہوتا | ہرگز کسی آغاز کا انجام نہ ہوتا
(نکات الشعراء)

---

(۱۵) جھمکے دکھائین کے دل چھین لے چلے ہو | انکھیوں کو تیری کن نے سکھلا دیا چھنالا
(بیاض ذخیرۂ سلیمان ۵/۵)

---

(۱۶) نہ تو ملنے کے اب قابل رہا ہے | نہ وہ مجھ کو دماغ و دل رہا ہے[۱]
(بیاض ذخیرۂ سلیمان ۵/۵)

---

(۱۷) سعادت شب تماشے میں اگر تیرا نیا جوڑا
گیا تو جانے دے، دُردانہ کے بھڑودں کے سر صدقے
(تذکرۂ ہندی)

---

(۱۸) سعادت کو کبھی ہنس کر جو فرماتے ہو رونے کو
تمھارے امر کو پیارے بجا لاتا ہے آنکھوں سے
(عیار الشعرا قلمی) [ورق ۱۰۹ الف]

---

[۱] کشکول متفرقات (ذخیرہ سرسلیمان، آزاد لائبریری علی گڑھ فارسی ۵/۵) میں نکات الشعرا کے کچھ اوراق بھی شامل ہیں جو نسخہ مطبوعہ سے قدرے مختلف روایت ہے۔ اس میں یہ اشعار (نمبر ۱۵ و ۱۶) سعادت کے نام لکھے گئے ہیں۔ نسخہ مطبوعہ میں میر نے شعر ۱۶ کو یک رنگ سے منسوب کیا ہے (نکات / ۲۳) اور مجموعہ نغز میں اُسے مظہر کا زائیدہ فکر بتایا گیا ہے۔

ڈاکٹر مختار الدین احمد

تجلّی دہلوی

تجلّی، میر محمد حسین کلیم کے بیٹے اور میر تقی میر کے ہمشیر زادے تھے۔ تذکرۂ بیجکر (نسخۂ لندن) مجموعۂ نغز اور تذکرۂ شوق میں ان کا نام میر محمد محسن، عمدۂ منتخبہ، عیار الشعراء، تذکرۂ صدر الدین آزردہ اور گلشن بیخار میں میر محمد حسین، سخن شعراء اور سراپا سخن میں، میر حسن لکھا ہے۔ طبقات سخن (مصنفہ غلام محی الدین مبتلا و عشق، نسخۂ برلین) میں میر غلام علی اور دستور الفصاحت میں نام میر حسن علی درج ہے۔ بینی نرائن جہاں نے میاں حاجی ان کا نام بتایا ہے لیکن دوسرے تذکرہ نویس ان کا عرف میر حاجی یا میاں حاجی بتلاتے ہیں اُن کا تخلص تجلّی تھا۔ عیار الشعراء میں حاجی تخلص بھی درج ہے۔ گو میرے پاس جو دیوان کا قلمی نسخہ ہے اس میں یہ تخلص کہیں دیکھنے میں نہیں آیا۔ ہو سکتا ہے کہ ابتدا میں اپنے عرف کی مناسبت سے وہ تخلص بھی حاجی کرنے لگے ہوں بعد میں اُسے ترک کر دیا ہو۔ اس لئے کہ آخر میں تجلّی تخلص ان کے عرف پر بھی غالب آ گیا تھا اور بقول صاحب مجموعۂ نغز لوگ انھیں میر تجلّی کہنے لگے تھے۔

حالاتِ زندگی زیادہ معلوم نہیں۔ سپاہی پیشہ تھے اور یہی گذر اوقات کا ذریعہ تھا۔ اعظم الدولہ سرور اور شیفتہ نے لکھا ہے کہ سرائے باغ بیگم واقع چاندنی چوک میں قیام کرتے تھے مصحفی اور خوب چند ذکا، عرب سرائے ان کا مسکن بتلاتے ہیں۔ میر کے شاگرد تھے۔ اور مصحفی سے اُن کے دوستانہ تعلقات تھے۔

تذکرہ ہندی کی ترتیب (قبل از سنہ ۱۲۱۰ھ بعد از سنہ ۱۲۰۹ھ) کے وقت جب ان کی عمر چالیس سال کے قریب تھی دہلی میں موجود تھے۔ مجموعۂ نغز کی ترتیب (سال اختتام سنہ ۱۲۲۱ھ) سے پہلے وہ دہلی سے دیارِ شرقیہ کی طرف ہجرت کر گئے تھے اور وہیں ان کا انتقال ہوا۔ سرور لکھتے ہیں: "از چندے بہ لکھنؤ رفتہ بود"

حالا بہ سمع رسیدہ کہ از دنیائے فانی رحلت گزید۔ سال وفات معلوم نہیں لیکن یہ یقینی ہے کہ ۱۲۲۱ھ سے پہلے وہ فوت ہو چکے تھے۔

تجلی کے ہاتھ کی لکھی ہوئی صرف ایک ہی تحریر کا اب تک علم ہو سکا ہے اور یہ میر تقی میر کا دیوان چہارم ہے جو تجلی کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے اور کتب خانہ ریاست محمود آباد میں محفوظ ہے۔

مصحفی نے انھیں فن ریختہ میں بے نظیر لکھا ہے۔ یکتا لکھتا ہے:

"بزعم راقم روئے میر سوائے مشارالیہ در کلام ہیچ کس یافتہ نمی شود۔ حق ایں ست کہ ہر چہ گفتہ، خوب گفتہ ...... غزلہائے بحر کامل ہیچ شاعرے بہتر و خوشتر از و نگفتہ"

خوب چند ذکا کی رائے ان کے کلام پر سنیئے:

"چندے فکر شعر بطرز میری کند۔ مثنوی لیلےٰ مجنوں بسیار خوب گفتہ و تلاش نمایاں بکار بردہ۔ اشعارے کہ از فکر بلندش تراویدہ از آن بوئے استادی می آید۔ و ناخن بدل است۔"

تصانیف میں ایک دیوان اردو اور مثنوی لیلےٰ مجنوں کا ذکر تذکروں میں ملتا ہے۔ اس مثنوی کا ایک پرانا نسخہ ۱۲۴۲ھ کا لکھا ہوا راقم کے پاس موجود ہے۔ جناب امتیاز علی عرشی کی اطلاع کے مطابق یہ مثنوی مولوی کریم الدین کے زیر اہتمام ۱۲۶۴ھ میں چھپ گئی ہے۔ اس کا کوئی مطبوعہ نسخہ راقم کی نظر سے نہیں گذرا۔

دیوان اردو کے نسخے کمیاب ہیں۔ راقم کے پاس دیوان تجلی کا ایک قدیم نسخہ ہے جو شاعر کی زندگی میں ۱۱۹۸ھ میں لکھا گیا ہے۔ اوراق ۹۴ سطور ۱۱ پہلا ورق میرے نسخے سے ضائع ہو گیا ہے خاتمے پر حسب ذیل ترجمہ درج ہے:

تمت تمام شد بتاریخ غرہ جمادی الاول ۱۱۹۷ھ عہد عالم شاہ یعنی عالی گوہر در بلدۂ غوث گڈھ بحکومت نواب ضابطہ خان بہادر بدستخط احقر العباد فیض اللہ خاں بہادر ظفر جنگ غفرلہ و لوالدیہ تحریر یافت۔

مصحفی اور یکتا نے تجلی کے دیوان ضخیم کا ذکر کیا ہے۔ موجودہ دیوان کو ضخیم نہیں کہہ سکتے۔ اس میں تقریباً دو ہزار شعر ہوں گے۔ ظاہرا دیوان کی دو روائتیں تھیں۔ پہلی روایت مختصر ہے اس میں صرف

غزلیات ہیں۔ دوسری روایت میں بعد کا کلام بھی شامل کیا گیا ہوگا اور اس میں دوسرے اصناف سخن، مخمس، مسدس وغیرہ بھی ہونگے۔ جن کا بعض تذکرہ نویسوں نے ذکر کیا ہے۔ (دیوان مملوکۂ راقم میں کوئی مخمس یا مسدس موجود نہیں ہے) اس عرصہ میں کلام پر نظر ثانی اور اصلاح کا کام بھی ہوا۔ کچھ غزلیں اور اشعار جو بعض تذکروں میں موجود ہیں۔ دیوان نسخۂ راقم میں موجود نہیں اشعار کی روایت میں بھی کہیں کہیں اختلاف ہے:

تہمت عشق تجلی پہ عبث رکھتے ہیں یار | وہ تو کوچے میں بھی اُس کے کبھو آیا نہ گیا

اس کی روایت بعض تذکروں، عیار الشعراء، عمدۂ منتخبہ، مجموعۂ نغز اور تذکرۂ ہندی وغیرہ میں اس طرح ہے:

عشق میں کرتے ہیں بدنام تجلی کو عبث | وہ بچارا کبھو اس کوچہ میں آیا نہ گیا

نمونہ کلام ملاحظہ ہو۔ یہ اشعار دیوان تجلی نسخۂ راقم سے ماخوذ ہیں:

(۱)

صرفہ ہے اگر مدِ نظر عشق میں جاں کا[1] | تو بوالہوسی کفر ہے اندوہ بتاں کا
کافر ہوئے ہم عشق میں پھر بھی نہ ہوئے رام | کیا سخت ہے اللہ دِل ان سنگ بتاں کا
محبوب اسی خاک میں کیا کیا ملے افسوس | اب دیکھو اگر نام نہیں ان کے نشاں کا
ٹک خود کو دکھا جا کہ دم آنکھوں میں رہا ہے | کیا یار بھروسا ہے حبابِ نگراں کا[2]
یہ شہر دل اب چھوڑ رہ چشم سے تجھ بن | اِک قافلہ جاتا ہے چلا اشک رواں کا
دستار میں دے زلفوں کو بل باندھے ہی اکثر | ہے یار تجلی کا میاں زور ہی بانکا

(۲)

کیا خوب دن تھے یارو جب وہ نیا ملا تھا[3] | بیگانوں سے خفا تھا اور ہم سے آشنا تھا
بے طاقتی نے دِل کی مارا ہے ہم کو خوباں | ورنہ دماغ اپنا تم سے بھی کچھ سوا تھا

---

[1] دیوان تجلی ورق ۳

[2] ٹک میر جگر سوختہ کی جلد خبر لے | کیا یار بھروسا ہے چراغ سحری کا

[3] دیوان تجلی ورق ۳

تو نے مرا تڑپنا دیکھا نہ ورنہ قاتل — اِک ہی نگاہ تیری میرا تو خون بہا تھا

قطعہ

تم گے بھی گرچہ اس نے پی پی کے مے نشے میں — کتنوں کو خاک و خوں میں ناحق ملا دیا تھا
پر اک جوان تجلّی تم نے سنا ہی ہوگا — اس شہرۂ جہاں کا کل تازہ خوں کیا تھا
ہرگز کسو نے اس کو یوں بھی کہا نہ ظالم — کیوں تو نے اس کو مارا اور اس نے کیا کیا تھا

(۳)

گر یوں ہی جنوں دست بداماں رہے گا[۱] — یا پنجہ رہے گا کہ گریبان رہے گا
جلنے سے ترے آئینہ پر آب تو ڈالا — کیا جانئے دل کب تئیں حیران رہے گا
آشفتہ کیا خاک میں زلفوں نے تجلّی — تا حشر غبار اس کا پریشان رہے گا

(۴)

جمالِ سبزۂ خط یار جب خیال کیا[۲] — گلوں کے دعت سے ہم نے زباں کو لال کیا
غبار ہو کے بھی پہنچے نہ اس کے دامن تک — ہماری خاک کو غیروں نے پائمال کیا
ہے وقتِ نزع خبر اب تو لے تجلّی کی — ترے فراق نے یہ کچھ تو اس کا حال کیا

(۵)

یہاں تک قفس میں تظلّم کیا[۳] — کہ صیاد نے بھی ترحّم کیا
تری زلف کر یاد روئے زبس — شبِ ہجر باراں کا موسم کیا
نہ جنگل میں کھوج اس کا نے شہر میں — تجلّی نے دل کو کہاں گم کیا

(۶)

شوخ، مانع نہیں میں تیری دل آزاری کا[۴] — پر بھلا پاس تو رکھ میری وفاداری کا
ہم اسیرانِ محبت تری خاطر صیاد — اب تو شکوہ بھی نہیں کرتے گرفتاری کا
اس کی زلفوں کے تصور سے کٹی آنکھوں میں شب — مت سبب پوچھ تجلّی مری بیداری کا

---

[۱] دیوان تجلّی ورق ۴ [۲] دیوان تجلّی ورق ۵ [۳] دیوان تجلّی ورق ۱۰ [۴] دیوان تجلّی ورق ۱۱

(۷)

اُڑا پھرے ہے غبار عاشقوں بچاروں کا[1]   کہیں قرار نہیں اس کے بے قراروں کا ۱
ہماری خاک سے جز لالہ اور گل نہ اُگا   مرے پہ بھی نہ گیا، داغ گل عذاروں کا
کسے فراق میں اس گل کے اتنی فرصت ہے   چمن جو دیکھیں تماشا تری بہاروں کا
اگرچہ خو ہے تغافل تری پراے ظالم   کبھی تو حال سنا ہوتا اپنے ماروں کا
مباد ہووے کوئی کشتہ تیرا دامن گیر   خدا کے واسطے مت سیر کر مزاروں کا
بہار آئی تجلی تجھے جنوں نہ ہوا   گر خوش آیا کچھ احوال ہوشیاروں کا

(۸)

نہ برگِ عیش ہے مسکن ہمارا[2]   جگر کے داغ ہیں گلشن ہمارا
لباسِ زندگی میں ہیں مقید   حباب آسا ہے پیراہن ہمارا
برنگِ شمع غم سے کٹتے کٹتے   گریباں ہو گیا دامن ہمارا

(۹)

باغ میں اس نے کل خرام کیا[3]   سرو مائل نے جھک سلام کیا
کل تجلی کو پوچھے تھا مجنوں   ق   شہر میں اس نے کیوں مقام کیا
کون شہری غزال ہے ایسا   ایسے وحشی کو جس نے رام کیا

(۱۰)

بلبلو گرچہ گل بھی ہے محبوب[4]   پر مرا یار اس سے بھی ہے خوب
ہم نے بیت الحزن کیا آباد   کیا ہوا مر گئے اگر یعقوب
گر تجلی نہ ہوتا تو عاشق   کیوں کر آتا یہ بات کا اسلوب

(۱۱)

دل چاہتا ہے ملنے کو اس بیوفا سے آج[5]   کوچہ میں اس کے جا نہیں سکتے حیلے آج

۱؎ دیوان تجلی ورق ۱۲   ۲؎ دیوان تجلی ورق ۱۷   ۳؎ دیوان تجلی ورق ۲۶۔
۴؎ دیوان تجلی ورق ۲۷، ۲۸   ۵؎ دیوان تجلی ورق ۳۱، ۳۲

الفت سے ان بتوں کی رہائی ہو دل کے تئیں — یہ بات چاہتا ہوں الٰہی اپنے خدا سے آج
ایک جا ہوا اغذہ تھا تجلّی گئے تھے ہم — شعرا تمام خوش تھے ترے آشنا سے آج
اس کی تو وضع اپنی بھی آنکھوں میں کھب گئی — پڑھتا تھا تیرے شعر و وایسی ادا سے آج

(۱۲)

سیکھیے طرزِ جاں کنی ایجاد — محنتیں کوہکن کی ہوں برباد
فصلِ گل میں تو ہم اسیر رہے — فائدہ کیا، جو اب ہوئے آزاد
مہرباں کیوں کہ ہووے وہ خورشید — گر ہی طالع نہ جب تلک امداد
دل شگفتہ کبھی نہیں ہوتا — غنچۂ تصویر کا ہے یہ ناشاد
عشق کو خوش لگے ہے ویرانہ — ملکِ دل کس طرح رہے آباد
اب تو ملنا بھی تم نے ترک کیا — اس سے زیادہ کروگے کیا بیداد
دل سے اب تو ہمیں بھلایا ہے — ہم نہ ہوں گے تو کیجیے گا یاد
کل تجلّی چمن میں نالاں تھا — بلبلوں نے کہا اُسے استاد

(۱۳)

صبا بیت الحزن میں کہیو جا کر میر کنعاں کو[1] — کہ تیرا نور دیدہ روشن اب کرتا ہے زنداں کو
ہمارے دل پہ داغ دوریٔ جاناں کفایت ہے — چراغ و شمع یاں کیا چاہیے گورِ غریباں کو
لگے جس سے ہماری آنکھ اسی کے روبرو ہیں پھر — نہ جانو آئینے سے کم ہماری چشم حیراں کو[2]
جہاں آباد کا ہر ایک کوچہ اک ولایت تھا — خدا پھر سے کرے آباد اب اس شہرِ ویراں کو

(۱۴)

میرے ہرجائی کو اگر دیکھو[3] — ہے اسی طرح وہ جدھر دیکھو
سارا دامن کیا ہے افشانی — چشم خوں بار کے ہنر دیکھو

---

[1] دیوان تجلّی ورق ۳۳ [2] دیوان تجلّی ورق ۶۱

[3] میرؔ: اپنی تو جہاں آنکھ لڑی پھر وہیں دیکھو — آئینے کو لپکا ہے پریشاں نظری کا

[4] دیوان تجلّی ورق ۶۳

عاشقو اس کے لب مسیحا ہیں / گر نہیں اعتبار مر دیکھو
شوق بس ہے دلیلِ کوچۂ یار / مت کوئی اور راہ بر دیکھو
رہ گزر پر تمھاری بیٹھے ہیں / یوں ہی شاید تم اک نظر دیکھو
جیب کی دھجیاں کروں تو بھی / ناصحو التیام کر دیکھو
ہے تجلی کا ریختہ کیا خوب / چشمِ انصاف سے اگر دیکھو

(۱۵)

غم سے آزاد کرو ہم کو بھی اب شاد کرو[1] / خانۂ چشم کو پھر آن کے آباد کرو
قاصدا کہیو انھیں اتنی فراموشی کیا / اپنے مہجورِ بلاکش کو کبھی یاد کرو
قتل کرنے سے بھی ہوتی نہیں ہے خاطر جمع / اور نئی طرزِ جفا تم کوئی ایجاد کرو
شاعرِ زور ہے اندازِ سخن رکھتا ہے / چاہیے جل کے تجلی کو تم استاد کرو

(۱۶)

دیکھا خدا کا کعبہ دیر آستاں کریں گے[2] / اس سنگ دل کو جا کر نذرِ بتاں کریں گے
اک عمر کی خوشی کھو کر یہ درد دل کا / دو چار دن کی خاطر اب کیا بیاں کریں گے
واماندگی کی خاطر یاں بستر ابچھایا / تھا جی میں عرش ہی پر جا کر مکاں کریں گے
اس ریختے کے فن میں گر جی لگا تجلی / سو سو طرح سے دل کی حالت بیاں کریں گے

(۱۷)

بیکل قفس میں غم کے ہو کر اسیر آئے[3] / باغِ جہان میں کیوں ہم لے صفیر آئے
بے چشمِ نم رسیدہ کون اب میاں تجلی / پانی چوانے منہ میں وقتِ اخیر آئے

(۱۸)

چمن میں اب تو بے کل جاں بلب بے اختیار آئی[4] / ہمارے بعد بلبل فائدہ کیا گر بہار آئی
پیامِ یارِ بے پروا کبھی ہم تک نہ پہونچا یا / میاں اس بے وفا کے شہر سے تو چند بار آئی

---

[1] دیوان تجلی ورق ۶۴
[2] دیوان تجلی ورق ۷۳
[3] دیوان تجلی ورق ۷۴
[4] دیوان تجلی ورق ۷۵

(۱۹)

گو غم آساں ہے گاہ مشکل ہے[1] | لیکن اے دل نباہ مشکل ہے
رک گیا غم سے دل زبس تجھ بن | کھینچنا ایک آہ مشکل ہے
سب کچھ آساں ہے ناصحا لیکن | چھوڑنا اس کی چاہ مشکل ہے
ڈوبے سب بحرِ عشق کے غواص | کیوں کہ لانی یہ تھاہ مشکل ہے
باز آ شہرِ عشق کو مت جا | ق اے تجلّی یہ راہ مشکل ہے
رو کے بولا کہ اب تو کیا پھر لے | خواہ آسان خواہ مشکل ہے

(۲۰)

ہم نشیں یار مرا غیرِ جفا کیا جانے[2] | کہ ابھی طفل ہو وہ مہر و وفا کیا جانے
دل تو جوں غنچۂ پژمردہ ہو تجھ بن اے گُل | تو ہی آوے تو کھلے ورنہ صبا کیا جانے
ہم گرفتاریٔ اُلفت میں تجلّی خوش ہیں | تو ہے آزاد اسیری کا مزا کیا جانے

یہ آخری غزل ہے اسی پر ہمارا نسخۂ دیوان ختم ہو جاتا ہے۔

تجلّی کے کچھ اشعار تذکروں میں بھی درج ملتے ہیں، کچھ ایسے اشعار بھی ملتے جو دیوانوں میں موجود نہیں۔ یہاں بینی نرائن کے تذکرۂ دیوان جہاں، سے ایک غزل نقل کی جاتی ہے یہ غزل ہمارے نسخہ میں موجود نہیں ہے۔

طرب کا رنگ رخِ گل پہ آشکار آیا[3] | کلی سی کھل گئی جو نہیں وہ گلعذار آیا
تڑپ کے جان نکل جاوے گی ابھی صیاد | نہ کہیو باغ میں پھر موسمِ بہار آیا
ملا میں خاک میں مر مر کے آہ پر تو بھی | نہ بیقراری سے دل کے تئیں قرار آیا
مری وفا پہ تجھے زور رشک تھا اے ظالم | پہ سر پہ تیغ ہی لی اب تو اعتبار آیا
یہ شوق دیکھو پسِ مرگ بھی تجلّی نے | کفن میں کھول دیں آنکھیں سنا جو یار آیا

---

[1] دیوان تجلّی ورق ۷۷ [2] دیوان تجلّی ورق ۹۴

[3] دیوان جہاں ص ۵۴ مرتبہ پروفیسر کلیم الدین احمد (پٹنہ، ۱۹۵۹ء)

مآخذ:

(۱) دیوان تجلی دہلوی۔ نسخۂ راقم مکتوبہ ۱۱۹۶ھ
(۲) تذکرۂ صدر الدین آزردہ۔ ص ۹۔ ۱۰ نسخہ کورلیس کرسٹی کالج عکس مملوکۂ راقم
(۳) تذکرۂ عیار الشعراء ص ۱۱۸ ۔ ۱۱۹۔ نسخۂ وزارت ہند لندن عکس مملوکۂ جناب مالک رام
(۴) تذکرۂ طبقات سخن مصنفۂ غلام محی الدین مبتلا و عشق نسخۂ برلین۔
(۵) عمدہ منتخبہ مصنفہ اعظم الدولہ سرور دہلوی نسخۂ وزارت ہند لندن
(۶) دستور الفصاحت مصنفہ احد علی یکتا مرتبہ جناب امتیاز علی عرشی (رام پور، ۱۹۴۵ء)
(۷) دیوانِ جہاں مصنفہ بینی نرائن مرتبہ جناب کلیم الدین احمد (پٹنہ، ۱۹۵۹ء)

ایم۔ حبیب خاں

میر کلّو عرشؔ

میرؔ کے دو بیٹے تھے، بڑے فیض علی تھے فیضؔ اُن کا تخلص تھا، کلام کچھ تذکروں میں دست یاب ہوجاتا ہے [1] ان کا دیوان یا تو مرتب ہی نہیں ہوا یا ضائع ہوگیا۔ یہ عمر میں عرشؔ سے بہت بڑے تھے اور غالباً دلی ہی میں پیدا ہوئے تھے۔ میرؔ کے سفر کا ماں و لکھیر کے وقت یہ بھی اُن کے ساتھ تھے۔ عرشؔ سے ان کی عمر کا تفاوت دیکھتے ہوئے یہ قیاس ہوتا ہے کہ عجب نہیں دونوں مختلف بطن سے ہوں۔

میرؔ کی ایک صاحبزادی کا ذکر بعض تذکروں میں ملتا ہے کہ وہ بھی شاعرہ تھیں اور بیگمؔ تخلص تھا [1]۔ ان کے بارے میں یہ روایت بھی مشہور چلی آتی ہے کہ شادی کے معاً بعد ان کا انتقال ہوگیا تھا جس سے میرؔ کو بہت صدمہ ہوا اور انھوں نے یہ شعر کہا:

اب آیا دھیان اے آرام جاں اس نامرادی میں
کفن دینا تمھیں بھولے تھے ہم اسبابِ شادی میں

مگر یہ شعر نہ میرؔ کے کلیات مطبوعہ میں ملتا ہے نہ کسی قلمی نسخے میں۔ کسی ہم عصر تذکرہ نگار نے بھی اسے میرؔ کی طرف منسوب نہیں کیا۔ بظاہر یہ واقعہ اختراعی ہے اور یہ شعر امیر اللغات جلد اول میں نادرؔ سے منسوب ہوا ہے اور سب سے پہلے تذکرہ شمیم سخن نے اسے میرؔ کا زائیدہ لکھا ہے۔ اس کی روایت ضعیف ہے۔ دوسرے صاحبزادے میر حسن عسکری [2] عرف میر کلّو اپنے آبائی مکان محلہ مفتی گنج لکھنؤ میں رہتے تھے۔ پہلے زارؔ تخلص کرتے تھے پھر عرشؔ رکھا اور میر کلّو عرشؔ کے نام سے مشہور ہوئے: رنگ سانولا اور کشیدہ قامت تھے۔ میانہ جسم تھا سر پہ پٹے رکھتے تھے۔ اونچی چولی کا انگرکھا اور کلی دار پائجامہ زیب تن کرتے۔ پاؤں میں گھیتلی جوتی ہوتی تھی۔ آخر عمر میں کمر بھی جھک گئی تھی" [3] افیون اور حقہ پینے کے بہت عادی تھے۔ حقہ کبھی ہاتھ سے نہ چھوٹتا تھا یہاں تک کہ مشاعروں اور محفلوں وغیرہ میں بھی اپنا حقہ ساتھ لے جاتے تھے۔ ترتیب خواندگی کے عادی نہ تھے۔ جب جی میں آتا صاحبِ خانہ

---

[1] سخن شعرا/ ۵۰۲ [2] ریاض الفصحا/ ۱۸ و سخن شعرا از عبدالغفور نساخ / ۳۲۳
[3] حیات رشید از آغا اشہر لکھنوی۔ بعض تذکروں میں میر محمد عسکری بھی لکھا ہے لیکن صحیح میر حسن عسکری ہے۔

کی اجازت لے کر اپنی غزل سنا دیتے اور حقہ اٹھا کر رخصت ہو جاتے[1]

عرش اپنے والد ہی کے شاگرد تھے اور اپنے باپ کی طرح بڑے بے دماغ انسان تھے مفلسی ان کا بھی مقدر تھی۔ میر کو تو زندگی میں کبھی فراغت بھی نصیب ہو گئی لیکن عرش کی ساری زندگی آلام و مصائب میں بسر ہوئی۔ انھوں نے کبھی کسی بادشاہ یا نواب کی شان میں کوئی قصیدہ نہیں کہا بلکہ ظاہری شان و شوکت سے زندگی بھر بچتے رہے اور فقر و فاقہ گوارا رہا۔ آغا شہر نے "حیات رشید" میں عرش اور میر انس کے تعلقات بہت گہرے بتائے ہیں۔ ان کا بیان ہے کہ عرش میر انس کے پاس رہتے تھے اور وہ اُن کے اخراجات کی بھی کسی حد تک کفالت کرتے تھے۔

عرش کا گھر پہلے ہی مفلسی کا ڈیرا تھا۔ غدر کے ہنگامے نے اور بھی تباہ کر دیا۔ بچاے گھر کے لٹ جانے کے بعد مفتی گنج سے میاں الماس کے امام باڑے میں آ گئے۔ یہاں بھی انھیں سکون نصیب نہ ہوا تو رکاب گنج چلے گئے۔ وہاں ایک عرصے تک مقیم رہے۔ آخر اسی محلے میں ۱۸۶۷ء میں ان کا انتقال ہوا اور رکاب گنج کی دال منڈی میں دفن ہوئے۔

میر کی طرح عرش کے شاگردوں کی تعداد بھی زیادہ نہیں۔ انسب میر ابوطالب۔ انسخ میر تراب علی۔ انجم مرزا بندہ رضا۔ شیخ فدا علی عیش۔ میر سجاد حسین فلک۔ شیخ سرفراز علی قمر اور شیخ محمد جان شاد خاص طور پر مشہور ہیں مگر ان میں بھی شیخ محمد جان شاد "پیرِ میر" زیادہ مشہور ہیں۔ عرش ان سے بڑی محبت کرتے تھے کیونکہ یہ میر کے رنگ میں کہتے تھے اور وہی زبان بھی استعمال کرتے تھے اس لیے عرش اُن کو پیرِ میر کہتے تھے۔ شاد نے اپنے استاد کی بڑی خدمت کی اور آخر وقت تک ان ہی کا دم بھرتے رہے۔ آپ لیلیٰ سخن کے ایسے فریفتہ ہوئے کہ ساری عمر شادی نہیں کی۔ مؤلف "آب بقا" خواجہ محمد عبد الرؤف عشرت مرحوم ان ہی کے شاگرد تھے۔ بقول عشرت مرحوم میر تقی میر نے انتقال کے وقت اپنے بیٹے عرش سے کہا: "تم جانتے ہو کہ ہمارے پاس دولتِ دنیا میں سے تو کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس پر ہمیں فخر و ناز ہو۔ اگر ہوتی بھی تو قابلِ فخر نہ تھی۔ ہاں کچھ زبانِ اُردو کے متعلق علم سینہ ہے جو ہمیں بہ مشورہ ماموں سراج الدین خاں آرزو نے عطا کیا ہے اور اسی کے بھروسے پر ہم کو ہمیشہ ناز و استغنا رہا۔ میں نے ان کو تمھارے واسطے ایک کتاب کی صورت میں لکھ دیا ہے۔ اس کتاب کا نام "اصولِ اُردو" ہے۔ زبان کی حفاظت کے لیے یہ قواعد کافی ہیں۔ ان اصول پر کاربند ہو گئے تو اُردو ایک دن بام ترقی پر پہنچے گی اور وصیت کرتا ہوں کہ اس کتاب کو بہت حفاظت سے رکھنا۔ مجھے تمنا تھی کہ خدا مجھے پوتا عطا کرتا وہ اب تک پوری نہیں ہوئی۔ شاید میرے بعد خدا تم کو بیٹا مرحمت کرے تو اسے تعلیم دینا اور یہی کتاب یاد کرا دینا اور اس کے مطالب سمجھا دینا اور اگر کوئی اولاد نرینہ نہ ہو تو کسی اہل شاگرد کو یہ

[1] نگار۔ ج ۴۴۔ ش ۴

امانت تفویض کردینا[1]:

بدقسمتی سے عرش کے یہاں آخر وقت تک سوائے ایک لڑکی کے کوئی اولاد نرینہ نہ ہوئی اس لیے باپ کی وصیت کے مطابق عرش نے یہ کتاب اپنے شفیق اور لائق شاگرد حضرت شاد کے سپرد کی۔ میر کے ایام ضعیفی میں شاد شاگردی کے لیے پہنچے تو انھوں نے شاد کو اپنے بیٹے عرش کے سپرد کردیا۔ عرش نے ان پر کافی محنت کی۔ وہ شاد کو بھی بھائی کہہ کر پکارتے تھے۔ شاد بھی اپنے استاد کی خدمت آخر وقت تک کرتے رہے۔ بقول عشرت مرحوم میر کلو عرش جب رکاب گنج میں مقیم تھے تو انھوں نے کتاب اصول اُردو ان کے سپرد کی اور کہا: "میر صاحب مرحوم کی وصیت تھی کہ ان انمول جواہر کو اولاد نرینہ یا قابل شاگرد کو دینا۔ اولاد تو میں رکھتا نہیں اور شاگرد تم سے زیادہ قابل نہیں ہے۔ اس لیے کہ لکھنؤ کی زبان سے تمام شاعر متاثر ہیں مگر تم نے دہلی کی طرز شاعری اور دہلی کی زبان کو نہیں چھوڑا اور میر کے صحیح پیرو تم ہو۔ اب یہ امانت تم کو پہنچ جاتی ہے تم کو اختیار ہے اپنے جس شاگرد کو قابل یا لائق دیکھو اسے دے دینا۔"[2] میر کی اس وصیت کا ذکر عشرت مرحوم کے سوا کسی دوسرے تذکرہ نویس نے نہیں کیا۔

میر عرش کی دختر سے صرف ایک لڑکا پیدا ہوا تھا بقول عشرت مرحوم "یہ غریب یکہ ہانکتا ہے اور وہاں کی منڈی میں رہتا ہے۔"

عرش سے ناسخ نے استفادہ کیا اور ناسخ عرش کو استاد مانتے تھے۔ خاندان ناسخ نے عرش کو ناسخ کا شاگرد بتایا۔ سراپا سخن کے مولف سید محسن علی محسن نے بھی اپنے تذکرے میں عرش کو ناسخ کا شاگرد لکھ دیا۔ عرش نازک مزاجی اور خودداری میں اپنے باپ سے کم نہ تھے اور ویسے بھی وہ باپ کے شاگرد تھے۔ بھلا یہ الزام کیسے برداشت کرسکتے تھے بس اسی بنا پر ناسخ سے ٹھن گئی۔ عرش نے اپنے شاگرد میر تراب علی عرف منجو معروف بہ سپہر الدولہ ولد اکرم علی کے نام سے ناسخ پر اعتراضات کی بھرمار شروع کردی اور سرقے کا الزام لگاکر ان کو دلائل سے ثابت کیا۔

عرش صاحب دیوان تھے۔ ان کا دیوان مرنے کے کوئی آٹھ سال بعد یعنی فروری ۱۸۶۸ء میں مطبع کارنامہ لکھنؤ میں پہلی بار چھپا تھا۔ جسے ان کے شاگرد رشید شیخ محمد جان شاد نے بڑی صحت و اہتمام کے ساتھ اپنی نگرانی میں چھپوایا تھا۔ یہ دیوان اب کم یاب ہے۔ اس کا ایک مطبوعہ نسخہ کتب خانہ انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ میں محفوظ کر

---

[1] عشرت لکھنوی نے یہ روایت قطعاً جعلی لکھی ہے اور اس کے مرتکب وہ اس حد تک ہوئے ہیں کہ ایک رسالہ بھی "قواعد میر" کے نام سے خود ہی تصنیف کرکے چھپوا دیا۔ یہ روایت اور میر کی وصیت قطعاً لغو اور وہ رسالہ قواعد میر سراسر جعلی ہے۔ ـ ایڈیٹر

[2] اس روایت کو جناب خواجہ احمد فاروقی نے بغیر چون و چرا تسلیم کرلیا ہے (حیات میر ص ۲۷۲) ان کا خیال ہے کہ "درایتہً اس میں کوئی نقص نہیں ہے۔" (ایڈیٹر)

یہ نسخہ ہنوز ابھی حالت میں ہے اور بڑی تقطیع کے ۹۲ صفحات کو محیط ہے۔ اس کے علاوہ عرش کا ایک واسوخت شیخ غلام بخش کے مجموعۂ واسوخت جلد دوم میں چھپا تھا۔ یہ مجموعہ بھی انجمن کے کتب خانے میں موجود ہے۔

عرش کے یہاں جذبات و واردات عشق کے نہایت ہی دلکش اور موثر مرقعے ملتے ہیں جن میں سوز و گداز کوٹ کوٹ کر بھرا ہے انھوں نے باپ سے کہیں زیادہ اپنی زندگی عسرت و تنگ دستی میں گزاری۔ ساری عمر کسی رئیس کی دربارداری نہیں کی۔ اُن کے کلام میں درد اور مایوسی کے بڑے گہرے نقوش ملتے ہیں ثقیل الفاظ بھی کم استعمال کیے ہیں۔ ان کے کلام میں رنگینی و شادابی پائی جاتی ہے۔ یہاں ان کے کلام کا مختصر انتخاب پیش کیا جاتا ہے۔

بعد میرے اس کو جینا دہر میں مشکل ہوا — خون اس کا میرے سر پہ جو مرا قاتل ہوا
راہئ ملکِ عدم کا ساتھ دیتا کون ہے — خضر بھی گھبرا کے رخصت اولِ منزل ہوا

بزمِ عالم میں جو حسنِ پاک کا دیوانہ تھا — دل مرا شاید چراغ طور کا پروانہ تھا
منزل مقصود کو پہنچا جو راہِ شوق سے — نقشِ پا ہر اک نشان سجدۂ شکرانہ تھا
قتل کروایا رقیبوں کو بھی میں نے اپنے ساتھ — ایک جاں دینا تو ننگ ہمتِ مردانہ تھا

وفورِ ضعف سے دل یار پر نہیں آتا — غمِ فراق میں جینا نظر نہیں آتا
چڑھائے گورِ غریباں پہ کون چادرِ گل — چراغ لے کے کوئی قبر پر نہیں آتا
نگاہ دیدۂ دل سے نظر نہیں آتا — خیالِ یار بھی دو دو پہر نہیں آتا
یہ روز شام سے ہی صبح تک خود آرائی — کہ شب کو آئینہ بھی اپنے گھر نہیں آتا

یار آ کے خواب میں مجھے شرمندہ کر گیا — کیا سخت جان تھا کہ نہ فرقت میں مر گیا
اچھا ہوا شباب کا عالم گزر گیا — اک جن چڑھا ہوا مرے سر سے اتر گیا
لوحِ مزار بھی جو بنائے وہ سنگ دل — پتھر کی سل تراش کے چھاتی پہ دھر گیا
سنتے ہیں جان ہجر میں عرشِ حزیں نے دی — بھوکا وصالِ یار کا کچھ کھا کے مر گیا

کس گل نے گل کیا تھا، مری شمعِ گور کو — تھا قبر پہ ہجومِ عنادل تمام رات
روشن تھی صبح تک مرے مدفن پہ شمعِ طور — رویا کھڑے کھڑے مرا قاتل تمام رات
اے رشکِ مہر و ماہ ترے منہ پہ ہے نثار — سورج تمام دن مہِ کامل تمام رات
کہتے ہیں گل جو چاک گریباں تمام دن — سنتے ہیں نالہ ہائے عنادل تمام رات

فاضل زیدی

تلامذۂ میر

یہ تلامذۂ میر کا مختصر تذکرہ ہے جس کا مقصد اِن شعرا کے سوانح کی جزئیات فراہم کرنا نہیں، بلکہ اُن کا سرسری تعارف پیش کرنا ہے۔ اسے میری فرمائش پر جناب فاضل زیدی (نواب شاہ پاکستان) نے مرتب کیا ہے۔ اس فہرست میں انھوں نے بعض ایسے نام بھی درج کر لیے تھے جنھیں سرشاہ سلیمان یا میر کے دوسرے ناقدوں نے تلامذۂ میر میں شمار کیا ہے، لیکن یا تو ان کا خارجی وجود مشتبہ ہے جیسے محمد حسن یا فائز یا سخن، یا وہ صریحًا میر کے شاگرد ہو ہی نہیں سکتے جیسے آبرو اور آرزو — وغیرہ۔ میں نے ایسے نام فہرست سے خارج کر دیے کیونکہ یہ غیر ضروری طول ہو جاتا۔ البتہ چند نام ایسے شاملِ فہرست ہیں جن کا شاگردِ میر ہونا مشتبہ یا مختلف فیہ ہے۔

میر کے شاگردوں کی فہرست زیادہ لمبی چوڑی نہیں، اس کے اسباب کیا ہیں؟ یہ بجائے خود تفصیل طلب اور دلچسپ موضوع ہے۔ اس کے لیے ہم یہی کہہ سکتے ہیں کہ میر ایک بخود مشغول، بے دماغ، اور انانیت پسند انسان تھے وہ استادی شاگردی کے چکر سے گھبراتے ہوں گے یا وہ ہر ایرا غیر کی شعر گوئی کو بنظرِ استحسان نہیں دیکھتے تھے اور اسے فنِ شریف سمجھتے تھے وہ جانتے تھے کہ شاعری وہبی چیز ہے اکتسابی نہیں۔ انھوں نے شاعری کے لیے کچھ اصول و ضوابط بنا رکھے ہوں گے۔ وغیرہ —— لیکن بڑی حیرت تو یہ دیکھ کر ہوتی ہے کہ میر کے اُن شاگردوں میں بھی جن کا تلمّذ ثابت ہے، کوئی شاعر مردِ میداں نہیں ہے جس کے کلام پر میر کی استادی کا ہلکا سا پرتو بھی نظر آتا ہو۔ نہ کوئی ایسی شخصیت ہے

جس کی انفرادیت نمایاں ہو۔ یہ باتیں غور طلب ہیں اور غور و فکر کا موضوع بن سکتی ہیں۔
میر نمبر میں تلامذۂ میر کی یہ فہرست میر کی سوانح عمری کے ایک پہلو کی تکمیل کے لیے
شامل کی گئی ہے — ایڈیٹر]

برشتہ آغا حسین علی مرحوم لکھنوی شاگرد میر تقی[1] لیکن مصحفی نے لکھا ہے کہ وہ سودا کے شاگرد تھے "جلوۂ خضر" میں بھی ان کو میر کا شاگرد لکھا ہے۔ عبدالمنان بیدل عظیم آبادی "اشعار میر" میں انھیں مرزا آغا حسین علی برشتہ لکھنوی اور خواجہ عشرت لکھنوی "آب بقا" میں میر برشتہ دہلوی کہتے ہیں۔
برشتہ میر تھے یا مرزا، دہلوی تھے یا لکھنوی اس کے متعلق سردست کچھ کہنے سے قاصر ہوں۔
خواجہ عشرت کے بیان سے ہماری معلومات میں کچھ اضافہ ہوتا ہے[2]۔

"میر برشتہ دہلوی مفتی گنج میں رہتے تھے۔ زمانہ ناموافق تھا۔ میر صاحب نازک مزاج تھے۔ اور باوضع تھے۔ میر تقی میر کے شاگرد اور مصحفی کے ہم عصر تھے۔ ان کی قبر عنایت باغ کی پشت پر پیر جلیلوں میں پیر جلیل کے مزار کے قریب شکستہ حالت میں ہے۔ اولاد کا پتا نہیں لگتا۔ میر صاحب کا غیر مطبوعہ دیوان بہت مختصر ہے، اور کوئی غزل گیارہ بارہ شعر سے زیادہ نہیں ہے لیکن کل کلام منتخب ہے اور بالکل تیر و نشتر ہے۔" ملاحظہ ہو ؎

جو مدرسۂ عشق میں مجنوں کا سبق تھا ۔۔۔ سوا پنے وہ دیواں کا بر آور دہ ورق تھا
جان سے تنگ تھا جی کھول کے رونے نہ دیا ۔۔۔ دامنِ دشت بھی یاروں نے بھگونے نہ دیا
جس قدر بدنام ہو عاشق وہ ہے نام آوری ۔۔۔ پارسائے عشق وہ ہے جو کہیں رُسوا ہوا
پھر نہ کوئی کاروانِ رفتہ سے یاں آیا پھر ۔۔۔ ہر نفس مثلِ جرس میں گو کہ چلّاتا رہا
میرے لب سے جو ہوا نالہ بلند ۔۔۔ حلقۂ گوشِ ثریا ہو گیا
خضر سے سن کے اس کے لب کی بات ۔۔۔ منہ میں بھر لایا پانی آبِ حیات
آنے جانے پہ اس کے ہے موقوف ۔۔۔ عاشقِ خستہ کی حیات و ممات
ہر وقت ہم سے کرتا ہے وہ نوجواں دماغ ۔۔۔ اتنا دماغ اٹھانے کا ہم کو کہاں دماغ
سلگا کے دل کو عشق میں پہنچی جگر کو آگ ۔۔۔ اے چشمِ تر بجھا کہ لگی سارے گھر کو آگ
دیکھا جو اپنے در پہ برشتہ کو یہ کہا ۔۔۔ کیا خانماں خراب کہیں تیرا گھر نہیں

[1] سخن شعرا/ ۱۰۰ [2] آب بقا/ ۳۴ [3] جلوۂ خضر

بیگم | دختر میر ساکنہ لکھنؤ۔ شاگرد میر تقی میرؔ[1]
نمونۂ کلام

برسوں خمِ گیسو میں گرفتار تو رکھا   اب کہتے ہو کیا تم نے مجھے مار تو رکھا
کچھ بے ادبی اور شبِ وصل نہیں کی   ہاں یار کے رخسار پہ رخسار تو رکھا
اتنا بھی غنیمت ہے تری طرف سے ظالم   کھڑکی نہ رکھی روزنِ دیوار تو رکھا
وہ ذبح کرے یا نہ کرے غم نہیں اس کا   سر ہم نے تہِ خنجرِ خونخوار تو رکھا

اس عشق کی ہمت کے میں صدقے ہوں کہ بیگمؔ[2]
ہر وقت مجھے مرنے پہ تیار تو رکھا

پروانہ | کنور جسونت سنگھ نام۔ عرف کاکا جی۔ ولد راجہ بینی بہادر جو نواب شجاع الدولہ بہادر کے رکن رکین تھے۔ ظاہری وجاہت اور حسنِ اخلاق کے باعث اپنے ہم عصر امرا میں ممتاز تھے۔ ایک تذکرہ میں تو یہاں تک ان کی خوب صورتی کی تعریف لکھی ہے کہ یہ جوان یوسف مثال تھے اور ایک زمانہ زلیخا داران کا دیوانہ اور فریفتہ تھا، استعدادِ علمی بہت معقول تھی، بایں ہمہ تحصیلِ علمی کا شوق آخر عمر تک قائم رہا۔ مولانا حسرت موہانی ناقل ہیں کہ اس زمانے میں مولوی غلام مصطفیٰ تسلیم موہانی ایک بزرگ تھے، پروانہ نے جب ان کا نام سُنا تو لکھنؤ سے مسافت کی تکلیف برداشت کر کے موہان پہنچے اور مولوی صاحب موصوف کو اپنے ہمراہ لکھنؤ لے جانے کے لئے بے حد کوشش کی لیکن تسلیم کی عزلت گزین و قناعت پسند طبیعت نے ترکِ وطن گوارا نہ کیا اور پروانہ کچھ روز قیام کرنے کے بعد واپس آ گئے۔

پروانہ نے کچھ غزلیں میر تقی میرؔ کو بھی دکھلائی تھیں۔ یہ صاحبِ دیوان تھے۔ کلام بہت پاکیزہ اور عمدہ[3] ہے۔ خوش فکر اور بڑے طباع تھے۔ ہندی کبت بھی خوب کہتے تھے۔ اربابِ کمال کے بڑے قدرداں تھے۔ لالہ سری رام صاحب خمخانۂ جاوید کا بیان ہے کہ ان کا دیوان ڈاکٹر اشپرنگر کے کتب خانہ میں موجود تھا۔ یہ پہلے فارسی میں بھی طبع آزمائی کیا کرتے تھے اور رائے سرب سنگھ دیوانہ کو دکھاتے تھے۔ چنانچہ فارسی اشعار مصحفی کو تذکرۂ اوّل لکھتے وقت میرزا قتیل کی معرفت ملے تھے۔ جب مصحفی شاہ جہاں آباد سے لکھنؤ آئے تو انھیں چونکہ مصحفی سے ملاقات کا بڑا شوق تھا، آئے، اور بڑے تپاک سے ملے۔ اور اسی زمانے میں فارسی ترک کر کے اُردو میں اشعار کہنے لگے

---

[1] سخن شعرا ۶۰ ، ۵ [2] شمیم سخن و تذکرۃ الخواتین [3] اذکار الخواتین

یہ کس کے شاگرد تھے اس کے متعلق صحیح طور پر کہنا مشکل ہے۔ تذکرہ نگاروں کا اس میں بڑا اختلاف رہا ہے۔

لالہ سری رام مصنف خمخانۂ جاوید اور اکثر تذکرہ نگار لکھتے ہیں کہ یہ مصحفی کے شاگرد تھے ناسخ کا خیال ہے کہ وہ سرب سکھ دیوانہ کے شاگرد تھے۔ لکھتے ہیں۔ "پروانہ شاگرد سرب سکھ دیوانہ[1] شعر فارسی بھی کہتے تھے۔ بعض تذکرے والوں نے ان کو مصحفی کا شاگرد بتایا ہے، اس پر اعتبار نہیں" (سخن شعرا)

نواب خلیل "گلزار ابراہیم" میں فرماتے ہیں: "یہ لالہ سرب سکھ دیوانہ کے شاگرد تھے" (ص ۱۴۱)

ناسخ کے تذکرے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ "بعض حضرات میر حسن کو ان کا استاد سمجھتے ہیں"

ایسی صورت میں مجھے کوئی صحیح رائے دینی مشکل ہوتی لیکن اتفاقاً مشرقی کتب خانہ پٹنہ میں قدرت اللہ قادری کے قلمی تذکرہ "تذکرۃ الشعراء" میں یہ عبارت نظر سے گذری جس سے تمام گتھیاں سلجھ جاتی ہیں۔

"در فارسی شاگرد سرب سکھ دیوانہ ہست، و در فن ریختہ اول تلمذ بہ سخن سنج بے نظیر محمد تقی میر نمودہ، از اں پس بہ میر حسن صاحب مثنوی بدر منیر استفادہ فرمودہ، و در آخر ہا از میاں غلام ہمدانی مصحفی توسل جستہ" (ص ۲۴)

تاریخ گوئی میں استادانہ درجہ رکھتے تھے۔ چنانچہ جب شیخ قلندر بخش جرأت کا انتقال ہوا تو آپ نے تاریخ کہی:

کہو جنت نصیب جرأت ہے

شاہ عالم کے جلوس کے چوبیسویں سال لکھنؤ میں موجود تھے[2]۔ اہل کمال کی بہت قدردانی کرتے تھے۔ وفات ۱۲۲۷ھ میں ہوئی۔ اور قطعہ تاریخ وفات ناسخ نے لکھا۔

از مردن پروانۂ جاں سوختہ — شمع بزم اہل سخن ہائے بمرد
تاریخ رقم نمود ناسخ — پروانہ بمرد شمع ہم وائے بمرد

صاحب خمخانۂ جاوید نے سن وفات ۱۸۱۵ء تحریر کیا ہے لیکن یہ ۱۲۲۷ھ سے منطبق نہیں ہوتا اور شیخ ناسخ کے قطعہ تاریخ وفات کی موجودگی میں درست بھی نہیں کہا جاسکتا۔ خواجہ عشرت لکھنوی سن وفات ۱۸۲۵ء لکھتے ہیں[3]۔

اردو، فارسی دونوں دیوان مکمل تھے لیکن اب نایاب ہیں چند اشعار جو مختلف تذکروں سے دستیاب ہوئے

---

[1] ان کا نام غلطی سے سرب سنگھ یا سرب سنگ لکھا جاتا ہے صحیح سرب سکھ ہے۔ مصرع مصحفی:
"وہی ہوں میں جسے دیوانہ سرب سکھ نام تھا" — ایڈیٹر

[2] گلزار ابراہیم / ۱۴۱
[3] ہندو شعرا / ۳۲

ہیں۔ یہاں پیش کیے جاتے ہیں:

[فارسی] از یں نظارہ بازی زود ترشیدا کنی خود را
تو کارے میکنی اے دل کہ خود رسوا کنی خود را

بہ ہجرِ تو اے شمع پروانہ تا کے
کشد از جگر نالۂ آتشیں را

بگو حاجب باں چشمِ دل افروز
کہ امشب عاشقاں را حکمِ بار است

غریبے، بے کسے، پروانۂ نامے
بروں در ز بر امیدوار است

بے لعل لبت غنچۂ دل وا نتواں کرد
جاں رازِ پیالے تو شکیبا نتواں کرد

وصلے تو ز ہجر است بتر بہر عذابم
ایں طرفہ کہ جز وصل تمنا نتواں کرد

(تذکرہ "روز روشن" مصنفہ مظفر حسین صبا ایٹھوی مقیم بھوپال)

[اردو] کیا جانئے ہمدم کہ اُسے دیکھ کے ہم کو
ہر چند سنبھالا کئے پر دل کو غش آیا (سراپا سخن)

جو کثرت میں وحدت سدا دیکھتے ہیں
بتوں میں وہ نورِ خدا دیکھتے ہیں

میں ہوں دو محبوب سے مجبور کس کا ہو رہوں
وہ پری ہے تو یہ رشکِ حور کس کا ہو رہوں

زاہد رہے ہے کعبہ میں راہب کنشت میں
حیراں ہوں میں رکھا ہے کیا سنگ و خشت میں

ہم کو بتوں کے سایۂ دیوار سے ہے کام
لے قصرِ زرنگار تو زاہد بہشت میں

دیکھا ہے جب سے نرگسِ بیمار کو تری
ناسور اور دیدۂ تر دونوں ایک ہیں

اے شیخ دیر و کعبہ تو جائے دوئی نہیں
گر پوچھتا ہے حق تو یہ گھر دونوں ایک ہیں

دل زدگانِ عشق کو یکساں ہے عیش و غم
غارت زدوں کو امن و خطر دونوں ایک ہیں

آئینہ ساں ہے صاحبِ جوہر کو زنگِ غم
اس دور میں کہ عیب و ہنر دونوں ایک ہیں

کنجِ قفس میں بلبلِ غم کش کو باغ کے
کیا خارِ خشک، کیا گلِ تر دونوں ایک ہیں

حرفِ عتاب لب سے ترے جو سنا کئے
ہجراں کو زہرِ تلخ و شکر دونوں ایک ہیں

پروانہ دل بجھا ہے زبس شامِ ہجر میں
یہ نیم جان و شمعِ سحر دونوں ایک ہیں

تیرے سوا تو اپنا کوئی یار ہی نہیں
پر حیف تجھ کو ہم سے سروکار ہی نہیں

بدگوئی اغیار سے دلدار ہے دشمن
اے دوستو! مشکل ہے کہ اب یار ہو دشمن

چشمِ بد دور پری ہے کہ کوئی حور ہے تو
سر سے پا تک جو تجھے دیکھئے اک نور ہے تو

لاکھ تدبیریں کریں ہاتھ کوئی آتا ہے — اپنے نزدیک تو اے جان بہت دور ہی تو
بحرِ ہستی میں ترا جسم ہے مانندِ حباب — تس پہ اک دم کی ہوا کھانے پہ مسرور ہی تو
اُس کی ہم چشمی انھیں آنکھوں سے بس بس نرگس — تجھ کو بینائی سے بہرہ نہیں معذور ہی تو
تن بدن میں جو لگی آگ تو اے پروانہ — کیا کرے اپنے جلا دینے پہ مجبور ہی تو

جس نے دیکھا اُسے کیا سجدہ — غرض اُس بُت نے بھی خدائی کی
دیکھ تو ہم سے راست بازوں سے — تو نے آخر یہ کج ادائی کی
عہد کیا کیا تھے اور قول و قرار — آہ! اُس پر بھی بے وفائی کی

دل یار سے اور درد مرے دل سے کہے ہے — جانے کا نہیں اب تو میں پہلو سے کسی کے

تڑپتی جو دیکھی ہیں لاشیں تو دل اب — ترے کوچہ کو کربلا جانتا ہے

ایک دن دیکھا نہ تو عاشق کی غم خواری کرے — بے وفا تجھ سے کوئی کب تک وفاداری کرے

نسیم آہ نے شاید کسی کی، کی تاثیر — شگفتگی سی ترے غنچۂ دہاں پر ہے

کوچۂ گیسو میں دل کو ڈھونڈیئے — کیا ہوا گر راہ کا کچھ پھیر ہے

صادق نہ سمجھ اُس کو محبت میں ہے کاذب — جو صبح نمط چاک گریباں نہیں ہے

("نسخۂ دلکشا" مصنفہ راج نرائن ارماں مطبوعہ کلکتہ)

تجلی ناسخ نے ان کے متعلق لکھا ہے: "شاگرد و خواہرزادۂ میر"[1]
شیفتہ لکھتے ہیں: "تجلی تخلص۔ میر محمد حسن المشتہر بہ حاجی۔ ولد میر محمد حسین کلیم خواہرزادۂ میر در باغ بیگم واقع چاندنی چوک سکنت داشت۔ جوانِ خرم و خنداں و ظریف و نکتہ داں بود۔ مثنوی لیلیٰ مجنوں بزبانِ ریختہ از خیالاتِ او بہ نظر رسیدہ، پذیرائے دل نشد"[2]

ثروت جگل کشور نام۔ قوم کا بھاٹ اور پیشے کے اعتبار سے شراب فروش تھا۔ محمد شاہ کے عہد میں بنگال کا وکیل ہو گیا۔ اپنے بیٹے کی شادی اس شان و شوکت سے کی کہ دلّی میں اس جیسی نہیں ہوئی"[3]
"جگل کشور کا تخلص ثروت تھا اور وہ میر سے اصلاح لیتا تھا"[4]

---

[1] سخن شعرا/۸۰ [2] گلشن بے خار/۴۰ [تجلی دہلوی کے بارے میں ڈاکٹر مختار الدین احمد آرزو کا مضمون اور دیوان تجلی (قلمی) کا انتخاب اسی مجموعے میں شامل ہے — ایڈیٹر] [3] مجموعۂ نغز/۲۰۴ [4] وقائع عالم شاہی/۱۳

میر لکھتے ہیں: "راجہ جگل کشور جو محمد شاہ کے زمانے میں وکیل بنگالہ تھے اور بڑی جاہ و حشمت کے ساتھ رہتے تھے انھوں نے اصلاحِ اشعار کی خدمت میرے سپرد کی مگر میں نے اصلاح کی قابلیت نہ دیکھی اور ان کی اکثر تصنیفات پر خط کھینچ دیا۔"[1]

جان جان علی۔ از مردم اکبر آباد است۔ با نواب بیرم خاں مغفور واسطۂ قرابت دارد و نسبتِ تلمذ بہ میر تقی میر۔ آزادانہ بسری برد۔۔۔ از دست[2]

ذکر اُس زلف کی درازی کا صبح سے تا بہ شام ہوتا ہے

کریم الدین نے جان علی شاہ جہاں آبادی لکھا ہے اور یہ کہ "آزادانہ عمر بسر کرتا تھا۔"[3]

جگن میاں جگن۔ میر لکھتے ہیں: "خالہ زاد شیر افگن خانِ حال است، دعوئی شاگردی فقیر می کند، بارے سرِ سخن دارد، خدایش زندہ دارد۔"[4]

اے دل مریضِ عشق کو آزار ہی بھلا چنگا ہو تو ستم ہے یہ بیمار ہی بھلا[5]

چشتی دہلی کے رہنے والے۔ لکھنؤ میں میر تقی کے پاس دہلی سے آئے۔ ان کے شاگرد ہوئے اور تا زندگی لکھنؤ میں رہے۔ زبان سیکھنے کے لیے میں استاد کی خدمت کرتے رہے۔[6] چند اشعار درجِ ذیل ہیں

قدِ موزوں ہے تیرا رشکِ شمشاد کہ جس کا ہے غلام اک سروِ آزاد

قفس میں بال و پر باقی ہیں اب تک بہار آئی ہے اب تو چھوڑ صیاد

دھڑکتا دل ہے یارب خیر کیجو کہ اب قاتل نے مجھ کو کر لیا یاد

تم شوق سے جا بیٹھو اغیار کی صحبت میں لو ہم تو چلے یاں سے اے یار خدا حافظ

محشر میں یہ بولیں گے سب رند کہ نکلا ہے چشتی کے گناہوں کا انبار خدا حافظ

لکھنؤ میں عہدِ ناسخ میں انتقال کیا۔ مزار کا کہیں پتا نہیں ملتا۔

خادم شیخ خادم علی۔ بقولِ صاحبِ جلوۂ خضر "یہ بھی میر کے شاگرد ہیں۔" عشقی نے لکھا ہے: "خادم تخلص، اسمش خادم علی خاں، ساکن مضافات پنجاب، از متوسلانِ سرکار نواب ناصر جنگ بہادر است۔ میگویند کہ در شیوۂ خطاطی کہ عبارت از نستعلیق و شکست باشد دستگاہے داشت در نظم و نثر دخلے تمام دارد۔ از دست

---

[1] میر کی آپ بیتی/۱۱۰ [2] گلشن بے خار [3] نکات الشعرا/۱۲۸ [4] آب بقا/۱۷۲

[5] طبقات شعرائے ہند/۱۰۲-۱۰۳ (طبع ۱۸۴۸ء)

ایسے جلوے ہی اگر کیجئے گا ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ مہر کو شہر بدر کیجئے گا

صاحبِ "خمخانۂ جاوید"[1] نے انھیں غلام محمد آزاد کا شاگرد لکھا ہے۔ نمونۂ کلام ؎

ہر چند غالب ہے تو لیکن تری طرف ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ آتا ہوں پھر پھرا کے میں قبلہ نما کی طرح
سج دھج میں، آن بان میں، ترکیب و طور میں ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ بھاتی ہے ہم کو اپنے ہی اس خوش ادا کی طرح
خادمِ سخن تو اور بھی کہتے ہیں خوب خوب ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ پر ہم سے سیکھ لے کوئی طرزِ ادا کی طرح
عاشق ہوا ہوں اک بتِ بالا بلند پر ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ صد آفریں ہے میری بھی اعلیٰ پسند پر
مجھ کو کہتے ہو کہ چل باہر ہو ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ آپ کے کہنے سے کب باہر ہوں
ہے کہیں یہ بھی رہ و رسم وفاداری کی ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ دل مرا چھین کے یوں راہ بتائی تو نے
پاس سے میرے جو وہ غرفہ نشیں اٹھ جائے ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ طاقت و صبر و قرار و دل و دیں اٹھ جائے
تیرے قامت کا اگر شور نہ ہو کیا شک ہے ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ سارے عالم سے قیامت کا یقیں اٹھ جائے
اس سے در پردہ کچھ اظہار محبت کا کروں ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ یہ بغل کا مرے دشمن جو کہیں اٹھ جائے

راسخ شیخ غلام علی عظیم آبادی شاگرد میر تقی میر۔ اپنے وقت کے استادوں میں شمار کئے جاتے تھے۔ بزرگوں کا وطن شاہ جہاں آباد تھا لیکن ان کی ولادت عظیم آباد میں ہوئی۔ ابتدائے عشق میں میر و سودا کے ہمعصر شاہ گھسیٹا عشق کے شاگرد میرزا محمد علی فدوی اور میرزا اشرف کو غزلیں دکھائیں۔ ۱۲۳۸ھ میں انتقال کیا۔

"جلوۂ خضر" میں بھی انھیں میر کا شاگرد لکھا ہے۔

مگر مصحفی نے لکھا ہے کہ وہ سودا کے شاگرد تھے۔ نمونۂ کلام ؎

مدعا عالم سے اپنا ہی فقط دیدار تھا ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ دید کو اپنی یہ آئینہ اسے درکار تھا
مت پوچھئے مجھ سے حال میرا ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ حیرت زدہ کیا بیاں کرے گا
غافل تو بھی تو رفتنی ہے ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ کب تک غم رفتگاں کرے گا
پیشتر تم تھے جہاں اب سبب تسکیں ہے ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ اس مکاں کے در و دیوار کو دیکھا کرنا
شاگرد ہیں ہم میر سے استاد کے راسخ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ استادوں کا استاد ہے استاد ہمارا

---

[1] خمخانۂ جاوید ۳/۲۲۵

راقم | لالہ بندرابن دہلوی۔ ان کے سلسلۂ شاگردی کی نسبت تذکرہ نویسوں میں اختلاف ہے۔ اکثر انھیں مرزا رفیع سوداؔ کا اور بعض مرزا مظہر کا شاگرد بتاتے ہیں۔ مگر مرزا مظہر کی شاگردی کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ البتہ اوائلِ عمر میں انھوں نے میر صاحب سے ضرور اصلاح لی تھی جس کی بابت خود میر تقی اپنے تذکرے میں اشارہ کرتے ہیں کہ "بندرابن راقمؔ از شاہ جہاں آباد است، مشقِ سخن از میرزا رفیع می کند۔ قبل ازیں با فقیر نیز مشورتِ شعری کرد"[۱] میر صاحب کی تائید قدرت اللہ خاں اور عشقیؔ عظیم آبادی نے بھی اپنے تذکروں میں کی ہے[۲]

راقمؔ فنِ سخن میں کامل دستگاہ رکھتے تھے اور شعر خوب کہتے تھے۔ چنانچہ میر حسنؔ نے اپنے تذکرہ میں ان کی رسائیِ طبع کا اعتراف کیا ہے: "بندرابن راقم بسیار بست قد ولیکن بلند فکر است"[۳] ان کا اندازِ کلام خود اس بات کا شاہد ہے[۴]

نامے کا میرے قاصد لے کر جواب پھرنا   پر واسطے خدا کے قاصد شتاب پھرنا

کام عاشقوں کا کچھ تجھے منظور ہی نہیں   کہنے کی یہ بات کہ مقدور ہی نہیں "

کہتا تھا کون یہ کہ خوشی ہے جہاں کے بیچ   اس بات کا تو یاں کہیں مذکور ہی نہیں

مری بدشرابیوں سے کریں توبہ مے گساراں   زہے وہ عمل کہ ہووے سببِ نجاتِ یاراں

سنا کس نے میرا قصہ کہ جوں ابر وہ نہ رویا   رکھے ہے گر یہ نقشہ اثرِ دعائے باراں

یاں تک قبولِ خاطر کیجیے تری جفا کو   تا سب کہیں کہ راقمؔ رحمت تری وفا کو

پہنچا نہ آہ درد کو میرے کوئی طبیب   یارب عجب طرح کا یہ آزار ہے مجھے

رضا | میر محمد رضا برادر زادۂ میر تقی میرؔ ایک غزل ان کی ایک پرانے تذکرے میں نظر سے گزری جو خوش گوئی پر دلالت کرتی ہے[۵]۔ زیادہ حال نہیں معلوم ہوا۔ دو شعر یہ ہیں

تم جو کہتے ہو مت نظر تو لگا   تم کو میری نظر لگے نہ لگے

شمع رو تو نہ ہووے جس گھر میں   پھر وہ تاریک گھر لگے نہ لگے

سخن | سر شاہ سلیمان مرحوم نے کسی حوالے کے بغیر مقدمہ "مثنویاتِ میر" میں ان کو بھی تلامذۂ میر میں منسوب کیا ہے۔

قاضی عبدالودود ان کے متعلق فرماتے ہیں: "سخنؔ شاگردِ میر سے میں بالکل واقف نہیں، یہ تخلص عبدالصمد

۱؎ نکات الشعرا ص ۱۵۳   ۲؎ تذکرہ عشقی ۲/ ۲۸۲   ۳؎ خمخانۂ جاوید ۳/ ۵۲ ۳   ۴؎ خمخانۂ جاوید ۳/ ۴۴۱   ۵؎ یہ غزل قدرت اللہ شوق کے تذکرے میں ہے، جیسا کہ "معیارستان" میں قاضی عبدالودود صاحب نے لکھا ہے (مرتب)

استادِ آرزو کا البتہ تھا۔[۱]

شکیب | شیخ غلام حسین دہلوی شاگرد میر تقی میر۔ بزمرہ شعرائے پایۂ تخت حضورِ والا محسوب بود۔ بیت ذیل او بغایت دل پذیر فقیر است[۲]

کریم الدین کا بیان ہے کہ شاہ عالم کے ملازموں میں منسلک تھا۔ (طبقات شعرائے ہند/ ۱۳۶)

نیم بسمل اُس نے گر چھوڑا شکیبؔ غم نہیں ۔۔۔۔ پر یہ غم ہے اعتبارِ دستِ قاتل اُٹھ گیا

صفا | لالہ منولال کایستھ۔ رائے پورن چند اخبار نویس شاہی کے بیٹے اور رائے صاحب رام داروغۂ املاکِ شاہ اودھ واقع دہلی کے چھوٹے بھائی اور لالہ جھاؤ لعل نائب آصف الدولہ والیٔ اودھ کے داماد تھے۔ اور خود بھی عہدۂ اخبار نویسی رکھتے تھے۔ عربی و فارسی میں عالم و فاضل اور اُردو و فارسی دونوں زبانوں کے خوش گو شاعر تھے۔ دو دواوینِ اُردو و فارسی یادگار چھوڑ کر وفات پائی۔ ان کے بعض اشعار بہت مشہور ہوئے چنانچہ یہ شعر انھیں کا ہے۔

چرخ کوکب یہ سلیقہ ہے ستم گاری میں ۔۔۔۔ کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں

اس شعر کو بعض صاحبانِ تذکرہ نے حسرت استادِ جرأت کے نام سے بھی لکھا ہے۔

ان کی شاگردی میں تذکرہ نویسوں کو اختلاف ہے صفیر بلگرامی نے جلوۂ خضر میں میر تقی میر کا شاگرد لکھا ہے۔

شیفتہ کہتے ہیں: "منولال صفا از اہل لکھنؤ و تلامذۂ مصحفی است، در علوم معقول و درست نویسی بعض خطوط دستگاہے داشت، و برادر صاحب رام است واز آشنایان قاضی اختر بود۔"[۳]

منشی دیبی پرشاد بشاش جو دھپوری مصنف تذکرہ "آثار الشعرائے ہنود" نے منشی مینڈھل لال زار بلگرامی کا شاگرد لکھا ہے۔

مولوی کریم الدین کا بیان ہے: "منولال صفا لکھنوی وہ مصحفی کا شاگرد ہے"[۴]

"طورِ کلیم" کے مولف نے بھی مصحفی کا شاگرد لکھا ہے اور تخلص صبا ظاہر کیا ہے۔[۵]

میرے خیال میں صفا فارسی میں مینڈھو لال زار کے شاگرد تھے۔ اُردو میں اول میر تقی میر سے اور بعدہٗ مصحفی سے مستفید ہوئے۔ نمونۂ کلام

[فارسی] نیست غم گر نذیرمن دلِ بر غم برود ۔۔۔۔ پارۂ ہست نہ آتش بہ جہنم برود

سزائے جورِ تو ایں بادکیں فلک چندے ۔۔۔۔ ترا بہ ہجو تو بے مہر آشنا می کرد

۱؎ معیارستان/ ۵۰ ۲؎ گلشن بے خار/ ۱۱۰ ۳؎ گلشن بے خار ۴؎ طبقات شعرائے ہند/ ۲۰۳ ۵؎ طور کلیم/ ۶۳

ہیم از تشنگی روزِ جزا نیست صفا — کہ امیدِ کرم از ساقیٔ کوثر دارم

[رباعی]
اکنوں کہ شباب رفتہ پیری آمد — وز انس بخاک ناگزیری آمد
بیہودہ چہ در کشاکشی ہمچو کماں — بنشیں کہ زمانِ گوشہ گیری آمد

[اُردو]
سامنے تیرے جو ہوں حور و پری کا منہ کیا — کیا چلے آگے ترے کبکِ دری کا منہ کیا
خوبصورت جو بہت حور کو سمجھا ہے صفا — تو نے دیکھا نہیں اُس رشکِ پری کا منہ کیا
کیا ہنسی آتی ہے مجھ کو حضرتِ انسان پر — فعل بد تو خود کرے لعنت کرے شیطان پر
جب داغ دیکھتا ہوں میں سینے میں جائے دل — بے اختیار منہ سے نکلتا ہے ہائے دل

ضیا ضیاء الدین حسین نام استاد میر حسن۔ بقول مصحفی میر کے شاگرد تھے[۲]۔ ۵۴ سال کی عمر میں عظیم آباد چلے گئے۔ وہیں انتقال کیا۔ نمونۂ کلام ؎

صاف جب تک تھا تو ہم کو بھی جوابِ صاف تھا — اب جو خط آنے لگا شاید کہ خط آنے لگا
کل کی رسوائی تجھے کچھ کم نہ تھی اے ننگِ خلق — اُس کے کوچہ میں ضیا تو آج پھر جانے لگا
رسوائیوں کی اپنی مجھے کچھ ہوس نہیں — ناصح پہ کیا کروں کہ مرا دل پہ بس نہیں

طالب عاشور بیگ خاں سلمہ الرحمٰن خلف الصدق دولت بیگ خاں مرحوم کہ در ایام دولت نواب غفران مآب امیر الامرا ذوالفقار الدولہ نجف خاں بہادر بہ سرکردگیِ چند صد سوار جرار روزگار بسر می برد اصلش از توران و مسقط الراسش خاکِ پاکِ ہندوستان جنت نشان است مردِ کشادہ پیشانی خوش زندگانی نیک طبع شیریں گفتار صاحبِ وضع ستودہ کردار واقع شدہ خود بیشتر بہ سمع محب سراپا وفاق حکیم ثناء اللہ خاں فراق رسانیدہ و برخے از سخن سنجِ بے نظیر محمد تقی میر ہم گذرانیدہ بہرکیف ایں چار بیت از ریختہ ہائے طبع اوست[۳] ؎

رہا تجھ کو وہاں نت کام اپنا — ہوا یاں کام اے خود کام اپنا
کہاں ملتا ہے طالب ہم سے وہ شوخ — یہ ہیں بدنام ہے اب نام اپنا
رقصِ بسمل ہے طپش ہائے دل — تو بھی آ دیکھ تماشائے دل
ایک دم چین[۴] نہیں دیتا ہے — کاش سینے سے نکل جائے دل

---

[۱] تذکرۂ روز روشن/۳۸۹ — [۲] الہامات شاد/۲۴
[۳] مجموعۂ نغز/۳۶۶-۳۶۷ — [۴] چینے (نسخہ دیگر)

عرش بقولِ مصحفی سید حسن عسکری نام عرف میر کلو عرشؔ خلفؔ میر تقی میرؔ گو زیادہ پڑھے لکھے نہ تھے۔ مگر ان کی خوش گوئی زبان زدِ عوام تھی۔ جناب انسؔ سے قدیمی مراسم تھے۔ اور کوئی ذاتی آمدنی نہ تھی۔ اس وجہ سے میر صاحب ہی کے پاس رہتے تھے۔ میر انسؔ صاحب کی وضعداری اور فراخ دلی نے عرشؔ مغفور کو کبھی شکایت کا موقع نہیں دیا۔ ورنہ ممکن تھا کہ میر کلو عرشؔ ایسا سخن گو لکھنؤ ایسے شہر میں کسی دوسری جگہ رہ کر بھی اپنی زندگی عزت کے ساتھ گزار سکتا۔ ہاں یہ لطف شعر گوئی اور صحبت اہل علم اُن کو اور کسی جگہ میسر نہیں آسکتی تھی۔ پرانے لوگ تھے۔ زندگی ایک روش پر بسر کرنا پسند کرتے تھے۔ اگر موجودہ طرز تمدن کی طرف نظر ڈالو تو اس کے آگے ہیچ معلوم ہوتا ہے۔

میر کلو عرشؔ کی رنگت سانولی۔ کشیدہ قامت تھے۔ وسط کا جسم تھا۔ سر پر پٹے تھے۔ اونچی چولی کا انگرکھا اور کلی دار پائجامہ استعمال کرتے تھے۔ گتھیلا جوتا یا بوٹ پہنتے تھے۔ آخر عمر میں بہ سبب پیرانہ سالی کمر خم ہوگئی تھی۔ اور افیون بھی کھانے لگے تھے۔ ہر وقت آنکھیں بند رہتی تھیں۔ حقہ سامنے لگا رہتا تھا۔ جنابِ رشیدؔ اور جناب حمیدؔ اکثر ان سے مہذب مذاق کر لیا کرتے تھے۔ مثلاً اُن کے سامنے حقے سے چلم اتار کر دوسرے حقے پر رکھ دی اور غائب ہوگئے۔ انھوں نے تھوڑے سے مراقبے کے بعد جب کش لیا تو احساس ہوا کہ بغیر چلم کا حقہ بول رہا ہے، اب آنکھ کھولی تو دیکھا کہ چلم ندارد ہے۔ صرف یہ کہہ کر اکتفا کی۔ "یہ لڑکے بڑے شریر ہیں" وضعداری کی اس قدر پابندی کی کہ انتقال بھی یہیں ہوا اور دفن بھی یہیں ہوئے۔

شیخ محمد جان شادؔ بیرو میرؔ انھیں سے اصلاح لیا کرتے تھے۔ ایک صاحب شادؔ مرحوم کی زبانی ناقل ہیں۔ کہ میر کلو عرشؔ نے وضع میں داخل کر لیا تھا کہ پانچ بجے شام تحسین کی مسجد کے چبوترے پر بیٹھا کرتے تھے۔ اور چاروں طرف شعرائے نامی ہوتے تھے۔ بڑے نازک مزاج تھے۔ کسی رئیس کی طرف نظراً ٹھا کر نہ دیکھتے تھے۔ عرشؔ کی نظرِ استغنا پیوندزدہ انگرکھے کو قبائے زربفت سے بہتر سمجھتی تھی۔ آخر میر ہی کے تو بیٹے تھے۔ ذیل کے دو شعر رشیدؔ مرحوم کی زبانی سنے گئے تھے۔ دیوان عرشؔ (مطبوعہ[2]) میں موجود نہیں[3]۔

مدت ہوئی نہیں خبرِ رفتگاں مجھے ۔۔۔ پس ماندہ ہوں کہ چھوڑ گیا کارواں مجھے

---

[1] ناسخ لکھتے ہیں: "پہلے زارؔ تخلص کرتے تھے" (سخن شعرا ص ۳۲۳) قاضی عبدالودود لکھتے ہیں: ریاض الفصحا قدیم ترین کتاب ہے جس میں عرشؔ کا حال زارؔ تخلص کے تحت ملتا ہے۔" (عیار ستان ص ۴۵)

[2] دیوان عرشؔ مطبع کارواں میں طبع ہوا تھا" (عیارستان" ص ۵۲) [مطبع کارنامہ ہونا چاہیے ـــــ ایڈیٹر]

[3] "حضرت رشیدؔ" سوانح پیارے صاحب رشیدؔ مولفہ آغا اشہر لکھنوی ص ۱۹

بے یار گور میں بھی نہیں ایک جا قرار　　　لے جائے گی یہ وحشتِ دل اب کہاں مجھے

عشق سرشاہ سلیمان نے ان کو بھی میر کا شاگرد کہا ہے۔ مگر نہ ان کا نام دیا ہے اور نہ اپنے دعوے کا ثبوت پیش کیا ہے۔ میر کے عہد میں عشق تخلص کے ایک سے زیادہ شاعر تھے۔ مگر ان میں سے کوئی بھی میر کا شاگرد نہ تھا۔ اگر کسی کے متعلق کوئی روایت اس مضمون کی موجود ہے تو وہ نہایت ضعیف اور ناقابلِ اعتبار ہے۔[1]

عیاش میر محمد یعقوب خلف میر محمد انور دہلوی خودش در لکھنؤ تربیت و نشوونما یافتہ۔ اکثر بخدمتِ میر محمد تقی فائدہ صحبت برداشتہ و شعرِ خود را در اوائل بہ میر سوز مرحوم و در اواسط بہ میر قمرالدین منت مغفور مبرور نمودہ در ایں ایام او اخرمشق بہ نقیر (مصحفی)، رجوع مشورہ آوردہ است۔"[2]

"عیاش از باشندۂ لکھنؤ است۔ بکرش دقت طلبی امرت[3]۔ نمونۂ کلام

خنجرِ بیداد کو سنگِ فساں پر تیز کر　　　وقتِ قتل اتنا ترحم مجھ پہ اے خوں ریز کر

پیرِ میخانہ یہی کہتا ہے ہر اک رند کو　　　صحبتِ زاہد سے جتنا ہو سکے پرہیز کر

غیور دہلی کے رہنے والے۔ میر تقی کے شاگرد، لکھنؤ میں آئے۔ پہلے ایک بنئے سے ملاقات ہوئی۔ اس نے کہا میرے یہاں پندرہ روپیہ ماہوار آپ کو مل سکتا ہے اور کھانا اور موٹا کپڑا۔ آپ نے کہا میری گزر اس میں نہ ہوگی۔ اس نے کہا اچھا آپ قیام کیجئے میں کسی سے آپ کی سفارش کر دوں گا۔ دو مہینے تک قیام کیا۔ کوئی صورت پیدا نہ ہوئی۔ آخر بنئے کی ہجو میں ایک مثنوی لکھی جس کے چند شعر لکھے جاتے ہیں۔ جگل کشور بنئے کا نام ہے۔

عجب ایک منحوس بقال تھا　　　غرض صاحبِ ملک اور مال تھا

کوئی نامِ نحس اس کا لیتا نہ تھا　　　بجز گالیاں اس کو دیتا نہ تھا

بخیلی میں مشہور تھا اس قدر　　　کہ قاروں کی جوتی تھی اور اس کا سر

شـ۱۲۲۶ھ کا یہ واقعہ ہے۔ آپ لکھتے ہیں۔ میں نے بنئے سے ملاقات کی۔ اس نے کہا۔

ہمارے یہاں دال روٹی تو ہے　　　جو پوشاک پہنو گے موٹی تو ہے

اگر پانزدہ روپیہ ہوں قبول　　　تو ہر ماہ میں مجھ سے ہوں گے حصول

آپ نے جواب دیا۔

کروں گا بھلا اس میں کیوں کر معاش　　　گر اب کہیں اور کروں گا تلاش

---

[1] عیارستان/۵۰ [2] ریاض الفصحا/۲۱۳ [3] تذکرہ روز روشن/۱۲۰

اس نے کہا آپ میرے یہاں مہمان رہیے۔ میں کہیں کام دلوا دوں گا۔ آپ وہاں کئی مہینے تک رہے۔

رہا اس کی امید پہ چند ماہ　　　　به حالِ پریشاں، به حالِ تباہ

نتیجہ یہ ہوا کہ آپ وہاں سے خفا ہو کر چلے آئے۔ اور اس کی ہجو لکھی۔ بعد چندے مرزا جعفر صاحب کی شان میں ایک قصیدہ کہہ کر پیش کیا۔ وہاں سے کچھ وظیفہ مقرر ہو گیا۔

اگلے زمانے کے شعرا میں یہ صفت تھی کہ ذرا سی بات پر ہجو لکھ ڈالتے تھے۔ اور وہ زمانہ بھی قدر دانی کا تھا۔ لوگ نازک مزاجیاں اٹھاتے تھے۔ ورنہ ایک بنئے کا اردو زبان کی خدمت کے لئے کچھ روپیہ صرف کرنا قابلِ تقلید امر ہے۔ مگر غیور نے اس کی بھی قدر نہ کی۔ انتقال لکھنؤ میں ۱۲۴۰ھ میں ہوا۔ مزار کا کہیں پتا نہیں ملا۔ غالب گمان یہ ہے کہ مفتی گنج میں ہوگا۔ کیونکہ نواب آصف الدولہ بہادر کے زمانے میں یہ لکھنؤ آئے تھے۔ اور اس وقت کے تمام شعرا مفتی گنج میں زیادہ رہتے تھے۔ آج کل مغربی لکھنؤ ویران ہو رہا ہے اس لئے وہاں کی قبروں کا نشان ذرا مشکل سے مل سکتا ہے[1]۔ سچ ہے۔

امیر فاتحہ پڑھنے کوئی کہاں آئے　　　　مزار ہے نہ نشانِ مزار باقی ہے

فیض | میر فیض علی فیض۔ فرزند و شاگردِ میر تقی میر است بہ سال یک ہزار و یک صد و نود و شش ہجری اشعارش در بلدۂ بنارس از لکھنؤ طلبیدہ تحریر شد[2]۔

کہہ دیا سب سے جو کہ تھا معلوم　　　　دل ترا حوصلہ ہوا معلوم

شوق میں تیرے کنار و بوس کے اے بحرِ حسن　　　　موج کی مانند ہو جاتے ہیں سب آغوش ہم

گل | میرزا اکبر علی خاں نام۔ گل بلبل نے تخلص تجویز کیا ہے اور نگار استاد کا مجوزہ ہے۔ نیز ہندی میں پھول تخلص کرتے ہیں۔ میر تقی میر سے تلمذ ہے۔ اور حسب ذیل معاصرین ہیں: نگار۔ بندہ، مہدی اور اظہر، مگر ان چاروں اصحاب کا حال بھی معلوم نہ ہو سکا۔ ثبوت میں ان کے اشعار ملاحظہ ہوں۔

نگار استاد نے بلبل نے گل رکھا تخلص جب　　　　کیا اکبر علی خاں نے قبول احکام دونوں کا

گل رکھا بلبل نے اور استاد نے رکھا نگار　　　　میرزا اکبر علی خاں کے ہوئے ہیں نام دو

---

[1] آب بقا ص ۷۰، [2] گلزار ابراہیم ص ۱۹۱ (کریم الدین نے غلطی سے ان کا نام میر فائز علی لکھا ہے یہ غالبًا فیلن کی وجہ سے غلطی ہوئی اس نے انگریزی میں Z بجائے F کو فائز ہی پڑھا ہوگا۔ [ایڈیٹر]

[3] نیز ملاحظہ ہو تذکرہ شعرائے جے پور مولفہ احترام الدین شاغل۔

نہ کیوں گوہر فشاں اشعار ہوں میرے زمانے میں   مرا استاد اے گلؔ میر سا یکتائے دوراں ہے
لے فگار و بندہ و مہدیؔ و اظہرؔ سے یہ گلؔ   اس غزل پر آفریں اے بندہ پرور تو بھی

سکونتِ جے پور کے ثبوت میں حسبِ ذیل اشعار ملتے ہیں۔

آہ اے دوست ترے ہجر میں یارِ جے پور   مثلِ ویرانہ سمجھتے ہیں دیارِ جے پور
بے شبہہ خاک سمجھنا اُسے مرقد کی مرے   پہنچے تم تک جو کبھی گرد و غبارِ جے پور

گلؔ کا قلمی کلیات جو $\frac{17 \times 27}{4}$ سائز کے ۴۷۷ صفحات پر مشتمل ہے اور تقریباً جملہ مروجہ اصنافِ سخن اس میں موجود ہیں۔ اُردو کے علاوہ ہندی، فارسی اور مخلوط زبانوں میں بھی متعدد اصنافِ کلام موجود ہے۔ منشی نعیم الدین پنشنر انسپکٹر پولس جے پور نبیرہ منشی نظام الدین عیشؔ کے پاس محفوظ ہے۔

گلؔ کو زبان پر پوری قدرت ہے۔ بعض جگہ فارسیت کا غلبہ ہے اور بیشتر غزلیات میں صاف و سلیس زبان استعمال کرتے ہیں۔ تشبیہہ و استعارہ سے زیادہ کام لیتے ہیں۔ بلندیٔ تخیل اور دقت پسندی کی بہت سی عمدہ مثالیں ملتی ہیں۔ زورِ بیان بھی ہے اور تاثیرِ کلام بھی۔ سنگلاخ زمینوں کی طرف زیادہ توجہ کرتے ہیں اور خوب شعر نکالتے ہیں ؎

(نمونہ کلام) جگر پر داغ، دل پر گلؔ گیا آرام دونوں کا   کیا آخر تری فرقت نے ظالم کام دونوں کا
پوچھتا آنسوؤں کو چشم سے اپنی کیوں کر   جامۂ گل میں تو اتنا بھی نہ داماں نکلا

یہ کس عشوہ گر نے اشارا کیا   مرے دل نے مجھ سے کنارا کیا
نہ دی مجھ کو دشنام تک بھی کبھی   میں ہر چند دامن پسارا کیا
پس از میر و مرزا بہ ملکِ سخن   سنا ہے کہ گلؔ نے اجارا کیا

مجھ سے مت تنگ ہو پل مارتے ڈھل جاؤں گا   پرورش یافتۂ دامنِ مژگاں ہوں میں
اس قدر فرطِ جنوں ہے ترے دیوانے کو   تار چھوڑا نہ گریباں میں قسم کھانے کو
پھرتی ہے غبارِ تن دیوانہ کی خاطر   زنجیر لیے موجِ صبا دیکھیے کیا ہو
مجھ سے کہتا ہے یہی پنجۂ وحشت اے گلؔ   آپ یہ بارِ گریباں نہ اُٹھایا کیجیے

(ہندی اشعار) برہ بِیا میں تُول دے کیسے دیکھوں پھول   بن پی دیکھوں پھول جد لگے ہیا میں شُول
ریکھ لکھی کرتار کی میٹ سکیں کب لوگ   شو۔ برہن کے بھاگ میں بدھنا لکھیا جوگ

پانی برسے مینھ کا اُگ آئی سب گھاس ۔۔۔ بھیگت ہیں وہ مینھ میں جن کا جنگل باس
آہ کروں تو تن جلے چپ کئے من جل جائے ۔۔۔ ایسی بھاری پیڑ میں کیسے کر کل آئے

مُحکّل صاحبِ سلسلہ شاعر تھے۔ ان کے تلامذہ میں شیخ عطا حسین شورؔ مشہور ہوئے۔ شورؔ کے شاگرد منشی فرزند علی نقیرؔ تھے۔ ثبوت میں نقیرؔ کے اشعارِ ذیل ملاحظہ ہوں:۔

شاگرد ہوں میں حضرتِ شورِؔ شریف کا ۔۔۔ اور شورؔ باغِ حضرتِ مُحکّلؔ کے تھے خوش صفیر
اور مُحکّلؔ وہ تھے کہ ان کی بہارِ کلام سے ۔۔۔ آتی مشامِ عقل میں تھی بوے باغِ میر

لطف شیفتہؔ نے ان کے متعلق لکھا ہے[1]: "لطفؔ تخلص، مرزا علی اصلش از استرآباد است در دہلی نشو و نما یافتہ و در نواحِ عظیم آباد ساکن و بہ حیدرآباد رفتہ، قصائدِ انشا کردہ و صلہا یاو نسبتِ شاگردی بہ میر تقی داشتہ۔ تذکرہ در حال ریختہ گویاں بہ زبانِ ریختہ نوشتہ است بہ نظر رسیدہ" نمونۂ کلام ؎

بڑھایا قصۂ سنبل صبا نے حد لیکن ۔۔۔ فسانہ زلف کا تیری بہت دراز رہا

لیکن خود مرزا علی لطفؔ یہ لکھتے ہیں: "اور مشورہ ریختہ کا صرف اپنی ہی طبع ناصواب سے ہے[2]"

مجنوں شیفتہؔ نے لکھا ہے: "مجنوںؔ تخلص، مجہول الاسم مشہور بہ درویش سر برہنہ، شخصے بود از اولادِ رائے بھیم ناتھ، بزرگانش بہ یک دو واسطہ با اسلام مائل شدند، از تلامذۂ میر تقی میرؔ است۔ گویند کہ در کوچہ و برزن عور محض می گشت و ایں معنی دلیلِ تاثیر تخلص است"[3]

جس سے جی چاہے ملو تم نہ کسی سے پوچھو ۔۔۔ مجھ سے کیا پوچھتے ہو اپنے ہی جی سے پوچھو

محسن محمد محسن، محسنؔ برادر زادۂ میر خلف حافظ محمد حسن۔ تذکرہ نکات الشعراء تحریر کرتے وقت ان کی عمر بیس سال کی تھی۔ میرؔ نے لکھا ہے: "ذہنش بسیار مناسب و سلیقہ اش خیلے درست معلوم می شود"[4]

محسن نہ رووُں میں تو بھلا کہہ کہ کیا کروں ۔۔۔ اک دل بساط میں تھا سو اس کو بھی کھو چکا
مر گیا پوچھی نہ پر تم نے مری زحمتِ دل ۔۔۔ جیو کی جیو ہی میں رہی ہائے مری حسرتِ دل
کیا جانیے وہ شوخ کدھر ہے، کدھر نہیں ۔۔۔ ہم کو تو تن بدن کی بھی اپنے خبر نہیں
ٹک راہ پر تو آؤ اب سیر کو تو محسنؔ ۔۔۔ مانندِ نقشِ پا کے پامال ہو گیا ہے

---

[1] گلشن بے خار/۱۱۰ [2] گلشن ہند مرتبہ شبلی نعمانی [3] گلشن بے خار/۱۶۹ [4] نکات الشعراء/۱۴۸

مرزا شیفتہ نے ان کے متعلق لکھا ہے: "مرزا تخلص، آقا مرزا نام، اصلش از ماژندران است۔ دوے در لکھنؤ متولد شدہ پدرش محمد اسمٰعیل نام تجارت پیشہ بود، از تلامذۂ میر است[1]۔ نمونۂ کلام ؎

یاس سے جب وہ پھر گیا غش سے کھلی تب آنکھ | مجھ نارسا کے طالعِ بیدار دیکھنا

مرزا کا ذکر مصحفی نے بھی کیا ہے[2]۔

مشتاق عبداللہ خاں نام۔ مصحفی نے ان کو بھی میر کا شاگرد لکھا ہے[3]۔

خرد کو روؤں یاس دل رہیں ناز پرور کو ؎
کیا اک ترک نے غارت مرے لشکر کے لشکر کو

مظفر "خواجہ مظفر علی خاں خلف غلام علی خاں مولف کتاب "تواریخ عالی گوہر بادشاہ" ابن نواب بھکاری خاں صوبہ دار لاہور ابن روشن الدولہ نواب۔ نوجوان موزوں طبع است مرید خاندان طریقۂ نقشبند یہ دارد وبہ شاگردی میر تقی میر فخر می کند وتحصیل عربی تا شرح مُسَلّم از محمد اشرف شاگرد رشید مولوی نور صاحب بودہ۔ معہذا بہ سبب معرفت ایشاں کہ فقیر را بہ پدر بزرگوارِ ایشاں در شاہ جہاں آباد بود و آں بزرگ ایں عاصی را کمال دوست داشتے معزالیہ نیز بافقیر نہایت اتحاد کردہ اکثر بلا ناغہ در شاعرۂ عاصی وارد می شود۔ غزلہائے خود نمودہ اکثر بست وہشت سالہ خواہد بود"[4]

خواجہ مظفر علی خاں کے دادا نواب بھکاری خاں کے مختصر حالات ملاحظہ ہوں:۔

"نواب بھکاری خاں رستم جنگ بانی مسجد طلائی لاہور، معین الملک نواب میر منو داماد نواب فخرالدین خاں وزیر محمد شاہ بادشاہ دہلی کے زمانہ میں لاہور میں رہا۔ میر منو کے انتقال کے بعد جب مراد بیگم نے صوبہ داری کی تو اس کو امیر اعظم اور مدار المہام بنایا۔ شہر میں بہت رسوخ و اقتدار رکھتا تھا۔ بیگم نے اس خطرہ سے محفوظ رہنے کے لئے جہاں خاں کے سامنے اس کو محلات میں بلوایا اور لونڈیوں کے ہاتھ سے سولی دلوا دی ۱۱۶۸ھ زمانہ احمد شاہ"[5]

(نمونۂ کلام) مانع نہیں چلنے کا مرے سلسلۂ پا | پر رکنے نہیں دیتا قدم آبلۂ پا
کیا پوچھتے ہو فرق وجود اور عدم کا | گر غور سے دیکھو تو ہے اک قافلۂ پا
پھرتا ہے لئے آٹھ پہر مجھ کو مظفر | کس سے میں کروں جا کے اب یہ گلۂ پا

---

[1] گلشن بے خار / ۱۷۱ [2] ریاض الفصحا / ۲۰۶ [3] "اشعار میر" مرتبہ بیدل عظیم آبادی
[4] ریاض الفصحا [5] تواریخ عالی گوہر بادشاہ

مظلوم شاہ مظلوم۔ دہلی کے شاعر تھے۔ میر کے شاگرد تھے۔ ۱۲۰۵ھ میں انتقال فرمایا۔ قبر کا نشان نہیں معلوم۔ کسی نے تاریخ انتقال کہی ہے[1] ع ہائے افسوس دائے مظلوم است

نشلہ ان کے متعلق میر نکات الشعرا میں لکھتے ہیں: "میر عبدالرسول نثار فقیر مولف کے دوستوں میں سے ہیں، چنانچہ میرے مشورہ سے شعر کہتے ہیں۔ سید نجیب اور جوان سعادت مند ہیں۔ ان کی اصل اکبرآباد سے ہے۔ فرخ سیر بادشاہ کے زمانے میں جب نیکو سیر اکبرآباد میں ہنگامہ برپا کر رہا تھا۔ ان کے بزرگ عزت کے ساتھ بسر کرتے تھے۔ بہت آراستہ و پیراستہ۔ سنجیدہ اور سمجھ دار ہیں۔ میں ان کے طور و طریق سے بہت خوش ہوں"[2]

اکثر ہیں دلفگار ولیکن نہ اس قدر — کتنے ہیں بے قرار ولیکن نہ اس قدر

میں وہ ہوں جس کے رشک سے گل نے کیا سحر — ٹکڑے جگر ہزار ولیکن نہ اس قدر

ہاتھ سے ان جامہ زیبوں کے نکل جاویں گے ہم — یہ گریباں دامنِ صحرا کو دکھلا دیں گے ہم

ٹک نے یکہ تو چمن کا کیسا ہے ڈھنگ تجھ بن — منہ سے اڑا ہے گل کے گلشن میں رنگ تجھ بن

ہر سمت صد تمنا تڑپیں ہیں خاک و خوں میں — ہے صحن خانہ میرا میدانِ جنگ تجھ بن

یاں گل لگے بھرے ہے دستار پر تو اپنی — واں عاشقوں کے سر پر پڑتے ہیں سنگ تجھ بن

جو ہے یعقوب! یوسف دیکھنا منظور آنکھوں سے — تو اتنا پھوٹ کر مت رو کہ جائے نور آنکھوں سے

نامی مبارز الدولہ نواب حسام الدین حیدر خاں (شاگرد میر حسن خلیق و میر تقی میر) آپ نے مرزا غالب کا ابتدائی کلام اس کی ندرت و غرابت کے پیشِ نظر دہلی سے لے جا کے لکھنؤ میں اپنے استاد میر کو دکھایا کہ "دیکھئے حضرت! ایک ۱۲۔۱۳ برس کا لڑکا ایسے شعر کہتا ہے" تو انھوں نے مندرجہ ذیل رائے ظاہر کی کہ "اگر اس لڑکے کو کوئی کامل استاد مل گیا اور اس نے اس کو سیدھے رستے پر ڈال دیا تو لاجواب شاعر بن جائے گا۔ ورنہ مہمل بکنے لگے گا"

(یادگارِ غالب ص ۹۸۔ ذکرِ غالب ص ۱۴۔۴۲۔۴۳)

نزار نساخ نے ان کے متعلق لکھا ہے[3]: "نزار تخلص۔ خواجہ محمد اکرم شاگردِ میر تقی میر" میر حسن نے بھی ان کو میر کا شاگرد لکھا ہے[4]۔ ان کا ایک شعر ملاحظہ ہو ؎

نزدیک ہے مرنے کو وفا کشتہ نزار اب — ٹک دیکھنے چلئے کہ بہت دور نہیں ہے[5]

---

[1] آب بقا/۵۰، ۱ [2] نکات الشعرا [3] سخن شعرا/۵۰۲

[4] تذکرہ شعرائے اردو [5] اشعار میر مرتبہ بیدل عظیم آبادی/۳۱

وحشت "مرزا باقر علی خاں فرخ آبادی۔ صاحب "جلوۂ خضر" نے ان کو بھی میر کا شاگرد لکھا ہے اور یہ شعر نقل کیا ہے ؎

دیکھ کر اس کو ہوا ہوں غش نہ آؤں ہوش میں ہووے محشر کا اگر شورِ فغاں بالائے سر

یار میر احمد یار دہلوی۔ "جلوۂ خضر" میں لکھا ہے کہ یہ بھی میر کے شاگردوں میں تھے۔ ان کا یہ شعر عام پسند ہے ؎

آفریں اے دستِ گستاخِ محبت آفریں
یہ گریباں ایک مدت سے گلے کا ہار تھا

نادم سیتاپوری

میر کا مدفن

میر کی وفات کو ڈیڑھ سو سال سے زیادہ ہو گئے مگر اب تک نہ تو مدفن "میر" کی صحیح نشاندہی کی جا سکی نہ ان قبروں کے متعلق کوئی قابل اعتبار ثبوت مہیا ہو سکا جن کے بارے میں "مرقد میر" ہونے کا دعویٰ کیا گیا تھا یہاں تک کہ اہلِ لکھنؤ میر کے صاحبزادے میر کلو عرش مرحوم سے بھی کچھ حاصل نہ کر سکے جو مرتے وقت تک پیارے صاحب رشید مرحوم کے دادا سید محمد میرزا انس کے یہاں مقیم رہے۔ پروفیسر آغا شہر لکھنوی نے "حیات رشید" میں لکھا ہے۔

"میر کلو عرش خلف ناخدائے سخن میر مرحوم۔ گو زیادہ پڑھے لکھے نہ تھے مگر ان کی خوش گوئی زباں زد عوام تھی۔ جناب انس سے قدیمانہ مراسم تھے اور کوئی ذاتی آمدنی نہ تھی اس وجہ سے میر صاحب (انس) ہی کے پاس رہتے تھے۔ میر انس کی وضعداری اور فراخدلی نے عرش مغفور کو کبھی شکایت کا موقع نہ دیا۔ ورنہ ممکن تھا کہ میر کلو عرش ایسا سخن گو لکھنؤ ایسے شہر میں کسی دوسری جگہ رہ کر بھی اپنی زندگی عزت سے گذار سکتا تھا۔ ہاں یہ لطف شعر گوئی اور صحبت اہل علم ان کو اور کسی جگہ میسر نہیں ہو سکتی تھی پرانے لوگ تھے زندگی ایک روش پر بسر کرنا پسند کرتے تھے۔[1]

سید محمد میرزا انس کا انتقال ۱۳۰۲ھ میں ہوا۔ ان کے تینوں صاحبزادے۔ میر عشق، تعشق اور صابر ان کے بعد علی الترتیب ۱۳۰۳ھ۔ ۱۳۰۹ھ اور ۱۳۱۱ھ میں راہی دار بقا ہوئے ــــ اور پوتے مصطفیٰ میرزا رشید (پیارے صاحب) تو ابھی ۱۹۱۰ء میں اللہ کو پیارے ہوئے۔ حیرت یہ ہے کہ ان بزرگوں میں سے کسی نے میر کلو عرش کے حوالے سے میر کی قبر کی نشاندہی نہ کی۔

---

[1] حیات رشید۔ ص ۱۹-۲۰ اصح المطابع لکھنؤ

"مزار میر" کے متعلق گذشتہ بچاس سال کے اندر لکھنؤ میں روایات کی جو آندھیاں چلیں ان میں سب سے زیادہ مقبول وہ حکایت ہوئی جو سٹی اسٹیشن کے قریب ریلوے لائن کے پورب جانب ایک قبر کے متعلق مشہور ہو گئی تھی کہ یہ میر تقی میر کا مدفن ہے چنانچہ اس روایت نے ایسا قبول عام حاصل کیا کہ ۱۹۲۸ء یا ۱۹۲۹ء میں جب ماہنامہ نیرنگ رام پور کا "میر نمبر" شائع ہوا تو اس میں میر کے اسی فرضی مزار کا ایک فوٹو شائع کیا گیا تھا جس میں نشان قبر کے علاوہ ریلوے لائن کا ایک ایسا "پوز" دیا گیا تھا گویا قبر کے برابر ہی ٹرین خود بجاتی چلی جا رہی ہے —— اور تصویر کے نیچے میر کا یہ شعر لکھا ہوا تھا

سرہانے میر کے آہستہ بولو　　　ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے

اس افسانہ طرازی کی داستان بھی نہایت دلچسپ ہے —— جس کا آغاز حامد علی خاں حامد مرحوم بیرسٹر لکھنؤ کے ایک "موہوم مضمون" سے ہوا۔ شہرت یہ دی گئی کہ حامد علیخاں کا یہ مضمون مرحوم ماہنامہ "معیار" (لکھنؤ) میں شائع ہو چکا ہے اور اس مضمون میں حامد علی خاں مرحوم نے خدائے سخن میر کی قبر کو "جوبلی انٹر کالج کے سامنے ریل کے چھتہ کے نیچے بلند باغ روڈ کی حد پر اس قبرستان میں بتایا تھا جہاں کچھ قبریں اس وقت تک موجود تھیں —— اس سلسلہ میں ایک ضعیف عورت کا قصہ بیان کیا گیا اور مشہور یہ کیا گیا کہ اس "ضعیفہ" نے میر کی قبر کی نشاندہی کی تھی۔

اس حکایت نے جس طرح شہرت پائی تھی وہ من و عن ویسا ہی واقعہ تھا جیسا میر مہدی حسن مرحوم نے واقعات انیس میں لکھا تھا چنانچہ سب سے پہلے پنڈت منوہر لال زتشی کی نظر اصل مسئلہ پر پڑی جو اس زمانے میں جوبلی انٹر کالج کے پرنسپل تھے انھوں نے معیار کی فائلوں میں حامد علی خاں مرحوم کا یہ مضمون تلاش کیا۔ مگر وہ تھا ہی کہاں۔؟ جو ملتا۔ مجبوراً انھوں نے ماہنامہ "خیابان" (لکھنؤ) کے ایڈیٹر سید شہنشاہ حسین مرحوم ایڈوکیٹ کو ایک خط لکھکر ادھر توجہ دلائی —— زتشی صاحب نے اپنے خط میں لکھا تھا۔

"حامد علی خاں مرحوم نے "معیار" کی قدیم اشاعت میں "ضعیفہ" کے واقعہ کو تفصیل کے ساتھ لکھا ہے معیار کا وہ پرچہ میری نظر سے نہیں گذرا —— لیکن میر مہدی حسن صاحب احسن نے "واقعات انیس" میں اس واقعہ کو ایک نوٹ میں یوں تحریر فرمایا ہے۔

"اسی طرح ایک مرتبہ دل میں خیال آیا کہ میر تقی مرحوم کی قبر دریافت کرنا چاہئے۔ پرانے لوگوں سے معلوم ہوا کہ میر صاحب کی قبر "بھیم کے اکھاڑے" میں ہے۔ یہ محلہ عہد شاہی میں بہت مشہور تھا اور اب وہاں سوا کھنڈروں کے اور کچھ نہیں ہے۔ آغا میر کی ڈیوڑھی سے "بیلی گارڈ" کے پیچھے پیچھے تک اسی محلہ کا سلسلہ گیا ہے۔ راستہ میں ایک بہت بڑا تکیہ ہے جس کو سیتاپور کی جدید ریلوے لائن نے کاٹ کر

قبروں کو متفرق اور پامال کر دیا ہے .... کئی سال کے بعد اتفاقیہ اس طرف گذر ہوا شام کا جھٹپٹا وقت تھا۔ تاریکی پھیلی ہوئی تھی۔ میں بیل گاڑی میں سوار تھا۔ داہنے بائیں دونوں طرف "بیہڑ میدان" اور چند کھیتوں کے سوا کچھ معلوم نہ ہوتا تھا۔ داہنی جانب کی بلندی پر جہاں اس قبرستان کا ایک حصہ باقی ہے کسی انسان کی پرچھائیں سی معلوم ہوئی۔ مجھ شوریدہ مزاج کو ایسے مقاموں سے دلچسپی ہے گاڑی روک لی۔ اتر پڑا ـــ اور ایک ناہموار بلندی کا راستہ طے کر کے ایک قبر کے سرہانے پہونچا تو ایک نیک بخت ضعیفہ کو اس قبر پر جھکے ہوئے حصول دعا کے لئے دعاؤں میں مصروف پایا .... دل کڑا کر کے اس ضعیفہ سے سوال کیا کہ اس سناٹے کے وقت تم اس قبرستان میں کیا کر رہی ہو اور یہ قبر کس کی ہے جس پر تم جھکی ہوئی ہو ـــ؟ وہ بیچاری سہم گئی اور کچھ جواب نہ دیا۔ گر خدا میرے اس گناہ کو بخشے میں نے بے ضابطہ دھمکیاں دے کر حال دریافت کیا۔ اس بیچاری غریب عورت نے جواب دیا کہ یہ قبر اس کے ایک مورث اعلیٰ کی ہے اور وہ ایک درویش صفت سید تھے۔ میرا باپ جب کسی مصیبت میں گرفتار ہوتا تھا تو اسی صاحب قبر سے استدعا کرتا تھا۔ میں نے پوچھا ان کا نام کیا ہے۔ نام میں نہیں جانتی۔ گر اتنا جانتی ہوں کہ اگلے زمانہ میں ایک مشہور شاعر تھے .... اہا .... کیا خوشی کی بات تھی۔ مجھ پر ایک عالم وجد طاری تھا اور بیخودی میں بکمال عقیدت سر قبر پر فاتحہ کو جھکا یا .... میں نے اپنے دل سے اس مزار کو "میر مرحوم" کا مزار مقدس طے کر لیا۔ واللہ اعلم بالصواب! بندہ۔ منوہر لال زتشی۔ ۲۰۔ جنوری ۱۹۲۶ء[1]

کم و بیش اسی قسم کا واقعہ حامد علیخاں مرحوم سے منسوب کر دیا گیا تھا اور وہ بھی اس حاشیے کے ساتھ ـــــ کہ حامد علی خاں مرحوم نے اس سلسلہ میں کوئی مضمون بھی لکھا تھا جو ماہنامہ معیار (لکھنؤ) میں شائع کرایا تھا۔ گر معیار کی فائلیں چھان ڈالی گئیں اس قسم کے کسی مضمون کا پتہ نہ چلا۔ چنانچہ سید شہنشاہ حسین مرحوم (ایڈیٹر خیابان) نے لکھا ہے۔

• باوجود سخت کوشش کے معیار کا وہ پرچہ دستیاب نہ ہو سکا۔ جس میں حامد مرحوم نے ضعیفہ کا واقعہ تحریر کیا تھا۔ معیار پارٹی کے بعض کہن سال ارکان سے استفسار کیا گیا لیکن کسی نے اپنی نظر سے حامد علی خاں کے قلم سے اس واقعہ کو لکھا ہوا نہیں دیکھا۔"[2]

---

[1] ماہنامہ خیابان لکھنؤ جنوری ۱۹۲۷ء جلد ا شمارہ ۳ ۲ ہم گدہ عزیزاں میں / ۱۰ - ۱۱ مطبوعہ یوسفی پریس لکھنؤ

یہ قبر میر سے منسوب ہونے کے بعد مرجع خاص و عام بنتی چلی جارہی تھی کہ ایک شاہ صاحب کی "نگاہ باطنی" کو کچھ اور جلوے نظر آنے لگے اور سید شہنشاہ حسین مرحوم یہاں پہونچے تو کشف و کرامات کی جلوہ فرمائیوں سے ان کی آنکھیں خیرہ ہوگئیں ۔انھوں نے دیکھا

"وہاں حسب معمول ایک سرخ چادر قبر پر پڑی ہوئی ملی ــــــ اور ایک مجاور صاحب سے بھی ملاقات ہوئی جنھوں نے اپنا نام "گلاب باقر" بتایا ۔ ان کی عمر تقریباً پچاس ساٹھ سال کی ہوگی ۔ انھوں نے فرمایا کہ یہ قبر میر جیش شاہ کی ہے جو "میر جلیل" کے برادر ہوتے تھے اور حضرت شاہ مینا کے جوار میں نہ دفن ہو سکنے کی وجہ سے یہاں مدفون کئے گئے تھے ۔ گلاب باقر صاحب باورچی ٹولہ کے رہنے والے ہیں ۔ معلوم نہیں کہ ان کا اصلی نام بھی یہی ہے یا حقیقی نام کچھ اور ہے اور زمرۂ فقرا میں شامل ہونے کے بعد یہ لقب اختیار کر لیا ہے ۔ ان سے معلوم ہوا کہ (اس مزار پر) عرس ذی الحجہ میں ہوتا ہے اس "عرس" کا بھی قصہ دلچسپ ہے جو لوگ دیکھنے والے ہیں وہ بلا تامل یہ کہنے کے لئے تیار ہیں کہ عرس اور اجتماع صرف چند سال سے ہونے لگا ہے اور اس کا آغاز (جیسا کہ مجھکو بعض اہل محلہ سے معلوم ہوا) یوں ہوا کہ گلاب باقر صاحب کے بعض ہوا خواہوں نے ایک پنچایت سی کی اور اس میں قبر مذکور کو "میر جیشن شاہ" کا مزار تصور کر کے ان کو اس کا سجادہ و مجاور مقرر کر دیا ۔ اس وقت سے یہ عرس کرتے ہیں اور اس کی آمدنی بھی شاید خود ہی لیتے ہیں ۔ حضرت شاہ صاحب پھلواری مدظلہ (شاہ سلیمان مرحوم) کا خیال بالکل صحیح ہے کہ آج سے قبل اس قسم کی روایات کبھی نہیں سنی گئیں ۔ یہ سب ساختہ و پرداختہ ہیں"[1]

یہ قبر مدفن میر کے روپ میں بہت دنوں تک مرجع خاص و عام بنی رہی ــــــ لیکن آہستہ آہستہ ساری حقیقت سامنے آگئی ۔ "خیابان" کے ایڈیٹر سید شہنشاہ حسین ایڈوکیٹ مرحوم اور سید جالب دہلوی مرحوم نے بہت چھان بین کے بعد اعلان کیا :

"ریل کے چھتہ کے نیچے والی قبر جو حضرت میر سے غلط طور پر منسوب کی جاتی ہے وہ درحقیقت نواب وصی علی خاں کی قبر ہے جیسا کہ ان کے (نواب صاحب مغفور) کے خاص ملازم شیخ حسین بخش صاحب مرحوم کے بیان سے ثابت ہوتا ہے"[2]

---

[1] ہم گور غریباں میں ہیں / ص ۱۳
[2] روزنامہ حقیقت لکھنؤ مورخہ ۱۵ مئی ۱۹۲۹ء (بحوالہ ہم گور غریباں میں ہیں)

روایت سازی کے اس طلسم کی شکست کے بعد ایک دوسری بات کہدی گئی کہ ریلوے لائن کے پیچھے والی بات تو غلط ہے دراصل میر کی قبر "بھیم کے اکھاڑے" میں ہے اور یہ شاہی محلہ "بھیم کے تکیہ" کے نام سے بھی منسوب ہے جس کا سلسلہ نواب ممتاز الدولہ کے محل (موجودہ اقبال منزل) کے سامنے دور تک پھیلا ہوا ہے۔ خاص محل کے سامنے کئی قبریں آج سے پچیس تیس سال پہلے تک موجود تھیں۔ بھیم کے اکھاڑے یا بھیم کے تکیہ کے حدود کی وسعت کے باوجود بھی یہ دریافت کچھ زیادہ عمر نہ پا سکی تھی۔ سید جالب دہلوی مرحوم کا سمند جستجو میاں الماس کے امام باڑہ پر جا ٹھیرا۔ جہاں آخری عمر میں پیرو میر شیخ محمد جان شاد اقامت گزیں ہو گئے تھے۔ شاد مرحوم میر کو عرش کے شاگرد تھے۔ سید جالب مرحوم نے اپنے چند معمر احباب کے حوالے سے (نام ظاہر کئے بغیر) ۵ / مئی ۱۹۲۹ء کے "ہمت" میں لکھا۔

"شیخ محمد جان پیرو میر (شاد) کی نسبت۔ ایڈیٹر ہمت (سید جالب دہلوی) نے متعدد مُسِن احباب سے یہ روایت سُنی ہے کہ آخر عمر میں انھوں نے ...... (صحیح پڑھا نہ جا سکا) کے بالمقابل ایک امام باڑہ غالباً امام باڑہ الماس علی خاں مرحوم میں اس غرض سے اقامت اختیار کر لی تھی کہ یہاں سے ان کو اپنے روحانی استاد حضرت میر کی قبر پر وقتاً فوقتاً جانے میں سہولت پہونچتی تھی۔"

میرے محترم شیخ علی حسن مرحوم ہمیشہ اس روایت کی تردید کرتے رہے۔ شیخ علی حسن مرحوم جو ریاست محمود آباد میں مناصب جلیلہ پر فائز رہ چکے تھے۔ شاد مرحوم کے نسلی و معنوی جانشین تھے۔ مجھے ان کی خدمت میں بارہا حاضری کا موقع ملا ہے۔ "پیرو میر" شاد مرحوم کے خاندان میں ان کے اور ان کے بھائی شیخ ہادی حسن مرحوم کی اولاد کے سوا کوئی بھی نہ تھا۔ شیخ علی حسن کا انتقال غالباً انقلاب ۴۷ء کے بعد ہوا ہے۔

انھیں ناقابل یقین روایتوں میں ایک روایت وہ بھی ہے جسے سید شہنشاہ حسین ایڈوکیٹ مرحوم (ایڈیٹر خیابان لکھنؤ) نے تقریباً ۱۹۲۵ء یا ۱۹۲۶ء میں شہرت دی تھی۔ شہنشاہ حسین مرحوم نے اس سلسلہ میں کئی مضامین ماہنامہ "خیابان" لکھنؤ میں بھی لکھے اور ایک مختصر سا کتابچہ "ہم گور غریباں میں" شائع کیا گیا۔ ان مضامین میں شہنشاہ حسین مرحوم نے اپنے والد سید سجاد حسین اور دادا سید فدا حسین فدا (وفات ۱۹۱۵ء) سے یہ روایت کی تھی کہ میر کی قبر "مصری کی بغیہ" میں کہیں ہے۔ شہنشاہ مرحوم کا بیان ہے۔

عہ روایات کے اس انبار میں صرف یہی ایک بات صحیح ہے کہ میر اکھاڑہ بھیم میں دفن ہوئے تھے جیسا کہ ایک عبارت نوشتۂ محمد حسن سے ظاہر ہوتا ہے جو میر کے دیوان چہارم (کتب خانۂ محمود آباد) میں ملتی ہے۔ ایڈیٹر۔

> "شیخ محمد جان شاد نے میر تقی میر کی قبر حکیم میرن صاحب (حکیم فضل علی مرحوم) کو "مصری کی بغیہ" میں خود بتلائی تھی اور کہا کہ میں ہر پنجشنبہ کو فاتحہ پڑھنے جاتا ہوں۔ یہ شہادتیں عینی سے کسی طرح کم نہیں لہذا میں یہ باور کرنے پر مجبور ہوں کہ یہ مغفور کی قبر سوا "مصری کی بغیہ" کے اور کہیں نہیں تھی ۔۔۔ لیکن کون سی قبر تھی اس کے بتانے سے ہر شخص قاصر ہے۔
>
> کاش جناب میرن صاحب آغا مرحوم یا شاد مغفور کے کہنے کے مطابق زحمت گوارا فرماکر قبر کی زیارت کرا آتے"[10]

حکیم میرن صاحب کا انتقال تقریباً ۱۹۳۶ء میں بمقام لکھنؤ ہوا۔ اور شہنشاہ حسین مرحوم تو ابھی پانچ سات برس پہلے تک بقید حیات تھے۔ کتابچہ "ہم گورِ غریباں میں" غالباً ۱۹۳۰ء کے گردو پیش شائع ہوا تھا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ شہنشاہ حسین مرحوم نے حکیم میرن صاحب مرحوم سے یہ درخواست تو کی کہ وہ حسب نشان دہی شیخ محمد جان شاد زحمت گوارا فرماکر میر کی قبر کی زیارت کرا دیتے لیکن برسہا برس ایک مقام پر رہنے سہنے کے باوجود انھوں نے حکیم میرن صاحب کو اپنے ہمراہ لے جاکر اس قبر کی دریافت ضروری نہ سمجھی جس کے بارے میں وہ برسوں جستجو کرتے رہے۔ بھر شہنشاہ حسین مرحوم ہی کیا اگر میر کی قبر کی صحیح نشاندہی حکیم میرن صاحب مرحوم کر سکتے تو سید جالب دہلوی۔ خواجہ عشرت لکھنوی (وفات تخمیناً ۱۹۳۹ء) شیخ تصدق حسین ایڈوکیٹ۔ شیخ ممتاز حسین جونپوری۔ پروفیسر مسعود حسن ادیب۔ حکیم محسن علی ابر مرحوم (ایڈیٹر ماہنامہ معیار لکھنؤ) اور حکیم سید احمد (وفات اکتوبر ۱۹۶۱ء) وغیرہ کب نچلے بیٹھتے اس کے علاوہ صفی۔ ثاقب۔ عزیز محشر اور نجانے کتنے شعراء و ادیب ایسے تھے جو حکیم میرن صاحب کو چین نہ لینے دیتے۔

حقیقت یہ ہے کہ لکھنؤ بھر میں "مدفن میر" کی نشاندہی کرنے والا کوئی ہے ہی نہیں؛ چالیس پچاس سال سے برابر اس کی کوشش کی جا رہی ہے مگر اس وقت تک کوئی قابل اعتبار ثبوت مہیا نہ ہو سکا اور نہ کسی نے میر کے قبر کی صحیح نشاندہی کی۔ میں خود ایک عرصے تک اسی ادھیڑ بن میں مصروف رہا لیکن نتیجہ کوئی بھی نہ نکلا —— میری سب سے آخری سعی و کاوش کا مرکز عمومی حکیم سید احمد تھے جنھوں نے تخمیناً ایک سو دس سال کی عمر میں اکتوبر ۱۹۶۱ء میں بمقام لکھنؤ انتقال کیا۔ وفات سے چند ہفتے پہلے میں مرحوم سے ملا ہوش و حواس بالکل درست تھے۔ کوئی دو گھنٹے تک باتیں کرتے رہے۔ مدفن میر کے بارے میں بھی میں نے دریافت کیا مگر انھوں نے بھی لاعلمی ظاہر کی حکیم سید احمد۔ راشد الخیری کے خاص دوستوں میں تھے اور لکھنؤ کی "معیار پارٹی" کے خاص رکن تھے۔

---

[10] ہم گورِ غریباں میں / ۱۷

بابِ دوم

میر کا فن

الف : عمومی مطالعہ

ب : مثنویوں کا مطالعہ

ج : میر کا فارسی کلام

د : میر کا لسانیاتی مطالعہ

آل احمد سرور

میر کے مطالعہ کی اہمیت

میر کے متعلق کچھ کہنا آسان بھی ہے اور مشکل بھی۔ آسان اس لئے کہ میر کی عظمت ان کے زمانہ سے آج تک مسلم رہی ہے اور مشکل اس لئے کہ اس عظمت کا تجزیہ یا اس کا سائنٹیفک مطالعہ ابھی تک پورے طور پر نہیں ہو سکا ہے۔ کسی شاعر پر تنقید کے لئے سب سے اہم تو اس کا کلام ہے لیکن اس کے علاوہ شاعر کے حالات زندگی، اس کی شخصیت کے نمایاں پہلو، اس کے ماحول، اس سے پہلے کے شاعری کے اسالیب سب کو ذہن میں رکھنا پڑتا ہے۔ ڈاکٹر جانسن کا یہ خیال اگرچہ غلط نہیں ہے کہ زمانہ کسی شاعر کو یونہی اہم قرار نہیں دیتا مگر اسے آنکھ بند کر کے تسلیم کرنے سے فکر کی راہیں مسدود ہو جاتی ہیں۔ اور تنقید میں ایک تقلیدی رنگ آجاتا ہے جو ادب کی ترقی کے لئے مضر ہے۔ اس لئے میر کی مسلمہ عظمت کو ذہن میں رکھتے ہوئے بھی ہمارا فرض یہ ہے کہ تنقید کے ان جامع اصولوں کی روشنی میں جو دور حاضر کا عطیہ ہیں ہم میر کو پرکھنے کی اور اس طریقہ سے اپنے تنقیدی معیاروں کو پرکھنے کی برابر کوشش کرتے رہیں۔

یہ بھی ایک عجیب اتفاق ہے کہ اگرچہ میر پر بہت کچھ لکھا گیا ہے مگر سوائے خواجہ احمد فاروقی کی کتاب کے ابھی تک کوئی تفصیلی جائزہ موجود نہیں ہے۔ میر پر مضامین کی ایک بڑی تعداد ہے۔ اور ان میں سے بعض ایک سنجیدہ اور قابل قدر مطالعہ کا نتیجہ ہیں۔ پھر بھی یہ محسوس ہوتا ہے کہ میر کے متعلق بہت کچھ بے سمجھے تسلیم کر لیا گیا ہے اور اسی لئے ہماری کوشش یہ ہے کہ میر کی شاعری کا تفصیلی

مطالعہ کیا جائے۔ ان کے فکر و فن کی اہمیت واضح کی جائے اور اُردو شاعری میں ان کے کارنامے کی نوعیت متعین کی جائے۔

میر کے حالات بہت کچھ 'ذکرِ میر' سے معلوم ہو سکتے ہیں جو ان کی خود نوشت سوانح عمری ہے لیکن میر کے سارے بیانات کو بے چوں و چرا تسلیم کر لینا جیساکہ خواجہ احمد فاروقی نے کیا ہے، درست نہیں معلوم ہوتا۔ میر نے اپنے والد کی بزرگی کا جو تذکرہ کیا ہے اس پر اکتفا کر کے میر کے بچپن کی تصویر کھینچنا ہمارے عام نظامِ اخلاق کے مطابق ہو تو ہو۔ لیکن ادبی تحقیق کا تقاضا کچھ اور ہے۔ ہمارا یہ مطلب نہیں ہے کہ میر نے جو کچھ کہا ہے وہ جھوٹ ہے لیکن میر کے سچ کا کچھ ثبوت اس دور کے تذکروں یا تاریخوں سے ملنا چاہیئے۔ آزاد نے بعض قدیم تذکروں کی مدد سے آبِ حیات کے نگارخانہ میں میر کی ایک جیتی جاگتی تصویر ضرور بنائی ہے۔ مگر آزاد کی جانب داری بھی مسلّم ہے۔ میر کے حالات کے سلسلہ میں 'گلِ رعنا'، 'جواہرِ سخن'، 'مقدمہ نکات الشعرا'، 'مقدمہ مثنویاتِ میر'، 'مقدمہ کلیاتِ میر'، 'تذکرۂ خوش معرکۂ زیبا'، 'تذکرہ مجموعۂ نغز'، 'آبِ حیات کا تنقیدی مطالعہ' از مسعود حسن رضوی اور قاضی عبدالودود کے متعدد مضامین اہمیت رکھتے ہیں۔ لیکن چونکہ ہماری تحقیق اب تک محدود دائروں میں گھومتی رہی ہے اور بنیادی اور ضمنی باتوں میں فرق نہیں کرتی۔ اس لئے ان سے ہمیں میر کو سمجھنے میں بہت زیادہ مدد نہیں مل سکتی۔ معمولی واقعات اور نتیجہ خیز واقعات میں فرق ہے۔ میر کے والد کا نام دراصل اتنا اہم نہیں جتنا میر اور خان آرزو کے بگاڑ کے وجوہ کو سمجھنا۔ ذکرِ میر اور نکات الشعرا میں خان آرزو کے متعلق متضاد باتیں کیوں ملتی ہیں؟ میر باوجود اس کے کہ مختلف امراء سے کسی نہ کسی طرح متوسّل رہے ہیں کیوں اپنی درویشی اور بے نیازی پر زور دیتے ہیں؟ اس گتھی کو سلجھانا ضروری ہے۔ میر کا گھریلو ماحول، ان کی اکبر آباد کی زندگی، دہلی میں ان کے عنفوانِ شباب کے تجربات، ان کی دیوانگی، بعض امراء سے ان کے مراسم، لکھنؤ میں بیتی ہوئی زندگی، آصف الدولہ اور ان کے معاملات، معاصرین سے ان کے تعلقات یہ ایسے مسائل ہیں جن پر ابھی تک بہت کچھ تحقیق کی ضرورت ہے۔ میر کا کلام ان کی زندگی میں مشہور ہو گیا تھا، بظاہر ان کے جو دیوان ملتے ہیں ان میں ایک تاریخی ترتیب ہے لیکن ان کے دہلی اور لکھنؤ کے کلام کو علیحدہ کرنا ضروری ہے تاکہ اس کے ارتقا پر رائے زنی ہو سکے۔ میر کے معاصرین کے اقوال ہم آنکھ بند کر کے نقل نہیں کر سکتے۔ ہمیں ان سارے جذبات و تعصبات کو ذہن میں رکھنا چاہیئے

جو ایک ہم عصر اور میر جیسے نازک مزاج ہم عصر کے متعلق قرین قیاس ہیں۔ ہمیں یہ بھی ملحوظ رکھنا چاہیئے کہ اس زمانہ میں تحقیق اور تنقید کا معیار کیا تھا۔ اور ذاتی اور شخصی تعلقات شاعری پر رائے میں کس حد تک اثر انداز ہوتے تھے۔ پھر لکھنؤ اور دہلی کے تہذیبی ماحول میں جو فرق رونما ہو رہا تھا اس کا احساس بھی ضروری ہے۔ میر کے حالات اور شخصیت کے متعلق تحقیق ابھی مکمل نہیں ہوئی۔ میر کی شخصیت کا نفسیاتی مطالعہ بھی ابھی نہیں کیا گیا ہے۔ لیکن اگر ہم موجودہ معلومات کو تقلید کی روش یا اجتہاد کے جذبہ سے بلند ہو کر پرکھیں تو میر کی زندگی اور ان کی شخصیت کے متعلق چند موٹی موٹی باتیں ضرور کہہ سکتے ہیں۔

میر کو بچپن ہی میں مہربان چچا اور شفیق باپ کی موت کی وجہ سے ایک محرومی کا احساس ہوا۔ بھائی نے ان کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا چنانچہ محرومی کے احساس میں ظلم کا احساس بھی شامل ہوگیا۔ دہلی میں انہیں خان آرزو جیسے سنجیدہ اور ثقہ آدمی کی صحبت ملی۔ مگر خان آرزو کی شفقت انھیں نصیب نہ ہوئی۔ قصور خان آرزو کا زیادہ ہے یا میر کا؟ مگر یہ کہا جا سکتا ہے کہ خان آرزو میر کے اطوار سے خوش نہ تھے۔ یہ اطوار اخلاقی اعتبار سے کتنے ہی قابل اعتراض کیوں نہ ہوں۔ ان کی شا[redacted] کو سمجھنے کے لئے بہت اہم ہیں۔ مجھے تو کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ایک عالم اور ایک "رند" کے مزاج میں جو فرق ہو سکتا ہے وہ یہاں بھی موجود تھا۔ اس فرق نے اپنا رنگ دکھایا۔ میر خان آرزو سے رخصت ہوئے ایک گھنے سایہ دار درخت کا سایہ ان کے لئے عذاب ہوگیا۔ انھوں نے کڑی دھوپ کی آزادی پسند کی اور اس سایہ میں جو چوٹیں ان کے دماغ کو لگی تھیں انھیں ساتھ لئے ہوئے اپنی انانیت کے سہارے زندگی کے خارزار میں مردانہ وار نکل کھڑے ہوئے۔ میر دیوانے تو نہیں تھے مگر دیوانگی کا دورہ ان پر پڑ چکا تھا۔ ایک گہرے اور طوفانی عشق نے ان کے دل و دماغ پر شدید اثر کیا تھا۔ باپ اور چچا سے انہیں چند اخلاقی اور متصوفانہ تصورات ملے تھے۔ وہ اعصاب زدہ NEURATIC ضرور تھے۔ زندگی کی تلخ حقیقتوں سے وہ یکسر بے نیاز تو نہیں ہو سکتے تھے لیکن اپنے تخیل کی طلسم کاری سے اس پر پردہ تو ڈال سکتے تھے۔ دہلی کی معاشرت نے انہیں جو کچھ دیا تھا اس کو سینہ سے لگانے جب وہ لکھنؤ پہنچے تو لکھنؤ کی جنت سے ان کی نگاہیں خیرہ تو کیا ہوتیں ہاں ان پر ایک حقارت کی نظر تو ڈال سکتے تھے۔ ضرورت امرا کی طرف جانے پر مجبور کرتی تھی۔ مگر اپنے کو لئے دیئے تو رکھ سکتے تھے۔ دہلی کی تباہی و بربادی میں انسانیت اور تہذیب کی جو بربادی ہوئی اس کا احساس تو رکھ سکتے

تھے۔ صدیوں کے ریاض سے تہذیب کی جو جنت بنی تھی اس کے مٹنے سے اخلاق اور اقتدار کا جو نقصان ہوا اسے تو محسوس کر سکتے تھے جو خزانہ زمانے کے ہاتھوں لٹ گیا تھا اس کی قدر و قیمت کا اندازہ نہ لگا سکتے تھے۔ میر کی شخصیت کو سمجھنے کے لئے ان نکتوں کو بھی ذہن میں رکھنا ضروری ہے۔

رہی میر کی شاعری تو اگرچہ اس کی اہمیت اور قدر و قیمت کے متعلق اختلاف نہیں ہے۔ مگر خصوصیات کے تعین اور ان کے مدارج کے متعلق بے شمار جزوی اختلافات ہیں۔ تذکروں کی تنقید بیشتر تعارف، تحسین یا تنقیص سے آگے نہیں بڑھتی۔ اس غبار میں حقائق کی کرنیں ضرور ہیں۔ مگر اس زمانہ کے تہذیبی اور اخلاقی معیاروں نے تنقید کو تقریظ اور تجزیہ کو تاثرات کی ایک دلدل بنا دیا ہے۔ میر کی سادگی ان کی قنوطیت، پست و بلند، ان کی آہ اور مرزا کی واہ کو اب لوگ بے سمجھے بوجھے دہرا دیتے ہیں۔ میر پر لکھنے والوں میں پہلی معنی خیز تنقید مولوی عبدالحق کی ہے انھوں نے ان کے غم کو ان کے ماحول کے انتشار سے مربوط کیا ہے۔ اس کے بعد وحید الدین سلیم نے میر کے کلام کی اصلیت اور ان کے بیان کے جادو پر زور دیا۔ مگر میر کی سادگی قنوطیت اور جذباتیت کا اتنا ڈھنڈورا پیٹا جا چکا تھا کہ یہ خیالات ادبی تاریخ کا جزو بن گئے۔ اس یک رخی تصویر نے بیسویں صدی کی اس نسل کو جو جذبات سے آگے بڑھ کر فکر کی کارفرمائی دیکھتی تھی اور جو غالب کی ذہنی رو سے خاصی مانوس ہو چلی تھی میر سے بیگانہ رہنا سکھایا۔ پھر سماجی تنقید نے اپنے جوش میں کبھی اس عشق کی مذمت کی جو ایک آزار ہے کبھی جذبات کی مستی کو ایک خطرہ قرار دیا اور کبھی حسن و عشق کے رنگ محل کو حقائق سے فرار بتایا۔ میر کو سر آنکھوں پر بٹھاتے ہوئے اس کی عظمت کو تسلیم کرتے ہوئے اس نسل نے میر کو اپنے دل سے قریب نہ ہونے دیا۔ میر کے دیوان کی جگہ تو الماری کے سب سے اونچے خانہ میں محفوظ تھی مگر اس کا مطالعہ چنداں ضروری نہ رہا تھا۔ صرف اس کا احترام کافی تھا لیکن سماجی تنقید کی ابتدائی طفلانہ کوششیں جب کم ہوئیں اور اس میں توازن آیا تو کلاسکس کو دوبارہ دریافت کیا گیا۔ عبدالحق اور وحیدالدین سلیم کے بعد میر کی عظمت کا احساس دلانے میں مجنوں اور جعفر علی خاں اثر کا بھی ہاتھ ہے۔ اثر نے میر پر متعدد قابل قدر مضامین لکھے اور جو لوگ غالب پرستی کے جوش میں میر کو محض جذبات کا شاعر سمجھتے تھے ان پر یہ حقیقت واضح کی کہ بڑی شاعری میں فکر اور جذبہ اس طرح گھل مل جاتا ہے کہ بعض اوقات یہ محسوس نہیں ہوتا کہ کون سی چیز کہاں شروع ہوتی ہے

اور کہاں ختم ہوتی ہے۔

افسوس ہے کہ جعفر علی خاں اثر نے ان بکھرے ہوئے موتیوں سے کوئی مالا نہیں بنائی۔ پھر بھی مرزا میر کے نام سے انہوں نے میر کا جو انتخاب شائع کیا اس کے مقدمہ میں میر کی حسن کاری کو بڑی خوبی سے واضح کیا ہے۔ مولوی عبدالحق نے میر کی سادگی کو سب سے زیادہ اہمیت دے کر خلط مبحث بھی کیا۔ سادگی یا رنگینی بذاتِ خود کوئی بڑی چیز نہیں۔ سادگی خیال کی ترسیل میں مدد دیتی ہے۔ رنگینی اسے کیفیات کے ایک لطیف غبار میں پیش کرتی ہے۔ سادگی یا رنگینی سے پہلے خیال کی ندرت اور اظہار کی کیفیت ضروری ہے۔ یہ کیفیت جب سادگی لئے ہوتی ہے تو زیادہ عام فہم ہوتی ہے لیکن غالب کے یہاں ان کے بہترین اشعار وہی نہیں ہیں جو سادہ ہیں۔ ادھر کچھ عرصہ سے میر کی جو پرستش شروع ہوئی ہے اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ نئی نسل جس کے پاس حقائق نے صرف کچلے ہوئے خواب چھوڑے ہیں اور جس کے صنم کدے کئی بار ویران ہو چکے ہیں میر کی آواز میں ایک جانی پہچانی کیفیت محسوس کرتی ہے۔ اس نسل کے پاس زخموں کی جو کائنات ہے، وہ میر کی "چشم خون بستہ" سے اور ان کے عشق کے آزار سے اسے کچھ قریب کر دیتی ہے۔ مگر اس مقبولیت میں بھی میر کے ساتھ انصاف نہیں کیا جاتا ہے بلکہ میر کے ایک من مانے بت کی پرستش ہو رہی ہے۔ ہر دور اپنی ذہنی پرواز اور حدود فکر کے مطابق اپنے ماضی کی تشریح اور تفسیر کرتا ہے۔ درحقیقت یہ الگ الگ تصویریں میر کی تمام خصوصیات کی آئینہ دار نہیں ہیں۔ میر کی شاعری بھی ایک بت ہزار شیوہ کی طرح ہے۔ وہ ہمیں جو بصیرت عطا کرتے ہیں اس کی کئی تہیں ہیں۔ سطحی ذہن رکھنے والے میر کے دردناک اشعار سے اس دور کے درد و داغ کا جو اندازہ لگاتے ہیں اس میں اس نکتہ کو نظر انداز کر دیتے ہیں کہ میر کا مقصد صرف ماحول کی عکاسی نہیں ہے۔ گو اس کے کلام میں اس ماحول کی روح جلوہ گر ہے۔ میر اس لئے بڑے شاعر نہیں کہ وہ ماحول کے مصور ہیں۔ وہ اس لئے بڑے شاعر ہیں کہ ان کے اشعار اس بھرپور احساس سے لبریز ہیں جو زندگی کی گہری بصیرت سے حاصل ہوتا ہے۔ جو واقعات اور حالات کی نشاندہی نہیں کرتا بلکہ ان کے پیچھے جو ذہنی دنیا ہے اس کا دروازہ ہمارے لئے کھول دیتا ہے۔ میر کے مطالعہ میں ہمیں اس نکتہ کو ملحوظ رکھنا ہے کہ انہیں کے ذریعہ سے ہم اس دور کے ذہن کی گہرائیوں تک پہنچ سکتے ہیں اور اس محشر جذبات کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ جو

ہماری تہذیبی بساط پر رونما ہوا تھا۔ میرؔ اِس لئے بڑے شاعر ہیں کہ ان کی کرن نہ صرف ماضی کے دھندلکے کو چیر کر ہمیں ایک جیتی جاگتی تصویر دکھادیتی ہے بلکہ ان کی یہ تصویر ہمارے حال اور مستقبل دونوں میں رہبری اور رہنمائی کر سکتی ہے۔ میرؔ کی رفاقت سے ہم اسی لئے کسی دور میں منہ موڑ کر نہیں بیٹھ سکتے۔

میرؔ کی شاعری کی اہمیت کے اسباب ظاہر ہیں۔ ان کے خیالات میں گہرائی، جذبات میں خلوص اور اظہار میں کیفیت ہے۔ یوں تو ان کی نظر انتخابی ہے یعنی زندگی کے مخصوص پہلوؤں کی زیادہ کامیاب مصوری کرتے ہیں مگر اس انتخاب میں بھی قوس قزح کی سی دلآویزی اور رنگا رنگی ہے وہ اپنی ذاتی زندگی اور اپنے ماحول دونوں میں کئی بڑے بڑے طوفانوں سے گزرے ہیں۔ ابتدائی تربیت نے انہیں ایک نظامِ اخلاق، ایک شیوہ زندگی اور ایک آئینِ مجلسی عطا کیا۔ جوانی نے انہیں ہر قسم کے تجربات سے آشنا کیا مگر یہ تجربات ان کے مزاج کو بدل نہ سکے۔ ان کے مخصوص میلان کو اور استوار کر گئے۔ میرؔ کی زندگی میں ان کے عشق اور دورِ جنوں دونوں کی بڑی اہمیت ہے۔ ان کے اثر سے وہ عمر بھر اعصاب زدہ رہے۔ اسی لئے ان کی شاعری کی سمت کو سمجھنے کے لئے ان کی شخصیت کے پیچ و خم کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے۔ میرؔ کے یہاں عشق کا تصور ایک دھندلا سا دیا نہیں ہے بلکہ ایک شعلۂ بے باک ہے جس کی آنچ ان کی ہڈیوں تک کو جلائے دیتی ہے۔ اس مادی عشق کا سلسلہ "اسرار و معارف" سے بھی مل جاتا ہے۔ کیونکہ یہی اس زمانہ کا ذہنی سرمایہ تھے۔ مگر اس میں ہماری گوشت پوست کی دنیا اور اس کے تند و تیز جذبات کی ساری گرمی موجود ہے۔ یہ عشق ایک وضع داری بن کر زندگی کی ایک خاص قدر کی شکل میں نمودار ہوتا ہے اور وہ بصیرت عطا کرتا ہے جس کے فیض سے واعظ اور ناصح کی منافقت دیر و حرم کی حد بندی، دولت کی رعونت، تعیش کی سطحیت واضح ہو جاتی ہے۔ یہی دردمند انسانیت کی وہ آواز بن جاتا ہے جو ہر جبر و قہر کے خلاف ہے اور صداقت، حسن، انصاف اور صحتِ ذہنی کی امین ہے۔ میرؔ کے فن پر توجہ اور ان کی فکر کی طرف سے بے نیازی نے ان کے جوہر کو نمایاں نہ ہونے دیا حالانکہ فن کی بہار فکر کی حنا بندی کے بغیر وجود میں نہیں آتی۔ میرؔ کا فن اس لئے برگزیدہ اور بلند پایہ ہے کہ ان کے آئینۂ فکر میں پُرخلوص تجربات کا جوہر ہے اور یہ تجربات بھی ذاتی ہوتے ہوئے ایک عمومی رنگ رکھتے ہیں۔ میرؔ کا عشق گو جنسی ہیجان کا نتیجہ ہے مگر یہ جنسی ہیجان نہ ہوتا تو میرؔ کی شاعری میں جنسی

جذبہ ایک ترفع حاصل نہ کر پاتا۔ شاعری جنسی ہیجان کا نام نہیں ہے۔ جنسی ہیجان کے ترفع کا نام ہے جب اس ترفع میں اخلاقی اقدار شامل ہو جاتے ہیں تو یہ ایک تہذیبی صفت بن جاتا ہے۔ شخصی اور ذاتی ناکامیاں اور محرومیاں ایک دور کی ناکامیاں اور محرومیاں ہو جاتی ہیں — ذات کائنات کی مظہر ہو جاتی ہے۔ شاعری زندگی کا آئینہ ہی نہیں اس کی شمع بن جاتی ہے اور اس شمع کی روشنی دیر تک، اور دُور تک ہماری رفاقت کر سکتی ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ کچھ تو میر کی شخصیت کے پیچ و خم کو پوری طرح نہ سمجھنے کی وجہ سے کچھ ان کی الم پسندی کو قنوطیت کہہ کر اور کچھ غزل کے رمز و ایما کے آداب کو نہ سمجھنے کی وجہ سے میر کی شاعری کے کئی اہم پہلو واضح نہیں ہونے پائے۔ بشریت، سادگی، قنوطیت، سوز و گداز جیسے الفاظ سے میر کے رنگ کی پوری ترجمانی نہیں ہوتی۔ ان الفاظ کی اہمیت ضرور ہے۔ مگر میر کی عظمت میں ان کا بنیادی حصہ نہیں ہے یہ صرف اس عظمت کو اور واضح کرتے ہیں۔ ادب کے طالب علم کا فرض ہے کہ میر کی نفسیات اس دور کی تاریخ اور اس تہذیبی بساط سے آشنا ہو جائے جس میں میر نے آنکھیں کھولیں اور زندگی کے سرد و گرم سے گزرے۔ اس تہذیبی بساط کی یہ خصوصیت نظر انداز نہیں کرنی چاہیئے کہ یہ اشراف کی پرستار ہونے ہوئے بھی عوام اور عوام کی زبان سے اپنا رشتہ مضبوط رکھتی تھی اور دربار سے تعلق کے باوجود خانقاہ یا بازار سے منہ موڑنے کے لئے تیار نہیں تھی۔ میر کی شاعری اس لئے بھی ہماری بہت بڑی دولت ہے کہ ان کے یہاں ہمارے تینوں تہذیبی ادارے، بازار، خانقاہ اور دربار اس طرح ملے جُلے نظر آتے ہیں کہ اس دور کی تمام سماجی حقیقتیں اس نگارخانے میں جلوہ گر ہو جاتی ہیں۔

میر کے یہاں پست و بلند پر ہمارے نقادوں نے بڑا زور دیا ہے اور اسی وجہ سے ان کے بہتر نشتر مشہور ہیں۔ پست و بلند کی یہ اصطلاح بھی بڑی گمراہ کُن ہے۔ اس سے کون بڑا شاعر بچا ہے۔ شکسپیئر، گوئٹے، کالیداس، امرؤ القیس —— پھر ہمارے یہاں سودا، نظیر، غالب، حالی انیس سب ہی کے یہاں کم و بیش یہ دھوپ چھاؤں مل جائے گی۔ پست و بلند سے کسی نے بہت برے اشعار اور بہت اچھے اشعار مراد لئے ہیں۔ کسی نے پستی کو ابتذال کے مضمون میں استعمال کیا ہے۔ لیکن یہ دونوں چیزیں الگ الگ ہیں۔ پہلی بات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ میر کا کلام ناہموار ہے

دوسری سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اخلاقی اعتبار سے انہوں نے پست خیالات ظاہر کئے ہیں ۔ دراصل پست و بلند کے اخلاقی اور جمالیاتی تصور میں فرق کرنا چاہیئے ۔ اخلاقی اعتبار سے میرکے یہاں جو خیالات قابلِ اعتراض ہیں وہ اس دور کی عام کیفیت کو ظاہر کرتے ہیں اور صرف میر کو اس وجہ سے ہدفِ ملامت بنانا صحیح نہیں ۔ شاہ حاتم سے لے کر نظیر مصحفی ۔ انشا اور جرأت تک یہ نشیب و فراز ملتا ہے ۔ شرفاء کی زندگی عام بدمذاقیوں سے بری نہیں تھی اور پچھلے اخلاقی قوانین کے پیچھے عقیدہ تو تھا مگر استقامت نہیں تھی ۔ سماج میں جب کوئی بڑی اتھل پتھل رو نما ہوتی ہے تو یہ کیفیت اکثر نظر آتی ہے ۔ رہی وہ پستی جو پھیکے پن یا سپاٹ پن کے مترادف ہے تو اسے پستی کے بجائے کسی اور نام سے یاد کرنا چاہیئے ۔ میر نے ساری عمر شعر کہے ۔ یہی ان کا سب سے بڑا مشغلہ تھا ۔ وہ اپنے آپ کو دہراتے بھی ہیں اور کہیں کہیں ان کے اشعار صرف کلامِ موزوں بھی ہو جاتے ہیں ۔ لیکن ان کے یہاں شروع سے آخر تک ایک لہجہ اور آواز ہے ۔ آوازوں کا تصادم یا کشمکش نہیں ہے ۔ یہ بالکل الگ بات ہے کہ جس طرح غالب نے اپنے کلام کا انتخاب کیا تھا اسی طرح میر کے بھی کلام کا انتخاب ہوتا تو اس کی عظمت کا نقش اور گہرا ہوتا ۔

نشتریت، تغزل، سہل ممتنع، یاسیت یا قنوطیت ان میں سے کسی اصطلاح میں میر کے مجموعی رنگ کی ترجمانی نہیں ہوتی ۔ نشتریت یا تغزل یا سہل ممتنع میر کی کچھ خصوصیات کو سمجھنے میں مدد دیتے ہیں ۔ قنوطیت کی اصطلاح یقیناً غلط ہے ۔ اس پر بحث آگے آئے گی ۔ الم پسندی اور الم پرستی میں فرق کرنا چاہیئے ۔ دراصل میر اور غالب جیسے بڑے شاعروں کے رنگ کو ایک اصطلاح میں بیان کرنا بہت مشکل ہے کبھی کبھی دریا کوزے میں نہیں سما پاتا ۔ میرے نزدیک میر کے یہاں ایک دردمند انسانیت کی فریاد اور ایک حساس اور خود دار شخص کا خاموش گریہ ملتا ہے ۔ میر کے رنگ کو ہم اگر چاہیں تو شبنمی رنگ کہہ سکتے ہیں ۔ میر کے یہاں وہ مسائل یا سوالات ڈھونڈنا بیکار ہے جو غالب کے یہاں ملتے ہیں ۔ غالب کے دور پر آنے والے زمانے کی پرچھائیاں پڑ رہی تھیں ۔ میر کا چمن خزاں دیدہ تھا ۔ نئے نظام کی آمد نے غالب کے دور کے سامنے جو مخصوص الجھنیں پیدا کی تھیں، میر کے زمانے میں ان کا احساس نہیں ہوا تھا ۔ زندگی کے متعلق جو سوالات غالب کے ذہن میں آتے تھے اور اس کی وجہ سے ان کے یہاں جو تفکر یا تفلسف ملتا ہے وہ میر کے یہاں تلاش کرنا بیکار ہے ۔

میر کے سامنے تو ایک لٹتی ہوئی جنت ایک الٹتی ہوئی بساط اور ایک جاتے ہوئے کارواں کا ماتم ہے۔ اور اس ماتم کے پیچھے انسانیت کی چند ایسی قدریں ہیں جو نہ صرف اس دور کو بصیرت عطا کر سکتی تھیں بلکہ آج بھی ہمارے ذہن کا اجالا ہو سکتی ہیں۔

ہماری مشرقی تنقید ہمارے تہذیبی تصور کا عطیہ ہے جس میں جاگیردارانہ دور کی تمام خصوصیات جلوہ گر ہیں۔ اس کا تہذیبی تصور شہروں اور ان کی ایک مخصوص ہما ہمی تک محدود تھا اس کے فن کا تصور زبان کے ایک ادھورے شعور کا غماز ہے۔ تنقیدی شعور تو تخلیقی شعور کے ساتھ ساتھ چلتا ہے۔ مگر تنقیدی کارنامے ہر دور میں تخلیقی کارناموں کے پیچھے چلے ہیں۔ چنانچہ ہمارے تذکرے اور تنقیدیں زبان اور فن کے خواص پسند تصور سے عرصہ تک آزاد نہ ہو سکے۔ میر کم اور نظیر زیادہ اس تصور کا شکار ہوئے۔ مگر میر اور نظیر میں جو تعلق ہے اسے بھی نظر انداز نہ کرنا چاہیئے۔ میر کی غزلوں میں ہماری مشترک تہذیب و تمدن کا وہی جلوہ صد رنگ ملتا ہے جو نظیر کی نظموں میں پہنچ کر ایک مخصوص آہنگ اور نئے اختیار کر لیتا ہے اور نظم کے فارم کی سہولتوں کی وجہ سے زیادہ روشن ہو جاتا ہے۔

نظم غزل کے مقابلہ میں راست گفتاری سے زیادہ کام لیتی ہے۔ اگر ہم ٹلیرڈ کی اصطلاحوں کو تسلیم کر لیں تو ہم کو نظم میں بلا واسطہ شاعری اور غزل میں بالواسطہ (OBLIQVE) شاعری ملتی ہے غزل کا ابہام اس کے رمز و ایما اس کی ماورائے سخن باتیں اور نہ کہنے کے انداز میں بہت کچھ کہہ دینا ہر حقیقت پر نقاب ڈال دینا تفاوت کی مشکلات میں اضافہ کر دیتا ہے۔ غزل گو شاعر کے یہاں فلسفہ ڈھونڈنا بیکار ہے۔ اس کے یہاں فلسفیانہ میلان مل سکتے ہیں۔ یہ تنظیم اور تعمیر کے پھیر میں نہیں پڑتا۔ اس کی ہر تصویر اپنی جگہ مکمل ہوتی ہے لیکن تصویر میں ایک نگار خانے کی شان پیدا کرنا اور اشاروں میں داستان کی بلاغت سمو دینا اسے آتا ہے چونکہ غزل بڑے ریاض کا ثمرہ ہے اس لیے اس پر تنقید بھی خاصا ریاض چاہتی ہے۔ یہاں حکم لگانے سے پہلے ذہنی ہمدردی درکار ہے۔ فیصلہ سے پہلے ترجمانی کی ضرورت ہے۔ تنقید میں غزل کی روایات کے حسن و قبح کا سوال اتنا اہم نہیں۔ ان روایات سے واقفیت زیادہ ضروری ہے۔ اسی ناواقفیت نے ہمیں اپنی کلاسیکل شاعری سے پوری طرح مستفید نہ ہونے دیا۔ اگر ہم اس کا کچھ عرفان رکھتے ہوتے تو شاید اس طرح اسے

ماننے سے انکار نہ کیا کرتے ۔ ہماری فکر میں ہم آہنگی اور ہمارے فن میں ہمواری کی جو کمی ہے اس کا یہی راز ہے ۔ شاعری کو ترنم، معنی اور کنایہ کا مجموعہ کہا گیا ہے ۔ اچھی شاعری میں یہ تینوں اجزا اس طرح وصل ہو جاتے ہیں کہ کوئی چیز نہ علیحدہ سے ذہن میں کھٹکتی ہے نہ کانوں کو ناگوار گزرتی ہے نہ کوئی متضاد ذہنی رَو پیدا کرتی ہے ۔ متضاد ذہنی ردگی ایک مثال ذم کا پہلو ہے ۔ شاعرانہ ترنم اور خالص ترنم میں فرق یہ ہے کہ یہاں ترنم کے ساتھ معنی کا رابطہ بھی ہے ۔ اگر معنی میں ترنم نہیں تو وہ ذہن میں ہلچل نہیں پیدا کرتے نہ جذبات کو متاثر کر سکتے ہیں ۔ میرؔ نے قیامت کے ہنگامے شور انگیزی یا جادو کی پڑیا پر جو فخر کیا ہے وہ اسی مترنم معنی آفرینی کی وجہ سے ہے ۔ میرؔ کے دور میں شاعر موسیقی سے یکسر نابلد نہیں ہوتے تھے ۔ وہ فنون لطیفہ کے مشترک جوہر کا ضرور احساس رکھتے تھے ۔ ان کی طویل اور چھوٹی بحریں دونوں بڑی مترنم ہیں ۔ میرؔ کو الفاظ کے ترنم کا بھی پورا پورا احساس ہے یہاں تک کہ وہ اس کی خاطر قواعد تک کی پردا نہیں کرتے ۔ اگر میرؔ کے معنی آفریں ترنم میں جو تحت الشعوری زیر و بم جو تصویروں میں پیٹی ہوئی تصویریں اور جو نگار خانہ آباد ہے وہ ایک تفصیلی اور سائنٹیفک جائزہ لیتا ہے ۔ خوش قسمتی سے ہمیں جدید نفسیات سے جو معلومات حال میں حاصل ہوئی ہیں وہ یہاں بہت مفید ہو سکتی ہیں ۔

علم نفسیات شاعری کی قدر و قیمت متعین کرنے میں ہمیں کوئی مدد نہیں دے سکتا ۔ لیکن شاعر کی شخصیت اس کے تخیل اس کے لاشعور، اس کی محرومیوں اور سرشاریوں، اس کے جذباتی مراکز اور ذہنی الجھنوں کو سمجھنے میں ضرور مدد دے سکتا ہے ۔ اس سلسلہ میں میرؔ کی شخصیت اور شاعری کے مطالعہ سے بہت دلچسپ نتائج برآمد ہو سکتے ہیں ۔

میرؔ کے کسی شعر پر نظر ڈالئے تو یہ بات آئینہ ہو جاتی ہے کہ الفاظ معلوماتی اظہار نہیں بلکہ تاثراتی اظہار ہیں ۔ بشریات کے ماہروں نے الفاظ کو جذباتی علامات کہا ہے ۔ مالینوس کی اس بنیاد پر شعر کو (VOCAL CUSTOM) کہنا ہے ۔ جب الفاظ نظر دل یا کانوں سے گزرتے ہیں تو ان کے معلوماتی پہلو سے زیادہ تیز اور صریح ان کا جذباتی پہلو اور اس کے روابط ہوتے ہیں ۔ یہ جذبات آفرینی ہی شاعر کی قادر الکلامی کو ظاہر کرتی ہے ۔ بڑی شاعری جذبات بھی ادا کرتی ہے اور ان کا تنقیہ بھی کرتی جاتی ہے ۔ اسی لئے میں میرؔ کو (CATHARSIS) کا بادشاہ سمجھتا ہوں ۔ اس اصطلاح کو تنگ نظری

کی وجہ سے المیہ سے مخصوص کر لیا گیا ہے حالانکہ خود ارسطو کی نظر المیہ کے ادبی پہلو پر زیادہ ہے، اس کے فنی پہلو پر کم ہے۔ میر کے یہاں یہ تنقیہ اتنا عام ہے کہ ان کی مایوسی اور ناکامی یاس و حرماں اور رنج و غم بھی ان کو قنوطی نہیں بنا پاتے۔ ان کے ان تین اشعار پر غور کیجئے:

نامرادانہ زیست کرتا تھا　　　میر کا طور یاد ہے ہم کو

مرے سلیقہ سے میری نبھی محبت میں　　　تمام عمر میں ناکامیوں سے کام لیا

کھا گیا نشتر سر تیز جگر دل دونوں　　　رات کی سینہ خراشی میں ہنر ہم نے کیا

ان اشعار میں زیست کرنا محبت میں سلیقہ سے نباہ اور رات کی سینہ خراشی میں ہنر قابل غور ہیں

میر کا سب سے محبوب موضوع عشق ہے ان کی عشقیہ شاعری میں جسم کی مستی بھی ہے اور روح کی آنچ بھی۔ لیکن ان کا کمال یہ ہے کہ وہ نہ تو صرف جسم کے پیچ و خم میں اسیر ہو کر رہ جاتے ہیں اور نہ محض حسن سے ایک روحانی رشتہ کافی سمجھتے ہیں۔ اگر میر کے یہاں صرف شباب کے ہیجان کی داستان ہوتی تو اس کی اتنی اہمیت نہ تھی۔ میر کے یہاں یہ ایک وضع جنوں بن گئی ہے اور اس وضع جنوں میں عاشقی ہی نہیں زندگی کی کچھ بڑی قدریں بھی شامل ہیں۔ کسی نے ٹھیک کہا ہے کہ اعلیٰ درجہ کی عشقیہ شاعری محض عشقیہ نہیں ہوتی کچھ اور بھی ہوتی ہے۔ "دل پُر خون کی اک گلابی" سے جو شخص عمر بھر شرابی رہے اس کی مستی زندگی میں بھی کچھ معنی رکھتی ہے۔

ایلیٹ نے اپنے ایک مضمون میں شاعری کی تین آوازیں بتائی ہیں۔ ایک اپنی آواز، دوسری دوسروں کی آواز اور تیسری کسی کردار، موقع یا واقعہ کی ترجمانی۔ ہمارے یہاں آپ بیتی اور جگ بیتی کے دو رنگ تسلیم کئے گئے ہیں یہ تقسیم سمجھانے کے لئے ہے اور اس کا ریاضیاتی تصور غلط ہوگا۔ میر کے یہاں شاعری کی پہلی آواز ہے مگر اس پہلی آواز میں دوسری آواز کی گونج بھی سنائی دیتی ہے۔ میر کی داخلیت تمام تر داخلی نہیں ہے۔ گردوپیش کی کرنیں میر کے ذہنی آئینے میں آکر کچھ نئے خطوط اور رنگوں کی حامل ہو جاتی ہیں۔ رنگوں کے اس دلاویز کرشمہ کے ساتھ ساتھ گردوپیش کی کرنوں کا احساس بھی ضروری ہے۔

فکر کے معنی چونکہ ہم نے کسی نہ کسی فلسفہ طرازی کے سمجھ لئے ہیں اور کسی شاعر کے کلام میں ذہنی گہرائی ڈھونڈنا ایک محبوب مشغلہ ہو گیا ہے۔ اس لئے بعض اوقات میر کے یہاں جو افکار ایک لطیف

بے ساختگی کے ساتھ آتے ہیں۔ ان کی اہمیت کو ہم نظر انداز کر دیتے ہیں۔ میر یا غالب یا اقبال ان معنوں میں مفکر نہیں ہیں جن معنوں میں افلاطون، کانٹ اور ہیگل وغیرہ ہیں اور نہ ان کی فکر کی گہرائی ہمارے لئے بذاتِ خود اہمیت رکھتی ہے جب تک کہ یہ افکار شاعرانہ اظہار کے سانچے میں نہ ڈھل جائیں۔ میر کے یہاں چونکہ افکار کے ساتھ شاعرانہ اظہار بھی ملتا ہے اس لئے اظہار کا حسن بعض اوقات فکر کی لطیف تابانی کی طرف سے توجہ ہٹا دیتا ہے۔ غالب اور اقبال نے افکار کو اظہار بنانے میں جو پاپڑ بیلے وہ میر کو نہیں بیلنے پڑے۔ اس لئے حسنِ بیان کے لحاظ سے میر اب بھی سب سے اچھے ماڈل ہیں۔ اچھا معمار وہ ہے جو اپنے مسالہ کو ماہرانہ طور پر استعمال کرے۔ مسالہ کی فراوانی لازمی طور پر تعمیر کی خوبی کی ضمانت نہیں ہوتی۔ رنگوں کی کثرت کی بجائے رنگوں کا چابک دستی سے استعمال زیادہ قابلِ قدر ہے۔

جس طرح فکر کو محدود معنوں میں لینے کی وجہ سے ہم میر کے میلان فکری پر پوری توجہ نہیں کر سکے اسی طرح فن کے محدود تصور نے میر کے فن کی عظمت بھی واضح نہ ہونے دی۔ میر کے یہاں ہندی بول چال کی بنیاد پر فارسی تراکیب کا خوشنما محل ہے۔ مگر پوری تعمیر میں اجزا کی موزونیت اور ہم آہنگی کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔

میر نے دراصل انشا کو یہ کہنے کا موقع دیا کہ لفظ خواہ کسی زبان کا ہو جس طرح ہماری زبان میں بولا جاتا ہے اسی طرح صحیح ہے۔ انھوں نے فارسی اور ہندی کی اضافت کو جائز رکھا۔ انہوں نے جامع مسجد کی سیڑھیوں کا محاورہ برتا جہاں تیغ و سناں اور طاؤس و رباب گلے ملتے تھے اور قواعد سے زیادہ چلن کی حکومت تھی۔ ناسخ نے میر کے آداب فن کو نظر انداز کر کے اردو زبان و ادب کو بڑا نقصان پہنچایا۔ دوسرے الفاظ میں انہوں نے دیہات اور قصبات سے شہروں تک پھیلے ہوئے لسانی مواد سے کام لینے کے بجائے شاعری کو ایک مخصوص مصنوعی اور بے مصرف شہرت کا آئینہ دار بنا دیا جس کے پاس نہ چلن کی فضا تھی نہ محنت کا آب و رنگ اور نہ کسی گہرے عقیدے کی گرمی۔ فن کے اچھے تصور میں صرف زبان کی قدرت ہی نہیں اس کا مناسب و موزوں استعمال بھی شامل ہے۔ میر کے فنی شعور کا ثبوت یہ ہے کہ انہوں نے غزل اور مثنوی دونوں کے آداب کا لحاظ رکھا۔ ان کی غزل کہیں قصیدہ نہیں ہو پاتی۔ اور مثنویاں مختلف موضوعات کا بے جوڑ سلسلہ

نہیں معلوم ہوتیں۔ میر کے زمانہ میں اردو زبان وسیع بھی ہو گئی تھی اور مالامال بھی۔ وسعت کا خیال عام تھا۔ حفاظت کا تصور اس وقت پیدا نہیں ہوا تھا۔ وسعت کا یہ تصور صوفیوں، درویشوں اور عوام کا لایا ہوا اور تہذیبی قدروں کے بڑھنے اور پھیلنے کا ثبوت ہے۔ حفاظت دربار اور امراء کے خواص پسند تصور سے وابستہ ہے۔ میر کے سامنے اگرچہ زیادہ تر فارسی ادب کی روایات تھیں۔ مگر ان کا رشتہ اپنی سرزمین اور اپنی عام زندگی سے بھی تھا۔ اس عام زبان میں ادبی عظمت میر کے اثر سے آئی ہے۔ یوں تو ادبی کارنامے میر سے بہت پہلے ملنے لگتے ہیں اور جنوبی ہند میں ولی تو ایک سلسلہ کے خاتم اور دوسرے کے بانی ہیں مگر شمالی ہند میں عام زبان کے ادبی حسن کو سب سے زیادہ میر نے آشکار کیا اور ان کے بعد نظیر نے۔ میر ٹھیٹھ بول چال کے الفاظ جس بے تکلفی اور روانی سے استعمال کرتے ہیں وہ اُن ہی کا حصّہ ہے۔ پھر وہ ہندی اور فارسی کے الفاظ کو اس خوبی سے ملاتے ہیں کہ وہ بے جوڑ نہیں معلوم ہوتے۔ فارسی تراکیب کے استعمال کے باوجود میر کبھی ثقیل نہیں ہوتے۔ ان کے لہجہ کی خوش آہنگی اور شیرینی کبھی ماند نہیں پڑتی۔ ان کے یہاں اضافتوں کے پہاڑ بھی روئی کے گالے معلوم ہوتے ہیں۔ اگر میر کی سادگی کا موازنہ میر سوز سے کیا جائے تو میر کی چابکدستی اور صنّاعی کا پتہ چلتا ہے۔ میر سوز اپنی سادگی میں سپاٹ ہو جاتے ہیں۔ میر کی سادگی میں پُرکاری ہے۔

ہر شاعر کی طرح میر کے یہاں بھی بعض الفاظ اصطلاحات اور ترکیبیں بار بار آتی ہیں۔ 'دوانہ' 'ہو جنوں' 'دل پر خوں' 'آزار' جیسے الفاظ کی تکرار بھی کچھ معنی رکھتی ہے۔ امپسن کا یہ خیال بھی اہمیت رکھتا ہے کہ ہر شاعر کے یہاں کچھ کلیدی الفاظ KEY-WORDS بھی ہوتے ہیں۔ جن سے ہر شاعر کی رُوح کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔ یہ کلیدی الفاظ کچھ تو روایتی بھی ہوتے ہیں یا اپنے دَور کی آئینہ داری کرتے ہیں مگر کچھ اس شاعر کی انفرادیت کے مظہر ہوتے ہیں۔ میر اس لحاظ سے بھی اہم ہیں کہ ان کے کچھ اپنے بھی کلیدی الفاظ ہیں جو بعد کی روایت بن گئے ہیں۔

اوّل و دوسرے درجہ کے شاعروں میں ایک فرق یہ بھی ہے کہ اوّل درجہ کا شاعر کچھ اپنے کلیدی الفاظ رکھتا ہے جن کی وجہ سے اس کی شاعری میں ایک جدّت' تازگی اور طرفگی کا احساس ہوتا ہے۔ دوسرے درجہ کے شاعر روایتی کلیدی الفاظ کو کامیابی سے برت لینا کافی سمجھتے ہیں۔ اوپر کہا گیا ہے کہ میر کے یہاں فارسی تراکیب کے استعمال میں بڑا سلیقہ ملتا ہے۔ وہ صرف فارسی پر

ہی اکتفا نہیں کرتے بلکہ فارسی کے محاوروں اور فقروں کا نہایت آزادی اور بے تکلفی سے اُردو میں ترجمہ بھی کر لیتے ہیں - ان ترجموں میں فارسی مفہوم سے زیادہ وسعت پیدا کر کے وہ ہماری زبان کو مالا مال کر دیتے ہیں - وہ عجمی لَے کی خاطر ہندی لَے کو نہیں چھوڑتے اور نہ بعض شعرا کی طرح فارسی تراکیب سے خواہ مخواہ پرہیز کرتے ہیں - وہ اس گُر سے واقف ہیں کہ دوسری زبانوں سے نہ صرف تلمیحات اور رمز و ایما کے سانچے لئے جا سکتے ہیں بلکہ الفاظ اور فقروں کو بھی سلیقہ سے استعمال کیا جا سکتا ہے اور اس سے زبان کی طاقت میں اضافہ ہوتا ہے۔ میرؔ کی زبان اپنی حزنیہ لے کے باوجود بڑی جان دار زبان ہے -

شاعروں کے لئے وہ بہت اچھے رہنما ہیں - الفاظ پر قدرت رکھتے ہوئے بھی وہ الفاظ کی بازیگری یا شعبدہ بازی کے قائل نہیں - وہ ایک اسٹائل یا اسلوب کے مالک ہیں مگر اسٹائل کے شہید نہیں ہیں - انہوں نے تغزّل کے لب و لہجہ کو اس طرح متعیّن کر دیا ہے کہ اس سے انحراف آسان نہیں ہے - وہ ہر لفظ کے صحیح استعمال اس کی آواز اس کی گونج اور تھرتھراہٹ اس کے ذہنی اثرات اور ضمنی ارتعاشات کو مانتے ہیں - پھر وہ الفاظ کی چمک دمک کو قابو میں رکھنے اور جذبات کی تھرتھراہٹ کو نمایاں کرنے کے راز سے واقف ہیں - ان کے الفاظ میں گرج اور کڑک کہیں نہیں ملتی دلکشی، دل آسائی، اور دلاویزی جا بجا نظر آئے گی - وہ نرم اور کرخت آوازوں کے فرق کو سمجھتے ہیں ان کا جادو اپنا کام کر جاتا ہے مگر اس جادو کے پیچھے جو صناعی ہے وہ جلد نظر نہیں آتی - یہی فن کا اعجاز ہے - اپنے جذبات کی تہذیب کرنے کے بعد ہی انہوں نے جرأت کو ان کی "چوما چاٹی" پر متنبہ کیا تھا - حالانکہ چوما چاٹی کے اشعار ان کے یہاں بھی مل جاتے ہیں -

اُردو شاعری پر میرؔ کے جو احسانات ہیں - ان کا احساس عام ہے - مگر ان کا عرفان کم ملتا ہے میرؔ کے دَور میں جو اخلاقی سماجی اور تہذیبی قدریں مسلّم تھیں - وہ بہر حال ہندوستان کے جاگیردارانہ دَور کا عطیہ تھیں - میرؔ کی شاعری کی خصوصیات کو ہم اٹھارہویں صدی کے ہندوستان کی تاریخ اور اس کے پس منظر کی روشنی میں ہی سمجھ سکتے ہیں - اس میں اس مشترک تہذیب کا جادو اور جمال ہے جو مغلوں کے دَور کا عطیہ ہے - اس میں وہ تصوّف ہے جو ایران اور وسط ایشیا کے تمدّنی اثرات کے بیج ہندوستان میں بو کر ایک پوری فصل تیار کر چکا تھا - اس تصوّف کے پیچھے ایک فلسفہ زندگی تھا جسے سہولت کے

لئے ہم مینیت یا IDEALISM کہہ سکتے ہیں ۔ میر بہر حال اپنے دَور کی پیداوار ہیں لیکن ان کی شاعری کی اپیل آفاقی ہے ۔ وہ اپنے اظہار میں اپنے دَور سے بلند بھی ہو جاتے ہیں اور ذہن انسانی کے ایسے سربستہ رازوں سے بھی پردہ اٹھاتے ہیں جو ہر دَور کے لئے کشش رکھتے ہیں ۔ کارگہ شیشہ گری کا کام صرف میر کے زمانہ میں ہی نازک نہیں تھا ۔ آج بھی نازک ہے اور اگرچہ آج سانس آہستہ لینے کا زمانہ نہیں ہے پھر بھی اس شعر کو پڑھ کر تھوڑی دیر کے لئے ہم سانس روک لیتے ہیں اور ہمیں یہ احساس ہونے لگتا ہے کہ موجودہ دَور کے سارے کمالات کے باوجود جسم و جان کا رشتہ ایک ڈورے سے زیادہ نازک ہے اور زندگی ایک پل صراط کی طرح ہے جو بال سے زیادہ باریک اور تلوار سے زیادہ تیز ہے ۔

میر کے یہاں زندگی کے جبر و قہر اور انسان کی معذوری و مجبوری کا جو تذکرہ ہے اس کی وجہ سے بعض لوگ میر کو قنوطی کہنے لگتے ہیں ۔ میر نے زندگی کے جبر و قہر کا احساس رکھتے ہوئے بھی انسان کی عظمت کا ترانہ گایا ہے ۔ یہ صاحب نظر جو مقدور سے زیادہ مقدور رکھتا ہے جس کے لئے برسوں مہر و مہ کی آنکھیں لگی رہی ہیں ۔ جو خاک کے پردے سے اس وقت نکلتا ہے ۔ جب فلک برسوں گردش کر لیتا ہے جو گرم سخن ہوتا ہے تو اس کے گرد ایک خلق ہے اور جس کی خاموشی میں بھی ایک عالم نکلتا ہے ۔ وہی میر کا ہیرو ہے ۔ میر اس سستی رومانیت سے بلند ہیں جو اپنے خواب و خیال کی مستی کی وجہ سے سنگین حقائق کا احساس نہیں رکھتی ۔ انھیں زندگی کی سنگین اور دلدوز حقیقتوں کا پورا پورا احساس ہے ۔ زندگی ان کے نزدیک ایک گمبھیر اور عظیم شے ہے اور انسان زندگی کے صحرا میں اس قطرۂ شبنم کی طرح ہے جو خار بیاباں پر رُکا ہوا ہے ۔ میر کی شاعری میں قطرۂ شبنم اور خار بیابان دونوں کا احساس ملتا ہے ۔

مشرقی فلسفے میں جو ترک دُنیا اور فنا کی تعلیم ملتی ہے وہ اس قنوطیت سے مختلف ہے جس کا اظہار شوپنہار، ہابس، ہارڈی یا وجودیت EXISTENTIALISM کے بعض علم برداروں میں ملتا ہے ۔ مشرقی فلسفے میں روحانیت اور مغربی فلسفے میں مادیت کی جلوہ گری ہے ۔ روحانیت کے خیال کے مطابق مادے کی کثافتوں کو دور کر کے روح کے جلوے کو جلا دینا عین مقصد زندگی ہے ۔ مگر اس کی وجہ سے کائنات ایک بے مقصد وجود اور زندگی ایک بے سود مظاہرہ نہیں بلکہ یہ وہ پردہ ظلمات ہے جس سے

گزنکر آبِ حیات ملتا ہے۔ مغرب میں قنوطیت فطرت انسانی کو ایک اندھی مشیت کا کھلونا سمجھتی ہے مشرق میں جبریت اور بے ثباتیِ دنیا کی تعلیم دنیا کو مقصود بالذات سمجھنے سے روکتی ہے اور اس کی نیرنگیوں سے نگاہوں کو خیرہ نہیں ہونے دیتی۔ بعض اوقات تصوّف نے قنوطیت کو بھی شہ دی ہے مگر تصوف کے وہ افکار جن سے میر نے بھی غذا لی، اپنے اخلاقی نصب العین کی وجہ سے قنوطیت کے اسرار نہیں بن پاتے۔ اُردو میں قنوطیت کے سچے پرستار صرف فانی ہیں۔ ہاں قنوطی رنگ کے اشعار میر اور غالب کے یہاں بھی مل جائیں گے۔

میر نے شاعری کو جولب و لہجہ دیا ہے اور صلابت کے بجائے لطافت پر توجہ، آواز میں گونج اور گرج کے بجائے نرمی پر اصرار، جذبات کے تند و تیز بہاؤ کے بجائے ضبطِ فغاں اور سازِ زیرلبی پر زور۔ یہ ظاہر ہے انہیں شاعری کی مستقل قدریں نہیں کہا جاسکتا۔ میر کے زمانہ میں سیاسی انتشار، بدامنی اور تاراج نے صراحت کے بجائے کنائے اور وضاحت کے بجائے اشارے میں پناہ لی۔ تہذیبی معیاروں نے آہستہ روی اور نازک خرامی سکھائی۔ شرافت کے آداب نے نرمی اور ملائمت پر اصرار کیا۔ اس طرح فن میں جو لطیف چاندنی اور پُراسرار دھندلکے کی کیفیت آئی اسے فن کی ابدی خصوصیت سمجھنا غلطی ہوگا۔ فکر میں تبدیلی کے ساتھ فن بھی بدلتا ہے مگر بدلتے ہوئے بھی یہ اپنا ایک تسلسل قائم رکھتا ہے اور نیا فن پُرانے فن سے بالکل بے نیاز کبھی نہیں ہوتا تجربے میں دراصل روایت نئے نئے روپ اختیار کرتی ہے۔ اور نئی بجلیوں میں کتنے برسے ہوئے بادلوں کی کہانی دہرائی جاتی ہے۔ اس لئے ادب میں روایات یکسر بیکار نہیں ہوتیں۔ دراصل روایات کا اصل مفہوم ہی یہ ہے کہ چاہے ان کی صحت باطل ہو جائے مگر ان پر اعتماد باقی رہے چاہے ان کا وزن ختم ہو جائے مگر وقار نہ جائے۔ اِس لئے میر نے غزل کو جو لب و لہجہ دیا ہے اور تغزل کو جو آداب سکھلائے ہیں انہیں کسی زمانے میں ترک نہیں کیا جاسکتا۔ اور کسی نہ کسی وقت میر سے آدابِ فن سیکھنے کے لئے ہر ایک کو آنا پڑتا ہے۔ غالب بھی ساری دنیا کی سیر کر کے میر تک پہنچے۔ انیسویں صدی کے آخر کے لکھنؤ میں اگرچہ غالب کے خیال اور میر کی زبان کی ایک میکانیکی تقسیم ہوگئی مگر وہ میر کی طرف متوجہ ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ دوسری جنگ عظیم ہندوستان کی آزادی اور تقسیم کے بعد "دل کی جراحتوں کے جو چمن کھلائے گئے"، ان میں میر کا رنگ فطری طور پر آیا اور جب تک غمِ جاناں اور غمِ دوراں کا

"دشتر سر تیز" "موجود ہے" میر کا ہنر" بھی زندہ ہے۔

اس لئے عاشقی اور زندگی کے تصورات میں انقلابی تبدیلیوں کے باوجود میر کے فکر و فن سے ہم کبھی بے نیاز نہیں ہو سکتے۔ برنارڈ شا نے ایک جگہ کلاسیکی ادب کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے کہ کچھ مدت گذر جانے کے بعد کلاسیکل شعرا اور ادیبوں کی تصانیف کا رنگ محل افکار پارینہ کا ایک کھنڈر رہ جاتا ہے مگر ان کا طرز تعمیر اور تعمیر کی فضا کبھی برباد نہیں ہوتی۔ ہر دور کی فضا اور طرز تعمیر کا یہ احساس نہ ہو تو نئی تعمیر میں کجی اور ناہمواری آجاتی ہے۔ ہر زمانے کے شاعر اور ادیب وہ تہذیبی اقلیت ہوتے ہیں جو اپنے دور کی تمدنی اکثریت کے پیشوا کہے جا سکتے ہیں اور ہر آنے والا تمدن پچھلے تہذیبی کارناموں کی بصیرت کے سہارے آگے بڑھتا ہے۔ اس لئے انیسویں صدی کے تہذیبی معیار بیسویں صدی کے تمدن کے لئے بالکل فرسودہ نہیں ہوئے ہاں بیسویں صدی کی تہذیب کے لئے فرسودہ ہو سکتے ہیں۔ شعر و ادب تصور کو تاثر بناتا ہے۔ اس تاثر میں زندگی کی نوانا قدروں کا جتنا احساس ہوتا ہے اتنا ہی بڑا ادب وجود میں آتا ہے۔ میر کی شاعری میں غزل کی اہمیت سب سے زیادہ ہے۔ غزل میں انداز نظر، حجاب سخن، اشارے کی بلاغت اور کنائے کی تاثراتی جنت سب کچھ ہے غزل نہ شاعری کی آبرو ہے نہ پوری شاعری ہے۔ جس طرح شاعری میں رمز و ایما کی اہمیت ہمیشہ رہے گی۔ رمز و ایما بدلتے بھی رہیں گے اسی طرح رمزیت اور ایمائیت کی جس صنف میں سب سے زیادہ اہمیت ہے وہ صنف بھی باقی رہے گی۔ غزل کے ذریعہ سے ذہنی قیادت کا وہ کام نہیں لیا جا سکتا۔ جو نظم کے ذریعہ سے ممکن ہے۔ ہاں اس کے ذریعہ سے دلوں میں وہ خاموش طوفان برپا ہو سکتے ہیں جو بعض اوقات کسی آتش فشاں سے زیادہ ہلچل پیدا کر سکتے ہیں۔ یہ طوفان شاعری کی تمام اصناف میں ہمارے لئے نمونہ اور مثال نہیں بن سکتے۔ جس طرح میر کی عاشقی زندگی کی آبرو ہوتے ہوئے ساری زندگی نہیں بن سکتی۔ جس طرح زندگی ایک بت ہزار شیوہ ہے اسی طرح شاعری بھی بلبل ہزار داستان ہے۔ بات کہنے کے بہت سے انداز ہوتے ہیں مگر شیوہ کار آگہی ہر انداز میں جلوہ گر ہوتا ہے۔ وحدت اور کثرت کا تصور ادب میں بھی ایک ناقابل تردید حقیقت ہے۔

میر کی شاعری میں ہمیں آفاقی عناصر ملتے ہیں۔ آفاقی عناصر مثبت اور منفی دونوں قدروں کے احساس سے بنتے ہیں۔ ان قدروں پر ہر دور میں ایمان لانے کی ضرورت نہیں۔ ان کی اہمیت کا

احساس کافی ہے۔ میر انسانیت کے لئے ایک نظام اخلاق ضروری سمجھتے ہیں فرد کے جنون کو وہ آزار مانتے ہوئے بھی وہ اس آزار کی عظمت کو ظاہر کر دیتے ہیں۔ میر کے دور میں عشق کے آداب ہی زندگی کو ایک بے معنی چکر سے بلند کرتے تھے۔ یہ عشق فرد کو جذبات کی تہذیب اور سماج کو خیالات کی تہذیب سکھاتا رہا۔ فرد کو نفسانیت تعیش اور زر پرستی سے بچانے کی کوشش کرتا رہا اور سماج کو تنگ نظری منافقت اور ظاہر پرستی سے روکتا رہا۔ میر کے یہاں عاشقی قدر اعلےٰ ہے۔ غالب کے یہاں زندگی کیونکہ غالب نے قدیم نظام کے رخنوں کو دیکھ لیا تھا اور ایک صحت مند تشکیک کے ذریعہ سے قدیم نظام اخلاق سے بلند ہو کر زندگی کی عظمت کو واضح کیا تھا۔ اقبال کے یہاں آ کر صرف زندگی ہی نہیں بلکہ باعمل زندگی قدر اعلےٰ بن جاتی ہے۔ مگر غالب و اقبال کو بھی میر ہی کی مدد سے سمجھا جا سکتا ہے۔

ادب اپنے دور کی پیداوار ضرور ہوتا ہے۔ مگر کوئی ادیب سماج کے دھارے پر تنکے کی طرح نہیں بہتا۔ وہ کبھی نہ کسی طرح اس دھارے کی سمت اور رفتار پر اثر ڈالتا ہے۔ اس کے لئے اپنے ماحول کا فرد ہوتے ہوئے اُسے ماحول کو ذرا دور سے یا بلندی سے یا پیچھے ہٹ کر دیکھنا بھی ہوتا ہے۔ چاہے وہ کوئی نیا ماحول پیدا کرنے کے لئے ہو یا کسی جاتی ہوئی قدر کو باقی رکھنے کے لئے۔ میر سودا درد اور سوز کے مطالعہ سے ان سب کا فرق واضح ہو جاتا ہے۔ سودا اپنے دور کے نالہ و نغمہ دونوں کے آئینہ دار ہیں مگر ان کے کلام کے مطالعہ کے بعد ہمارے دل میں وہ ٹیس نہیں اٹھتی جس کے درد میں کیفیت ہوتی ہے اور جس کی کیفیت زندگی کے لئے ایک مسلسل مستی کا باعث ہوتی ہے۔ درد کا کلام میر سے پہلو مارتا ہے مگر درد کا ذہنی اور تجرباتی سرمایہ محدود اور ان کا لب و لہجہ میر کے مقابلہ میں اس لئے کم پرسوز ہے کہ انہوں نے انسانی فطرت کو اس کے ہر رنگ میں نہیں دیکھا۔ درد ہمارے محترم ہیں مگر محبوب نہیں ہو سکتے۔ سوز کو جذبات کی تہذیب کا گر نہیں آیا۔ درد، سودا اور سوز تینوں اپنے دور سے بہت بلند یا دور نہیں ہو پاتے۔ میر گرد و پیش کی دنیا میں اپنے حزنِ جگر کا ایک باغ لگا کر اس میں محو ہو جاتے ہیں۔ آبِ حیات کے لطیفے سے یہ نتیجہ نکالنا صحیح نہ ہوگا کہ میر کو مطالعہ حیات کی حاجت نہ تھی۔ میر کو فوٹو گرافی کی ضرورت نہ تھی۔ انہیں تجربوں کو تخیلی لباس دینا تھا۔ انھیں تخیلی پیکروں میں قدروں کا احساس پیدا کرنا تھا۔ ان کی نگاہ میں کون و مکان کے جلوے تھے۔ مگر وہ

خود خلوت پسند تھے۔ یہ خلوت پسندی بھی فنکار کے لئے ضروری ہے۔ لیکن اس کے معنی مردم بیزاری کے نہیں لینا چاہیے۔ اس خلوت پسندی کی وجہ سے میرؔ کی زندگی میں بہت سی محرومیاں آئیں۔ مگر ہر دور میں زندگی کی یہ محرومیاں شاعری کی کامرانیاں ثابت ہوئی ہیں۔ خوابوں کے نگارخانوں سے حقائق کی توسیع کا سلسلہ اسی طرح چلتا رہتا ہے۔ میرؔ کا کمال یہ ہے کہ ان کے خواب معنی خیز حقائق کی طرف اشارہ کرتے ہیں اور یہ اشارے اس نرمی اور دل آسائی کے لہجہ میں کئے گئے ہیں کہ ان کی اپیل آج بھی باقی ہے۔ اردو شاعری اور اس کے اسالیب سے جذباتی وابستگی آج کافی نہیں ہے۔ کیونکہ جذباتیت کے پاؤں نہیں ہوتے اور وہ سختی اور سستی کی تاب مشکل سے لاسکتی ہے۔ ہمارے لئے قدروں کے اس رنگ محل کا علم ضروری ہے جو صدیوں کے فکر و فن اور تہذیبی عرق ریزی کا مرہون منت ہے۔ میر اس لحاظ سے اپنے ہم عصروں سے زیادہ ہمیں بصیرت عطا کرسکتے ہیں کہ ان کے یہاں نہ فن پر بہت سے پردے ہیں اور نہ فکر میں زیادہ پیچ و خم۔ اس قدر خلوت پسند اور الگ تھلگ رہنے کے باوجود وہ زندگی اور اس کے عام مظاہر سے ایک ایسا رشتہ رکھتے ہیں کہ ان کے مرد معقول ہونے میں کوئی شبہ نہیں رہتا۔

حرف و حکایت شکر و شکایت ہے اک وضع و طیرہ پر　　میرؔ کو جا کر ہم نے دیکھا ہے مرد معقول کوئی

پھر میرؔ کا فن بھی اپنے اعجاز کے باوجود ترسیل اور ابلاغ کے لحاظ سے عام فہم ہے اور سہل ممتنع کی پرانی اصطلاح کا سب سے اچھا نمونہ۔ میرؔ کے یہاں ابلاغ کا یہ احساس نہایت واضح ہے۔

شعر میرے ہیں سب خواص پسند　　پر مجھے گفتگو عوام سے ہے

نوٹ: یہ مضمون چونکہ میری زیر ترتیب کتاب "میر کا مطالعہ" کی تمہید ہے اس لئے اس میں میرؔ کے فکر و فن کے مختلف پہلوؤں کی طرف مناسب اشارے کئے گئے ہیں مثالیں اپنی اپنی جگہ پر بعد میں آئیں گی +

نثار احمد فاروقی

میر کا آرٹ

میر نے لکھا ہے کہ "شاعری میں جو انداز میں نے اختیار کیا ہے وہ ترصیع، تشبیہ، صفائے گفتگو، فصاحت، بلاغت، ادابندی، خیال وغیرہ تمام صنائع کو محیط ہے لیکن اسے وہی سمجھ سکتا ہے جو فن شاعری پر نگاہ رکھتا ہو"۔ میر کی شاعری کے اجزائے ترکیبی میں سب سے اہم جزو سوزِ دل ہے اس لئے ان کا کلام سمجھنے والے کا بھی سوزِ دل سے بہرہ ور ہونا ضروری ہے۔ اُن کا شعر ہے:

مجکو شاعر نہ کہو میر، کہ صاحب میں نے
درد و غم کتنے کئے جمع تو دیوان کیا

اور ایک فارسی مثنوی کے دو شعر ہیں:-

دل ز جوشِ درد و غم خوں می کنم   مصرعے آں گاہ موزوں می کنم
رفتۂ عشقم، غمِ من وافر است   ہر کہ شاعر داندم نا شاعر است

میر کے کلام کی خصوصیت یہ ہے کہ اُسے ایک مخصوص مترنم و ملائم لہجے سے جتنی بار پڑھا جائے ایک نیا کیف اور نئی لذت ملتی ہے اور ہر لفظ دل میں چٹکی لیتا ہے۔ یہ شعر دیکھئے:

یک نگہ سے بیش کچھ نقصان نہ آیا اُس کے تئیں
اور میں بے چارہ نوا ے مہربان مارا گیا

اس میں "یک نگہ" کا لفظ ہی نگاہ کے اُچٹتے ہوئے ہونے کی غمازی کر رہا ہے۔ شاعر اس "نیمہ نگاہ" کو بھی محبوب کا نقصان بتاتا ہے پھر یہ کہ اس "یک نگہ" سے بیش کچھ "نقصان" اور بھی نہیں ہوا۔ اپنے لئے شاعر نے "بے چارہ" اتنا برمحل استعمال کیا ہے کہ پورے شعر میں جان پڑ گئی ہے۔ جہاں "بے چارہ" کہہ کر اپنی بے بسی اور مسکینی کا اظہار کیا ہے وہیں یہ پہلو بھی نکال لیجئے کہ "زخمی نگاہ" کا چارہ بھی کیا ہے؟ پھر "اے مہرباں" کہہ کر شعر میں اتنا اثر اور گداز سمو دیا ہے کہ اس سے زیادہ ممکن نہ تھا۔ غور کیجئے کہ "یک نگہ" کے بعد دل کا زخمی یا جگر کا گھائل ہونا بیان نہیں کرتا، نہ راتوں کی نیند اُڑ جانے کا ذکر ہے نہ متاعِ صبر و قرار لُٹ جانے کا شکوہ! "مارا گیا" کہہ کر دو لفظوں اور سات حرفوں میں اپنی مکمل بے بسی، بے چارگی، تباہی و بربادی اور بے صبری و بے قراری کا مرقع پیش کر دیا ہے۔ پورا شعر بیانیہ انداز میں پڑھیے۔ نرم و سبک لہجہ پُر درد بھرائی ہوئی آواز اور چہرے پر وہ تمام نقوش و اثرات جو ایک فریادی کے لئے مخصوص ہیں۔ کسی ثالث کو داور تصور کیجئے ذرا اسی توقع پر کہ شاید یہی بربادی کی کچھ تلافی کر دے یا کم از کم تباہی پر دو آنسو بہا لے اور کچھ نہیں تو ہمدردی سے سُن ہی لے۔ یہ بھی دیکھئے کہ اسی شعر میں معشوق کی سنگدلی اور جفا شعاری کا کیسا لطیف پہلو ہے!

فن کے نقطۂ نگاہ سے میر کا ایک یہی شعر اتنا مکمل نہیں۔ اس کے دیوان میں سینکڑوں اشعار ایسے ہی جامع ملیں گے جو میر کے آرٹ اور اس کے منفرد فن و اسلوب کے نمائندہ ہیں۔ اُن کا ایک وصفِ امتیازی یہ بھی ہے کہ ایک لفظ کم کرنا کیسا، اِدھر سے اُدھر کر دیجئے تو شعر مہمل یا کم سے کم بے کیفیت ضرور ہو جائے گا۔

ایک اور شعر ہے:

کیا خوبی اس کے مُنھ کی اے غنچہ نقل کریے
تُو تو، نہ بول ظالم، بُو آتی ہے دہاں سے

اس شعر میں بھی وہی کمال ہے جس کا میں نے پہلے شعر کی توضیح میں بیان کیا یعنی آہنگِ الفاظ سے شاعر کے تخیل کی پوری تائید ہوتی ہے اور اس کا معبودِ ذہنی ہمارے خیال میں اپنی تمام خوبیوں اور رعنائیوں کے ساتھ اس طرح آتا ہے کہ دل جھومنے لگتا ہے۔ پہلے مصرعے کا لہجہ

حقارت آمیز ہے۔ چمن میں غنچے کو دیکھ کر معشوق کا دہن یاد آتا ہے لیکن پھر خیال ہوتا ہے کہ کہاں میرے محبوب کا دہن اور کہاں یہ بے مایہ غنچہ! مگر دیکھتا ہے کہ غنچہ محبوب کے دہن کی نقل اڑانے کی کوشش کر رہا ہے لیکن ایسا ہے گویا بنا نہیں سکتا، منہ بگڑا جا رہا ہے۔ شاعر اسے دیکھ کر تو کہتا ہے: "کیا خوبی اس کے منھ کی اے غنچہ نقل کریئے"۔ تصور کی آنکھوں نے دیکھا اور خیال کے کانوں نے سنا کہ غنچہ کچھ کہنے چلا ہے۔ ظاہر میں وہ آہستہ آہستہ کھل رہا ہے۔ غنچے کے تبسم کو دیکھ کر شاعر سوچتا ہے کہ جب میرا محبوب بات کرتا ہے تو اس کی شان ہی دوسری ہوتی ہے۔ غنچے کا اس کے دہن کی نقل کرنا ہی ایک جسارتِ ناروا تھی۔ چھوٹا منہ بڑی بات! اب وہ محبوب کے تکلم کا بھی خاکہ اڑانے چلا۔ تو کس عجیب ڈھنگ سے للکارتا ہے ؎

تو، تو نہ بول ظالم۔ بُو آتی ہے دہاں سے!

دوسرے مصرعے کا پہلا ٹکڑا بیزاری میں اضافے کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ "ظالم" ایسی جگہ واقع ہوا ہے کہ اس سے ایک پیار بھری نفرت کا اظہار ہو رہا ہے۔ "پیار بھری" یوں کہ نقل بُری ہے یا بھلی، صحیح ہے یا غلط۔ ہے تو دہانِ محبوب کی! ذہن اس بھونڈی نقل کو ہی دیکھ کر معشوق کے پیارے مکھڑے اور اس کے دل نواز تبسم کی طرف منتقل تو ہوتا ہے اور دوسرے ٹکڑے کی جامعیت یہ ہے کہ جیسے ناک سکیڑ کر ماتھے پہ بل ڈال کر منھ پھیر لیا— "بُو آتی ہے دہاں سے!"

اور دیکھیے:

رُخسار اس کے ہائے رے جب دیکھتے ہیں ہم
آتا ہے جی میں آنکھوں کو اِن میں گڑو دیجے

اس شعر میں رخسار کی صباحت یا ملاحت اور شگفتگی کا کہیں ذکر نہیں۔ لیکن شعر کا پہلا مصرع پڑھ کر ہی رخسار کی جتنی خوبیاں ہو سکتی ہیں وہ سب ذہن میں آجاتی ہیں۔ دوسرے مصرعے میں ایک عجیب خواہش کا اظہار ہوتا ہے جو محبت کا درجۂ انتہا ہے۔ سب سے بڑا فن کا رانہ کمال یہ ہے کہ رخسار دیکھ کر بوسے کی خواہش ظاہر نہیں کرتا نہ ان سے آنکھیں ملنے کو کہتا ہے۔ "آنکھیں گڑو دیجے" کہہ کر تمنا کی پاکیزگی، محبت کی فراوانی، رخسار کی دلکشی سب کا بیان یک جا کر دیتا ہے ایک عام شاعر "ہائے رے" کا بھی اتنا برمحل استعمال نہیں کر سکتا۔ میر نے یہاں "ہائے رے"

کہہ کر اس مفہوم کو ادا کر دیا کہ اس پر اپنا بس نہیں چلتا۔
یہ شعر ملاحظہ ہو:

مجلس آفاق میں پروانہ ساں
میر بھی شام اپنی سحر کر گیا

یہ گیارہ الفاظ اتنا بڑا مرقع پیش کرتے ہیں جسے گیارہ سو صفحات پر پھیلایا جا سکتا ہے میر کے آرٹ کا کمال ایسے ہی اشعار سے ظاہر ہوتا ہے وہ الفاظ کے مزاج کو پہچانتا ہے، الفاظ سے لہجہ اور لہجے سے موسیقی پیدا کرتا ہے۔ الفاظ کے مزاج اور آہنگ سے اشعار میں ندرت اور دلکشی پیدا ہوتی ہے۔ یہاں دیکھیے کہ مجلس کے ہم معنی الفاظ محفل، بزم، انجمن، وغیرہ بھی ہیں۔ مصرعے کے وزن سے قطع نظر کر کے "آفاق کی بزم" "آفاق کی محفل" یا "آفاق کی انجمن" پڑھیے خاک مزا نہ آئے گا "آفاق" بھی محل غور ہے۔ یہاں کائنات، عالم یا دنیا کہنے سے بات بن بھی جائے تو اثر کافور ہو جائے گا۔ اب "مجلس آفاق" کی ترکیب پر نظر کیجیے تو ذہن میں کائنات کی تمام وسعتوں کا احاطہ ہو جاتا ہے اور مجلس کا لفظ آفاق کی نیرنگیوں اور اس کے تضاد کا لطیف پہلو بھی پوشیدہ کئے ہوئے ہے۔ دیکھیے اس مجلس میں، آفاق کی مجلس میں، میر کا موقف ہے "پروانہ ساں" یعنی ایک پتنگا۔ مبالغہ ہے مگر مبالغہ معلوم نہیں ہوتا اور یہی شاعرانہ کمال ہے جو مصوری سے زیادہ بلند اور نازک ہے۔ دوسرے مصرعے میں صرف اتنی بات کہی ہے کہ "شام اپنی سحر کر گیا"۔ اس میں اور کسی بات کا ذکر نہیں ہے لیکن ہر لفظ اتنا جامع اور ایسا پہلو دار ہے کہ انسان کی مجبوری، کائنات میں اس کی بے مائگی، اور وجود کی بے آہنگی سب کا تصور مستلزم ہے۔ میں غالب کو اس کے مقام پر بہت بڑا شاعر سمجھتا ہوں، یہاں موازنہ مقصود نہیں، لیکن یہ حقیقت ہے کہ غالب نے جو بات اس شعر میں کہی ہے:

غمِ ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

یہ شعر میر کے مذکورہ بالا شعر کے صرف اتنے ٹکڑے میں سما گیا ہے بلکہ گم ہو گیا ہے کہ "شام اپنی سحر کر گیا"۔ لیجیے میر و غالب کے ان دونوں شعروں کا ذرا موازنہ کر دیکھیے۔ غالب

نے زندگی کو "شمع" سے تشبیہہ دی ہے اور میر نے اپنے وجود کو "پروانے" سے۔ غالب کے شعر میں خیال کے دونوں پہلو نہیں ہیں لیکن میر نے "مجلس آفاق" کہہ کر آفاق کی لاج رکھ لی صرف اپنی بے اہمیتی کا ذکر کیا ہے۔ غالب نے پہلے مصرعے میں (غم ہستی کا اسد کس سے ہو جز مرگ علاج) جو کچھ کہا ہے وہ بات میر نے بغیر الفاظ کا سہارا لئے اپنے خیال کے ساتھ ادا کر دی ہے۔ شعر پڑھتے ہوئے آپ کو انسان کی مجبوری کا تصور لامحالہ کرنا پڑیگا! کہا جا سکتا ہے کہ غالب نے بالتخصیص، پنے متعلق نہیں، پورے غم ہستی کے لئے کہا ہے کہ اس کا علاج سوائے موت کے اور کچھ نہیں اور میر نے صرف اپنے وجود اور اپنی زندگی کے لئے۔ لیکن غور کیجئے تو میر نے دوسرے مصرعے میں "میر بھی" کہہ کر اس اعتراض کی زبان بند کر دی ہے۔ یہ "بھی" دلالت کر رہا ہے کہ جس طرح اور لوگ مجلس آفاق میں پروانے کی سی حیثیت رکھتے تھے۔ اسی طرح میر بھی اپنی شام کو جیسے تیسے سحر کر گیا۔ غالب نے ہستی کو تشبیہ شمع سے دی ہے اور شعر سے یہ بات صاف ظاہر ہے کہ ماتم خانہ ہو یا شادی خانہ، کوئی رنگ ہو، شمع محفل کو سحر تک جلنا ہی پڑتا ہے۔ شمع کے ختم ہو جانے پر محفل کا سرد ہو جانا بھی لازم و ملزوم ہیں۔ لیکن میر نے پروانے کی مثال سے یہ بھی نکتہ ملحوظ رکھا ہے کہ پروانے کے لئے ضروری نہیں وہ مجلس کے ساتھ یا مجلس اُس کے ساتھ ختم ہو۔ "مجلس" کے کسی بھی دَور میں پروانے کی شام زندگی سحر ہو سکتی ہے۔ مجلس کے ہنگامے اور اس کی گرمی بدستور قائم رہے۔ مجلس کی شام سحر نہیں ہوتی بلکہ ایک پروانے کی شام جُوں تُوں سحر ہوئی ہے! پروانے کی زندگی میں سوز ہے، کرب ہے، ماسوا سے بے تعلق ہونے اور اپنے محبوب و مقصود پر فدا ہو جانے کی خصوصیت ہے، جو شاعر اپنی زندگی کا بھی وصف سمجھتا ہے۔ ان کے علاوہ بھی شعر کے ہر ہر لفظ میں ہزار ہزار پہلو ہیں۔ جتنا غور کیجئے نیا انکشاف ہوگا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی سادہ و حسین تصویر میں ہزاروں باریک خطوط ہیں اور ہر خط اپنی جگہ مصوری، خطاطی اور نقاشی کا بہترین نمونہ ہے جس میں دل و نگاہ جذب ہوئے جا رہے ہیں۔ اگر دو کے کسی بھی شعر کو پڑھیئے تنقیص نہیں حقیقت ہے کہ ایسا آرٹ اور اس تپاک دستی سے کہیں مل ہی نہیں سکتا۔

اس شعر کی توضیح میں غالب کے ایک شعر کا موازنہ آگیا، اس بارے میں یہ عرض کر دوں

کہ کچھ ناقدوں نے میر و غالب کا موازنہ کرنے کی کوشش کی ہے مگر وہ بے سود رہی کیونکہ موازنے کے لئے مطابقت شرط ہے۔ غالب صاحب فکر ہیں۔ میر صاحب نظر، غالب ایک مفکر ہیں میر مبصر و مشاہد، غالب دماغ سے زیادہ کام لیتے ہیں میر دل سے۔ میر کا "عشق" جس آگ میں "بے خطر" کود پڑتا ہے وہاں غالب کی "عقل" "محو تماشا ئے لب بام" نظر آتی ہے۔ میر کے الفاظ میں اُن کے معانی گم ہو جاتے ہیں اور غالب کے معانی میں الفاظ۔ میر کے اشعار پڑھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ الفاظ معانی کو وسعت دے رہے ہیں جب کہ غالب کے اشعار میں معانی، الفاظ کی اہمیت کا سبب بن جاتے ہیں اور مختصر کر کے یوں کہیں گے کہ غالب کے اشعار میں فشار الفاظ ہے اور میر کے کلام میں فشار معانی۔ دونوں آرٹ جدا گانہ ہیں اور بڑے ہیں۔ غالب اور میر کے بنیادی تصورات میں بھی بہت فرق ہے۔ میر کو تصوف کی عملی تعلیم ملی جس نے اُن کے دل کی کھڑکیوں کو کھول دیا۔ غالب نے فلسفے اور تصوف کو کتابوں میں تلاش کیا، اُن کے ذہن کو بیداری اور روشنی ملی۔ در اصل غالب کو میر کی تصویر کا دوسرا رُخ سمجھنا چاہیئے۔ یہ بات ضرور ہے کہ جتنی رنگا رنگ، دلکش اور جامع شخصیت غالب کی ہے اُتنی میر کی نہیں۔ غالب زندگی کی تلخ حقیقتوں پر ہنستے ہیں اور میر روتے ہیں!

پھر میر کے اشعار کی طرف آیئے، ؎

دیدنی ہے شکستگی دل کی
کیا عمارت غموں نے ڈھائی ہے

آپ نے سیکڑوں پُرانی اور شکستہ عمارتیں دیکھی ہوں گی جنھیں دیکھ کر ماضی کے نقوش ذہن میں اُبھر آتے ہیں۔ مثلاً دہلی کا پُرانا قلعہ دیکھ کر یہ احساس ہوتا ہے، کسی زمانے میں اس کی دیواریں سنگین تھیں۔ چاروں طرف ہزاروں مسلح سپاہی گشت کرتے تھے، کیا کرّ و فر تھے کیسی آن بان تھی، کتنے ٹھاٹ باٹ تھے، کیا سجاوٹ اور کیسی بناوٹ ہوگی! ظاہر کی نظر تو یہ دیکھتی ہے کہ دیواریں شکستہ ہیں، ایک ایک اینٹ بکھری ہوئی ہے۔ رنگ اُڑ گئے ہیں، پھول بوٹے خراب ہو گئے ہیں لیکن احساس کی آنکھ اس کا عکس ٹٹولتی ہے، کبھی یہاں چمن ہوگا، یہاں پچی کاری سے عجب گل کھل رہے ہوں گے، یہاں رنگین پھولوں کی بہار ہوگی! اسی تصور نے میر کو

"دیدنی" لکھنے پر مجبور کیا۔ اگر وہ یہاں "دیدنی" نہ کہتا اور مصرع یوں موزوں کرتا:

کوئی دیکھے شکستگی دل کی

تو وزن بھی ٹھیک ہے، مطلب بھی پورا ہو جاتا ہے اور کوئی لفظ بھرتی کا بھی نہیں ہے، مگر وجدان کہہ رہا ہے کہ اثر آدھا بھی نہیں رہا!

اشارے کنائے میں کیسی کیسی باتیں چپکے سے کہہ دی جاتی ہیں۔ اس شعر کو پڑھ کر دیکھئے کہ نظامِ زندگی کے عروج و زوال کی پوری تاریخ ایک طرف اور یہ دو مصرعے دوسری طرف!

اب جہاں آفتاب میں ہم ہیں
یاں کبھو سرو و گل کے سائے تھے

اگر میر کا تاریخی ماحول آپ کی نظروں میں ہے تو آپ اس شعر کو بار بار پڑھیں گے اور وجد کریں گے۔

ایک یہ شعرِ شور انگیز ہے ؎

کچھ کرو فکر مجھ دِوانے کی
دھوم ہے پھر بہار آنے کی

حضرتِ اثر لکھنوی نے مرزا میر کے مقدمے میں (ص ۳۱) اس شعر کی اپنے مخصوص و منفرد انداز میں تشریح کی ہے۔ میں ان سے اچھے الفاظ کہاں سے لاؤں، نقل کرنا کافی ہوگا۔ فرماتے ہیں۔

"پہلے مصرعے سے گھبراہٹ ظاہر ہوتی ہے! الفاظ اور ان کی ترتیب ایسی ہے کہ آدمی جلد پڑھنے پر مجبور ہے۔ جس سے پتہ چلتا ہے کہ اس شخص کو اپنے میں وہ تغیرات محسوس ہونا شروع ہو گئے۔ جو ایک مرتبہ پہلے دیوانگی کا پیش خیمہ بن چکے ہیں ...... دوسرے مصرعے میں لفظ "دھوم" ایسی جگہ واقع ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ ڈھول تاشے باجے بج رہے ہیں، بہار کا لشکر جوق در جوق امڈا چلا آ رہا ہے اور اس غریب کا خرمنِ صبر و ہوش تاراج کئے دیتا ہے۔"

زنداں میں بھی شورش نہ گئی اپنے جنوں کی
اب سنگ مداوا ہے اس آشفتہ سری کا

نشست و آہنگِ الفاظ کے اعتبار سے یہ شعر بھی میرؔ کی سحرکاری اور اعجاز کا نمونہ ہے۔
بقول حضرت اثرؔ لکھنوی — "یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک زندانی و زنجیری نے جو اپنی آشفتہ سری کے علاج سے مایوس ہے، پہلا مصرع پڑھا، پھر دانت بھینچ کر آنکھیں بند کر کے زور سے سر میں پتھر مارا اور خون میں لت پت ہو گیا"۔ یہاں "سنگ" ایسی جگہ آیا ہے کہ پڑھتے ہوئے لہجے میں جھٹکا سا لگتا ہے اور پتھر سے سر پھوڑنے کے تصور کو واضح کر دیتا ہے۔ پہلے مصرع میں لفظ "شورش" کی معنویت پر غور کیجئے کہ ایک لفظ نے جنوں کی ساری کیفیتوں کا احاطہ کر لیا ہے جن میں آہ و نالہ، بیخوابی، جیب و دامن کا چاک کرنا، رونا دھونا، چیخنا پیٹنا اضطراب و اضطرار، مدہوشی و بدحواسی سب کا تصور مجتمع ہو گیا ہے۔ دوسرے مصرعے میں یہ کہہ کر "اب سنگ مداوا ہے اس آشفتہ سری کا" اتنا کچھ بیان کر دیا کہ پتھروں سے سر پھوڑنا اور خاک و خون میں لوٹنا باقی رہ گیا تھا اسے بھی آزما دیکھیں شاید یہ شوریدگی میں تخفیف کا باعث ہو۔ لیکن یہ بھی ہے جنون کی ہی اضطراری و انفعالی حرکت! "زندان میں بھی" کہنا ظاہر کر رہا ہے کہ یہ شوریدہ سر صحرا صحرا کی خاک چھان چکا ہے لیکن کچھ فائدہ نہ ہوا۔ اب زندان میں ڈالا گیا۔ یہاں بھی سودا بدستور ہے۔

ایسے جامع، پہلودار، اور ہفت رنگ اشعار میرؔ کے بعد مشکل سے ہی کسی دوسرے شاعر کے ہاں ملیں گے۔ ہوں گے تو میرؔ کے ہی فیضان اثر سے! اور اسی کے خیال کا عکس۔

جم گیا خون کفِ قاتل پہ ترا میرؔ زبس
اُن نے کل رو رو دیا ہاتھ کو دھوتے دھوتے

دوسرے مصرعے کی ساخت ایسی ہے کہ پڑھتے ہوئے دونوں ہاتھوں کو خوب دبا دبا کر رگڑیے۔
فعل کی تکرار "رو رو دیا" اور "دھوتے دھوتے" نے شعر کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا!

لطف پر اُس کے ہم نشیں مت جا
کبھو ہم پر بھی مہربانی تھی

عاشق جواب سراسیمہ و سرگرداں اور بے خانماں پھر رہا ہے۔ اسے در اصل معشوق نے ہی پردۂ التفات میں مٹایا ہے۔ رقیب کو دیکھتا ہے کہ وہ معشوق کے الطاف و عنایات کا مورد ہے تو رشک کی زبان کس بانکے انداز میں کہتی ہے کہ میرا یہ حالِ درہم جو "عیاں را چہ بیاں" ہے

اسی کی مہربانی سے ہوا ہے، تو اس کے لطف کا فریب مت کھائیو۔ اس کی عنایتوں پر مت بھولیو یہاں "ہم نشیں" کہا ہے اور رقیب مراد ہے۔ اگر رقیب ہی کہتا تو نصیحت میں ہمدردی کا فقدان ہو جاتا اور صاف ظاہر ہوتا کہ عاشق کو رشک و حسد کی وجہ سے رقیب پر محبوب کی مہربانی گراں ہے یہاں بہت سے شاعر ٹھوکر کھا سکتے تھے۔

صبح تک شمع سر کو دھنتی رہی
کیا پتنگے نے التماس کیا

میں نے اس شعر کو بلا مبالغہ لاکھوں بار پڑھا ہوگا۔ جب پڑھتا ہوں دل میں گرہ سی لگ جاتی ہے اور آنکھیں نم آلود ہو جاتی ہیں۔ سرسری نظر کہتی ہے کہ شعر میں کوئی خاص بات نہیں شاعر صرف اتنی سی بات کہہ رہا ہے کہ ایک پروانے نے خدا جانے شمع کے حضور چپکے سے کیا عرض کیا کہ صبح تک شمع کو وجد آتا رہا۔ لیکن ان چھوٹے چھوٹے دو مصرعوں میں تاثیر و تاثر کی جو دُنیا آباد ہے اسے الفاظ و عبارت میں تحویل کرنا محال نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ پہلے شعر کی صناعی اور لفظی خوبیوں کو دیکھئے کہ شمع کی لو کے بھڑکنے اور پھڑ پھڑانے کے لئے سر دھننے سے اچھا استعارہ نہیں مل سکتا۔ پروانے کے لئے "پتنگا" ایسا برمحل کہا ہے کہ اس کے ناچیز وجود، اور بے حقیقت و اہمیت زندگی کو محیط ہے۔ پھر "التماس" کے اندر ایک عجیب رمز ہے۔ شمع کے حضور میں ایک پتنگے نے کیا التماس کیا ہوگا؟ ذرا غور تو کیجئے۔ جتنا آپ کی سمجھ میں نہ آئے گا اتنا ہی زیادہ حظ اٹھائیں گے!

مجھے میر کا ایک اور شعر بہت پسند ہے۔ ممکن ہے اسے میری پسند کے مطابق اہمیت نہ دی جائے لیکن شعر بہر حال میر کے آرٹ کا ایسا ہی مکمل نمونہ ہے جیسے چند اشعار اوپر نقل کئے گئے ہیں

وہ کھلے بال سوتے ہے شاید
رات کو جی مرا بکھر جا ہے

دن کے شور و شغب میں محبوب کی یاد اتنا نہیں چھیڑتی، جتنا رات کے سناٹے ہیں۔ رات کو عشق کی بہت سی کیفیات اور بہت سے خوابیدہ احساسات بیدار ہو جاتے ہیں، زخموں

ہیں ٹیس ہوتی ہے۔ دل میں ہُوک اُٹھتی ہے آنکھوں میں کھٹک ہوتی ہے اور فراق کا دھڑکا سونے نہیں دیتا۔ طرح طرح کے وسواس، واہمے، خیالات، پریشان گوئی اور ذہنی اضطراب و کشمکش میں بھی لاشعور یہ سہارا ڈھونڈتا ہے کہ عاشق کی اس حالت کا تعلق یقیناً محبوب کے ایما و اشارات سے ہے۔ رات کو جی کے بکھر جانے کا ایک سبب شاید یہ ہے کہ وہ بال اس کے شانوں پر لہراتے اور ان کی گھنیری حیات بخش چھاؤں میں قرار ملتا۔ تناسب الفاظ کی یہ صنعت بھی کتنی اتفاقیہ ہے کہ رات کو زلف سے اور زلف کو رات سے مشابہ قرار دیا جاتا ہے اور دل کو اسیرِ دامِ زلف کہا جاتا ہے۔ بالوں کا کھلنا اور دل کا بکھرنا اس قید کی رعایت سے بھی ہوا کہ دل زلفوں کا قیدی ہے۔ جب زلفیں لہرائیں، دل بکھرا اور یہاں "جی" سے مراد صرف دل نہ لیجیئے بلکہ "جی بکھرنا" بطور محاورے کے سمجھیئے تب بھی شعر بلاغتِ لفظی اور ندرتِ معنوی کے اعتبار سے نہایت بلند پایہ ہے۔

میرؔ پر جتنا لکھا جائے، جو کچھ لکھا جائے وہ یقیناً کم ہے۔ مَیں تو یہ کہنا مبالغے میں داخل نہیں سمجھتا کہ میرؔ کا ایک ایک شعر پڑھ کر جو جو اثرات مرتب ہوتے ہیں، جو کیفیت قلب و رُوح پر گذرتی ہے جو خلش ہوتی ہے اور جو کیف ملتا ہے صرف اس کے بیان کرنے کو ایک عمر درکار ہے اور شاید پھر بھی ڈھنگ سے بیان نہ ہو سکے۔ اب میں میرؔ کے چند اَیسے اشعار نقل کرونگا جو اس کے آرٹ کی نمائندگی کرتے ہیں اور اُس کے منفرد طرز و اسلوب کا بہترین نمونہ ہیں میرے مذکورہ بالا بیان اور مثالوں کی روشنی میں انہیں پڑھیئے اور سر دُھنیئے ؎

لیتے کروٹ ہل گئے جو کان کے موتی ترے
شرم سے سر در گریباں صبح کے تارے ہوئے

اشک کی لغزشِ مستانہ پہ مت کیجیو نظر
دامنِ دیدۂ گریاں ہے مرا پاک ہنوز

دِل وہ نگر نہیں کہ پھر آباد ہو سکے
پچھتاؤگے ـــ سنو ہو! یہ بستی اُجاڑ کر

دل کی آبادی کی اس حد ہے خرابی کہ نہ پوچھ
جانا جاتا ہے کہ اس راہ سے لشکر نکلا !

تم نے جوان ہو کر یہ چال کیا نکالی
جب جب چلو ہو دل کو ٹھوکر لگا کرے ہے

وصل اُس کا خُدا نصیب کرے
میرؔ جی چاہتا ہے کیا کیا کچھ

پاسِ ناموسِ عشق تھا ورنہ
کتنے آنسو پلک تک آئے تھے

آنکھوں سے حال پُوچھا دل کا
اِک بُوند ٹپک پڑی لہُو کی !

کوئی ہو محرمِ شوخی ترا تو میں پُوچھوں
کہ بزمِ عیش جہاں کیا سمجھ کے برہم کی

ہائے اس زخمیٔ شمشیرِ محبت کا جگر
درد کو اپنے جو ناچار چھپا رکھتا ہو

آوارگانِ عشق کا پُوچھا جو میں نشاں
مُشتِ غبار لے کے صبا نے اُڑا دیا

کیا کہیے داغ دل ہے ٹکڑے جگر ہے سارا
جانے ہے وہ جو ظالم کوئی وفا کرے ہے

قدر رکھتی نہ تھی متاعِ دل !
سارے عالم کو میں دکھا لایا

چاہے ہے آج ہوں میں ہفت آسماں کے اُوپر
دل کے مزاج میں بھی کتنی شتابیاں ہیں

ڈاکٹر سلامت اللہ خاں

کیا میرؔ قنوطی تھے؟

ممکن ہے کہ آپ میرؔ کی شاعری کو پسند نہ کرتے ہوں اور یہ بھی ممکن ہے کہ اساتذہ میں آپ میرؔ کو بہت بڑا شاعر مانتے ہوں۔ آپ کہیں گے کہ یہ تو کوئی بات نہیں ہوئی۔ یہ ہر شاعر کے بارے میں کہا جا سکتا ہے۔ مثلاً انیسؔ کے بارے میں کہا جا سکتا ہے۔ بعض لوگ نیک نیتی سے یہ سمجھتے ہیں کہ انیسؔ میں وہی شاعرانہ عظمت اور عالمگیر اپیل ہے جو شیکسپیئر میں ہے۔ اس قسم کے جانباز نقادوں کے بارے میں تو میں کچھ عرض نہیں کر سکتا۔ لیکن بہ یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اگر آپ کسی کی شاعری کو پسند کرتے ہیں تو یہ ضروری نہیں۔ ہے کہ آپ اسے بہت بڑا شاعر بھی سمجھتے ہوں۔ مثلاً یہ ممکن ہے کہ کسی خاص وجہ سے آپ داغؔ کے کلام سے لطف اندوز ہوتے ہوں لیکن آپ داغؔ کو بہت بڑا شاعر نہیں مانتے۔ شاید آپ نظیرؔ اکبر آبادی کو بھی بہت بڑا شاعر ماننے میں تامل کریں گے۔ حالانکہ آپ نے بچپن سے ان کا کلام پڑھا ہے اور اس سے محظوظ ہوئے ہیں۔ اسی طرح یہ بھی ممکن ہے کہ آپ کو اقبالؔ کی شاعری سے کوئی خاص لگاؤ نہ ہو لیکن آپ ان کی شاعرانہ عظمت کے منکر نہیں ہو سکتے۔ دراصل یہی بات میں کہنا چاہتا تھا کہ ہم میں سے بعض ایسے بھی ہوں گے جو میرؔ کی شاعری کو پسند نہ کرتے ہوں۔ لیکن ان کی شاعرانہ عظمت سے انکار نہیں کر سکتے بالکل اسی طرح جس طرح غالبؔ اور اقبالؔ یا ملٹن اور ٹی ایس ایلیٹ کی عظمت کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ میں نے

ملٹن اور ایلیٹ کا نام جان بوجھ کر لیا ہے۔ کیونکہ ان لوگوں کی شاعری کو پسند کرنے والے کافی لوگ موجود ہیں۔ اگر آپ کبھی غور کریں کہ دُنیا کے کتنے کم شاعروں کو یہ مرتبہ حاصل ہوا تو آپ کو بڑی حیرت ہوگی۔

آجکل کسی شاعر کو بُرا بھلا کہنے کا یہ نیا انداز نکلا ہے کہ فلاں شاعر نوجوانوں کا شاعر ہے یا فلاں بوڑھوں کا۔ مثلاً اسپنڈر اور ایلیٹ کا خیال ہے کہ جس نے شیلے یا سوئن برن کی شاعری کو نوجوانی میں نہیں سراہا وہ بعد میں اس کی داد نہیں دے سکتا۔ یا مثلاً لارڈ بائرن کی شاعری ایک خاص عمر کے بعد بالکل نمائشی اور تھیٹریکل معلوم ہوتی ہے یا مثلاً بہت دنوں تک لوگوں کا خیال تھا کہ ملٹن کی شاعری سے مذہبی لوگ یا ورڈز ورتھ کی شاعری سے سنجیدہ لوگ ہی استفادہ کر سکتے ہیں۔ اسی طرح اکثر یہ کہا جاتا ہے کہ میر کی شاعری کو سمجھنے اور پرکھنے کے لئے پختہ عمر اور مخصوص افتادِ طبع کی ضرورت ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ بات بے بُنیاد مفروضے پر مبنی ہے جس کا ذکر میں آگے چل کر کرونگا۔ یہ دوسری بات ہے اور یہ ہر شاعر کے بارے میں کہی جا سکتی ہے کہ کسی کی شاعری کو ہم اپنے معیارِ فہم و ادراک LEVEL OF SENSIBILITY کے مطابق سمجھتے ہیں۔ یہ بھی درست ہے کہ ہم بعض اشعار زندگی کے مختلف تجربوں سے گزر کر زیادہ اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں یا بعض اشعار کسی خاص کیفیتِ مزاج میں ہم پر زیادہ اثر انداز ہوتے ہیں۔ اس سے یہ نتیجہ نکال لینا غلط ہے کہ میر بوڑھوں کے شاعر ہیں یا ان لوگوں کے جن کے دل قبل از وقت بوڑھے ہو گئے ہوں۔ ہر بڑے شاعر کی پہچان اور خصوصیات کے ایک نمایاں خصوصیت یہ بھی ہوتی ہے کہ اس کے کلام سے ہر طرح کے لوگ اپنی ذہنی استعداد اور معیارِ ادراک کے مطابق فیض حاصل کر سکیں اور یہ خصوصیت میر میں بھی ہے۔

یہ بھی دوسری بات ہے کہ کسی کی شاعری کو مکمل طور پر سمجھنے کا انحصار فہم و ادراک کے علاوہ اس پر بھی ہوتا ہے کہ ہمارا زندگی کی طرف کیا رویہ ATTITUDE ہے۔ مثلاً نراسیسی EXISTENTIALIST شعراء صرف انہیں لوگوں کو متاثر کر سکتے ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ زندگی میں وہ اپنا پیالہ پی چکے اور ان کے لئے دعوت ختم ہو گئی۔ اسی طرح جو لوگ سرمایہ دارانہ نظام کو باعثِ برکت سمجھتے ہیں وہ ایسی شاعری پڑھ کر یا سُن کر بہت بدمزہ ہوتے ہیں جس میں اشتراکی قدروں کا اظہار ہو۔

یہاں بھی اعتقاد اور ادب BELIEF & LITERATURE کی طویل اور پیچیدہ بحث میں پڑنا نہیں چاہتا۔ لیکن اگر آپ نے زندگی کے مسائل کے بارے میں دردمندی کے ساتھ نہیں سوچا ہے یا اگر آپ نے انسانی تعلقات میں خلوص نہیں برتا ہے یا زندگی کے معاملات میں دیانت داری سے کام نہیں لیا ہے تو آپ میرؔ کے کلام کے بہت محدود حصّے سے لطف اندوز ہو سکیں گے۔ شاید آپ کہیں کہ میں گھوم پھر کر اسی بات پر آ گیا کہ میرؔ ایک خاص قسم کے لوگوں کے شاعر ہیں لیکن دراصل ایسا نہیں ہے۔ دنیا کی عظیم شاعری اپنے پڑھنے والوں سے جذباتی، ذہنی اور بعض اوقات اخلاقی اور روحانی مطالبات کرتی ہے۔ یہ مطالبہ میرؔ کی شاعری بھی کرتی ہے۔ لیکن اس میں عمر اور مزاج کی قید نہیں ہے۔ داغؔ یا مومنؔ اپنے پڑھنے والوں سے ایسا مطالبہ نہیں کرتے کیونکہ ان کی شاعری زندگی کے بہت محدود مسائل پر روشنی ڈالتی ہے۔ انہیں زبان و بیان پر قدرت حاصل تھی۔ لیکن انہیں نہ میرؔ کی بصیرت VISION نصیب ہوئی اور نہ میرؔ کی وسعتِ نظر۔

میرؔ کے متعلق چند بے بنیاد باتیں مشہور ہیں اور ان سے لوگوں نے غلط نتائج اخذ کر لئے ہیں مثلاً جب ہم یہ کہتے ہیں کہ میرؔ سنجیدہ اور بوڑھے لوگوں کو اپیل کرتے ہیں تو ہم اس غلط مفروضے سے چلتے ہیں کہ میرؔ قنوطی تھے اور چونکہ مایوسی اور غم کے احساس کی عادت زیادہ تر بوڑھوں کو نصیب ہوتی ہے اس لئے وہی میرؔ کے کلام کو پورے طور پہ سمجھ سکتے ہیں۔ اوّل تو میں اسی سے متفق نہیں ہوں کہ بڑھاپے اور غم کے احساس میں کوئی گہرا تعلق ہے۔ آپ نے اپنے بزرگ بھی دیکھے ہوں گے جو نوجوانوں سے زیادہ شگفتہ اور بونچال نظر آتے ہیں کیونکہ انہوں نے زندگی کی مسافت بہت آسان راستوں سے طے کی ہے۔ ان کو زندگی کے مسائل کی طرف لوٹ کر دیکھنے کی نوبت ہی نہیں آئی اور ان کا شعور کبھی کسی مرحلے پر بیدار ہی نہیں ہوا۔ کیونکہ ان کی زندگی میں ایسا کوئی مرحلہ ہی نہیں آیا لیکن یہاں بحث اس بات کی نہیں ہے۔ زیرِ بحث بات یہ ہے کہ کیا میرؔ کو قنوطی سمجھنا درست ہے؟

اس سلسلہ میں چند باتوں کی وضاحت ضروری ہے۔ اوّل تو یہ کہ قنوطی سے کیا مراد ہے؟ کچھ لوگ غلطی سے ہر اُس شاعر کو قنوطی سمجھتے ہیں جس نے اپنی شاعری میں بار بار اپنی ذاتی زندگی یا عالمگیر غم کا اظہار کیا ہو۔ اظہارِ غم بذاتِ خود کسی کے قنوطی ہونے کی دلیل نہیں ہے۔ جس طرح شگفتہ ہجو نگاری سے کسی شاعر کی رجائیت کے بارے میں حکم نہیں لگایا جا سکتا۔ اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ اعلےٰ

طنز نگاری بڑی تاریک قنوطیت سے پیدا ہوتی ہے اور بہت سی مثالیں ایسے شاعروں کی دی جاسکتی ہیں جن کی رجائیت پر شبہ نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن ان کی بیشتر شاعری غمِ زندگی کی تفسیر ہے۔ سوئفٹ اور شیلے اس سلسلے میں اچھی مثالیں ہیں۔ قنوطیت صرف نقطۂ نظر نہیں ہے۔ وہ فلسفۂ زندگی ہے اور قنوطی ہم اس شاعر کو کہہ سکتے ہیں جو زندگی کی اعلیٰ قدروں سے مایوس ہو چکا ہو، جس میں جدوجہد کا حوصلہ نہ ہو اور جس کی ذہنیت زندگی کے ہر معاملہ میں شکست خوردہ ہو۔ ان معنوں میں میر کو قنوطی کہنا بہت مشکل ہے۔ کیونکہ میر کی شاعری میں جس غم کا اظہار ملتا ہے وہ ذاتی ہے اور محبت کی ناکامیوں اور محرومیوں کے احساس سے پیدا ہوتا ہے یا غمِ روزگار ہے۔ یا ان کی شاعری میں غیر ذاتی IMPERSONAL غم ہے جو عالمگیر مصیبت کے احساس سے پیدا ہوتا ہے اور جس میں ان کے سماجی شعور کی جھلک نظر آتی ہے ذاتی غم کا احساس نہ تو کوئی قابلِ قدر جذبہ ہے اور نہ وہ عظیم شاعری کی تخلیق کر سکتا ہے اور ہر بڑے شاعر میں ذاتی غم اور آفاقی غم کی سرحدیں مل جاتی ہیں۔ میر کی شاعری میں بھی ان کا ذاتی غم خواہ وہ غمِ محبت ہو یا غمِ روزگار صرف ان کی ذات تک محدود نہیں ہے۔ وہ بیشتر بنی نوعِ انسان کا غم ہے۔ اگر میر نے زمانے کا نشیب و فراز نہ دیکھا ہوتا اور اسے محسوس نہ کیا ہوتا تو یہ ممکن تھا کہ وہ اپنے ذاتی غم میں اُلجھ کر رہ جاتے اور ادنےٰ غزل گو شعراء کی طرح تمام عمر اپنی زندگی کی ناکامیوں کا رونا روتے رہتے۔ ان کی زندگی کی حرماں نصیبی نے ہر قدم پر اس کے امکانات بھی پیدا کر دئے تھے۔ زمانے کے ستائے ہوئے اور دُکھیارے میر اگر خود میں گرفتار ہو کر رہ جاتے تو کوئی تعجب کی بات نہیں تھی۔ لیکن ایسا نہیں ہوا اور تمام باتوں کے باوجود ان کی وسعتِ نظر قائم رہی انہوں نے خود سے گذر کر اس غم کو دیکھا اور محسوس کیا جو معاشرے میں چاروں طرف پھیلا ہوا تھا۔

چمن میں نوحہ و زاری ہے کس گل کا یہ ماتم ہے
جو شبنم ہے تو گریاں ہے جو بلبل ہے تو نالاں ہے

ممکن ہے کہ آپ اس شعر سے سرسری طور پر گذر جائیں لیکن جس نوحہ وزاری کا ذکر میر نے یہاں کیا ہے وہ مجھے صدیوں پر پھیلا ہوا معلوم ہوتا ہے اور شبنم و بلبل کے اشارے میں پوری انسانیت جلوہ گر نظر آتی ہے۔ ممکن ہے کہ آپ اسے مبالغہ سمجھیں لیکن جو لوگ اس شعر یا اس قسم کے دوسرے اشعار کا سماجی پس منظر یاد نہیں رکھتے۔ وہ اکثر بہت گمراہ کن مطلب نکال لیتے ہیں اور اس قسم کے اشعار کو میر کی

قنوطیت پر محمول کرتے ہیں۔

بات صرف یہیں تک نہیں ہے کہ میرؔ نے اپنے فن کے پورے کمال کے ساتھ آفاقی غم کی مصوری کی۔ اہم بات یہ ہے کہ میر زندگی سے کبھی مایوس نہیں ہوئے۔

اب رنج و درد و غم کا پہنچا ہے کام جاں تک
پر حوصلے سے شکوہ آیا نہیں زباں تک

کیونکہ انہیں ہر شام کی سحر پر یقین تھا۔

کیا شب ہوئی زمانے میں جو پھر ہوا نہ روز
کیا اے شبِ فراق تجھی کو سحر نہیں

یہ یقین اس آدمی کا نہیں ہے جو زندگی کے آسان راستوں سے آیا ہو۔ آسان راستے میرؔ کے نصیب ہی میں نہ تھے۔ بلکہ اس شخص کا ہے جو زندگی کا درد و کرب جھیل کر آیا ہے۔ میرؔ نے ایک پُر آشوب زمانے کو کروٹیں بدلتے دیکھا تھا۔ ایک مملکت کا انحطاط اور زوال دیکھا تھا۔ اپنے عزیزوں اور دوستوں کی تباہی دیکھی تھی۔ خود اپنی زندگی میں وہ دردناک روحانی بحران سے گذرے تھے طرح طرح کی دلازاریاں اور صعوبتیں جھیلی تھیں۔ لیکن ان کی امیدیں ہمیشہ انسان کے روشن مستقبل سے وابستہ رہیں۔

کس دن چمن میں یارب ہوگی صبا گل افشاں
کتنے شکستہ پر ہم دیوار کے تلے ہیں

آج بھی ہم اس شعر پر وجد کرتے ہیں۔ وہ کون سا دن تھا میر جس کی راہ دیکھ رہے تھے؛ جو خواب میرؔ نے مستقبل کے بارے میں دیکھے تھے وہ پورے نہیں ہوئے۔ وہ دن میرؔ جس کے منتظر تھے ان کی زندگی میں نہیں آیا۔ وہ دن چمن میں شاید اب تک نہیں آیا لیکن میرؔ کی طرح ہم آج بھی منتظر ہیں اور میرؔ کی طرح ہزاروں لاکھوں انسان آج بھی مستقبل کے بارے میں خواب دیکھتے ہیں۔ چمن میں بہاروں کے خواب، چمن میں صبا کی گل افشانی کے خواب۔

اس کے علاوہ کلیاتِ میرؔ میں کافی تعداد ایسے اشعار کی ہے جن سے ان کی زندہ دلی کا پتہ چلتا ہے۔

مدعی مجھ کو کھڑے صاف بُرا کہتے ہیں
چپکے تم سُنتے ہو بیٹھے اسے کیا کہتے ہیں

مَیں تو خوباں کو جانتا ہی ہُوں
پر مجھے یہ بھی خُوب جانے ہیں

تم چھیڑتے ہو بزم میں مجھ کو تو ہنسی سے
پر مجھ پہ جو بن جائے ہے پُوچھو مرے جی سے

بات اپنے ڈھب کی کوئی کرے وہ تو کچھ کہوں
بیٹھا خموش سامنے ہوں ہُوں ہُوں کروں ہُوں مَیں

لعل خموش اپنے دیکھو ہو آرسی میں
پھر پُوچھتے ہو ہنس کر مجھ بے نوا کی خواہش

یہ چھیڑ دیکھ، ہنس کے رُخِ زرد پر مرے
کہتا ہے مِیر رنگ تو اب کچھ نکھر چلا

جاتا ہوں دن کو ملنے تو کہتا ہے دن ہے مِیر
جب شب کو جائیے تو کہے ہے کہ شب ہے اب

ظالم یہ کیا نکالی رفتار رفتہ رفتہ
اس چال پر چلے گی تلوار رفتہ رفتہ

میرا خیال ہے کہ جب داغ نے کلیات میر پڑھا ہوگا تو ان اشعار پر اپنی پسندیدگی کا نشان سُرخ روشنائی سے لگایا ہوگا۔ اسی طرح میر کے بہت سے اشعار میں مزاح کی ہلکی سی چاشنی ہے۔ اُردو غزل میں شاید یہ کوئی بہت نئی بات نہیں ہے لیکن جس فراخ دِلی سے میر خود اپنے آپ پر ہنستے ہیں وہ ضرور نئی اور قابل لحاظ بات ہے:

اگرچہ خُشک ہیں جیسے پرِ کاہ — اُڑیں ہیں میر جی لیکن ہوا میں
عشق کرتے ہیں اُس پری رو سے — میر صاحب بھی کیا دوانے ہیں
پھر میر آج مسجد جامع کے تھے امام — داغِ شراب دھوتے تھے کل جانماز کا
کچھ سُوجھتا نہیں ہے مستی میں میر جی کو — کرتے ہیں پوچ گوئی پی کر شراب کیا کیا
پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں — اس عاشقی میں عزتِ سادات بھی گئی

یہ خصوصیت غالب میں تھی اور شاید خود پر ہنسنے کی صلاحیت ہر اس شخص میں ہوتی ہے جس نے زندگی کی مشکلات کے سامنے سپر نہ ڈالی ہو۔ اور میرا خیال ہے کہ میر نے زندگی سے شکست کا اعتراف کبھی نہیں کیا۔

لیکن یہ خیال عام نہیں ہے۔ اس کے خلاف یہ کہا جاتا ہے کہ میر نے زندگی اور دُنیا کا جو تصور اپنی شاعری میں پیش کیا ہے وہ ہزیمت خوردہ ہے اور اس تصور کی تشکیل ایک زوال پذیر تمدّن کی قدروں سے ہوتی ہے اسی لئے انہوں نے زندگی کے فانی اور ناپائیدار ہونے کا ذکر بار بار کیا ہے۔ اور اس دُنیا کو کارواں سرا مانا ہے جہاں ہمارا قیام وقتی اور عارضی ہے۔ اس سلسلہ میں اوّل تو یہ بات ہی بحث طلب اور متنازعہ ہے کہ میر انحطاطی DECADENT شاعر تھے۔ اور یہ ایک علیحدہ بحث ہے جو میں یہاں اٹھانا نہیں چاہتا۔ دوسری بات یہ ہے کہ اس قسم کے خیالات کی ابتدا میر کے تصوف سے ہوتی ہے اور جن لوگوں نے مسئلہ تصوف کو اچھی طرح اور مکمل طور پر نہیں سمجھا ہے وہ اکثر میر کی متصوفانہ شاعری سے غلط مطالب نکال لیتے ہیں۔ تصوف کے دو پہلو ہمیں اردو شاعری میں ملتے ہیں۔ ایک تو فلسفۂ وجودیت جس میں یہ مانا گیا ہے کہ خدا کی ذات عین عالم ہے اور جہاں رنگ و بو کے ذرّے ذرّے سے آشکار ہے۔ دُنیا کی ہر جاندار شے اسی الوہیت کی مظہر ہے جو

اس عالم میں جاری و ساری ہے اور ہر دیدۂ بینا ہستی کی کثرت میں وحدت کا جلوہ دیکھتی ہے۔ تصوّف کا دوسرا پہلو فلسفۂ اشراقیت یا نو فلاطونیت ہے جس میں یہ مانا جاتا ہے کہ یہ کارخانۂ عالم اِس الوہیت کا سایہ ہے جو اس دنیا کی تمام چیزوں کا سرچشمہ ہے اور صرف جس میں تمام چیزوں کا وجود ہے۔ میر کی شاعری میں تصوّف کے دونوں پہلوؤں کا اظہار ملتا ہے۔ ان کے اس شعر سے

یہ دو ہی صورتیں ہیں یا منعکس ہے عالم — یا عالم آئینہ ہے اس یارِ خود نما کا

صاف ظاہر ہوتا ہے کہ میر نے فلسفہ وجودیت اور فلسفہ اشراقیت میں کسی ایک کو ترجیح نہیں دی بلکہ انھیں ایک ہی حقیقت کے دو امکانات تصور کیا۔

میر کے فلسفۂ وجودیت سے کسی غلط نتیجہ پر پہونچ جانا ممکن نہیں ہے۔ یعنی اگر جان بوجھ کر ہم کوئی غلط بات نہ کہنا چاہیں۔ جب ہم ایسے اشعار پڑھتے ہیں۔

آگے عالم عین تھا اس کا اب عین عالم ہے وہ — اس وحدت سے یہ کثرت ہے یاں میرؔ سب گیان گیا

کچھ گل سے ہیں شگفتہ کچھ سرو سے ہیں قد کش — اس کے خیال میں ہم دیکھے ہیں خواب کیا کیا

تو ہم کسی ایسے نتیجہ پر نہیں پہنچتے جو ان اشعار سے حاصل نہیں ہوتا۔ لیکن میر کا فلسفہ اشراقیت پیچ در پیچ ہے اور اسے سمجھنے میں غلطی کے امکانات ہیں اس لئے کہ جب ہم اس دنیا کو الوہیت کا سایہ مان لیں تو موجودات عالم کی حیثیت مادی خاکہ کی رہ جاتی ہے جو محدود ہے اور جس کا وجود غیر دائمی ہے کیونکہ لامحدود اور ابدی تو صرف وہ اکائی یا وحدت ہے جس کا سایہ یہ عالم ہے۔ اس لئے موجودات عالم عارضی اور فنا ہو جانے والے ہیں۔

اس موج خیز دہر میں تو ہے حباب سا
آنکھیں کھلیں تری تو یہ عالم ہے خواب سا

ان معنوں میں انسان بھی فانی اور مجبور ہے۔

پاتے ہیں اپنے حال میں مجبور سب کو ہم
کہنے کو اختیار ہے پر اختیار کیا

یہاں اور دوسری جگہوں پر جہاں میر نے انسان کی مجبوری کا ذکر کیا ہے وہ فلسفیانہ اور متصوفانہ ہے اور جس بات کا شکوہ ہے وہ انسان کے محدود اور فانی ہونے کا ہے۔ اس مجبوری کو عام معنوں میں سمجھ

لینا میرؔ کے ساتھ بڑی ناانصافی ہے۔

دوسرے یہ کہ فلسفہ اشراقیت میں انسان کا رتبہ بہت بلند مانا گیا ہے۔ کیونکہ موجودات عالم میں انسان ہی صرف ایسا ہے جو الوہیت کا ادراک کر سکے۔ میرؔ کو بھی انسان کی عظمت کا احساس تھا جس کا اظہار ان کی شاعری میں برابر ملتا ہے۔

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں ‌ ‌ ‌ تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

آدم خاکی سے عالم کو جلا ہے ورنہ ‌ ‌ ‌ آئینہ تھا تو مگر قابلِ دیدار نہ تھا

ہیں مشت خاک لیکن جو کچھ ہیں میرؔ ہم ہیں ‌ ‌ ‌ مقدور سے زیادہ مقدور ہے ہمارا

انسان کا مرتبہ اس لئے بھی بلند ہے کہ اس میں اور الوہیت میں بعض خصوصیات مشترک ہیں۔ مثلاً انسان کا تخیّل جس سے وہ ماورائے عالم کا ادراک کر سکے یا حسن سے متاثر ہونے کی صلاحیت یا جذبۂ عشق جس کی مدد سے وہ خود کی تکمیل کر سکے۔ یہ وہ تمام خصوصیات ہیں جو انسان کو دیگر موجودات عالم سے متمیّز کرتی ہیں۔ اور جو اس کی عظمت کی دلیل ہیں۔ میرؔ نے صرف انسان کی عظمت کا ذکر ہی بار بار نہیں کیا ہے۔ ان کی شاعری میں حسن اور عشق کے بھی کئی پہلو ہیں۔ حسن عام معنوں کے علاوہ اس لافانی حسن کا مادی ظہور ہے جسے ہم خدا کہتے ہیں اسی طرح ان کی شاعری میں عشق عام معنوں میں عاشق اور معشوق ہے۔ وہ عشق اس یار طرحدار کا بھی ہے جو:

گہہ گل ہے، گاہ رنگ، گہے باغ کی ہے بُو\
آتا نہیں نظر وہ طرحدار اک طرح

اور سب سے زیادہ اہم معنوں میں عشق خود وہ وحدت یا قوت ہے جس کی کارفرمائی ذرہ ذرہ سے آشکارا ہے۔

ظاہر و باطن، اول و آخر، پائیں بالا عشق ہے سب\
نور و ظلمت، معنی و صورت سب کچھ آپ ہوا ہے عشق

موج زنی ہے میر فلک تک ہر لحظہ ہے طوفاں زا\
سرتاسر ہے تلاطم جس کا وہ اعظم دریا ہے عشق

یا

عشق ہی عشق ہیں جہاں دیکھو
سارے عالم میں بھر رہا ہے عشق

ظاہر ہے کہ جس نے انسان اور عشق کا یہ بلند تصور اپنی شاعری میں پیش کیا ہو، اُس میر کے بارے میں جب یہ کہا جائے کہ وہ زندگی یا انسان کے امکانات سے مایوس ہیں تو یہ ایک ایسی بات ہے جو کم از کم میری سمجھ میں نہیں آتی۔ وقتی غم یا کسی منفرد باطنی تجربہ سے میر کے فلسفۂ زندگی کا تعین نہیں کیا جا سکتا۔ اس کا تعین اس سمت سے ہوتا ہے جس کی طرف میر کی شاعری اشارہ کرتی ہے اور جس سمت میر کی شاعری اشارہ کرتی ہے وہ روشن اور تابناک ہے ۔

حامد اللہ افسر

میر کی شاعری

گیا جہان سے خورشید ساں اگرچہ میر
ولیک مجلسِ دُنیا میں اُس کی جا ہے گرم

میر کے زمانے میں ہندوستان کی سیاسی حالت

میر ہندوستان کی اسلامی حکومت کے زوال کی ایک مُہتَم بالشّان یادگار ہے۔ اس کا کلام اٹھارویں صدی عیسوی کے نصف آخر کی دماغی اور ذہنی حالت کا صحیح نقشہ ہے۔ حقیقی شاعر کا ظہور نتیجہ ہوتا ہے اپنے ماحول اور اپنے گرد و پیش کے حالات کا۔ اس کے جذبات پرتو ہوتے ہیں، عالمگیر جذبات اور احساسات کے۔ اس کی ذہنیت مجموعہ ہوتی ہے اس کے زمانے کے عام اثرات کی۔ میر نے ہوش سنبھالا اور قوتِ احساس بیدار ہوئی تو دیکھا کہ نادر شاہ اور اس کے خونخوار سپاہیوں نے دِلّی میں کُشتوں کے پُشتے لگا رکھے ہیں۔ ہر طرف واویلا مچی ہوئی ہے۔ کُشت و خُون کا بازار گرم ہے۔ سارا شہر تباہ و برباد ہے۔ میر ابھی بچّے تھے۔ غریب اُلوطن تھے۔ یتیم تھے۔ پندرہ برس کی جان۔ گھر نہ در۔ نہ کوئی ہمدرد و غم خوار۔ "تلاشِ معاش میں دِلّی آئے تھے۔ یہ قیامت دیکھی۔" دروازہا شکستند مردماں را بستند، اکثرے را سوختند سر بُریدند۔ از خوردنی و پوشیدنی ہیچ نہ گزاشتند، سقفہا شگافتند، دیوارہا شکستند۔"

اس تمام کیفیت سے دل پر جو کچھ گذری ہوگی اس کا اندازہ مشکل ہے ؎

کیا زمزمہ کروں ہوں خوشی تجھ سے ہم صفیر   آیا جو میں چمن میں تو جاتی رہی بہار

پھر جس زندگی کی ابتدا مصائب و آلام کے ایسے شدید حملوں میں ہوئی۔ جس نے اپنے دوران حیات میں مرہٹوں کی دست درازیاں، روہیلوں کے مظالم، احمد شاہ درانی کے حملے، پنڈاریوں کی لوٹ مار، ہزاروں گھروں کا اُجڑنا، دوست احباب کا بچھڑنا، عزیز و اقارب کا قتل و خون اپنی آنکھوں سے دیکھا ہو۔ کون ہے جو اس کے درد و الم کی گہرائی کا اندازہ کرسکے۔ اور کون ہے جو اس کے لب سے نکلی ہوئی آہ پر دل تھام کر نہ بیٹھ جائے۔ سچ کہا ہے ؎

مجھ کو شاعر نہ کہو میر کہ صاحب میں نے   درد و غم کتنے کیے جمع تو دیوان کیا

میر کے ذاتی حالات

یہ تو ماحول تھا جس میں میر نے پرورش پائی اور زندگی بسر کی۔ اب ایک نظر ان کے ذاتی حالات پر بھی ڈال لیجئے۔ درویش باپ کے چہیتے بیٹے تھے جس کی زندگی کا مقصد "عشق" تھا اور جس کا مسلک تھا "عشق بساز و عشق بسوز"۔ سید امان اللہ[1] باپ کے عزیز ترین مرید تھے جن سے میر صاحب کو بہت انسیت تھی اور جنھوں نے انہیں گودوں کھلایا تھا۔ یہ دونوں مقدس اور عزیز ہستیاں یکے بعد دیگرے دس برس کی جان میر کو دنیا میں تنہا چھوڑ کر ہمیشہ کے لئے رخصت ہو جاتی ہیں۔ بڑا بھائی موجود ہے مگر وہ بات نہیں پوچھتا۔ بے خانماں۔ بے یار و مددگار میر اس عمر میں تلاشِ معاش کو نکلتے ہیں۔ جس میں ماں باپ بچوں کو ڈیوڑھی سے باہر قدم رکھنے کی اجازت نہیں دیتے۔ پریشان حال دلی پہنچتے ہیں۔ اپنے بڑے بھائی کے خالو سراج الدین علی خاں کے منّت پذیر ہوتے ہیں۔ اُن کے پاس ظالم بھائی کا خط آتا ہے کہ میر تقی فتنۂ روزگار ہے۔ اس کی مدد نہ کرنا وہ بدسلوکیاں کرتے ہیں۔ یہ صبر اور ضبط سے کام لیتے ہیں پھر مختلف رؤسا کی ملازمت اختیار کرتے ہیں۔ ان کے ساتھ جگہ جگہ پھرتے ہیں۔ کبھی لڑائی کے میدان میں قتل و خون کا بازار گرم دیکھتے ہیں کبھی غنیم کے تعاقب میں اپنے آقا سردار کے ساتھ جاتے ہیں۔ کبھی شکست خوردہ فوج کے ساتھ بھاگتے ہیں۔ آخر جب مصائب کی انتہا نہیں رہتی اور تہی دستی حد سے گزر جاتی ہے تو متعلقین کو ہمراہ

---

[1] یہ بیانہ کے ایک نوجوان سید تھے جو میر علی متقی کے مرید تھے اور جنہیں وہ برادرِ عزیز کہتے تھے۔

دے کر دلی کو خیر باد کہتے ہیں ؎

جاتا ہے آسماں لٹے کوچے سے یار کے　　آتا ہے جی بھرا در و دیوار دیکھ کر

مگر کسی خاص مقام کا ارادہ نہیں کرتے۔ توکل علی اللہ چل دیتے ہیں۔ طرح طرح کی مصیبتیں برداشت کرتے ہیں۔ فاقوں تک نوبت پہنچ جاتی ہے۔ کسی کے یہاں سے فاتحہ کی مٹھائی آتی ہے۔ اس پر دو روز بسر ہو جاتے ہیں۔ غرض جوں توں کرکے پیٹ پالنے کی صورت پیدا ہوتی ہے۔ پھر درانی کے حملے کے بعد دلی آتے ہیں تو جوں جوں آگے بڑھتے ہیں حیران رہ جاتے ہیں۔ مکان پہچانے نہیں پڑتے، مکینوں کا پتا نہیں۔ "گھر بیٹھے ہوئے، دیواریں شکستہ، محلے خراب، کوچے نایاب، وحشت ہویدا۔ انس ناپیدا۔"

جس جا کہ خس و خار کے اب ڈھیر لگے ہیں　　واں ہم نے انھیں آنکھوں سے دیکھی ہیں بہاریں

اُس محلّے میں پہنچتے ہیں جہاں خود رہا کرتے تھے۔ ہر وقت شعر و شاعری اور حسن و عشق کے چرچے رہتے تھے وہاں اب کوئی نظر نہیں آتا:

یا قافلہ در قافلہ ان رستوں میں تھے لوگ　　یا ایسے گئے یاں سے کہ پھر کھوج نہ پایا

کچھ دیر حیرت سے کھڑے تکتے رہتے ہیں اور یہ عہد کرتے ہیں کہ اب مرتے دم تک دلی نہ آؤں گا۔ غرض جب کوئی سہارا باقی نہیں رہتا تو ۶۰ برس کی عمر میں لکھنؤ روانہ ہوتے ہیں اور پھر دلی دیکھنا نصیب نہیں ہوتی:

جیسے کوئی جہاں سے جائے رخصت اس حسرت سے ہوئے　　اس کوچے سے نکل کر ہم نے رو بقفا ہر گام کیا

کلام کی خصوصیات

ظاہر ہے کہ جس شخص کی زندگی اس رنگ سے گزری ہو، اس کے کلام میں اگر سوز و گداز نہ ہو تو تعجب ہوگا۔ پس مجھے اس پر تو تعجب نہیں ہے کہ ان سے زیادہ درد و تاثیر اردو کے کسی شاعر کے کلام میں نہیں ہے۔ مجھے تو اس پر

حیرت ہے کہ جذبات کو لفظوں کا جامہ پہنانے میں میرؔ کو وہ کمال حاصل ہے جس کی نظیر ملنا محال ہے وہ جس خیال کو جس طرح ادا کرتے ہیں اس خیال کا اس سے بہتر طریقہ پر ادا ہونا ممکن نہیں ۔ جن حالات اور جس ماحول میں میرؔ نے اپنی زندگی گزاری ۔ بڑا ہا آدمی اُسی ماحول میں زندگی بسر کر رہے تھے ۔ جن میں شاعر بھی تھے ۔ انشا پرداز بھی تھے ۔ مصور بھی تھے ۔ نقاش بھی تھے ۔ عالم بھی تھے مورخ بھی تھے ۔ مگر کسی کے قلم سے اس زمانہ کی دماغی اور ذہنی حالت کے ایسے سچے اور بے عیب خاکے نہ کھنچے ۔ میرؔ نے جو کچھ کہا ہے اپنی حالت پر منعکس کر کے کہا ہے ۔ وہ ساری دُنیا کے دُکھ درد کو اپنا دکھ درد بنا لیتے ہیں ۔ عالمگیر احساسات کو اپنے دل کی گہرائیوں میں جذب کر لیتے ہیں ۔ اور پھر انھیں اس کمال اور قوت سے لفظوں میں ادا کرتے ہیں کہ ہر شخص یہ سمجھتا ہے کہ یہ تو میرے ہی دل کا حال ہے ۔ وہ تو خیر مصیبت کا زمانہ تھا ۔ دل کے زخم تازہ تھے لوگ میرؔ کے شعر سُن سُن کر تڑپ جاتے تھے ۔ اُن کے کلام کی داد تو آج بھی بے اختیار آہوں سے دی جاتی ہے ۔ ہندوستانی فطرتاً فکر اور خیال کے بندے ہیں اس سے زیادہ متین اور سنجیدہ قوم دُنیا کے پردے پر نہیں ہے اور یہ تمام خصوصیات اگر زیادہ گہری نہ ہوں ۔ جیسا کہ عوام میں نہیں ہوتیں تو اس کا لازمی نتیجہ غمگینی ہے ۔ پھر انسانی فطرت کا تقاضا ہے کہ تکلیف اور غم کا احساس زیادہ ہوتا ہے اور زیادہ دیر تک قائم رہتا ہے ۔ یہاں حزنیہ شاعری کی کثرت اور مقبولیت کا یہی سبب ہے ۔ پس جب میرؔ چبھتے ہوئے لفظوں میں غم کی کہانی کہتے ہیں تو وہ ہر شخص کے دل میں اُتر جاتی ہے اور وہ ایسے سیدھے سادے لفظوں میں خیالات کا اظہار کرتے ہیں ۔ جو حقیقت اور واقعیت کی جان ہیں شاعرانہ مبالغہ کا گمان تک نہیں ہوتا ۔ میرے نزدیک یہی میرؔ کا سب بڑا کمال ہے ۔ اُن کے خیالات میں تصنع نہیں ہے ۔ اُن کی زبان مصنوعی نہیں ہے ۔ الفاظ میں سادگی ۔ فقروں میں سادگی ۔ خیالات میں سادگی اور ایسی سادگی کہ حسن بن گئی ہے اور ہنر سے بہتر ادبی اختراعیں اور صنعتیں اس پر قربان کر دینے کو جی چاہتا ہے ۔ سنئے ؎

دل تڑپے ہے، جان گھلے ہے، حال جگر کا کیا ہوگا
مجنوں مجنوں لوگ کہیں ہیں، مجنوں کیا ہم سا ہوگا

اشعار کی تشریح کا انتظار نہ کیجئے ۔ میرے نزدیک شعر کی تشریح میں شعر کا حسن باقی نہیں رہ سکتا ۔ شعر کا لطف تو شعر ہی میں ہوتا ہے ۔

جسے شب آگ سا دیکھا سُلگتے　　　اُسے پھر خاک ہی پایا سحر تک

میر دُعا کر حق میں میرے تو بھی فقیر ہے مُدت سے　　　اب جو کبھو دیکھوں اس کو تو مجھ کو نہ آئے پیار بہت

رونے پھرتے ہیں ساری ساری رات　　　اب یہی روزگار ہے اپنا

مجنوں نے ریگِ بادیہ سے دِل کے غم گنے　　　ہم کیا کریں کہ غم ہیں ہمارے تو بے حساب

پھر پھر گیا ہے آ کر منہ تک جگر ہمارے　　　گزرے ہیں جان و دل پر یاں اضطراب کیا کیا

اک آن اس زمانے میں یہ دل نہ وا ہوا　　　کیا جانیے کہ میر زمانے کو کیا ہوا

کوفت سی کوفت اپنے دل پر ہے　　　چھاتی کو کوٹتے ہیں اکثر ہم

بھری آتی ہیں آج یوں آنکھیں　　　جیسے دریا کہیں اُبلتے ہیں

گھر سے اُٹھ کر کوچے میں بیٹھا بیت پڑھے دو باتیں کیں　　　کس کس طور سے اپنے دل کو اس بن میں بہلاتا ہوں

میر کے انتقال کو آج ڈیڑھ سو برس[1] سے زیادہ ہو گئے۔ اردو کہیں سے کہیں پہنچ گئی۔ ہزاروں شاعر بھی ہوئے۔ انشا پرداز بھی ہوئے۔ ہم نے فارسیت کے دریا بھی بہائے۔ عربیت کی بڑی بڑی صنعت کاریاں بھی کیں۔ مگر خدا کے لئے ذرا انصاف سے کہئے کہ اس طویل عرصے میں ہم نے

---

[1] میر صاحب کی وفات کا سنہ ۱۲۲۵ھ مطابق ۱۸۱۰ء ہے

کوئی ایک فرد بھی ایسا پیدا کیا جو جذبات نگاری میں میرؔ سے بازی لے گیا ہو۔

میرؔ کا فلسفہ میرؔ صوفی تھے۔ ایک برگزیدہ درویش کے فرزند تھے۔ انہوں نے ایک ایسے گھرانے میں پرورش پائی تھی جس کا ذرّہ ذرّہ روحانیت میں سرشار تھا۔ انھیں ایسی مقدس ہستیوں نے گودوں کھلایا تھا جو عشق کی راہ میں فنا ہو چکی تھیں۔ انہوں نے ایک ایسا دل پایا تھا جس کی وسعتیں سارے عالم پر حاوی آ جانے کے بعد بھی تشنہ رہ جاتی ہیں۔ جس کی طلب و جستجو اس مادّی دُنیا کی تنگ سامانی سے میسّر نہیں ہوتی۔ وہ انسان کو چند ہڈیوں کا ڈھانچا اور گوشت و پوست کا مجموعہ نہیں سمجھتے بلکہ اُسے مظہرِ ذاتِ باری مانتے ہیں۔ میرؔ کا خدا ہملٹن اور اسپنسر کے خدا کی طرح غیر متعلق اور ایک غیر معلوم مطلق طاقت (UNKNOWABLE ABSOLUTE) نہ تھا۔ نہ پلیٹو کے خُدا کی طرح ایک لازوال ہستی تھا جو خود کو انسان سے الگ تھلگ رکھتی ہو۔ اور جس کا وجُود خارجی ہو بلکہ وہ ہر جگہ اور ہر چیز میں خدا کا جلوہ دیکھتے ہیں۔ ان کا مسلک وحدۃ الشہود نہیں وحدۃ الوجُود ہے۔ وہ ہمہ از وست کے قائل نہیں بلکہ ہمہ اوست کے ماننے والے ہیں اور ان کا فلسفہ ویدانت کے فلسفہ سے بہت ملتا جُلتا ہے۔ سنئے:

ہم آپ ہی کو اپنا مقصود جانتے ہیں — اپنے سوائے کس کو موجُود جانتے ہیں
صورت پذیر ہم بن ہرگز نہیں وہ معنی — اہلِ نظر ہمیں کو معبُود جانتے ہیں
اپنی ہی سَیر کرنے ہم جلوہ گر ہوئے تھے — اس رمز کو و لیکن محدُود جانتے ہیں

میرؔ کو مجاز میں حقیقت کے جلوے نظر آتے ہیں وہ انسان اور خُدا کے درمیان زمین اور آسمان کا فرق تسلیم نہیں کرتے۔ وہ خدا کو انسان سے جُدا نہیں سمجھتے ؎

کب سے نظر لگی تھی دروازۂ حرم سے — پردہ اُٹھا تو لڑیاں آنکھیں ہماری ہم سے

جو سوچے ٹک تو وہ مطلوب ہم ہی نکلے میرؔ — خراب پھرتے تھے جس کی طلب میں مُدت سے

اتحاد اتنا ہے اس سے کہ ہمیشہ ہے وصال — اپنے مطلوب کو ہے ربط سدا اپنے ساتھ

کھینچا ہے آدمی نے بہت دُور آپ کو   اس پردے میں خیال تو ٹک کر خدا نہ ہو

گوش کو ہوش کے ٹک کھول کے سُن شورِ جہاں   سب کی آواز کے پردے میں سخن ساز ہے ایک

غلط تھا آپ سے غافل گزرنا   نہ سمجھے ہم کہ اس قالب میں تُو تھا

تھا وہ تو رشکِ حُورِ بہشتی ہمیں میں میر   سمجھے نہ ہم تو فہم کا اپنے قصور تھا

میر اُس بے نشاں کو پایا جان   کچھ ہمارا اگر سراغ لگا

پھر نہ شیطاں سجودِ آدم سے   شاید اس پردے میں خدا ہووے

میر کو ہر شے میں خدائے قدوس کا جلوہ نظر آتا ہے۔ وہ کوئی جگہ اس سے خالی نہیں پاتے کسی مقام کو اس کے جلوے سے محروم نہیں دیکھتے۔

دیا دکھائی مجھے تو اُسی کا جلوہ میر   پڑی جہان میں جا کر جہاں نظر میری

جلوے ہیں اُس کے شانیں ہیں اُس کی   کیا روز، کیا خور، کیا رات، کیا ماہ

آنکھیں جو ہوں تو عین ہے مقصود ہر جگہ   بالذّات ہے جہاں میں وہ موجود ہر جگہ
واقف ہو شانِ بندگی سے قیدِ قبلہ کیا   سر ہر جگہ جُھکا کہ ہے مسجود ہر جگہ

سراپا میں اُس کے نظر کرکے تم   جہاں دیکھو اللّٰہی اللّٰہ ہے

عام ہے یار کی تجلی میر　　　خاصِ موسیٰ و کوہِ طور نہیں

ہو باغ و بہار آیا، گُل پھول کہیں پایا　　　جلوہ اُسے یاں اپنا صد رنگ دکھانا تھا

میر کی نظر میں انسان کا درجہ بہت بلند ہے۔ وہ جگہ جگہ کہتے ہیں کہ انسان کو اپنی حقیقت سے آگاہی حاصل کرنے کی ضرورت ہے۔ وہ اس امر پر بہت زور دیتے ہیں کہ انسان کے لئے اپنی ذات کا علم اور معرفت ہی اُسے خدا تک پہنچا سکتی ہے۔ مَنْ عَرَفَ نَفْسَہٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّہٗ۔ اسی کو اُپنشادیں "آتما گیان" اور "آتما بھوتی" کہا گیا ہے۔ یہی "خود دریابی" ہے جس کی طرف میر جگہ جگہ اشارہ کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں اپنی ہستی کو پہچانو اور اس حقیقت کو سمجھو کہ تم کیا ہو ؎

خدا ساز تھا آذرِ بت تراش　　　ہم اپنے تئیں آدمی تو بنائیں

کام کیا آتے ہیں گے معلومات　　　یہ تو سمجھے ہی نا کہ کیا ہیں ہم

اپنے خیال ہی میں گزرتی ہے اپنی عمر　　　پر کچھ نہ پوچھو سمجھے نہیں جاتے ہم سے ہم

ہم نے یہ مانا کہ واعظ ہے مَلَک　　　آدمی ہونا بہت مشکل ہے یہاں

میر موت کو زندگی کا اختتام نہیں بتاتے۔ آخری منزل نہیں سمجھتے بلکہ زندگی کے سفر میں ایک وقفہ، فراغت کا ایک لمحہ، دم لینے کے لئے اور سکون حاصل کرنے کے لئے ایک فرصت تصور کرتے ہیں اور پھر سفر شروع ہو جائے گا۔

مرگ اِک ماندگی کا وقفہ ہے　　　یعنی آگے چلیں گے دم لے کر

عمر کا وقفہ اس رستے میں کیا ہے میر سمجھتے ہو　　　ہارے ماندے راہ کے ہیں ہم لوگ کوئی دم سو لینگے

مرگ کیا منزلِ مراد ہے میر یہ بھی اک راہ کا توقف ہے

تھا جسم کا ترک اولی ایام میں پیری کے جانا تھا چلا ہر دم جامہ بھی پرانا تھا

جہاں تک فلسفۂ اخلاق کا تعلق ہے میر صاحب جبریہ گروہ کے متبع ہیں۔ وہ انسان کو مجبور اور بے بس سمجھتے ہیں۔ اس مسئلے میں وہ حافظ شیرازی کے ہم خیال ہیں۔ دیکھئے ذیل کے شعر میں کس خوبی کے ساتھ معتزلہ اور اشعریہ عقائد کی طرف طنزیہ اشارہ کرتے ہیں ؎

ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے خود مختاری کی چاہتے ہیں سو آپ کریں ہیں ہم کو عبث بدنام کیا

منھ نہ ہم جبریوں کا کھلواؤ کہنے کو اختیار سا ہے کچھ

ہے عبث یہ تردد و تشویش پہنچے ہے وقت پر جو ہے مقسوم

یاں کے سفید و سیہ میں ہم کو دخل جو ہے تو اتنا ہے رات کو رو رو صبح کیا یا دن کو جوں توں شام کیا

غرض میر نے اس عالم کے سربستہ راز کو اپنے دل کی گہرائیوں میں ڈھونڈا اور پالیا۔ ان کا باطن ان کے ظاہر پر حاوی آگیا تھا اور وہ زندگی کے حقیقی مقصد سے آگاہ تھے۔

قدرتی مناظر اٹھارہویں صدی کا یہ درد انگیز نغمہ نواز بھی ہر حقیقی شاعر کی طرح قدرتی مناظر سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکا۔ اپنے مخصوص انداز میں کہتا ہے ؎

ڈوبے اچھلے ہے آفتاب بہت کہیں دیکھا ہے تجھ کو دریا پر

پھاڑا ہزار جا سے گریبانِ صبر میر کیا کہہ گئی نسیم سحر گل کے کان میں

یوں بارِ گُل سے اب کے جھکے ہیں نہالِ باغ
جُھک جُھک کے جیسے کرتے ہیں دو چار بار بات

نکلی ہیں اب کے کلیاں اس رنگ سے چمن میں
سر جوڑ جوڑ جیسے مل بیٹھتے ہیں احباب

کیا بے خبر ہے رفتنِ رنگینِ عُمر سے
جو سے چمن میں دیکھ ٹک آبِ رواں کی اُور

بہت رنگ ملتا ہے دیکھو کبھو
ہماری طرف سے سحر کی طرف

حکمت و موعظت

میر صاحب نے اپنے کلام میں روحانیت اور محبت کی تلقین نہایت شدّ و مد کے ساتھ کی ہے لیکن اسی کے ساتھ وہ اپنے اشعار کی لڑیوں میں اخلاقی اور حکیمانہ موتی بھی پروتے جاتے ہیں کہ تہذیب اخلاق کے بغیر رُوحانیت کے مدارج طے کرنا ممکن نہیں۔

خوش سیرتی ہے جس سے کہ ہوتا ہے اعتبار
ہے چوبِ خشک، بو جو نہ ہووے اگر کے بیچ

عشق و محبت یاری میں کیا لُطف رکھے ہے کرنا ضبط
چھاتی پر ہو کوہ الم کا تو بھی نالہ و آہ نہ کر

ایک دم پر ہے بنا تیری سو آیا کہ نہیں
وہ کچھ اس زندگی میں کر کہ تجھے یاد کریں

مجنوں نے حوصلے سے دیوانگی نہیں کی
جا گہ سے اپنی جانا اپنا نہیں و تیرا

بسانِ خاک ہو پامالِ راہِ خلق اے میر
رکھے ہے دل میں اگر قصدِ سر فرازی کا

خاک ہے اصلِ طینتِ آدم چاہیئے اس کو عجز کرے
بات کی تہ کو کچھ پاتے تو اتنا سر نہ اُٹھاتے تم

ایسی معشیت کر لوگوں سے جیسی غم کش میر نے کی   برسوں ہوئے ہیں اُٹھ گئے ان کو روتے ہیں ہمسائے ہنوز

دُنیا کی بے ثباتی | میر دُنیا کو بے حقیقت سمجھتے ہیں۔ بار بار کہتے ہیں کہ یہاں دل نہ لگانا۔ یہ عالم تو محض ایک دھوکا ہے، ایک خیال ہے، ایک وہم ہے، ایک طلسم ہے، اس سے دامن بچائے رکھنا۔ یہ تو راستہ ہے اسے منزل نہ سمجھ بیٹھنا ؎

جہاں سے تو رختِ اقامت کو باندھ   یہ منزل نہیں بے خبر راہ ہے!

خاک تھی موجزن جہاں میں اور   ہم کو دھوکا یہ تھا کہ پانی ہے

مقصود کے خیال میں بہتوں نے چھانی خاک   عالم تمام وہم ہے یاں ہاتھ کیا لگے

عالم کسی حکیم کا باندھا طلسم ہے   کچھ ہو تو اعتبار بھی ہو کائنات کا

جو کچھ نظر پڑے ہے حقیقت میں کچھ نہیں   عالم میں خوب دیکھو تو عالم ہے خواب کا

جہاں کا دریا سے بیکراں بھی سراب پایانِ کار نکلا   جو لوگ تہہ سے کچھ آشنا تھے انہوں نے لب تر کیا نہ اپنا

غفلت سے ہے غرور تجھے ورنہ ہے بھی کچھ   یاں وہ سماں ہے جیسے کہ دیکھے ہے کوئی خواب

میر نے ساری عمر شعر و شاعری کے مشغلہ میں صرف کی ہے اور جو کچھ کہا ہے سب چھپ کر شائع ہو گیا۔ انتخاب کی نوبت نہیں آئی۔ ظاہر ہے کہ اس صورت میں وہ کلام بھی منظر عام پر آ گیا جو نہ آنا چاہیے تھا۔ میر صاحب کے بعض اشعار ہمارے زمانے کے اخلاقی معیار کے لحاظ سے پست ہیں مگر جس زمانے میں یہ شعر کہے گئے تھے اس وقت کا رنگ یہی تھا۔ میرے نزدیک تو یہ بھی

میرؔ کا اعجاز ہے کہ اپنے کلام کے بیش تر حصے میں بھی وہ اپنے زمانے کی اخلاقی سطح سے بہت بلند رہے۔

خلاصۂ کلام میں نے مندرجہ بالا سطور میں میرؔ کے کلام کے بعض پہلوؤں پر مختصراً اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ میرے نزدیک ابھی میرؔ کی اتنی قدر نہیں ہوئی جس کے وہ مستحق ہیں۔ ایسے لوگ کہیں صدیوں کے اُلٹ پھیر میں پیدا ہوتے ہیں اور پھر قیامت تک زندہ رہتے ہیں۔ میرؔ نے کچھ اس درد کے ساتھ دل کا حال بیان کیا ہے کہ سُننے والوں کے دل پر چوٹ لگتی ہے۔ جو بات دل سے نکلتی ہے، بے اثر نہیں ہوتی۔ جب تک ایک متنفّس بھی اُردو زبان کا بولنے اور سمجھنے والا موجود ہے، میرؔ کی یاد تازہ رہیگی۔ جب کوئی مُصیبت زدہ دُکھ درد کا ستایا ہوا میرؔ کا کلام پڑھے گا تو اُسے تسکین ہوگی کہ دُنیا میں تنہا میں ہی مصیبتیں برداشت نہیں کر رہا ہُوں بلکہ یہاں کا یہی دستور ہے اور دُنیا میں ایسے لوگ بھی موجود ہیں اور موجود رہے ہیں جنھوں نے مجھ سے کہیں زیادہ مُصیبتیں برداشت کی ہیں۔ زوال سلطنت مُغلیہ کے وقت کی ذہنی اور دماغی حالت کے واحد مصوّر کی حیثیت سے اُن کا درجہ بہت بلند ہے۔ اُن کے کلام کے مطالعہ سے اُس وقت کے حالات کا جو اندازہ ہوتا ہے، وہ کسی تاریخ کی ورق گردانی سے نہیں ہو سکتا۔ میرؔ نے رُوحانیت کی تلقین کی ہے۔ اخلاق کے درس دیے ہیں۔ ان کے کلام کے مطالعہ سے عشق و محبّت کے جذبات بیدار ہو جاتے ہیں اور محبت ہی ایک ایسی چیز ہے جس پر دُنیا کا نظام قائم ہے۔ جس کے وجُود سے زِندگی وبال نہیں معلوم ہوتی اور دنیوی حیات میں ایک حُسن پیدا ہو جاتا ہے۔

نہیں عشق کا درد لذّت سے خالی
جسے ذوق ہے وہ مزا جانتا ہے
(میرؔ)

اظہر راہی

میر کی ہجویہ شاعری

شعرائے متقدمین کا محبوب مشغلہ ہجو گوئی رہا ہے، آپس کی نوک جھونک چھیڑ چھاڑ اور سماجی بُرائیوں کا اظہار اسی مخصوص صنف میں کیا جاتا تھا۔ جعفر زٹل کو اُردو کا پہلا باقاعدہ ہجو گو کہا جاتا ہے سودا کے ہجویہ قصائد اس صنف کی نمایاں مثالیں ہیں۔ دل کا غبار نکالنے اور اپنی نفرت کا اظہار کرنے میں اس صنف سے زیادہ تر کام لیا گیا۔ میر نے بھی اس میدان میں اپنا زورِ قلم دکھایا اگرچہ وہ غزل کے شاعر ہیں، اور بقول مالک رام "اُردو شاعری کے پیمبر ہی نہیں خدا" ہیں[1]۔

غزل کا اسلوب جو میر کی خصوصیت ہے وہی ان کی دوسری اصناف میں بھی نمایاں ہے۔ خاص طور پر بعض مثنویوں کو ہم مسلسل غزل کے زمرے میں شامل کر سکتے ہیں۔ مثنوی کے عاشق کے حصے میں بھی وہی حرماں نصیبی اور محرومی آتی ہے جو غزل کے عاشق کا مقدر ہے۔ جب انسان کا بس دوسرے کے گریبان پر نہیں چلتا تو وہ اپنے پیرہن کو تار تار کر دیتا ہے۔ یہی حال میر کا بھی ہے۔ زندگی میں ناکامی اور نامرادی ملی اور اس ناکامی اور نامرادی کا زور جب کہیں اور نہ چل سکا تو شاعر نے خود اپنی شخصیت کا مضحکہ اڑانا شروع کر دیا۔ بادی النظر میں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شاعر

---

[1] میر کی آپ بیتی صفحہ ۱۱ (مقدمہ)

اپنے پیرہن کو تار تار کر رہا ہے لیکن حقیقت شناس نگاہیں اس معشوق کو پہچان لیتی ہیں جو اس پردۂ زنگاری میں پوشیدہ ہے۔

میرؔ نے اس حرماں نصیبی کو اپنا مقدر سمجھ لیا اور اسی پر قانع ہو گئے۔ جو شخص اپنی ذات ہی کو تمام محرومیوں کا ذمہ دار ٹھہرائے وہ سوداؔ کی طرح ہنسوڑ اور چلبلا کیسے ہو سکتا ہے؟ سوداؔ نے بھی مشکلات اٹھائیں لیکن ان کی چلبلی طبیعت نے اس میں کئی مضحکہ خیز پہلو نکال لئے اور نظم میں اس کا اظہار کیا۔

کلیم الدین احمد کے الفاظ میں "اگر جذبہ عشق ایک پرغرور طاقت ہے تو جذبہ نفرت بھی ایک طاقتور غرور ہے[1]" میرؔ کے یہاں جذبہ عشق ان کی غزلوں اور مثنویوں کا سرمایہ ہے اور جذبہ نفرت ان کی ہجویات کا موضوع ہے۔ جب جذبہ نفرت اور حقارت جوش میں آتا ہے تو انسانی چہرہ سے وہ مصنوعی خول اتر جاتا ہے جسے تکلّف یا بناوٹ کہتے ہیں اور فرد کا صحیح کردار سامنے آجاتا ہے۔

میرؔ کی ہجویات ایک مخصوص سماج کی پروردہ ہیں۔ اس لئے ان میں اس ماحول کی تصویر کشی میں شدّت بھی ہے اور سچائی بھی۔ میرؔ کی زیادہ تر ہجویات کا موضوع وہ خود ہیں یا وہ حالات ہیں جو ان پر گزرے ہیں۔ غزل میں بھی ایسے اشعار کی کافی تعداد موجود ہے جس میں انہوں نے خود کو نشانہ بنایا ہے اور اپنا مضحکہ اڑایا ہے لیکن اس مضحکہ میں وہ شان نہیں جو سوداؔ کا حصّہ ہے بلکہ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے شاعر اپنے آپ پر ہنستا بھی ہے اور اپنی اس مخصوص کیفیت سے تلذذ بھی حاصل کرتا ہے۔ اس طرح میرؔ کے طنز اور مضحکہ خیزی میں ایک خصوصیت ہے جو ہجویہ شاعری میں ان کی انفرادیت کا سبب بنی۔

ہجو کا فن دراصل طنز، مزاح، پھبتی اور استہزاء کے امتزاج کا فن ہے۔ میرؔ کے یہاں طنز کی نشتریت تو ہے لیکن مزاح کے عناصر اتنے نمایاں نہیں جتنے سوداؔ کے یہاں ہیں لیکن وہ سوداؔ کی طرح بے اعتدالیوں سے عموماً پرہیز کرتے ہیں۔ ان کی ہجویات طنز اور تشنیع کے ہتھیاروں سے لیس ہیں اور اس کا مقصد دل کا غبار نکالنا یا عداوت نہیں بلکہ ہمدردی اور اصلاح ہے۔ ہجو خواجہ سرا

---

[1] سخن ہائے گفتنی ص ۱۹۵

اور ہجو بلاس رائے میں ان کی بے اعتدالیاں کسی حد تک نمایاں ہیں لیکن ان ہجویات کے مطالعہ سے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے شاعر کو ان کے کہنے پر مجبور کیا گیا۔ یا ایسے مخصوص حالات میں ہجویات کہی گئیں۔ جب میر کی طبع نازک کو سخت ٹھیس پہنچی۔ ہو سکتا ہے کہ یہ بھی اسی رسم زمانہ میں شامل ہو جب کہ ثقہ سے ثقہ شاعر بھی اس میدان میں اشہب قلم کو دوڑانا ضروری سمجھتا تھا۔

سودا اور میر کی ہجویات کا مقابلہ اسی طرح غیر رسمی ہے۔ جس طرح کہ میر کی آہ اور سودا کی واہ کا مقابلہ۔ دونوں شعراء کے طبائع اور محسوسات میں فرق ہے۔ سودا کے لئے زندگی کا لذتیہ EPICUREAN پہلو زیادہ اہمیت رکھتا تھا اور میر کے لئے زندگی کے حزینہ پہلو میں زیادہ جاذبیت تھی۔ ہم عصر ہونے کے باوجود طبائع کا اتنا اختلاف یقیناً قابل غور ہے لیکن زندگی کی جس قدر ناہمواریوں کو میر نے طے کیا سودا نے اسے دیکھا اور اس سے دامن بچا کر گذرنا بھی چاہا۔ لیکن پھر بھی "شہر آشوب" سے دامن نہ بچا سکے اور ہجویہ شاعری کو تخیل کی "پھلجھڑیوں" سے لالہ زار بنانے کے ساتھ ساتھ ایک کسک اور ٹیس بھی دی جو "بے درد اور ظاہر بین کے لئے بادشاہ اور دربار کی ہجو ہے لیکن نکتہ سنج اور نکتہ شناس کے لئے ملک کی دلسوزی میں اپنے وطن کا مرثیہ نظر آتا ہے"[1]۔ یہ حقیقت ہے کہ میر کا میدان نہ تو ہجویات ہیں اور نہ قصیدہ ——— سودا کے لئے یہ دونوں اصناف ان کے گھر کی لونڈیاں ہیں۔ اس کے باوجود عبدالباری آسی مرتب کلیات میر اُن کی ہجویات کی برتری کے قائل نظر آتے ہیں[2]۔

میر نے کل انیس[19] ہجویات کہی ہیں جن میں مثنویات کی تعداد تیرہ ہجویہ مخمس پانچ اور ایک ہجویہ قطعہ ہے۔ تعجب ہے کہ انہوں نے کوئی ہجویہ قصیدہ نہیں کہا۔ ہجویات کی فہرست اس طرح ہے:-

ہجویہ مثنویاں[3]

۱ — در ہجو خانہ خود (کیا لکھوں میر اپنے گھر کا حال)۔

---

[1] آب حیات ص ۱۴۰ (فروغ اردو ایڈیشن) [2] کلیات میر مطبوعہ نولکشور پریس ص ۵۱

[3] (اس ذیل میں اس مقالہ کی تیاری میں ڈاکٹر گیان چند جین کے۔ ڈی لٹ کے غیر مطبوعہ مقالہ "شمالی ہند میں اردو مثنوی کا ارتقاء" سے مدد لی گئی ہے)

۲ ۔ در ہجو خانہ خود (جسم خاکی میں جس طرح جان ہے)
۳ ۔ ہجو در بیان مرغ بازاں
۴ ۔ در مذمت برشگال
۵ ۔ در ہجو نااہل مسمی بہ زبان زد عالم
۶ ۔ در ہجو شخصے ہیچ مداں کے دعوی ہمہ دانی داشت عرف وم الفضول
۷ ۔ تنبیہہ الجہال
۸ ۔ اژدر نامہ
۹ ۔ در مذمت آئینہ دار
۱۰ ۔ در ہجو اکول
۱۱ ۔ در مذمت دنیا
۱۲ ۔ در بیان کذب
۱۳ ۔ ہجو عاقل نام ناکسے کہ با سگاں انسے تمام داشت۔

ہجویہ مخمس

۱ ۔ در ہجو بلاس رائے
۲ ۔ در ہجو لشکر (جس کسو کو خدا کرے گمراہ)
۳ ۔ در حال لشکر (مشکل ہوئی جو اپنی بود و باش)
۴ ۔ در ہجو شیخ جی (دستخطی فرد کا سنو احوال)
۵ ۔ در شہر کا ماحسب حال خود

ہجویہ قطعہ

۱ ۔ در ہجو خواجہ سرا

ڈاکٹر خواجہ[1] احمد فاروقی نے صرف بارہ[12] ہجویات کی فہرست دی ہے اور بقیہ سات ہجویات کا ذکر نہیں کیا۔

---

[1] میر حیات اور شاعری ص ۴۶۴

میر کی تمام ہجویات کو ہم دو خانوں میں تقسیم کر سکتے ہیں ۔ پہلا نوان کی ذات اور ماحول سے متعلق اور دوسرا افراد کے بارے میں جس کی تعداد زیادہ نہیں ہے، اپنے گھر اور ماحول کی ہجوگوئی میں میر کامیاب نظر آتے ہیں اور حقیقت بھی یہی ہے کہ میر درون خانہ کے شاعر ہیں وہ پائیں باغ کی طرف کھلنے والی کھڑکی کو بند ہی رہنے دینا چاہتے ہیں اور اپنے گھر اور اپنی ذات سے وابستگی انہیں اس کی تصویر کشی کا اچھا موقع دیتی ہے بجائے اس کے کہ وہ دوسروں کی پگڑیاں اچھالیں انہیں اپنے ہی گریباں کے چاک کرنے میں زیادہ سکون ملتا ہے ۔ جہاں جہاں انہوں نے اپنی ذات کو ہدف طنز و ملامت بنایا ہے وہاں یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ ان کی اپنی ذات تنہا نہیں ایک انجمن ہے ۔ ان کی دشواریاں تنہا ان ہی کی نہیں بلکہ اس ماحول کی پروردہ ہیں ۔ جب ایک تہذیب کا خاتمہ ہو رہا تھا اور ایک نیا سماج جنم لے رہا تھا پھر اس تغیر پذیر دور میں ان کی ذات تنہا کیسے رہ سکتی تھی ۔ ان کے گھر کا حال اس بات کا غماز ہے کہ اس دور میں لوگ ایسے ہی خستہ حال مکانوں میں اپنی زندگی کی کٹھن گھڑیاں گذارنے پر مجبور تھے ۔ جس طرح سودا کا "شہر آشوب" صرف بادشاہ اور دربار کی ہجو نہیں ہو سکتا اسی طرح میر کا اپنا گھر صرف ان ہی کا گھر کیسے ہو سکتا ہے؟ مثنوی "ہجو خانہ خود" کا پہلا شعر ہی اس بات کا غماز ہے کہ خرابی کا دور دورہ ہے اور اس نے سماج کے ساتھ میر کے گھر کا حال بھی تباہ کر دیا ہے ؎

کیا لکھوں میر اپنے گھر کا حال　　　اس خرابے میں میں ہوا پامال

اس کے بعد میر نے اپنی انفرادی مشکلات کا دلچسپ پیرائے میں ذکر کیا ہے جس کی جزئیات سودا کی ہجویات کی ہمسری کرتی ہیں ۔ ہجویات کی زبان جیساکہ پہلے کہا جاچکا ہے وہی غزل کی مخصوص زبان ہے جس میں جذبات کی شدت نمایاں ہے اور اس قسم کی ہجویات میں ہر جگہ نظر آتی ہے ۔ گھر کی تباہی کا عالم یہ ہے کہ

گھر بھی پھر ایسا جیسا ہے مذکور　　　ہے خرابی سے شہر میں مشہور
جس سے پوچھو اسے بتا دے شتاب　　　ساری بستی میں ہے یہی تو خراب
ایک حجرہ جو گھر میں ہے واثق　　　سو شکستہ تر از دل عاشق

غرض کہ ــــــــ

نہ اثر بام کا نہ کچھ در کا ۔۔۔ گھر ہے کاہے کو نام ہے گھر کا

شیخ چاند نے سودا کے قصیدہ تضحیک روزگار کے بارے میں لکھا ہے کہ یہ دراصل فوجی نظام کی خرابی کا مرثیہ ہے اسی طرح ہم میر کی ان ہجویات کے بارے میں کہہ سکتے ہیں کہ یہ اس دور کی اس معاشی ابتری کا مرثیہ ہے جب لوگ اپنی بنیادی ضروریات کو بھی پورا نہیں کر پاتے تھے۔ اور زندگی اس طرح افتاں و خیزاں گذار رہے تھے۔ میر حسن نے بھی ایک ہجویہ مثنوی میں اپنے گھر کی ابتری کا نقشہ کھینچا ہے۔ دونوں مثنویوں میں تخیل کی کارفرمائی کی بجائے مشاہدہ کا حسن ہے۔ میر کی مثنوی میں درون خانہ کی جملہ جزئیات اس حسن اور خوبی سے پیش کی گئی ہیں کہ اگر ان کے بجائے سودا ہوتے تو تخیل کی کارفرمائی کے باوجود شکستگی اور پریشانی کا وہ ماحول پیش نہ کر سکتے تھے جو میر کا حصّہ ہے۔ گھر کی شکستگی کے بعد کھٹملوں کی ایذا رسانی کا ذکر تفصیل سے کیا ہے۔ مصحفی اور انشاء نے بھی کھٹملوں کی ایذا رسانی کے بارے میں مثنویاں لکھی ہیں۔

میر کی دوسری مثنوی کا بھی یہی موضوع ہے اس کا پہلا شعر ہے ؎

جسم خاکی میں جس طرح جان ہے ۔۔۔ اس طرح خانہ ہم پہ زندان ہے

مکان ایک تو پہلے ہی خستہ حال تھا اب برسات نے رہا سہا نام و نشان بھی مٹا دیا۔

اب جو آیا ہے موسم برسات ۔۔۔ دن کو ہے اپنے ہاں اندھیری رات
صحن میں آب نیزہ بالا ہے ۔۔۔ کوچہ موج ہے کہ نالا ہے
مینہ میں گھر کے پانچ چھ چھپر ۔۔۔ ہم غریبوں کے ہوتے ہیں سر پر
پر تلک تنکے تھے کچھ ایک نئے ۔۔۔ سو وے چڑیوں کے گھونسلوں کو گئے
دل ہے کچھ مکڑیوں کا احساں مند ۔۔۔ کہ جنھوں نے کئے ہیں جھانکے بند
پھوس کچھ ہے کہیں سو آٹا ہے ۔۔۔ بانس کو جھینگروں نے چاٹا ہے

جب بارش کا زور بڑھا تو مکان کا یہ حال ہوا۔

ٹٹیاں تھیں جو آگے چھپر کے ۔۔۔ بہتی پھرتی ہیں صحن میں گھر کے
تا گلے سب کھڑے ہیں پانی میں ۔۔۔ خاک ہے ایسی زندگانی میں
اب تو اپنا بھی حال بدتر ہے ۔۔۔ سر پہ گٹھری ہے نسپہ چھپر ہے

اس عظیم شاعر کے افلاس کا یہ دردناک منظر یہیں ختم نہیں ہوتا۔ سب اس رات کو بھیگتے ہوئے مکان سے نکل کھڑے ہوتے ہیں اور کسی بھائی کے گھر پناہ لیتے ہیں۔ ان کے گھر سے نکلنے کی جزئیات کا بیان بہت خوب ہے۔

گٹھری کپڑوں کی میں اُٹھائی تھی | سر پہ بھائی کے چارپائی تھی
بوجھ کپڑوں کا جن نے باندھا تھا | اس کا سارا فگار کاندھا تھا
ساتھ کوئی چراغ لے نکلا | کوئی سر پر اُجاغ لے نکلا
چھاج کی کرکے کوئی اوٹ چلا | مینھ کے مارے کوئی لوٹ چلا
منھ پہ چھلنی کو ایک نے رویا | ایک نے سرکی کا کپا کھویا
ایک نے چھینکے حال حال لیے | پائے پٹی گلے میں ڈال لیے
ایک نے بوریا لپیٹ لیا | اور پایا جو کچھ سمیٹ لیا
اپنا اسباب گھر سے ہم لے کر | اگنی سب کے ہاتھ میں دے کر
صف کی صف نکلی اس خرابی سے | تاکہ پہنچیں کہیں شتابی سے
میرؔ جی اس طرح سے آتے ہیں | جیسے کنجر کہیں کو جاتے ہیں

آخری شعر میں سارا طنز اور نشتریت بھری ہوئی ہے اور اپنی اس زبوں حالی کا بڑی بیکسی کے ساتھ اظہار ہے، ان کی بجائے اگر سوداؔ ہوتے تو تخیّل کی مبالغہ آمیزیوں سے احوال واقعی کا خون کر دیتے۔

ایک دوسری مثنوی بعنوان "در مذمت برشگال کہ باراں درآں سال بسیار شدہ بود" ہے جس کا پہلا شعر ہے۔

کیا کہوں اب کی کیسی ہے برسات | جوش باراں سے بہہ گئی ہے بات

یہ مثنوی ان موسمیاتی مثنویوں میں سے ایک ہے جس میں موسم کی شدّت کا مبالغہ آمیز بیان ہوتا ہے۔ قائمؔ کی مثنوی "موسم سرما" اس کی نمایاں مثال ہے۔ میرؔ نے اس مثنوی میں برسات کی شدّت بیان کی ہے اور سوداؔ کی طرح مبالغہ کی شدّت ہے لیکن تخیّل کی کارفرمائی میں میرؔ معذور نظر آتے ہیں۔ اس وجہ سے کوئی خاص بات پیدا نہ ہوسکی۔ حیدرآباد کے کلیات میر کے نسخہ میں اس مثنوی کا نام

"در بیان جوش باراں" ہے۔

لشکر کی ہجو میں دو مخمس ہیں جو سماجی ہجویات کے ذیل میں آتے ہیں۔ ان میں دہلی کی معاشی ابتری، عسکری زوال اور انحطاط پذیر مغلیہ دور کا نہایت دل خراش ذکر ہے۔ سودا نے "ہجو اسپ" اور "شہر آشوب" میں فوجی نظام کی بدحالی کا ذکر کیا ہے اسی طرح میر نے بھی ان دونوں مخمسوں میں اس دور کی فوجی ابتری کی نشان دہی کی ہے لیکن اس باب میں سودا کو ہر لحاظ سے فوقیت حاصل ہے۔ سودا کے ان ہجویہ قصائد میں زبان، تخیل کی کارفرمائی اور جزئیات نگاری اپنی جملہ خصوصیات کے ساتھ پائی جاتی ہے جب کہ میر کے یہاں غزل کی زبان، مشاہدہ کی سچائی اور سادگی کا انداز نمایاں ہے جو اس قسم کی ہجویات کے لئے موزوں نہیں۔ اسی وجہ سے سودا کی طرح موثر بھی نہیں۔ ان کے یہاں مشاہدہ اور تجربہ کا امتزاج ہے جب کہ سودا کے یہاں تخیل کی کارفرمائی اس حد تک ہے کہ زندگی کا کوئی روشن یا تاریک پہلو ان سے پوشیدہ نہیں رہ سکتا۔ میر اور سودا کے اس فرق کو نمایاں کرنے کے لئے دونوں کے ہم موضوع اشعار کا مطالعہ ضروری ہے۔ میر اپنے مخمس میں کہتے ہیں ؎

فوج میں جس کو دیکھو سو ہے اُداس — بھوک سے عقل گم نہیں ہیں حواس
بیچ کھایا ہے سب لے ساز و لباس — چیتھڑوں بن نہیں کسو کے پاس
یعنی حاضر یراق ہیں گے سپاہ

دوسرے مخمس میں کہتے ہیں ؎

پوچھ مت کچھ سپاہیوں کا حال — ایک تلوار بیچے ہے ایک ڈھال
بادشاہ و وزیر سب قلاش

سودا کا بیان اس طرح ہے:۔

گھوڑا لے اگر نوکری کرتے ہیں کسو کی — تنخواہ کا پھر عالم بالا پہ نشاں ہے
گذرے ہے سدا یوں علف و دانہ کی خاطر — شمشیر جو گھر میں تو سپر بنیے کے یہاں ہے
ثابت ہو جو دگلا تو نہیں موزوں میں کچھ حال — تیروں میں ہے پرگیری تو بے چلہ کماں ہے
کہتا ہے نفر عزہ کو صراف سے جا کر — بی بی نے تو کچھ کھایا ہے فاقہ سے میاں ہے

یہ سن کے دیا کچھ تو ہوئی عید وگرنہ   شوال بھی پھر ماہ مبارک رمضان ہے

یوں تو سودا کی طرح میر نے بھی ان مخمسوں میں مختلف طبقات کی بدحالی کا ذکر کیا ہے۔ لیکن وہ کسی حد تک سرسری ہے۔ سپاہیوں کا ذکر تو اوپر آچکا فقیروں کے بیان میں میر کہتے ہیں:

جبے والے جو تھے ہوئے ہیں فقیر   تن سے ظاہر رگیں ہیں جیسے لکیر
ہیں معذب غرض صغیر و کبیر   کھمیاں سی گریں ہزاروں فقیر
دیکھیں ٹکڑا اگر برابر ماش

سودا فقیروں کی حالتِ زار کا اس طرح ذکر کرتے ہیں کہ بھک منگوں کی فوج شاہراہوں پر منڈلا رہی ہے اور جب کوئی پالکی گذرتی ہے تو وہ "رسالہ" اس کے پیچھے دوڑنے لگتا ہے۔

یوں بھی نہ ملا کچھ تو ہر ایک پالکی آگے   اس نہج سے رسالہ کا رسالہ ہی رواں ہے
کوئی سر پہ کئے خاک گریباں کسی کا چاک   کوئی رووے ہے منھ پیٹ کوئی نعرہ زناں ہے
ہندو مسلماں کو پھر اس پالکی اوپر   ارتھی کا تو ہم ہے جنازہ کا گماں ہے

امیروں کا حال میر اس طرح بیان کرتے ہیں:

لعل خیمہ جو ہے سپہر اساس   پالیں ہیں رنڈیوں کی اس کے پاس
ہے زنا و شراب بے دسواس   رعب کر لیجئے یہیں سے قیاس
قصہ کوتہ رئیس ہے عیاش

جتنے یاں ہیں امیر بے دستور   پھر بحسن سلوک سب مشہور
پہنچنا ان تلک بہت ہے دور   بات کہنے کا واں کسے مقدور
حاصل ان سے نہ دل کو غیر خراش

سودا کی ہجویات میں طبقاتی تضاد کی نادر مثالیں ملتی ہیں۔ کچھ لوگ تو بھوکے مر رہے ہیں لیکن امیروں کا یہ حال ہے:

مطبوخ میں ہے خربزہ اور خربزہ پر دودھ   ہے دودھ پہ مچھلی نس اوپر گاؤ زبان ہے
یہ بھی نہیں ہے کہ اسی سے ہو تسلّی   اس سب پہ تفنن کے لئے بیسنی نان ہے

مسدس شہر آشوب میں امیروں کا حال اس طرح بیان کرتے ہیں:

انہیں ہے اپنی امارت سے اب یہی منظور
کہ ہوں دو مورچھل اور ایک کاتبی سمور
نہ رسم صلح کی سمجھیں نہ جنگ کا دستور
جوان ہیں تو عادہ دان تھے ہوئے وہ ان سے دور
تماش ان کی طبیعت کا سب طرح ہے ٹھٹول

سودا اور میر کے محسوسات کا بنیادی فرق یہی ہے کہ میر کے یہاں طنز کی نشتریت فاسد خون کے ساتھ ساتھ صالح خون کو بھی بے رحمی سے نکالنے کی کوشش کرتی ہے جب کہ سودا طنز کے نشتر کو مزاح کی سان پر تیز کر کے فاسد خون اس خوبی سے نکالتے ہیں کہ خون ناب کی ایک بوند بھی نکل نہیں پاتی۔ میر کے نشتر اور سودا کے خنجر کا یہی بنیادی فرق ہے کہ قاری کو سودا کا دار کاری نظر آتا ہے۔ مگر جلدی صحت مند کر دیتا ہے جب کہ میر کا نشتر ایک نہ ختم ہونے والی چبھن اور ٹیس چھوڑ جاتا ہے۔

تاریخ کے طالب علم کو میر کے دونوں مخمسوں اور سودا کے "شہر آشوب" سے اس دور کے بہت سے حالات کا علم بخوبی ہو جاتا ہے اور تقریباً تمام طبقات کے حالات مل جاتے ہیں میر کی اس قبیل کی ہجویات اس دور کی تباہی اور نا اہلی کی طرف واضح اشارہ کرتی ہیں۔ دربار کی ہجو وہ اس طرح کرتے ہیں:

چار لچے ہیں مستعد کار
دس تلنگے جو ہوں تو ہے دربار
ہیں وضیع و شریف سارے خوار
لوٹ سے کچھ ہے گرمئ بازار
سو بھی قند سیاہ ہے یا ماش

دوسرے مخمس میں "مصاحبان شہ" کے بارے میں کہتے ہیں:

دیکھے میں نے مصاحبان شہ
نکلے سب بے حقیقت و بے تہ
ٹھہری آخر کو ان سے کچھ مت کہہ
رہ سکے ہے کسی طرح تو رہ
ورنہ لشکر سے جا خدا ہمراہ

اس دور کی بدامنی کا حال یہ ہے۔

جاؤ کرنے تلاش جس کے گھر
پہنچنا اس تلک بہت دو بھر
راہ مطلق نہیں نکلتی اِدھر
باعث صد فساد و شور و شر
دس تلنگے ہیں در پہ یہ گہہ و گاہ

لشکر کا حال یہ ہے:

فقر و فاقہ کی ہر طرف ہے دھوم　　دو تلنگے جہاں ہیں واں ہے ہجوم
لشکر اِک ہے خرابۂ مردم بوم　　زندگی کرنے کی طرح معلوم
کہ رہے جوں خدا ہی ہے آگاہ

ایک دوسرے مخمس میں جس کا پہلا مصرعہ ہے "دستخطی فردِ کا سنو احوال" ایک شیخ جی کا مذکور ہے جو "مختاروں کے مختار" تھے۔ میرؔ نے انہیں ایک دستخطی فرد دکھلائی اور اسے جاری کرنے کے لئے شیخ جی کو دیا۔ میرؔ اور شیخ جی میں پرانی آشنائی تھی۔ مگر ان کا وہ کام نہ ہو سکا اور میرؔ کا آٹھ آنہ روزینہ جاری نہ ہو سکا۔ کیونکہ بادشاہ کا خود یہ حال تھا:

آٹھ آنے ہیں شاہ پر بھاری　　اس کے لوگوں ہی کی ہے اب خواری
آپ ہے تو یہ ہے گرفتاری　　فوج ہے گی تو قحط کی ماری
کیوں یہ جس جا رہے ہیں واں تھا کال

عمدوں اور سپاہیوں کا حال یہ تھا:

عمدے جو ہیں دلوں کو بھرتے ہیں　　سو بھی اسباب گروی دھرتے ہیں
ہیں سپاہی سو بھوکے مرتے ہیں　　تو ہو پی پی کے زیست کرتے ہیں
ایک تلوار بیچے ہے اک ڈھال

بادشاہ نے جب شیخ جی کو اپنا معتمد نامزد کیا تو لوگ شیخ جی سے ناراض ہو گئے۔ کیونکہ یہ بیچارا کہاں سے ان کا کام کر سکتا تھا جب کہ خود آقا ہی بھیک مانگ رہا ہو۔ شیخ جی بے چارے فریاد کرتے ہیں:

بادشاہ بھیک مانگتا آیا　　روز روزینہ بند فرمایا
معتمد اپنا مجھ کو ٹھہرایا　　سو بُرا ہیچ میں ہی میں کہلایا
جس کو دیکھو رکھے ہے مجھ سے ملال

ملکی اور سارے صاحبان یتول　　پھرتے ہیں مجھ سے خوار و زار و ملول
کہئے حضرت سے کچھ بھی ہو جو حصول　　کوڑی دینا انہیں نہیں ہے قبول

آپی مرتے ہیں ان کے اہل و عیال

افراد کا تو یہ حال ہے لیکن اس کے باوجود بادشاہ خرچ بالائی مانگتا رہتا ہے مگر دینے کا کوئی ٹھکانا بھی ہو

اس کے اوپر ہے شہ تماشائی — اور چاہت ہے خرچ بالائی
ہر طرف پھیلی ہے یہ رسوائی — کل چنانچہ ہمیں نظر آئی
لال خیمہ کے گرد دوشہ پال
دینے کا ہو کہیں ٹھکانا بھی — جود کو چاہیئے زمانہ بھی
یاں نہیں شہ کے گھر میں دانا بھی — کبھو ہوتا ہے پینا کھانا بھی
ورنہ بھوکے رہے ہیں بیٹھے نڈھال

میر کی یہ ہجو جہاں دفتری نظام کی ابتری کی بہترین مثال ہے وہاں دراصل بادشاہ وقت کی نادار ی اور ابتری کی بھی ہجو ہے۔ ایک دوسرے مخمس "در شہر کاما حسب حال خود" میں اپنی پریشانی کا دردناک پیرائے میں ذکر ہے "ذکر میر"[1] میں مذکور ہے کہ مرہٹوں کے حملہ کے بعد جس میں عالمگیر ثانی اور انتظام الدولہ کو قتل کیا گیا۔ احمد شاہ ابدالی کی فوجوں نے دلی میں لوٹ مار کا بازار گرم کیا۔ تو میر نے بھی دلی سے کوچ کیا۔ دن بھر میں بڑی مشکل سے ۸ - ۹ میل کا فاصلہ طے کیا۔ صبح کو راجہ جگل کشور کی بیوی (راجا جگل کشور محمد شاہ کے زمانہ میں وکیل بنگالہ تھا) کا گذر ادھر سے ہوا۔ وہ اپنے ساتھ میر کو "برسانہ" تک لے گئیں جو ہندوؤں کا تیرتھ استھان تھا۔ پھر ذی الحجہ کی آخری تاریخوں تک "کاماں" گئیں اور میر کو بھی مع اہل و عیال کے ساتھ لے گئیں۔ میر وہاں عشرہ محرم تک مقیم رہے۔ کاماں اور دہلی میں میر کی جو خواری ہوئی اس کا ذکر وہ اس طرح کرتے ہیں:

کاما سے تلخ کام اٹھایا مرے تئیں — دلی میں بے دلانہ پھرایا مرے تئیں
ہم چشموں کی نظر سے گرایا مرے تئیں — حاصل کہ پیس سرمہ بنایا مرے تئیں
میں مشت خاک مجھ سے اسے اس قدر غبار

---

[1] ذکر میر ص ۹۱

دوست اور ہمدرد جو مدتوں میر کے ہمراہ رہے انہوں نے بھی کوئی کسر نہ اٹھا رکھی

مدت لا رہا تھا ساتھ جنہوں کے خراب حال دانستہ ان سبھوں نے کیا مجھ کو پائمال
آخر کو آیا مجھ میں انہوں میں نپٹ ملال یہ زندگی کسو سہل ہوئی جان کی وبال
اس جمع میں کسو کو میں پایا نہ دست یار

اس پریشانی اور جبہ سائی نے میر کو ایک لحظہ مہلت نہیں دی۔ ہر جگہ ذلیل و خوار ہونے ہر جگہ پشیمانی اور شرمندگی نصیب ہوئی۔ لوگوں نے انہیں بے دماغ اور تنک مزاج کہنا شروع کر دیا۔ لیکن دراصل یہ سب ان نامرادیوں اور ناکامیوں کی وجہ سے ہوا۔ ورنہ میر تو بہت عالی حوصلہ اور بلند نظر آدمی تھے۔ خود کہتے ہیں:

حالت تو یہ کہ مجھ کو غموں سے نہیں فراغ دل سوزش درونی سے جلتا ہے جوں چراغ
سینہ تمام چاک ہے سارا جگر ہے داغ ہے نام مجلسوں میں میرا میر بے دماغ
از بسکہ کم دماغی نے پایا ہے اشتہار

مثنوی "مذمت دنیا" میں دنیا کا فانی ہونا اور اپنی ضعیفی کا حال نہایت عبرت انگیز پیرایہ میں بیان کیا ہے۔ اس مثنوی کی خوبی یہ ہے کہ اس سے میر کی ضعیفی کے دنوں کی تصویر آنکھوں میں پھر جاتی ہے

جوانی کی شب کیا بسر ہو گئی سفیدیٔ مو سے سحر ہو گئی
بدن زار اعضا سبھی رعشہ دار کرے کون خوباں سے بوس و کنار
جو یہ چال ہے جلد ہے میں ہم اب ڈھول پر غرض آرہے ہیں ہم اب
کھڑے ہیں تو تھرائے ران اور ساق جنیں بیٹھے کیونکہ کہ جینا ہے شاق
جو یوں پاؤں چلتے بچلتے رہے تو دیکھو گے ہم یاں سے چلتے رہے

اس مثنوی میں صرف بیان واقعی ہے۔ سودا کی طرح مبالغہ یا تخیل کی کارفرمائی نہیں۔ لیکن اس کے باوجود جو حسن اس احوال واقعی میں ہے وہ مبالغہ سے پیدا نہیں کیا جا سکتا۔

مثنوی "در بیان کذب" میں جھوٹ کے چلن کی طرف اشارہ ہے۔ کس طرح اس دور میں جھوٹ کا بول بالا تھا وہ مندرجہ ذیل اشعار سے بخوبی واضح ہو جاتا ہے:

اے جھوٹ آج شہر میں تیرا ہی دور ہے	شیوہ یہی سبھوں کا یہی سب کا طور ہے
اے جھوٹ تو شعار ہوا ساری خلق کا	کیا شہہ کا کیا وزیر کا کیا اہل زلق کا
اے جھوٹ تجھ سے ایک خرابی ہیں شہر بے	اے جھوٹ تو غضب ہے قیامت ہے قہر ہے

حضرت یوسف کو بھی اسی جھوٹ کی وجہ سے زنداں میں رہنا پڑا۔ اور کوہکن بھی اسی جھوٹ سے ولالہ کے فریب میں آکر تیشہ مار کر مر گیا۔ اسی جھوٹ نے میر کو بھی پریشان کیا۔ کوئی سچ بات نہیں کرتا میر لے اپنی تنخواہ کی فرد تعطلی ایک دوسرے شخص کو دے رکھی تھی لیکن وہ جھوٹے وعدول پر ٹالتا رہا۔ اور اسی طرح مہینوں ہی نہیں برسوں گذر گئے۔ لیکن ایک پیسہ کی بھی ادائگی نہیں کی گئی۔ اسی فرد تعطلی کا ذکر ایک مخمس میں بھی ہے جس کا حوالہ پہلے آچکا ہے

مثنوی در بیان "مرغ بازاں" میر کی ان اہم ہجویات میں سے ہے جن کا تعلق ان کی ذات اور ماحول سے ہے۔ یہ ہجو لکھنؤ کے مخصوص سماجی حالات سے متعلق ہے

دلی سے ہم جو لکھنؤ آئے	گرم پرخاش مرغ یاں پائے
پر و پرزا درست و یکساں ہے	مرغ تصویر کا بھی حیراں ہے
مرغ ہے ایک ایک جیسے کلنگ	قاز و سارس سے جنگ جس کا ننگ
حوصلہ کس قدر حواصل کا	ذکر کیا کرگس نشتر دل کا
لات کی گھات کر جو مڑ جاوے	نسر طائر کا رنگ اڑ جاوے
زہرہ ققنس کا اس خطر سے آب	شب نہ سووے ہراس سے سرخاب
بکری سا فیل مرغ کو مارا	کب شتر مرغ سے ہوا چارا

اس مرغ بازی میں جہاں سفیہوں کی باتیں سنائی دیتی ہیں وہاں بڑے لوگ بھی موجود ہیں۔

آدمی جو بڑے کہاتے ہیں	مرغ مارے بغل میں آتے ہیں
سرخہ و سبزوار کے سب مرغ	ہیں ثنا گستر ایسے تھے کب مرغ
ہو جو کہیں مرغ خانگی کے تئیں	مت سُن اس ہرزہ چانگی کے تئیں

ان بے فکروں کی مرغ بازی میر صاحب کی طبع نازک پر بڑی گراں گذری۔ کہاں دلی جہاں جنون اور وحشت کا دور دورہ تھا اور کہاں لکھنؤ کے بے فکرے جن کی بساط جنگ بساط شطرنج

تک محدود دھتی ۔ مرغ بازی ان کے کارہائے نمایاں میں شامل تھی اور گرمیِ محفل کے وسیلوں میں اس کا بھی شمار تھا۔

جیسے منگل کو پالی کی ہے دھوم گلیوں میں روز حشر کا ہے ہجوم
مرغ بازوں کو ہے قیامت جوش جس کو دیکھو تو مرغ در آغوش
مرغ لڑتے ہیں ایک دو لاتیں سیکڑوں ان سفیہوں کی باتیں
ان نے پر جھاڑے یہ پھڑکنے لگے ان نے کی نوک یہ کڑکنے لگے
وہ جو سیدھا ہوا تو یہ ہیں کج ساتھ اس کے بدلتے ہیں سج و صج

غرض یہ "طرفہ ہنگامہ" اور "طرفہ صحبت" نصف النہار تک باقی رہتی ہے۔ پھر:۔

کھانچے سر پر بغل میں مارے مرغ لے گئے جیتے ہارے سارے مرغ
پھر جو روز معیّن آوے گا نالہ مرغ سحر سنا دے گا
عالم آوے گا گرد ویسا ہی گرم ہنگامہ ہوگا ایسا ہی

لیکن میر کہتے ہیں کہ وہ ان گہما گہمیوں کے قائل نہیں۔ زوال پذیر سماج کی نشانا۔ہی اس سے بہتر ممکن ہی نہیں ہو سکتی۔ شاعر کا درجہ اگر پیغمبری تک پہنچتا ہے تو میر کا شمار بھی ان ہی پیغمبروں میں کیا جا سکتا ہے جنہوں نے ان حالات کی موجودگی میں آنے والے دور کی بشارت کی۔ میر کی یہ ہجو یہ مثنوی ان کے جذبات کی عکاسی ہی نہیں بلکہ اس میں مشاہدہ کی بصیرت بھی شامل ہے۔ میر کی سماجی ہجویات اگرچہ سودا کے پائے تک نہیں پہنچ سکیں۔ پھر بھی سودا کے بعد میر کے سوا اور کوئی باشعور ہجو گو نظر نہیں آتا۔ ان کی اس قسم کی ہجویات طنزیہ شاعری کی اعلے مثالیں ہیں۔

شخصی ہجویات کے ذیل میں میر ناکام ہیں۔ حقیقت کی عکاسی کرنے کی کوشش میں بعض جگہ سپاٹ اور سیدھی بات کہہ جاتے ہیں جس سے کوئی لطف حاصل نہیں ہوتا۔ جہاں جہاں تخیل کی رنگ آمیزی ہے وہاں بھی وہ سودا کا مقابلہ نہیں کر سکے۔ میر کی ایک خصوصیت جو انہیں ہجو گوئی میں ممتاز کرتی ہے ان کی عمومیت اور سنجیدگی ہے۔ سوائے چند ہجویات کے (ہجو بلاس رائے ہجو خواجہ سرا، در مذمت آئینہ دار) انہوں نے متانت کا دامن کہیں ہاتھ سے جانے نہیں

دیا۔ جب کہ سودا نے بیشتر فحش کلمات سے زبان کو آلودہ کیا۔ اچھا ہجو نگار وہ ہے جو ذاتی عناد یا کسی کمزوری کو صرف کسی مخصوص فرد کی عیب جوئی یا تمسخر تک محدود نہ رکھے بلکہ اس میں ایک عمومیت پیدا کر دے تاکہ وہ تمام اشخاص اس کے دائرے میں آ جائیں جن میں وہ خامیاں موجود ہیں۔ میر نے زیادہ تر ہجو یات کی بنیاد افراد کی ان ہی کمزوریوں پہ رکھی ہے۔ وہ اپنے مد مقابل کی ہجو نااہل، عاقل، جاہل، اکول اور نائی کے پردہ میں کرتے ہیں اور کسی مخصوص فرد کو (سوائے تین ہجویات کے) اپنے تمسخر اور طنز کا نشانہ بنانے سے احتراز کرتے ہیں بلکہ ہر وہ شخص جس میں یہ خامیاں موجود ہیں، اس لعن طعن کا مستحق ہو جاتا ہے۔ یوں تو میر بھی سید تھے اور اہل تشیع بھی لیکن وہ کبھی سودا کی طرح مذہب کو بیچ میں نہ لاتے اور نہ کسی کی ہجو صرف اس وجہ سے کی کہ اس میں اور ان میں کوئی مذہبی اختلاف تھا۔ معاویہ کو خلیفہ ہجم کہہ دینا سودا کے مذہبی جذبات کو اشتعال دلانے کے لئے بہت کافی ہے۔ انہوں نے غیض اور غضب میں شاہ ولی اللہ محدث رح کی بزرگی کا بھی کوئی خیال نہیں کیا۔ حالانکہ اس بات کا کوئی واضح ثبوت نہیں ہے کہ شاہ ولی اللہ محدث نے ایسا کہا بھی تھا یا نہیں۔ میر کی ہجو میں بھی انہوں نے ان کے ۔۔۔ ہونے پر شک کر کے نفرت اور حقارت کا مظاہرہ کیا ہے۔

" ہجو عاقل نام ناکسے کہ بہ سگاں انسے تمام داشت " میں ایک ایسے شخص کی ہجو کی گئی ہے جو کتوں کا شیفتہ تھا اور ہر وقت کتوں کی دیکھ بھال اور پرورش میں لگا رہتا تھا لیکن مذہبی نقطہ نظر سے کتا تمام مسلمانوں کے نزدیک نجس ہے اور یہ غیر اسلامی حرکت میر کو ایک آنکھ نہیں بھاتی۔ شاید صرف یہی ایک ہجو یہ مثنوی ہے جس میں میر نے غیر اسلامی شعائر کے بارے میں کچھ کہا ہے۔ اصل میں یہ مثنوی سودا کی شان میں کہی گئی ہے۔ جنہیں کتوں کا بہت شوق تھا۔ سودا اپنے اس شوق کا ذکر ندوی کی ہجو میں اس طرح کرتے ہیں:

سن بے الو پہنچ کے بنگالے　　　مادہ سگ آپ کو تو بھوا لے

میرے تئیں گو ہے بس کہ ذوق سگ　　　سگ بہت خوب میں نے ہیں پالے

میر اس مثنوی میں سودا کا کتوں سے شوق اس طرح بیان کرتے ہیں:

کتے ہیں پاس کتے ہیں جیب و کنار میں　　　کتے ہیں آستینوں میں کتے ازار میں

آیا جو ایک روز وہ سب سے نہ چلا ہوا | کتا ازار اس کے سے نکلا بندھا ہوا
یک سگ گزیدہ کی سی طرح جھومنے لگا | پھر کھول اس کے منہ کے تئیں چومنے لگا
ایسی بھی ہم نے دیکھی نہیں کتوں کی ہوس | گردن میں اپنے ڈالے پھرے روز و شب مرس

ضرب المثل کو یہاں کس خوبصورتی سے نظم کیا ہے:

کتوں کی جستجو میں ہوا روڑا باٹ کا | دھوبی کا کتا ہے کہ گھر کا نہ گھاٹ کا

میر کو بلیوں کا شوق تھا۔ ایک مثنوی میں اس کا ذکر بھی کیا ہے۔ یہاں کہتے ہیں:

بلی جو پالتا تو بھلا ایک بات تھی | آپس میں اس کی دوستی ایماں کے ساتھ تھی

سودا نے اس کے جواب میں ایک مخمس بعنوان "در ہجو طعن میر تقی کہ فی الحقیقت میر شیخ بودہ است" کہا، یہ میر کے اسی طعنہ کا جواب ہے:

اکثر تو مرے خبث کہتا ہے یہی بات | کتوں میں فلانے کی شب و روز ہے اوقات
خود اس کی نجاست کا نہیں کتے پر اثبات | لازم ہے مسلماں نہ کرے اس سے ملاقات
یہ چاہیئے صحبت سے رکھے ایسے کی اکراہ

یہ سچ ہے جو کہتا ہے تو مجھ پر بھی یقیں ہے | کتے کو کہے پاک سو وہ دشمن دیں ہے
لیکن وہ سگ نفس نجس اس سے کہیں ہے | تجھ پر جو ہر اک لحظہ و ہر آن تعیں ہے
تو اس کا نہ کہنا کرے نت پاک ہے واللہ

ایک جگہ سودا نے میر پر شبہ کیا کہ ان کے نانا نانبائی تھے اس لئے کہتے ہیں:

بیٹھے تنور طبع کو جب گرم کر کے میر | کچھ شیر مال سامنے کچھ نان کچھ پنیر
میری ۔ اب تو سارے مصالحہ ہیں مجتمع | بیٹا تو گندنا ہے اور آپ کو خمیر

ایک دوسری مثنوی جس کا عنوان "ہجو نااہل مسمی بہ زبان زد عالم" ہے یہ بقا کی ہجو میں ہے نسخہ حیدرآباد میں بجائے "نااہل" کے "بے ادب" لکھا ہے اور رامپور میں کلیات میر کے مخطوطے میں اس مثنوی کا نام "در ہجو محمد بقا" ہے۔ غالباً یہ بقا اللہ خاں بقا شاگرد فاخر مکیں ہیں یہ میر اور سودا دونوں کے حریف تھے اور دونوں استادوں کے کمالات فن کے قائل نہ تھے۔ ایک جگہ[1]

---

[1] گل رعنا ص ۲۱۳

میر نے کہا ہے

پگڑی اپنی سنبھالیئے گا میر　　اور بستی نہیں یہ دلی ہے

ایک مرتبہ میر و میرزا دونوں کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کیا۔

میر و مرزا کی شعر خوانی نے　　بسکہ عالم میں دھوم ڈالی تھی
کھول دیوان دونوں صاحب کے　　اے بقا ہم نے جب زیارت کی
کچھ نہ پایا سوائے اس کے سخن　　ایک تو تو کہے ہے ایک ہی ہی

دوآبہ کا مضمون جو ان کے شعر میں بھی آ گیا تھا اور میر کے ایک شعر میں بھی اس کا ذکر تھا۔ بقا یہ سمجھے کہ میر نے میرا مضمون چرایا ہے[1]۔ بقا کا شعر تھا:

سیلاب سے آنکھوں کے رہتے ہیں خرابے میں　　ٹکڑے جو مرے دل کے بستے ہیں دوآبے میں

میر کا شعر اس طرح ہے:

وے دن گئے کہ آنکھیں دریا سی بہتیاں تھیں　　سوکھا پڑا ہے اب تو مدت سے یہ دوآبا

بقا نے بگڑ کر یہ قطعہ کہا:

میر نے گر ترا مضمون دوآبہ کا لیا　　اے بقا تو بھی دعا دے جو دعا دینی ہو
یا خدا میر کی آنکھوں کو دوآبہ کر دے　　اور بینی کا یہ عالم ہو کہ تربینی ہو

مصحفی "تذکرہ ہندی گویاں" میں بقا کے متعلق لکھتے ہیں:

"جوان سراپا خلق و ظریف مزاج قانع دیدم مش طبع شوخش بہ طرف ہجو بسیار مائل افتادہ در شاہ جہاں آباد با میر و در لکھنؤ با میرزا رفیع معرکہ گیری با کردہ بود قوت طبع خود را ظاہر نمودہ"[2]

بقا نے ایک جگہ اور میر و میرزا کی خبر لی ہے:

مرزا و میر دونوں باہم تھے نیم ملا　　فن سخن میں یعنی ہر ایک تھا ادھورا
اس واسطے بقا اب ہجو ان کی بیاں میں　　دونوں کو باندھ ہم نے اب کر دیا ہے پورا

---

[1] گل رعنا صفحہ ۲۱۲　　[2] تذکرہ ہندی صفحہ ۴۳

میر اس ہجو میں نہایت غضبناک نظر آتے ہیں۔ مثنوی کا پہلا شعر ہے:

سُنیو اے اہلِ سخن بعد از سلام چھیڑنا ہے مجھ کو ایک تم حرام

دُوسری جگہ ان لوگوں کو خطاب کر کے کہتے ہیں جو میر کو بلا وجہ چھیڑتے ہیں:

شاعری کو میری ہو گے جانتے تم چنانچہ سب مجھے ہو مانتے
مَیں ہمیشہ سے رہا ہُوں باوقار کن دنوں تھا ہجو کا کرنا شعار
گر کسھوں نے کچھ کہا میں چُپ رہا ہجو اس کی ہو گئی اس کا کہا
کیا ہوا گر چاند پر پھینکی رہیں خاک پڑتی ہے ان سب کے منہ پر مَیں ہُوں پاک

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ میر کبھی پہل نہیں کرتے تھے بلکہ اکثر طرح دے جاتے تھے۔ لیکن جب عاجز آجاتے تو اُن کے منہ میں بھی زبان تھی۔

رہیو شاہد کچھ نہیں میرا گناہ مدعی بے ہیچ ہے یہ رو سیاہ
تھا تحمل مجھ کو مَیں درویش تھا دردمند و عاشق دلریش تھا
کیا کروں بُرا علاجی سی ہے اب غصّے کے مارے چڑھی ہے مجھ کو تب

اس کے بعد اپنی استادی کا ذکر کرتے ہیں اور پھر بقا کی ہئیت کذائی کا مضحکہ اُڑاتے اور اس لفظی جنگ کے لئے تیار ہو تے ہیں۔ میر نے بقا کا بہت خیال کیا لیکن جب یہ حضرت حد سے بڑھ گئے تو میر کے صبر کا دامن چھوٹ گیا۔

مَیں نے پاس اس کا کیا حد سے زیاد ہرزگی کرتا ہے کب یہ ابن زیاد
قبلہ کہتے کہتے ہاجی ہو گیا پاس ظاہر چھوڑ پاجی ہو گیا

اس ہجو میں کہیں کہیں فحش کلمات بھی آ گئے ہیں جو اُن کے غصّے کی شدّت کا اظہار کرتے ہیں اسی ہجو میں وہ مشہور شاعرانہ تعلّی بھی ہے جو اُن کے منہ پر ہی اچھی لگتی ہے۔

سارے عالم میں ہُوں مَیں چھایا ہوا مستند ہے میرا فرمایا ہوا

مثنوی تنبیہہ الجہال میں میر اس وجہ سے برافروختہ نظر آتے ہیں کہ جھوٹے شاعر جاہل متشاعروں کو اپنا شاگرد بنا لیتے ہیں اور پھر مشاعروں میں یہ لوگ میر و میرزا جیسے اُستادوں کے منہ آتے ہیں۔

وہ سراپا جہل ناگہہ وقت کار — ہم سے تم سے کرنے لاگا اعتذار
سر میں رکھ کر دعویٰ طبع لطیف — میر و میرزا کا ہوا آخر حریف

لیکن ایسے لوگوں کا شاعری سے کیا واسطہ؟

نکتہ پردازی سے اجلافوں کو کیا — شعر سے بزازوں نداّفوں کو کیا

مثنوی "اژدر نامہ" میں شاعر خود اژدر خونخوار ہے اور ہم عصر شعراء کو مینڈک، چوہا، چھپکلی لومڑی وغیرہ ٹھہرایا ہے۔ ابتدائی اشعار ہی میں کہتے ہیں:

یہ موذی کئی ناخبردار فن — نئی ناگنیں جن کے نینگوں پہ پھن
نہیں جانے ہوں میں مار سیاہ — زبانہ ہے آتش کا میری نگاہ
نفس ہے میرا افعیٔ پیچ دار — گیا جس سے خصم تو ہی من کو مار

اس کے جواب میں محمد امان نثار شاگرد حاتم نے فی البدیہہ چند شعر کا قطعہ پڑھا جس کا مقطع ہے:

حیدر کرار نے وہ زور بخشا ہے نثار — ایک دم میں دو کروں اژدر کے کلے چیر کر

مثنوی در ہجو "شخصے بیچمداں کہ دعویٰ ہمہ دانی داشت عرف دم الفضول" عبد الباری آسی کی دریافت ہے۔ اس مثنوی میں کسی برخود غلط قسم کے عالم کی ہجو ہے جو اپنے آپ کو بہت قابل سمجھتا ہے اور اپنے شاگرد کے سوالات کا نہایت مضحکہ خیز جواب دیتا ہے جس سے مزاح کا لطف پیدا ہو گیا ہے۔

جب اس عالم سے تجنیس کے بارے میں پوچھا گیا تو اس نے جواب دیا:

تجنیس کا سوال کیا اس سے ایک روز — کہنے لگا اس اسپ کو کہتے ہیں جو ہو یوز
نادان تو نے اسپ مجنّس نہیں سنا — مشتق اسی سے جانے ہے جو ہے پڑھا گنا
لاتے جہاں ہیں شعر میں تجنیس شاعراں — مذکور ان سے ہوتے ہیں گھوڑوں کے وصف واں

مثنوی "در مذمت آئینہ دار" کے بارے میں گمان غالب ہے کہ یہ عنایت اللہ عرف کلو حجام شاگرد سودا کی ہجو ہے۔ اس مثنوی میں میر نے ایک جگہ سودا سے اپنی برتری کا اظہار بھی کیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کلو نے شاگردی کے ناتے کہیں سودا کو میر سے برتر کہہ دیا ہوگا۔ میر

کہتے ہیں:

میر و مرزا میں حکم ہووے خرد — نے کر نائی جس پہ سب کا دست رد
سمجھے مرزا میر کو مرزا کو میر — نے وہ رگ زن جو نہ سمجھے شیر شیر
مجھ میں میرزا میں تفاوت ہے بہت — یاں نائی داں عجالت ہے بہت
جس جگہ میں نے رکھی منہ میں زباں — ہوتے اس جاگہ جو میرزا بے گماں
استرے کانوں میں اپنے باندھ کر — کب کے اب تک گھس گئے ہوتے اُدھر

آخری شعر کی رکاکت نمایاں ہے۔ آگے بھی کئی جگہ میر نے فحش الفاظ کا استعمال کیا ہے جو ان کی نفرت کا اظہار کرتے ہیں۔

مثنوی در ہجو "اکول" ایک پیٹو کی ہجو ہے۔ سودا نے بھی اس موضوع پر ایک مثنوی لکھی ہے جو ضاحک سے متعلق ہے۔ دونوں کا موضوع ایک ہی ہے۔ لیکن سودا کے تخیل نے مزاح کے امتزاج سے مضحکہ خیز فضا بنائی ہے جب کہ میر مزاح پیدا کرنے میں کسی حد تک قاصر رہے ہیں۔ ایک جگہ کہتے ہیں:

نہ ٹلے دیکھ کر وہ قاب پلاؤ — منہ ہی منہ بیٹھا اگرچہ کھاوے گھاؤ
کھانے پر جب وہ جی چلاتا ہے — لاٹھی پاٹھی بھی کھانے جاتا ہے
نہیں پہونچے جو کھانا کھانے لگ — ہڈیوں پر لڑے ہے جیسے سگ
بھوک کا باؤلا جو آتا ہے — لوگوں کو کاٹ کاٹ کھاتا ہے

سودا بسیار نوشی کا ذکر اپنے تخیل کی بلند پروازی سے بڑا مضحکہ خیز بنا دیتے ہیں۔

آگ لگ کر کسی کے گھر سے دود — ایک ذرہ بھی گر کرے ہے نمود
لوگ تو دوڑے ہیں بجھانے کو — دوڑے یہ لے رکابی کھانے کو
ہر کسی بنیئے کی دکان پر جا — اپنی باتوں میں اس کو لے ہے لگا
کام ہر دجہ اپنا کر لیوے — کلے بندر کی طرح بھر لیوے

سودا کی شخصی ہجویات زعفران زار ہیں۔ لیکن میر کی ہجویات میں ظرافت کی کمی انہیں اس پایہ تک نہیں پہنچاتی۔ "ہجو خواجہ سرا" اور "ہجو بلاس رائے" اس کی نمایاں مثالیں کہی جاسکتی ہیں

بلاس رائے کا تعارف وہ اس طرح کرتے ہیں:

ایک عمدہ کے ہاں ہے اہل کار　　فوج کے لوگوں کا سب اس پے مدار
اور یہ ہنگامہ اس وجہ سے کھڑا ہوا۔
جب سے یہ ہے محرر دفتر　　تب سے ہنگامہ ہی رہا اکثر
ہووے پر جیا جو دے کسو کو زر　　سو یہ پٹی پڑھا نہیں ہے پچر
سب سے اس کو ہے ایک جنگ و جدال

میر کو اس سے مخاصمت اس بناء پر ہوئی:

قصہ کوتاہ بعد چندیں ماہ　　میری اس کھڑ دے پر ہوئی تنخواہ
جانے آدم لگا گہ و بے گاہ　　یہ تو مغرور بے تہ و گم راہ
مفتری، کاذب و سفیہ و ضلال

اس نے میر کی اہمیت کو سمجھا ہی نہیں میر اس طرف بھی اشارہ کرتے ہیں۔

سہل سا مجھ کو بھی سمجھ کے فقیر　　رکھنے دعووں ہی میں لگا بے پیر
یہ نہ جانا نہیں ہے اس کی نظیر　　اس کو جانے ہیں بادشاہ و وزیر
دور تک پہنچیں گے یہ قیل و قال

آٹھ آنے کی فرد دستخطی کی وجہ سے شیخ جی کی ہجو میں مخمس کہا۔ اسی فرد دستخطی کا ذکر مثنوی در بیان کذب میں کیا اور تنخواہ جاری نہ کرنے پر بے چارے بلاس رائے کی خبر لی۔ اس سے یہ نتیجہ نکالنے میں دشواری نہیں ہوتی کہ میر کس قدر مفلوک الحال تھے اور آٹھ آنے کی فرد دستخطی یا تنخواہ کی ادائیگی میں کتنے قیل و قال کئے جاتے تھے۔ اس ہجو میں اہلیہ بلاس رائے کی بھی وہی درگت بنی ہے جو سودا کے یہاں اہلیہ ضاحک اور دختر ندرت کاشمیری کی بنی ہے۔

ہجو "خواجہ سرا" میں کسی خواجہ سرا کے متعلق ایک فحش قصہ گھڑ کر اسے نظم کیا ہے کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی کہ بے چارے کی یہ درگت کیوں بنی؟ ہو سکتا ہے کہ یہ بھی دستور زمانہ رہا ہو جیسا کہ میر کے فارسی رسالہ "فیض میر" سے پتہ چلتا ہے کہ اس میں پانچ درویشوں کے قصے ہیں اور اپنی عقیدت مندی کا بیان ہے۔ لیکن آخر میں چند فحش لطیفے بھی ملتے ہیں جن کی وہاں کوئی ضرورت نہ تھی نہ جانے

یہ گیا اس زمانہ کا دستور تھا کہ لوگ سنجیدہ باتیں کرتے کرتے فحش کلمات سے اپنی زبان کو آلودہ کئے بغیر نہیں رہ سکتے تھے۔ میر کی ہجویات کا مطالعہ کرتے وقت ان کی سیرت و شخصیت، ان کے سوانح زندگی اور ان کے عہد کے سیاسی و معاشی خلفشار کو ذہن میں رکھنا چاہیئے۔ جب ہی ان کی اہمیت کو پرکھا جا سکتا ہے ورنہ ان کی اہمیت کچھ نہیں رہ جاتی۔ سودا اس میدان کے شہسوار ہیں لیکن وہ بھی اکثر ٹھوکر کھا جاتے ہیں۔ میر غزل کے مرد میدان ہیں۔ مثنوی میں بھی انھوں نے کارہائے نمایاں انجام دئے ہیں لیکن قصیدہ میں وہ سودا کے ساتھ چند قدم بھی نہ چل سکے۔ دراصل ان کا مزاج خارجی شاعری کے لئے بنا ہی نہیں۔ انہوں نے تو صرف رسم زمانہ کی پیروی کی ہے۔

شخصی ہجویات میر نے چند ہی کہی ہیں ان میں نہ تو ان کی عشقیہ مثنویوں کی سی روانی ہے اور نہ سودا کی ہجویات کی طرح تخیل آفرینی۔ لیکن جن نظموں میں اشیا یا واقعات کی ہجو کہی ہے وہ ان کی بلند پایہ ہجویات ہیں۔ شخصی ہجویات کے ذیل میں ہم بآسانی کہہ سکتے ہیں کہ انہیں اس قسم کی ہجویں کہنے پر مجبور کیا گیا ورنہ وہ دل سے اسے پسند نہ کرتے تھے، نہ کبھی انہوں نے پہل کی۔ اگر کوئی منہ لگا تو صبر کیا۔ جب صبر کی حد ہوگئی تو پھر زبان سے جو کچھ نکلا، غصہ میں اس کا خیال نہ کیا۔ ان کا طنز ان کی زندگی کے تجربات کی دین ہے۔ اسی وجہ سے اس میں انفرادیت ہے۔ وہ اپنے آپ پر ہنستے بھی ہیں اور اپنی ہیئت کذائی سے لطف بھی لیتے ہیں۔ اس طنز میں مایوسی یا نفرت کا اظہار تو ہے لیکن اس سے لطف لینے کی صلاحیت بھی موجود ہے۔ میر ذاتیات میں کم ہی الجھے ہیں بلکہ اپنے ماحول کو ہجو کا نشانہ بنایا ہے۔ بقول ڈاکٹر وزیر آغا[1]۔

"میر دراصل نہاں خانہ دل کے شاعر ہیں اور اپنے شعر میں ماحول کی عکاسی کے بجائے داخلی طریق کار اختیار کرتے ہیں۔ چنانچہ جب وہ اپنے "گھر" میں ایک لحظہ کے لئے جھانکتے ہیں تو دراصل اپنے نہاں خانہ دل میں جھانک رہے ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دل کے انتشار اور بے قراری کی طرح "گھر" کی ابتری اور بے ترتیبی بھی ان کے لئے دلچسپی کا موجب ہے اور یہاں ان کے قلم میں وہی روانی پیدا ہو جاتی ہے جو ان کی غزلیات کا مابہ امتیاز ہے۔"

---

[1] اردو ادب میں طنز و مزاح صفحہ ۱۰۸

یہ حقیقت ہے کہ میر کی ہجویات سودا کی ہم پلہ نہیں۔ ان میں گہرائی، اچھالنے یا مزاح پیدا کرنے کی صلاحیت سودا سے کم ہے لیکن صنف ہجو میں سودا کے بعد میر ہی کا نمبر آتا ہے۔ انھوں نے ہجو جیسی خارجی صنف کو بھی داخلی بنا کر پیش کیا۔ ان کا یہ اجتہاد جہاں مثنوی میں نمایاں ہے وہاں ہجو میں منفرد ہے۔ میر کے بعد کئی ہجوگو ہوئے لیکن میر جیسی بات کوئی اور نہ پیدا کر سکا ٭

ابو محمد سحر

میر کے قصیدے

دنیائے شاعری میں میر کی عظمت کا انحصار ان کی غزل گوئی پر ہے۔ اس میں نہ صرف ان کے تخلیقی کمالات کی معراج دکھائی دیتی ہے بلکہ کئی لحاظ سے اردو غزل کی معراج بھی اسی سے عبارت ہے لیکن اسی کے ساتھ ساتھ اردو شاعری کی دوسری صنفوں میں بھی ان کے کلام کا ایک معتد بہ حصہ موجود ہے۔ یوں سمجھیے کہ اگر ان کے کلام کے دو تہائی حصے میں غزلیں ہیں تو ایک تہائی حصے میں دوسری اصناف شاعری کے نمونے ہیں جن میں قصیدہ بھی شامل ہے۔ مطبوعہ کلیات میں کل سات قصیدے ہیں، ان میں سے تین قصیدے حضرت علیؑ، ایک قصیدہ حضرت امام حسینؑ، ایک شاہ عالم اور دو قصیدے نواب آصف الدولہ کی شان میں ہیں، لیکن میر کا ایک قصیدہ اور ہے جو ان کے دیوان اول کے قلمی نسخہ مملوکۂ ادارۂ ادبیات اردو، حیدرآباد دکن میں درج ہے۔ اس کا عنوان ہے "قصیدۂ در شکایتِ نفاقِ یارانِ زماں"۔ اسی نسخے میں ایک قصیدہ "در تعریف امام رضا" کے عنوان سے بھی درج ہے لیکن یہ وہی قصیدہ ہے جو امام حسین کی منقبت میں ہے اور مطبوعہ کلیات میں شامل ہے۔ عنوان میں تحریف غالباً کاتب کا سہو یا تصرف ہے۔ ان آٹھ قصیدوں کے علاوہ میر کے کسی اور قصیدے کا پتا نہیں چلتا۔

میر کے قصیدوں کے متعلق جیسا کہ بیشتر قصائد کا حال ہے یہ بتانا ناممکن ہے کہ کون سا

قصیدہ کس سن میں لکھا گیا۔ کیونکہ نہ تو ان کے سنین تصنیف کہیں درج ہیں اور نہ ایسے شواہد ملتے ہیں جن سے ٹھیک ٹھیک ان کا تعین کیا جا سکے لیکن میر کے دیوان اول کے مذکورہ قلمی نسخے کی مدد سے ان کے زمانۂ تصنیف کے بارے میں ایک حدِ فاصل ضرور قائم کی جا سکتی ہے۔ یہ نسخہ ۱۱۹۲ھ کا لکھا ہوا ہے۔ اس لئے یہ یقینی ہے کہ حضرت علیؑ، امام حسین اور شاہ عالم کی مدح کے قصیدے، قصیدہ در شکایت نفاق یاران زماں اور آصف الدولہ کی مدح میں قصیدۂ رائیہ جو اس میں مدرج ہیں ۱۱۹۲ھ اور اس سے پہلے کے لکھے ہوئے ہیں۔ میر کا لکھنو جانا ۱۱۹۶ھ سے پہلے ثابت نہیں ہے اس لئے یہ نتیجہ بھی نکلتا ہے کہ یہ سب قصیدے لکھنو جانے سے پہلے لکھے جا چکے تھے۔ آصف الدولہ کی مدح میں قصیدۂ رائیہ اگر دہلی میں لکھا جا چکا تھا تو یہ بھی صاف ہے کہ ان کی مدح میں دوسرا قصیدہ لکھنؤ میں لکھا گیا اور یہی ایک قصیدہ لکھنؤ کی تصنیف ہے۔ لیکن قصیدۂ رائیہ کا ۱۱۹۲ھ میں یا اس سے پہلے لکھا جانا بجائے خود کافی دلچسپ ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ میر لکھنؤ روانہ ہونے کے کئی سال پہلے سے اس کے لئے کوشاں تھے یہاں تک کہ انہوں نے آصف الدولہ کی مدح میں ایک قصیدہ بھی لکھ لیا تھا۔ بقول آسی یہی وہ پہلا قصیدہ ہے جو میر نے لکھنؤ پہنچنے کے بعد آصف الدولہ کے حضور میں پڑھا تھا اور اس میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں ہے۔[1]

خواجہ احمد فاروقی نے یہ دکھانے کے لئے کہ لکھنؤ آنے کے بعد میر کو دہلی جانے کا کیسا ارمان تھا حضرت علی کی شان میں ایک قصیدے سے عرض مطلب کے یہ اشعار نقل کئے ہیں[2]

گرمی کرے تنک بھی اعانت تری تو پھر
آجائے پختگی پہ مرا یہ خیال خام

یعنی کہ دیکھوں حضرت دہلی کی جا نواح
معلوم ہے سوائے ترے حاصل کلام

---

[1] قاضی عبدالودود نے شبہ ظاہر کیا ہے۔ ملاحظہ ہو "معاصر" پٹنہ ۹، ص ۱۷۷
[2] میر تقی میر ص ۲۵۵

لیکن چونکہ یہ قصیدہ میر کے دیوان اوّل کے قلمی نسخہ مکتوبۂ ۱۱۹۲ھ میں درج ہے اس لئے ان اشعار کا لکھنؤ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ غالباً یہ اشعار اس زمانے کے ہیں جب میر کئی سال تک دہلی سے دُور راجہ ناگر مل کی مصاحبت میں تھے۔

آزاد نے میر کے لئے ایک موقع پر لکھا ہے کہ "امراء کی تعریف میں قصیدہ نہ کہنے کا یہ بھی سبب تھا کہ توکل و قناعت انہیں بندہ کی خوشامد کی اجازت نہ دیتے تھے یا خود پسندی اور خود بینی جو انہیں اپنے آپ میں غرق کئے دیتی تھی وہ زبان سے کسی کی تعریف نکلنے نہ دیتی تھی"[1] میر کا توکل، قناعت، خود پسندی اور خود بینی تسلیم لیکن ان میں سے کوئی "وصف" اس حد تک نہ تھا کہ میر کو امراء کے توسل یا ان کی تعریف سے باز رکھتا جیسا کہ آزاد کی عبارت سے غلط فہمی ہوتی ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو نہ تو وہ کسی امیر سے توسل رکھتے اور نہ کسی کی شان میں قصیدہ لکھتے۔ مصاحبت اور مدح سرائی کو کامیابی سے نباہ نہ سکنا اور ان سے یک قلم احتراز کرنا دو مختلف کیفیتیں ہیں۔ میر مصاحبت اور مدح سرائی کو نباہ نہ سکتے تھے لیکن مصاحبت اور مدح سرائی سے انہیں گریز نہ تھا۔ انہوں نے اپنے محسنین سے کیا پایا یا کیا نہیں پایا، اس سے ہمیں غرض نہیں، سوال صرف ان سے توسل رکھنے اور ان کی سرپرستی حاصل کرنے کا ہے۔ اس کی تفصیل بیان کرنے کی چنداں ضرورت نہیں کہ درویش منش کے باوجود ان کی عمر کا کافی حصّہ امیروں اور سرپرستوں کے تعاقب میں گذرا۔ یہی وہ محرک تھا جو انہیں بالآخر خرابۂ دلّی سے بہارستان لکھنؤ کی طرف لایا۔ ورنہ فقر و فاقہ کی زندگی گذارنے کے لئے اس وقت کے ہندوستان میں دلی سے زیادہ موزوں جگہ اور کون سی ہو سکتی تھی، یہ اور بات ہے کہ وہ لکھنؤ آنے کے بعد خرابۂ دلّی کو لکھنؤ سے وہ چند بہتر سمجھنے پر مجبور ہو گئے اور غمِ دل کی طرح غمِ دلّی نے بھی کھلے طور پر ان کی زندگی میں ایک مستقل حیثیت اختیار کر لی۔ واقعہ یہ ہے کہ دلی چھوڑ کر لکھنؤ آنے کے معاملے میں میر اور سودا میں صرف تفصیلات کا فرق رہ جاتا ہے۔ جہاں تک شاعری کا تعلق ہے قصیدے کے علاوہ مثنوی میں بھی انہوں نے مدحیہ کلام یادگار چھوڑا ہے جس سے اس خیال کو اور بھی تقویت پہنچتی ہے کہ انہیں مدح و ستائش سے عار نہ تھی۔ ان کے قصیدوں کے بعض اشعار سے پتا چلتا ہے

---

[1] آب حیات صفحہ ۲۰۵

کہ اپنے زمانے کے تصورات کے مطابق آستان وزیر کی خاک بننے کے وہ بھی متمنی تھے اور مدح سرائی یہاں تک کہ بھٹئی تک انہیں پسند خاطر تھی ۔ مثلاً

غزل کو سن کے کہا ہمنشیں نے تجھ سا شخص
بجا ہو خاک ہو گر پیش آستان وزیر
——————(در مدح آصف الدولہ)

بھٹئی تیری کیجے یہ دل چاہتا ہے
نرسے شکر نعمت میں قاصر زباں ہے
——————(در مدح شاہ وقت)

اسی طرح قصیدے کو سر انجام کرنے میں وہ حتی الامکان کاوش و اہتمام سے کام لیتے تھے ممدوح کے وصف مجمل سے انہیں تسکین نہ ہوتی تھی، قصیدے کو بخیر و خوبی ختم کرنا چاہتے تھے، اپنے قصیدے کو قصیدۂ غرّا اور مدح میں حرف و سخن سے اجتناب کو کفر سمجھتے تھے۔

جی میں ہے اور بھی مطلع کے تئیں کریئے نمود　　دل کو تسکین نہیں بخشتا وصف مجمل
——————در منقبت حضرت علی

مطلع کروں ہوں اور بھی موزوں میں اس جگہ　　تا ہو بخیر و خوبی قصیدہ کا اختتام
——————در منقبت حضرت علی

میلان طبع مطلع ثالث کی اور ہے　　تا خیر پر قصیدۂ غرّا کا ہو مآل
——————در منقبت حضرت علی

مطلع ثانی کی اب مائل ہے طبع　　کفر ہے حرف و سخن سے اجتناب
——————در مدح آصف الدولہ

میر نے مشکل زمین میں کوئی قصیدہ نہیں لکھا لیکن کئی قصیدوں میں وہی زمینیں اختیار کی ہیں جو سودا کے بعض معرکہ آرا قصیدوں کی ہیں اور فارسی قصائد سے ماخوذ ہیں۔ اجزا ئے ترکیبی کے اعتبار سے بھی ان کے قصائد کا ڈھانچا وہی ہے جو سودا کے قصیدوں میں ملتا ہے۔ ان کا ہر قصیدہ تشبیب سے شروع ہوتا ہے جس کا ایک جز اکثر غزل بھی ہوتی ہے، اس کے بعد

گریز، پھر مدح غائب و مدح حاضر اور آخر میں عرض مطلب و دعا کے حصے آتے ہیں۔ درمیان میں کئی کئی مطلعے ملتے ہیں۔ تشبیب میں میر نے آسمان و زمانے کی شکایت اور دُنیا کی بے ثباتی اور نیرنگی کے مضامین سب سے زیادہ نظم کئے ہیں۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

فلک کے جور و جفا نے کیا ہے مجھ کو شکار | ہزار کوس پہ ہے جائے اک تپیدن دار
خراب کوہ و بیابانِ بے کسی ہوں میں | برنگ صوت جرس ہر طرف ہے میرا گذار
بغیر خوردن خوں کب نہار ٹوٹے ہے | سوائے گریۂ صبح اب کہاں ہے آب خمار
سوائے نالہ جاں سوز کون ہے دل سوز | بغیر آہ سحر گاہ کون ہے غم خوار

——— در منقبت امام حسین

کیا ہیں اندھیر فلک کے کہ نہیں ملتی داد | روز خورشید نکلتا ہے جلا کر مشعل
جو ہے سو دست بہ دل خاک بسر ہے اس سے | میں بھی نکلوں ہوں سدا منہ پہ کف خاک کو مل

——— در منقبت حضرت علی

برائے یک لب ناں مجھ ضعیف کو ان نے | ہلال وار کیا سارے شہر میں تشہیر

——— در مدح آصف الدولہ

تو یوں ہی کھینچے ہے یہ نقش برآب اے منعم | کیسی محبوب گئیں صورتیں اس خاک میں رل

——— در مدح حضرت علی

اس قسم کے مضامین کی بہتات کا سبب بالواسطہ زندگی سے عام بے اطمینانی کو قرار دیا جا سکتا ہے لیکن میر نے انھیں عموماً رسمی اور روایتی انداز میں پیش کیا ہے۔ ان میں بلاواسطہ میر کے زمانے کی معاشرتی بدحالی اور اہل علم و ہنر کی کس مپرسی وغیرہ کا بیان نہ ہونے کے برابر ہے۔ بعض جگہ اس کے ذکر میں میر ایک عاشق زار دکھائی دیتے ہیں، ان کو شکوہ ہوتا ہے تو یوں کہ نمک بجز رخ دل دار کے اور کہیں نہیں نظر آتا اور اس کو دیکھنے کے لئے بھی کوچہ و بازار میں مارا مارا پھرنا پڑتا ہے کیونکہ گھر بیٹھے اس کی صورت نہیں نکلتی۔

لگیں نہ داغ سو کیوں پھیکے میرے سینے میں | نمک نہیں نظر آتا بجز رخ دل دار
سو وہ بھی دیکھنا اماں نہیں ہے گھر بیٹھے | مگر ہوں ہند میں رسوائے کوچہ و بازار

تاہم آصف الدولہ کی مدح میں ایک قصیدے کی تمہید میں انہوں نے براہ راست انقلاب زمانہ کا بیان کیا ہے۔ اگرچہ غیر معمولی اختصار پڑھنے والے کو ناآسودہ چھوڑتا ہے لیکن جو چند اشعار ہیں وہ صاف اور موثر ہیں۔

رات کو مطلق نہ تھی یاں جی کو تاب — آشنا ہوتا نہ تھا آنکھوں سے خواب
ہر زماں تھی ساتھ اپنے گفتگو — کیا کروں ست ہر اور میں دونوں خراب
تھا کرم شیوہ جنھوں کا اُٹھ گئے — بیٹھے بیٹھے کھینچیے کب تک عذاب
جائیے کس کے در اوپر کون ہے — ملیے کس سے کون ملنے کا ہے باب
لے جوانی سے پھرے پیری تلک — امتحاں میں آگئے سب شیخ و شاب

شکایت آسمان و زمانہ کے بعد میر کی تشبیبوں میں مضامین حسن و عشق کا درجہ ہے۔ اور بعض اشعار حسن و لطافت سے خالی نہیں ہیں۔ حضرت علی کی مدح میں ایک قصیدے کی تشبیب کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

دل میں نہیں ہے قطرۂ خوں آنکھیں ہیں گی تر
خالی پڑا ہے شیشۂ مے بھر رہے ہیں جام
اے رشک ماہ عید نہ کر انتظار کش
مکھڑا دکھا دے چاند سا ٹک آ کے پشت بام
چلتا ہے تو تو جاتے ہیں کتنوں کے جی چلے
اب آکسو کی مان لے موقوف کر خرام
آنکھوں سے اس کی چشم وفا میر ہے غلط
وحشی ہیں یہ غزال نہ ہوں گے کسی کے رام

ایک قصیدے کی تشبیب میں چند شعروں میں میر نے بہاریہ مضامین نظم کئے ہیں۔ ان میں اصلیت اور مبالغہ دونوں کی کارفرمائی دکھائی دیتی ہے۔ ذیل کے اشعار بہار کی اصلی کیفیات کے ترجمان کہے جاسکتے ہیں:

جب سے خورشید ہوا ہے چمن افروز حمل
رنگِ گل جھمکے ہے ہر پات ہرے کے اوجھل
جوشِ گل یہ ہے جہاں تک کرے ہے کام نظر
لالہ و نرگس و گل سے ہیں بھرے دشت و جبل

عرفی کی تقلید میں مبالغہ کا رنگ دیکھئے:

برگِ گل فیض ہوا کرتا ہے ہر اخگر کو
آگ کی گر کہیں سلگا کے رکھیں ہیں منقل

لیکن ایسے متفرق اشعار کے باوجود جن میں کہیں زورِ بیان کا عکس ہے اور کہیں تغزل کا پرتو، میر کے قصائد کی تشبیبیں بہت کمزور ہیں۔ قطع نظر اس کے کہ موضوعات کے لحاظ سے ان کا دائرہ زیادہ وسیع نہیں ہے، ان کی تشبیبوں میں بڑی بے ربطی اور انتشار ہے۔ وہ جم کر کسی موضوع پر طبع آزمائی نہیں کرتے۔ ان کی اکثر تشبیبیں نہ حالیہ ہیں نہ عشقیہ اور نہ بہاریہ بلکہ ان سب کا مرکب ہیں۔ ایک طرف اختصار دوسری طرف مختلف موضوعات کا احاطہ کرنے کی کوشش، نتیجہ یہ ہے کہ کوئی نقش پوری طرح ابھر نہیں پاتا۔ قصیدہ در مدحِ شاہ وقت کی تشبیب نسبتہً طویل ہے لیکن اس میں بھی آسمان کی شکایت، دُنیا کی بے ثباتی، غزل اور وصفِ بُتاں سبھی کچھ شامل ہے قصیدہ چونکہ ایک طویل نظم ہوتی تھی، اِس لئے درمیان میں کئی کئی مطلعے کہنے کا مقصد یہ تھا کہ جب ایک سلسلہ میں اشعار کی تعداد کافی ہو جائے تو قبل اس کے کہ طولِ کلام سننے والے پر گراں گذرے ایک تازہ مطلع کہہ کر قصیدے میں از سرِ نو جان ڈال دی جائے۔ غزل اور معشوق کا سراپا وغیرہ کی شمولیت بھی اسی مقصد کی تابع تھی گویا قصیدہ گو کے ہاتھ میں یہ چند حربے تھے جن سے وہ طول کلامی کے باوجود خاطر خواہ اثر پیدا کرنے میں مدد لیتا تھا۔ میر کی تشبیبیں چونکہ بہت مختصر ہیں اس لئے ان میں مطلع اور غزل کا استعمال اور موضوعات کی تبدیلی کچھ بڑی اچانک سی ہوتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کسی پردۂ سیمیں پر بہت جلد جلد تصویریں بدلی جا رہی ہوں۔ ایسے موقع پر جو ایک تشنگی اور خلش سی دیکھنے والوں میں رہ جاتی ہے وہی میر کی تشبیبوں کو پڑھ کر محسوس ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ مضامین اور اسالیبِ بیان کے انتخاب میں میر قصیدے کے معنوی

اور صوری تقاضوں کا بہت کم لحاظ رکھ پاتے ہیں۔ عشقیہ اشعار اور غزلیں بھی جو انہوں نے کہی ہیں ان میں عموماً نہ قصیدے کا آہنگ ہے اور نہ وہ فضا جو ان کی اچھی غزلوں میں پائی جاتی ہے۔ بس یوں سمجھیے چند متفرق مضامین نظم کر دئے ہیں۔ قصیدہ لامیہ در منقبت حضرت علی میں بہاریہ اشعار کے بعد انہوں نے غزل کہی ہے اس میں دوسرے مضامین کے ساتھ شیخ پر یہ پھبتی بھی ہے:۔

شیخ کے قد کی درازی کے تئیں حال میں دیکھ
یاد آتا ہے جوانوں کے تئیں رقصِ جمل
کودنے کو جو اٹھا سر پہ اٹھا لی مجلس
دیکھیے بیٹھے جو پھر اونٹ تو بیٹھے کس کل

تشبیب کے مراحل کو "افتاں و خیزاں" طے کرنے کے بعد میر نے عموماً شکایتِ آسمان وصفِ بتاں یا غزل سے ایک بہت ہی سیدھے سادے پیرائے میں گریز کی راہ نکالی ہے۔ ایک قصیدے میں شکایتِ آسمان کے مضامین نظم کرتے کرتے کہتے ہیں۔

وقت ہے اپنے نُصیری کی مدد کا یا شاہ
روز و شب رہتی ہے اس موذی ہی سے جنگ و جدل

ایک اور قصیدے میں وصفِ بتاں کے بعد کہتے ہیں:۔

کب تک صفت بتوں کی خدا سے تو خوف کر
اے طبع رہ نہ اتنی بھی پابند خطّ و خال
پڑھ منقبت نہ شاہ کی جس سے نجات ہو
وہ شاہ جس سے ایک گدا کو ہے یہ کمال

قصیدۂ رائیہ در مدح آصف الدولہ میں شکایتِ آسمان کے بعد ہمنشیں کی فرمائش پر غزل کہتے ہیں اور پھر گریز کا پہلو نکالتے ہیں۔ جس کی مثال ایک دوسرے موقع پر اس سے پہلے گذر چکی ہے۔

میر کی مختصر تشبیبوں کو دیکھتے ہوئے ان کے قصائد میں مدحیہ اشعار کا تعداد میں زیادہ ہونا لازمی

تھا۔ صرف ایک قصیدے میں جو شاہ عالم کی تعریف میں ہے مدح کے اشعار تشبیب کے اشعار سے کم ہیں۔ اشعار کی تعداد سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ میر نے تشبیب کے مقابلے میں مدح میں زیادہ زور طبیعت پر صرف کیا ہے۔ ان کے قصیدوں میں ممدوحین کے فیوض و برکات، شجاعت و بہادری، عدل و انصاف، دینداری و دین پناہی، حسنِ انتظام، تلوار، گھوڑے، ہاتھی، مطبخ اور دسترخوان وغیرہ کی تعریف ملتی ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ ان کے مدحیہ مضامین کا حصار وہی ہے جو ان سے پہلے قائم ہو چکا تھا اور ان کے زمانے میں بھی مروج تھا۔ مدح میں ان کا سب سے پسندیدہ مضمون شجاعت و بہادری کی تعریف ہے جس میں انہوں نے ممدوح کے ادنیٰ غلام کی معرکہ آرائی کے مرقعے کھینچنے میں خاص انہماک دکھایا ہے۔ تخیئلی انداز میں معرکہ آرائی یا شمشیر زنی کا بیان قصیدے کے لئے نیا نہیں لیکن دوسرے قصیدہ گو ان موقعوں پر عموماً اختصار سے کام لیتے ہیں۔ میر نے تفصیل سے کام لے کر جدت پسندی کا ثبوت دیا ہے۔ یہاں نصرتی، سودا اور نظم طباطبائی کے قصیدوں کے وہ حصے خارج از بحث ہیں جن کا تعلق تاریخی معرکوں سے ہے۔

ادبی محاسن کے اعتبار سے مجموعی طور پر میر کے مدحیہ اشعار کی قدر و قیمت کیا ہے، یہ تو ہم آگے چل کر دیکھیں گے۔ یہاں اس امر کا اظہار ضروری ہے کہ مختلف قصیدوں میں کہیں کہیں ایسے اشعار مل جاتے ہیں جو قصیدے کی روایتی خوبیوں کے آئینہ دار ہیں، خصوصیت کے ساتھ آصف الدولہ کی شان میں ایک قصیدے کا مدح کا حصہ شان و شکوہ، زورِ بیان، تسلسل، روانی، اختصار اور جامعیت کے لحاظ سے ایک امتیازی حیثیت رکھتا ہے ملاحظہ ہو:۔

ہے کریم اب بھی وزیر ابنِ وزیر	آصف الدولہ فلک قدر و جناب
جم حشم انجم سپہ گردوں شکوہ	مرجعِ خرد و کلاں عالم مآب
دستِ ہمت اس کا گر در بار ہو	پانی پانی شرم سے ہوئے سحاب
فخر سام و رستم اس کی بندگی	داخلِ خدام یاں افراسیاب
جس سحر جرأت سے کھینچی ان نے تیغ	ڈھال رکھے مُنہ پہ نکلا آفتاب
رزم کے عرصہ میں ہل چل پڑ گئی	آسماں کے خیمہ کی کانپی طناب

زین رکھا جائے مرکب پر اگر — راجا پر جا آن کر داہیں رکاب
زلزلہ پڑ جائے سارے ملک میں — ملک داروں سے کہیں ہاں سرحساب

مطلعِ ثانی میں کہتے ہیں:-

اے ترے ڈر سے جگر شیروں کے آب — دشمنوں کو ہو بہانہ اضطراب
موجزن جیدھر ہو وہ دریا سے فوج — بستیاں اس سمت کی جیسے حباب
گرد اس لشکر کی ہوئے گر بلند — پھر زمین و آسماں میں ہے حجاب
داوری و منصفی سن دلبراں — چھوڑ دیں عشاق پر کرنا عتاب
رفعِ بدعت چاہے تو پھر کیا مجال — اُٹھ سکے جو نغمۂ چنگ و رباب

معرکہ آرائی کے ذکر میں دوسرے قصائد سے زورِ بیان کے نمونے ملاحظہ ہوں:-

من بعد اور باقی رہیں جتنے کشتنی — کر جمع ان کو زورِ شجاعت سے پیل پال
تلوار لے پھرے وہ تو پھر جائے روزگار — نعرہ کرے تو تن سے کرے رُوح انتقال
نعرے سے اس کو لیویں بہت یوں رہِ گریز — بھاگیں ہیں جیسے شیر کی آواز سے شغال
شیرِ فلک کو راہ بھلا دیوے وہ دھمک — اس زلزلے میں گاو زمیں سکھ جائے چال

——— در منقبتِ حضرت علی

ہو اسپ پر سوار کرے عزمِ جنگ اگر — میدان کارزار میں ادنےٰ ترا غلام
جولاں کرے جدھر کو رہے اس طرف نہ خاک — اڑ جائے خاک ادھر کو جدھر کو پھرے لگام
پامال اس قدر ہوں کہ معلوم بھی نہ ہوں — افراسیاب کون ہے رستم ہے یاں کدام

——— در منقبتِ حضرت علی

مدحیہ حصّوں میں بعض تشبیہیں بھی نئی اور لطیف ہیں۔ بیانِ رزم میں کہتے ہیں:-

تر ہو گئی ہے بسکہ لہو سے یہ گل زمیں — گر خشک ہو سے خاک کہیں بعد ماہ و سال
ہو پھر گذار بادِ صبا سے یہ واں کا رنگ — اڑتا ہے جیسے ہولی کے ایام میں گلال

——— در منقبتِ حضرت علی

ہاتھی کی تعریف میں کہتے ہیں:-

نہیں ہے فیل کہ زربفت پوش کوہ ہے وہ ۔۔۔ کروں شکوہ کو اس کے سو کس روش تسطیر
رواں رکاب میں ہے آسمانِ زر گویا ۔۔۔ ستارے جھول کے ایک ایک آفتاب نظیر

—————— قصیدہ در مدح آصف الدولہ

میر کے ایسے اشعار کو دیکھئے تو خیال ہوتا ہے کہ وہ قصیدے کے میدان میں کچھ ایسے ناقص نہ تھے لیکن مشکل یہ ہے کہ قصیدہ ایک مسلسل نظم ہوتی ہے اور اس لئے اس کے منتخب حصّے غزل کے منتخب اشعار کی طرح شاعر کا سرمایۂ کمال نہیں قرار دئے جا سکتے۔ اس کا فن مطلع سے مقطع تک وہی تعمیری قوت چاہتا ہے جو مسلسل نظموں کے لئے ضروری ہوتی ہے۔ چنانچہ جب ہم ان حصّوں کو دوسرے حصّوں کے ساتھ رکھ کر دیکھتے ہیں تو ایک بار پھر میر کے عجز کی سرحدیں شروع ہو جاتی ہیں ——— وہ تشبیب کے مقابلہ میں یہاں کامیاب سہی لیکن ان کے مدحیہ اشعار کا مجموعی تاثر بھی کچھ اچھا نہیں ہے۔ اسلوبِ بیان کی ناہمواری، ذہنی انتشار اور سہل انگاری کا احساس یہاں بھی ہوتا ہے۔ تشبیب کے مضامین سے گریز کرنے میں اگر ان کی بے دلی اس شعر سے ظاہر ہو جاتی ہے کہ

دماغ اب نہیں ہے کہ تمہید کریئے ۔۔۔ کہ کل رات ہے اور یہ داستاں ہے

تو مدح کا سلسلہ منقطع کرنے میں بھی ان کا یہ شعر ان کی اکتاہٹ کی غمازی کئے بغیر نہیں رہتا:-

دعا پر کروں ختم اب یہ قصیدہ ۔۔۔ کہاں تک کہوں تو چنیں ہے چناں ہے

مدح میں انہوں نے تخئیل آفرینی اور مبالغہ آرائی کی روش کو نباہنے کی کوشش کی ہے۔ خصوصاً رزمیہ مضامین اور گھوڑے کی تیز رفتاری کے بیان میں تخئیل اور مبالغہ کے جوہر دکھلانے کے لئے کسی قدر طول کلامی سے کام لیا ہے لیکن اس میں عموماً ذہن کی وہ جودت نہیں ہے جو سوداؔ، ذوقؔ یا بعض دوسرے قصیدہ گویوں کے یہاں پائی جاتی ہے۔ ان کا ذہن کچھ اتنا سست چلتا ہے۔ کہ تخئیل آفرینی اور مبالغہ آرائی کا خاطر خواہ اثر مترتب نہیں ہونے پاتا۔ بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی شخص کسی بچّے کو سمجھا سمجھا کر کہانی سنا رہا ہو۔ خیال کی سست رفتاری کی وجہ سے ایسے موقعوں پر بیان میں جھول پیدا ہو جانا لازمی ہو جاتا ہے۔ اس پر بعض مبتذل الفاظ اور بھی کھٹکتے

ہیں۔ یہ کمزوریاں رزمیہ مضامین میں زیادہ نمایاں ہیں لیکن طوالت کے خوف سے یہاں گھوڑے کی تعریف میں چند اشعار پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

کیا لکھوں اسپِ فلک سیر کی اس کے تعریف ۔۔۔ ادہم خامہ بھی لکھتے ہوئے جاتا ہے اچھل
اس فلک سیر کا میدان مقرر ہے گا ۔۔۔ تنگ دپو کے لئے اثنائے ابد اور ازل
آ گیا اس میں نظر جانا کسو شخص کو تو ۔۔۔ مارتے پل کے گیا اس کو چھلاوا سا چھل
قابو پانے کے لئے اس کے سوار اس کے سدا ۔۔۔ کہتے ہیں مدعی اس اسپ کے تئیں مار نیے چل
راکب اس کا کرے ہے سن کے تبسم یہ بات ۔۔۔ یعنی ان گیدیوں کے کچھ ہے دماغوں میں خلل
اک مصور نے اسے دیکھ کے دوڑایا خیال ۔۔۔ دیکھوں اس باد کی مجھ سے بھی سکے شکل نکل
سروِ سینہ کو کمر تک تو بنایا رکھ ہاتھ ۔۔۔ اڑ گیا صفحۂ کاغذ پہ سے چھوتے ہی کفل

قصیدہ در منقبت حضرت علی

کبھی کبھی ایسا پیرایۂ بیان اختیار کرتے ہیں جو قصیدے میں عجیب و غریب معلوم ہوتا ہے مثلاً حضرت علی کے عدل و انصاف کی تعریف میں کہتے ہیں:-

لقمۂ ظلم نہیں پچتا عدالت میں تری ۔۔۔ بازنگلی ہوئی چڑیا کے تئیں دے ہے اُگل

بزرگانِ دین کی تعریف میر نے کہیں کہیں بالقصد اس ڈھنگ سے کی ہے کہ ان کے مذہبی عقائد نمایاں ہو جائیں۔ چند اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ نصیریت کے قائل تھے لیکن خود انہیں کے دوسرے اشعار سے اس کی تردید ہوتی ہے۔ گمان غالب ہے کہ حضرت علی سے حسنِ عقیدت کے مبالغہ آمیز اظہار اور فنی نزاکتوں کا زیادہ خیال نہ رکھنے کی وجہ سے ان کا اصل عقیدہ کچھ سے کچھ ہو گیا ہے۔

عرضِ مطلب میں ایک قصیدہ میں "حضرت دہلی" کی نواح دیکھنے اور دوسرے قصیدے میں آصف الدولہ کے آستاں پر بقیہ عمر گذارنے کی خواہش قابلِ ذکر ہیں کیونکہ ان سے میر کے محبتِ وطن اور ترکِ وطن دونوں پر روشنی پڑتی ہے۔ امام حسین کی شان میں ایک قصیدے میں عرضِ مطلب سے پہلے میر نے مسلسل قسمیں کھائی ہیں۔ اگرچہ بعض قسمیں ممدوح کی ذات سے مناسبت نہیں رکھتیں اور اس لحاظ سے کہ نصف اشعار قسموں کی نذر ہیں۔ قصیدے میں

کچھ غیر متناسب بھی ہیں لیکن پھر بھی جوشِ طبیعت کا ایک اچھا نمونہ ہیں۔ دُعا میں میر نے بڑے اختصار سے کام لیا ہے اور جیسا کہ طریقہ تھا ممدوح کے دوستوں کو دعا اور دشمنوں کو بد دُعا دے کر خاتمۂ کلام کیا ہے۔

قصیدہ در شکایتِ نفاقِ یاراں زماں کی نوعیت میر کے دوسرے قصائد سے مختلف ہے۔ اس میں کسی کی تعریف نہیں ہے۔ میر پر لوگوں نے کچھ ایسی باتیں کہنے کا الزام لگایا تھا جو انہوں نے نہیں کہی تھیں۔ یہ قصیدہ انہوں نے اسی الزام کی تردید میں لکھا ہے۔ یہ باتیں کیا تھیں اور یہ لوگ کون تھے؟ اس کی تصریح نہ تو قصیدے کے عنوان یا متن سے ہوتی ہے اور نہ کسی قول سے۔ میر نے تمہید میں اہلِ زمانہ کی منافقانہ روش کا ذکر کیا ہے اس کے بعد مسلسل قسمیں کھا کر اپنی بے گناہی کا یقین دلانے کی کوشش کی ہے۔ قسموں کا انداز بالکل وہی ہے جو قصیدہ در منقبت امام حسین میں ہے بلکہ ایک مصرع بلا کسی تغیّر کے دونوں میں موجود ہے۔ یہ قصیدہ بظاہر اپنی صفائی میں لکھا گیا ہے لیکن اس میں لڑائی کی شان بھی پوشیدہ ہے۔ میر کے تیور کہہ رہے ہیں کہ وہ "شاعرِ غریب" نہیں بلکہ "شمشیر جنگ" ہیں۔ انہوں نے نہ صرف اپنی برتری کا اعلان کیا ہے بلکہ یہ دھمکی بھی دی ہے کہ اگر معذرت قبول کر لی گئی تو خیر ورنہ حریفوں کو سوائے خفّت کے اور کچھ حاصل نہ ہوگا۔ چونکہ یہ قصیدہ مطبوعہ کلیات میں شامل نہیں ہے اس لئے اس کا انتخاب درج کیا جاتا ہے۔

جہاں میں کون ہے جس کو کسی سے اُلفت ہے ۔۔۔ خرابِ کوچہ و بازاریاں محبّت ہے
باتفاق اگر دو عزیز مل بیٹھیں ۔۔۔ زبانِ مردمِ بد سے انہوں پہ آفت ہے
نہ دیکھوں مُنہ میں اُنہوں کا اگر ہوں آئینہ ۔۔۔ اسی لئے تو مرے دلنشین عزلت ہے
اگر سخن کی مرے رشک ان کی ہے جاں سوز ۔۔۔ وگر دلوں میں انہوں کے غرور و دولت ہے
سخن کی خوبی کے میدان کا ہوں میں رستم ۔۔۔ مقابلے کو مرے ان میں کس کی طاقت ہے
رہا غرورِ زر و مال ان کا اب باقی ۔۔۔ سو اس کا ہونے کو رد کش مری شرافت ہے
باحمدے کہ بلا میم اس کو کہتے ہیں ۔۔۔ اسی کی شرق سے لے تا بہ غرب امّت ہے
بمرتضیٰ کہ پیمبر سے اس کو ہے خویشی ۔۔۔ بفاطمہ کہ کنیز اس کی ایک عصمت ہے

باآں امام کہ قسمت میں اس کی زہر ہوا | باآں حسین کہ وہ بیکسِ شہادت ہے
بذوقِ وصل کہ اک دم نہیں ہے مجھ کو قرار | باضطراب کہ وہ خانہ زادِ فرقت ہے
بسوزِ شمع کہ جلتی ہے وہ بھی میری طرح | باانجمن کہ وہ کثرت میں رشکِ خلوت ہے
قسم ہے میرے تئیں ان تمام قسموں کی | جو میں نے کچھ بھی کہا ہو یہ مجھ پہ تہمت ہے
جو کچھ کہا ہے کنھوں نے غلط کہا ہوگا | کسو سے رنجش بے جا نہ میری طینت ہے
اگر یہ عذر ہو مقبول تو تو خیر ارنہ | حریف ہونے کا میرے نتیجہ خفت ہے

اُردو کے تقریباً سبھی قابلِ ذکر تذکرہ نگاروں اور نقادوں نے معمولی فرق کے ساتھ قصیدہ گوئی میں میرؔ کے عجز کا اعتراف کیا ہے۔ صرف ایک عبدالسلام ندوی نے میرؔ و سوداؔ کے کچھ اشعار کا موازنہ کرکے غزل کی طرح قصیدے میں بھی میرؔ کی فضیلت ثابت کرنے کی کوشش کی ہے لیکن اس کی حیثیت میرؔ کی بے جا طرفداری سے زیادہ نہیں ہے۔ قصیدے میں میرؔ کا انداز کچھ اُکھڑا اُکھڑا سا ہے۔ تشبیب ہو یا مدح علوئے فکر اور شان و شکوہ کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ بعض جگہ بقولِ صاحبِ شعرالہند شاندار الفاظ و باوقار تراکیب کا انبار لگا دیا ہے[1]۔ لیکن چونکہ علوئے مضامین کا فقدان ہے اس لئے الفاظ و تراکیب کی شان و شوکت ایک حد تک زائل ہو گئی ہے مبالغہ و تخئیل سے میرؔ نے بھی کام لیا ہے لیکن انداز فکر اور پیرایۂ بیان ایسا اختیار کیا ہے کہ کلام میں زور نہیں پیدا ہو سکا۔ رہ گئی تشبیہات و استعارات کی سادگی و لطافت اور چند بہاریہ اشعار میں محاکات کا عنصر تو اس میں بھی سوداؔ میرؔ سے آگے دکھائی دیتے ہیں۔ پھر اس قسم کی معدودے چند مثالوں کی بنا پر میرؔ کی قصیدہ گوئی کے بارے میں کوئی اتنا بڑا فیصلہ صادر نہیں کیا جا سکتا کہ نہ صرف میرؔ کے قصائد پر بھاری ہو بلکہ سوداؔ کے قصائد کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لے۔ میرؔ کے قصیدے خوبیوں سے یکسر عاری نہیں ہیں۔ ان میں ایسے اشعار موجود ہیں جن میں قصیدے کے بعض روایتی محاسن، تغزل یا کوئی اور ادبی خوبی تلاش کی جا سکتی ہے لیکن اوّل تو ان کے قصائد میں خوبیوں کے مقابلہ میں کمزوریوں کا پلّہ بہت بھاری ہے دوسرے کوئی خوبی ایسی

---

[1] شعرالہند حصّہ اوّل ص۶۶

نہیں ہے جو مستقل درجہ رکھتی ہو۔ مجموعی حیثیت سے ان کے یہاں نہ قصیدے کی شان و شوکت ہے، نہ تغزل کا رنگ اور نہ کوئی اور عنصر جس سے اس صنف میں ان کی انفرادیت کو واضح کیا جاسکے۔ اس اعتبار سے ان کے قصیدے بدرنگ ہیں۔

غالب نے اپنی راست گوئی کے ثبوت میں ایک خط میں تفتہ کو لکھا تھا کہ "میرے قصیدے دیکھو تشبیب کے شعر بہت پاؤگے اور مدح کے شعر کمتر"۔ ہر چند یہ قصیدے کی غرض و غایت کے منافی ہے لیکن اس سے ایک حد تک غالب کی راست گوئی ثابت ہو سکتی ہے۔ میر کے قصیدوں میں معاملہ اس کے برعکس ہے۔ صرف ایک قصیدے کو چھوڑ کر انہوں نے مدح میں تشبیب سے زیادہ شعر کہے ہیں اور زیادہ توجہ صرف کی ہے۔ ہم شروع میں دیکھ چکے ہیں کہ مدح سرائی سے انہیں اجتناب نہ تھا۔ لیکن بالفرض ان کی ضرب المثل قسم کی خودداری کو مدح کی کمزوری کا سبب قرار دیا جائے تو یہ صرف ارباب دولت کی مدح کے لئے صحیح ہو سکتا ہے۔ بزرگانِ دین کی مدح میں اس کے حائل ہونے کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی اور تشبیب کے سلسلہ میں تو سرے سے خودداری یا خودفروشی کا سوال ہی نہیں اٹھتا۔ چنانچہ اس صنفِ سخن میں ان کی بدرنگی کا سبب کہیں اور تلاش کرنا چاہیئے۔ ان کے بارے میں یہ کہنا تو صحیح نہیں کہ وہ اپنے دل کی دُنیا میں ایسے کھوئے ہوئے تھے کہ انہیں اپنے گرد و پیش کی بالکل خبر نہ تھی۔ ممکن ہے انہوں نے "مصروفیت خیال" اور "عالم محویت" میں اس "معقول مکان" کے پائیں باغ کو کھڑکیاں کھول کر نہ دیکھا ہو۔ جو بہ روایت آزاد کسی نواب نے ان کو رہنے کے لئے دیا تھا۔ لیکن دُنیا کے باغ کو انہوں نے آنکھیں کھول کر دیکھا تھا۔ یہی نہیں بلکہ ان کو اپنے زمانے کے سیاسی حالات تک سے گہری دلچسپی تھی جیساکہ "ذکر میر" سے ثابت ہوتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ان کے دل کی باتیں دل کی باتیں ہیں مگر ان میں کائنات کا گہرا مطالعہ اور ان کے عہد کا تاریخی ماحول جا بجا اپنا رنگ دکھاتا ہے لیکن وہ ہر چیز کو ایک داخلی زاویۂ نگاہ سے دیکھنے کے عادی تھے اور خون دل میں ڈبو کر پیش کرتے تھے۔ یہ ان کا ایک فطری میلان تھا جو مختلف داخلی و خارجی اسباب و علل کی بدولت شدید تر ہوتا گیا اور نتیجے کے طور پر ان کے اندر اور باتوں کے علاوہ انتہا درجہ کی گرفتگی، اضطرار اور بے چینی راہ پا گئی۔ دوسرے الفاظ میں ان کی شخصیت اور دل و دماغ

کی نشو ونما کچھ ایسے ڈھنگ سے ہوئی تھی کہ ان کی وہی شاعرانہ صلاحیتیں پوری طرح ابھر سکیں جو عشقیہ شاعری خصوصاً ان کے طرز کی غزل گوئی کے لئے موزوں ہو سکتی تھیں۔ قصیدے کا فن چونکہ اس سے مختلف تھا اس لیے وہ اس کے تقاضوں کو کامیابی کے ساتھ پورا نہ کر سکے۔

لکھنؤ میں رہ کر آصف الدولہ یا دربار اودھ سے بگاڑ چند در چند اسباب کی بنا پر میر کی زندگی کا ایک بڑا المناک حادثہ تھا۔ اس کے نتائج اُن کے حق میں بڑے دُور رس ہوئے۔ ان کے شخصی میلانات اور نفسیاتی اُلجھنیں اگر اس سے پہلے قصیدے کے میدان میں ان کی کامیابی کی مزاحم تھیں تو اس کے بعد مانع ثابت ہوئیں اور قصیدہ گوئی بالکل موقوف ہو گئی۔ جس میر نے لکھنؤ آنے سے پہلے آصف الدولہ کی شان میں قصیدہ لکھ رکھا تھا وہ میر لکھنؤ آنے کے بعد کم و بیش تیس سال کی مُدت میں صرف ایک قصیدہ لکھ سکا اور وہ بھی یقیناً اسی زمانے کا ہے۔ جب آصف الدولہ کی مہربانیاں شامل حال تھیں۔ آصف الدولہ کے بعد انہوں نے لکھنؤ میں سعادت علی خاں کی وزارت کے بھی تیرہ چودہ سال دیکھے لیکن ان کا دل اتنا آزردہ ہو چکا تھا کہ انہوں نے پھر دربار کی طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھا اور اندر ہی اندر گھلتے رہے۔ لیکن یہ ایک ہونے والی بات تھی جو ان کے مزاج کی ایک ٹیڑھ کی وجہ سے ہو کر رہی۔ اس میں ان کے قصد و ارادہ کو دخل نہ تھا۔

میر کے قصائد کے سلسلہ میں ان کی شخصیت کے کچھ پہلوؤں کا زیر بحث آنا لازمی تھا۔ میں نے حسب ضرورت ان کو نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے۔ شخصیت کے مطالعے میں جہاں حاوی پہلو بڑی اہمیت رکھتے ہیں وہاں جزئی پہلو بھی کچھ کم اہم نہیں ہوتے کیونکہ ان کی نشان دہی کے بغیر شخصیت کا مطالعہ اُدھورا اور ناقص رہ جاتا ہے۔ آدمی کی شخصیت میں اکثر ایسی باتیں پائی جاتی ہیں جو بادی النظر میں متناقض معلوم ہوتی ہیں لیکن ان کا پایا جانا بالکل فطری ہے۔ دراصل ان کو متناقض سمجھنا ہی ایک طرح کی غلطی ہے۔ کیونکہ اگر ہم تناقضات کی روشنی میں شخصیت کو دیکھتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم شخصیت کا صحیح تصور نہیں رکھتے۔ میر ساری عمر اپنے آپ میں ڈوبے رہے۔ ان کے مزاج میں ایک خاص قسم کی خود نگری تھی کبھی کبھی وہ خود فراموشی کی حدوں میں بھی داخل ہو جاتے ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ باہر کی دُنیا سے

ان کا رشتہ استوار رہتا ہے۔ چنانچہ وقتاً فوقتاً اپنے نفع و نقصان کو مدِّ نظر رکھ کر وہ مصلحت اندیشی اور زمانہ شناسی سے بھی کام لیتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ یہ بات میرؔ کے لیے نہ عجیب و غریب ہے اور نہ معیوب، کیونکہ میرؔ بہرحال انسان تھے اور ایک باشعور اور سمجھ دار انسان۔ انھوں نے اگر اپنے آپ کو پراگندہ طبع، بے دماغ اور دوانہ وغیرہ کہا ہے تو مردِ معقول بھی کہا ہے :

حرف و حکایت شکر و شکایت تھی نوک وضع و دوتیرہ پر
میرؔ کو جاکر دیکھا ہم نے ہے مرد معقول کوئی

اس سے بڑھ کر میرؔ کی شخصیت کا ایک نازک پہلو یہ ہے کہ جس طرح اوفیلیا[1] کے پاگل پن میں ایک طریقہ ہے اس سے کہیں زیادہ ان کی دیوانگی میں ایک شعور ہے۔ خود ہی کہتے ہیں۔

خوش ہیں دیوانگیٔ میرؔ سے سب
کیا جنوں کر گیا شعور سے وہ

ڈاکٹر سید عبداللہ نے صحیح لکھا ہے کہ میرؔ فطرتاً بخود مشغول آدمی تھے[2]۔ لیکن ہمیں اس میرؔ کو بھی دیکھنا ہے۔ جس نے مثال کے طور پر معاشی سکون اور قدر دانی کے لیے دوسرے باکمالوں کی طرح دِلی چھوڑی، نکات الشعرا اور ذکرِ میر تصنیف کیا اور قصیدوں، مرثیوں، واسوختوں اور شکارناموں کے علاوہ کپی کا بچّہ، موہنی بلی، سگ و گربہ اور مرثیۂ خروس وغیرہ دلچسپ مثنویاں لکھیں جن میں نظیرؔ اکبر آبادی کی زندہ دلی جھلکتی ہے۔ ان پہلوؤں کو میرؔ کی افتادِ طبع کے منافی سمجھ کر نظر انداز کر دینا میرؔ کے ساتھ ناانصافی ہے کیونکہ اس سے ان کی شخصیت میں جو تھوڑا بہت تنوع ہے اس پر بھی یک رنگی کے پردے پڑ جاتے ہیں اور ناگفتنی تو خیر ناگفتنی ہے گفتنی بھی پوری طرح منظرِ عام پر نہیں آتی

---

[1] شیکسپیئر کے ڈرامے "ہیملٹ" کا ایک کردار۔

[2] نقدِ میر ص ۸۹

جعفر علی خاں اثر لکھنوی

میر کی متصوفانہ شاعری

یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ ہر عظیم شاعر کے کلام میں اس کی شخصیت جلوہ گر ہوتی ہے، اس کے عہد کے حالات و واقعات و حادثات کی مصوری ہوتی ہے، کلچر اور ماحول سے اثر پزیری کے نقوش ملتے ہیں۔ اُسی کے ساتھ یہ بھی نہ بھولنا چاہیئے کہ محض وقوع نگاری شاعری نہیں بلکہ اُس تاثر کی ترجمانی ہو جسے شاعر کی طبیعت نے قبول کیا اور اس فنکارانہ خوبی و خوش اسلوبی کے ساتھ کہ سُننے والا بھی اُسی شدت سے متاثر ہو، ورنہ شاعری اور تاریخ میں کوئی فرق نہیں رہ جاتا۔

میر کے اشعار سے اُن کی زندگی اور اُس دَور کے حالات کا پتا چل سکتا ہے مگر خوش قسمتی سے ان کے خود نوشتہ سوانح مسمّیٰ بہ "ذکرِ میر" دستیاب ہو گئے اور کتابی صورت میں شائع ہو چکے ہیں۔ سہولت کے لیے وہی مختصراً درج کیے جاتے ہیں۔ ان سے واضح ہوگا کہ ان کی شاعری کا بیشتر حصّہ آپ بیتی ہے۔ جو کچھ دیکھا یا محسوس کیا ہے، زبانِ شعر و نغمہ میں اپنے جذبات و تاثرات کو پسِ منظر بنا کر پیش کر دیا ہے۔

خاندانی حالات

میر کے بزرگ زمانے کی ناساعدت سے مجبور ہو کر اپنی قوم و قبیلہ سمیت حجاز سے روانہ ہو کر سرزمین دکن میں پہنچے۔ وہاں سے وارد احمد آباد گجرات ہوئے، ان میں سے

بعض وہیں رہ گئے، بعض تلاشِ معاش میں آگے بڑھے۔ میر صاحب کے جدِّ کلاں نے دارالخلافہ اکبر آباد (آگرہ) میں توطن اختیار کیا۔ ایک فرزند اپنی یادگار چھوڑا جو میر صاحب کے دادا تھے۔ ان کے دو بیٹے تھے، بڑے کو کچھ خلل دماغ تھا اور جوانی میں انتقال کیا۔ چھوٹے بیٹے محمد علی نے جو میر صاحب کے والد تھے، درویشی اختیار کی اور ترک دنیا کر کے بیٹھ گئے۔ علم ظاہری جس کے بغیر علم معنی تک رسائی دشوار ہے شاہ کلیم اللہ اکبر آبادی کی خدمت میں جو وہاں کے اولیاے کاملین میں سے تھے، حاصل کیا۔ انھیں کے زیر ہدایت بڑی بڑی ریاضتیں کیں۔ ترک و تجرید کی سعی میں محنت شاقہ کی اور انجام کار درویشی کے اعلیٰ مدارج پر فائز ہوئے۔ جوان صالح و عاشق پیشہ تھے۔ دل میں گرمی اور سوز رکھتے تھے، اِس لیے "متقی" کے لقب سے ممتاز ہوئے۔ ہمیشہ یادِ الٰہی میں مشغول رہتے تھے، خطاب نام کا جزو ہو گیا، اور علی متقی کہلانے جانے لگے۔

تعلیم و تربیت میر علی متقی کے ایک مرید سیّد امان اللہ تھے۔ میر صاحب کے والد ان کو برادر عزیز اور میر صاحب عم بزرگوار کہتے تھے۔ میر صاحب دن رات انھیں کے پاس رہتے تھے اور ان سے بہت مانوس تھے۔ وہ بھی ان سے بہت محبت کرتے تھے۔ میر صاحب کی تمام ابتدائی تعلیم و تربیت انھیں کے زیر نگرانی ہوئی، جہاں بھی وہ جاتے، ان کو ساتھ لے جاتے۔ جہاں وہ سوتے یہ بھی وہیں سوتے۔ سیّد امان اللہ کو درویشوں سے ملنے کا بے حد شوق تھا۔ اس طرح میر صاحب کو اکثر درویشوں اور اہلِ دل کی خدمت میں حاضر اور مستفیض ہونے کا شرف حاصل ہوا اور تصوف سے شغف پیدا ہوا۔ اُن کے اقوال و افعال ذہن میں رچ گئے۔ بعض نے بعد کو شعر کا جامہ اختیار کر لیا۔

ایک پردہ نشیں سے ناکام معاشقہ نے اس شراب کو دو آتشہ کر دیا ؎

کچھ رنج دلی میر جوانی میں کھنچا تھا زردی نہیں جاتی مرے رخسار سے اب تک

ادھر میر صاحب کے والد اگر کسی وقت استغراق اور مجاہدۂ نفس سے فارغ ہوتے اور طبیعت شگفتہ ہوتی تو فرزند کو نصیحت کرتے کہ بیٹا عشق اختیار کر، عشق ہی کارخانۂ خدا میں متصرف ہے، اگر عشق نہ ہوتا تو نظم کُل کی تشکیل نہ ہوتی۔ جس وقت میر کے سامنے یہ باتیں ہوتی تھیں، ان کی عمر نو دس برس سے زیادہ نہ تھی۔ عنفوانِ شباب میں جب شعر کہتے ہیں تو یہ اور اسی قبیل کے خیالات قالب نظم

اختیار کر لیتے ہیں۔ مثلاً

عشق ہی عشق ہے جہاں دیکھو　　　سارے عالم میں بھر رہا ہے عشق
عشق سے نظم و ہر ہے یعنی عشق ہے کوئی ناظم خوب　　　ہر شے یاں پیدا جو ہوئی ہے موزوں کر لایا ہے عشق
ظاہر باطن اوّل آخر، پائیں بالا عشق ہے سب　　　نور و ظلمت، معنی و صورت سب کچھ آپ ہوا ہے عشق

یہ بھی فرماتے تھے کہ آسمانوں کی حرکت حرکتِ عشقی ہے، یعنی مطلب کو نہ پہنچنے اور سرگرداں ہیں میر صاحب کے یہاں بھی خیال یُوں موزوں ہوتا ہے

مطلوب گم ہوا ہے تب ایسا ہے اضطراب　　　چکر میں ورنہ کا ہیکو یُوں آسماں رہے

میر صاحب اپنے والد کے متعلق کہتے ہیں کہ دن کو کھوئے ہوئے سے رہتے تھے، شب عبادت میں بسر کرتے تھے۔ اکثر سربسجود، ہمیشہ مست شوق و پاکدامن، چہرے سے نور برستا تھا، ایک آفتاب تھے جو اپنے سائے سے گریزاں تھا۔ اب میر صاحب کا شعر سنیے

تجرید کا فراغ ہے اِک دولتِ عظیم　　　بھاگا جو اپنے سائے سے ہے خوشتر آفتاب

میں نے اس زمین میں فارسی کے قصائد دیکھے ہیں، میر نے غزل کہی۔ فارسی کی اور متعدد غزلوں پر بھی غزلیں کہی ہیں۔ مثلاً حافظ کہتا ہے

عیشم مدام است از لعل دلخواہ　　　کارم بکام است الحمدللہ

میر صاحب کہتے ہیں

اب حال اپنا اُس کے ہے دلخواہ　　　کیا پُوچھتے ہو الحمدللہ
حافظ من رند و عاشق انگاہ توبہ　　　استغفر اللہ استغفر اللہ
میر پیر مغاں سے بے اعتقادی　　　استغفر اللہ استغفر اللہ

(اسی طرح اور فارسی شعرا کی غزلوں پر غزلیں ہیں۔ خیر یہ جملہ معترضہ تھا)

ایک فقیر نے کہا کہ "درویشاں مزاج غیور دارند۔ برائے دیدن کسے کہ می آیند سوے او نمی بینند"۔

یہی قول شعر بن گیا

نہ ملیں گرچہ ہم بھی مر جائیں　　　عاشقوں کا وصال ہے کچھ اور

یا

؎ مواجِس کے لیے اُس کو نہ دیکھا   نہ سمجھے میر کا کچھ مُدّعا ھم

شاید مزید ثبوت پیش کرنے کی ضرورت نہیں کہ میر نے تصوف کی فضا میں آنکھ کھولی تھی اور اس کے رموز و نکات و اسرار و معارف سے بخوبی واقف تھے اور اسی کے ساتھ نشترِ عشق سے سینہ فگار تھا اور پاک و بے لوث عشق، حقیقی ہو یا مجازی تصوف کی جان ہے۔

میر کے متصوفانہ اشعار سننے سے قبل یہ دھیان رہے کہ اُس نے ایسی برگزیدہ ہستیوں کے درمیان آنکھ کھولی تھی اور پرورش پائی تھی جن کے افعال بھی اُن کے اقوال کی طرح پاک و منزّہ تھے، جن کے عشق میں حقیقی ہو یا مجازی نفس کا لگاؤ نہ تھا۔ جو غیور و خوددار تھے۔ اور اپنی عزت آپ کرتے تھے۔ جن کا اخلاق عام سطح سے بلند تھا۔ جو خدا کے سوا کسی سے ڈرتے نہیں تھے۔ بڑوں بڑوں کے سامنے ان کی گردن نہیں جھکتی تھی تاہم غرور و نخوت سے کوسوں دُور تھے۔ ایثار و انکسار اُن کا شیوہ تھا۔ جنھوں نے سلطنتوں کو بنتے اور بگڑتے دیکھا تھا، عبرت حاصل کی تھی اور دنیوی نام و نمود و جاہ و جلال کو ہیچ و بے بود سمجھتے تھے۔ توکل ان کا مشربہ تھا۔ انسانی مساوات کے قائل تھے اور مذہب کی پابندی کے باوصف تعصب و شقاوت و تنگ نظری سے کوسوں دُور تھے۔ جو علم حاصل کرتے تھے اور وجدان کی رہبری میں اسرارِ کائنات کو بے نقاب کرتے تھے۔ جس شخص کا ایسا کردار ہو اور پرداخت ریاضت یا مشقت سے ہوئی ہو یا حادثات زمانہ سے یہ کیفیت رونما ہوئی ہو اُس کو صوفی نہ کہیں گے تو کیا کہیں گے؟

یہ مقالہ میر کی متصوفانہ شاعری سے مخصوص ہے، لہٰذا پہلے تصوف اور اس کے مسائل کے متعلق اختصار کے ساتھ اشارہ کر دینا ضروری ہے۔

وحدت الوجود | یہ مسئلہ تصوف کا سنگِ بنیاد ہے۔ اس کو یوں بیان کیا گیا ہے کہ وجود تین قسم کا ہو سکتا ہے (۱) واجب الوجود۔ جس کا ہونا ضروری اور عدم محال ہو (۲) ممتنع۔ جس کا عدم ضروری ہو اور وجود محال ہو (۳) ممکن۔ وجود اور عدم دونوں برابر ہوں یعنی نہ وجود ضروری ہو نہ عدم۔

اصطلاح صوفیہ میں وحدت الوجود کے تنزلات خمسہ ہیں۔ تعین اول۔ وحدت۔ تعین ثانی۔ احدیت تعین ثالث۔ روحی۔ تعین رابع مثالی۔ تعین خامس جادی۔ وحدت سے مراد علم اجمال ہے یعنی شئی بسیط میں کثرت پیدا کرنے کی صلاحیت ہو۔ احدیت سے مراد علم تفصیلی ہے۔ اسی کو اعیانِ ثابتہ و حقائقِ ممکنات

بھی کہتے ہیں یعنی اس سے حقائق ممکنات کا تعین ہوتا ہے۔

تعینات اوّل و ثانی مرتبۂ وجوب کو ثابت کرتے ہیں باقی تعینات ثلثہ پرتو ہیں حقائق ممکنات اور اعیانِ ثابتہ کے۔ انھیں کو تعینات خارجہ کہتے ہیں۔ ان کو مرتبۂ وجوب میں کوئی دخل نہیں اور مرتبۂ وجوب سے خارج ہیں۔ کیونکہ واجب اور علم واجب کی ضد ہیں۔ یہ محل امکان میں ہیں اور انہیں پر احکام عذاب و ثواب و سزا و جزا جاری ہوتے ہیں۔

مسئلہ وحدت الوجود کا تعلق تعین وحدت و احدیت سے ہے۔ موجودات امکانیہ خارجیہ عکس یا پرتو یا ظل اعیان ثابتہ کے ہیں، لہٰذا وحدت الوجود یا ہمہ اوست سے یہ مراد ہوئی کہ کسی شخص یا چیز کا وجود خارجی مطابق اس شخص یا چیز کے ہے جو علم باری میں ہے۔ اور علم باری ذات باری سے علیحدہ نہیں ہے۔ ذات باری اور اس کے اسماء و صفات میں کسی طرح کی جدائی نہیں ہے۔

تصوف کیا ہے مولانا جامی نفحات میں فرماتے ہیں کہ سب سے پہلے حضرت ابو ہاشم صوفی کے نام سے مشہور ہوئے۔ ان سے قبل جو بزرگ ہوئے وہ زہد و ورع اور طریق توکل وغیرہ میں اچھے معاملات رکھتے تھے مگر اس نام سے مشہور نہ تھے۔ اُن کا شمار فقراء میں ہوتا تھا۔ خود ہمارے رسول مقبولؐ کا قول ہے "الفقر فخری"۔

حضرت معروف کرخی کا قول ہے کہ تصوف حقائق کا حاصل کرنا اور جو کچھ خلائق کے اختیار میں ہے اُس سے بیگانہ ہو جانا ہے۔

ایک بزرگ نے تصوف کو اس طرح سمجھایا ہے۔ تصوف عشق الٰہی ہے صرف اس کے لیے تصور سزا و جزا سے بالاتر ہوکر۔

حضرت ذوالنون مصری فرماتے ہیں کہ صوفی وہ ہیں جنھوں نے خدائے پاک کو سب چیزوں سے دستکش ہوکر اختیار کیا ہے اور خدائے پاک نے ان کو ساری چیزوں سے چُن لیا ہے۔

حضرت عبداللہ تستری کا ارشاد ہے کہ صوفی وہ ہے جو تمام کدورتوں سے پاک ہو اور خدائے تعالےٰ کے قرب میں اوصاف بشریت اس سے منقطع ہو جائیں اور اس کی نظر میں مٹی اور سونا برابر ہو۔

حضرت ابو حفص حداد نے تصوف کو "ہمہ اوست" سے تعبیر کیا ہے۔ حضرت خواجہ مرتعش فرماتے ہیں کہ تصوف حسن خُلق ہے۔ دوسری جگہ فرماتے ہیں کہ تصوف ایک حالت ہے جس پر طاری ہوتی ہے —

گفتگو سے غائب کر دیتی ہے اور خدا ئے تعالےٰ تک لے جاتی ہے اور اس وقت واپس لاتی ہے جب وہ شخص نیست ہو جائے۔ اور صرف ذات باری رہ جائے۔ اسی کو فنافی اللہ کہتے ہیں۔

حضرت عمر بن عثمان مکی فرماتے ہیں تصوف خدا کی یاد ہے۔

حضرت بشر حافی کا قول ہے کہ صوفی وہ ہے جو دل میں ماسوی اللہ کو دخل نہ دے۔

حضرت ابو الحسن بصری نے صاف صاف کہہ دیا کہ تصوف نہ علوم ہے نہ رسوم۔ کیونکہ اگر علوم ہوتا تو پڑھنے سے حاصل ہو جاتا اور رسوم ہوتا تو مجاہدہ سے دستگاہ ہوتی بلکہ تصوف نام ہے اخلاق کا یعنی خدائے پاک کے خلق سے ہر ایک سے پیش آنا۔

تصوف کیا ہے؟ خدا کا والہانہ عشق صرف اس کے لئے سزا و جزا کے خیال سے بالاتر ہو کر

○

سالک کے راستے میں تین حجابات ہوتے ہیں جن کو اٹھائے بغیر منزل تک رسائی معلوم۔

حجاب اوّل۔ چاہے دونوں جہان کی سلطنت اُسے بطور تحفہ عطا کی جائے وہ خوش نہ ہو۔ اگر اس طرح شادمانی ہوئی وہ پھر بھی بندۂ ہوس رہا۔ اور جو ہوس کا شکار ہے اس پر خدا کی حضوری کا دروازہ بند ہے۔

حجاب دوم۔ چاہے دونوں جہاں کی سلطنت ملنے کے بعد وہ اس سے محروم کر دیا جائے تو اس کو مطلق صدمہ نہ ہو۔ کیونکہ صدمہ اور قلق غصّے کی علامت ہے اور غصہ ایذا و محرومی کا غماز ہے۔

حجاب سوم۔ کسی کی مدح یا مرحمت اُسے گمراہ نہ کرے کیونکہ ایسی خوشدلی روح کی دناءت کی چغلی کھاتی ہے اور راستی سے گمراہی کی طرف لے جاتی ہے۔ سالک کا حوصلہ بلند ہونا چاہیئے اور اس کا عقیدہ ہونا چاہیئے کہ "اے خدا تو میرے لیے کافی ہے۔"

○

ہر شے اُس سے ڈرتی ہے جو خدا سے ڈرتا ہے لیکن جو خدا کے سوا کسی سے ڈرتا ہے وہ تمام مخلوق سے ڈرتا ہے۔

۲۔ تصوف کے دو اجزا ہیں علم اور عمل اور دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ حضرت حاتم الاصم نے فرمایا کہ میں نے چار علم حاصل کیے اور تمام دنیا کے علوم سے فارغ ہو گیا۔

(الف) خدا نے جو رزق میری قسمت میں لکھ دیا ہے اس سے کم یا زیادہ نہیں ہو سکتا چاہے

طلب میں کتنی ہی کوشش کروں۔ (یہاں سے توکل اور قناعت کا آغاز ہوتا ہے)۔

(ب) خدا کا مجھ پر حق ہے جس کو میرے سوا دوسرا ادا نہیں کر سکتا۔ (یہاں سے خود اعتمادی اور جہد فی العمل کا آغاز ہوتا ہے)۔

(ج) موت میری تلاش میں ہے جس سے میں بھاگ نہیں سکتا (یہاں سے ہراسِ مرگ کا خاتمہ ہو جاتا ہے اور انسان میں نڈرپن اور عزم و ہمت و استقلال پیدا ہوتے ہیں)۔

(د) میرا ایک خداوند ہے جو میرے تمام بھیدوں سے واقف ہے اور جو کچھ میں کرتا ہوں وہ سب دیکھتا ہے اور جانتا ہے۔ لہٰذا مجھ کو اس کے سامنے ناکردنی باتوں سے شرم آتی ہے اور ان سے اجتنابِ کرتا ہوں (جب بندہ یقین کی رو سے جان جائے گا کہ میرا خدا مجھے دیکھ رہا ہے تو ایسا کام ہرگز نہ کرے گا جس سے خدا کے حضور شرمندہ ہونا پڑے۔ اس کے متعلق ایک بصیرت افروز حکایت ہے:

بصرے میں ایک رئیس تھا وہ اپنے باغ جایا کرتا تھا۔ ایک روز اس کی آنکھ اپنے باغبان کی عورت پر پڑ گئی اور مائل ہو گیا۔ اس کے شوہر کو کسی بہانے سے کہیں بھیج کر عورت کو اپنے پاس خلوت میں بٹھایا' پھر اس سے کہا کہ سب دروازے بند کر دے۔ عورت نے تعمیل کی مگر کہا کہ ایک دروازہ بند نہ کر سکی۔ رئیس نے کہا وہ کون۔ عورت نے جواب دیا کہ وہ جو ہمارے اور خدا کے درمیان ہے۔ رئیس پشیمان ہوا اور فعل بد سے توبہ کی)۔

۳۔ علم دو قسم کا ہوتا ہے ایک اصول کا اور دوسرا فروع کا۔ اصول کا علم یہ ہے کہ زبان سے کلمۂ شہادت پڑھے اور اس کا باطن یہ ہے کہ معرفت کی تحقیق کرے۔ فروع کا ظاہر یہ ہے کہ معاملہ اختیار کرے۔ جس کا باطن یہ ہے کہ نیت درست رکھے اور ان کا ایک دوسرے کے بغیر قائم رہنا محال ہے۔ ظاہر بغیر حقیقت باطن نفاق ہے اور باطن بغیر ظاہر کے زندقہ ہے۔ ظاہر میں شریعت کا پابند رہنا بے باطن کے نقصان ہے اور باطن بغیر ظاہر کے ہوس ہے۔ اس طرح علم حقیقت کے تین رکن ہوئے:

(۱) خدائے تعالےٰ کی ذات اور اس کی واحدنیت کا علم اور اس کی مثل و مثال کی نفی۔

(۲) خداوند عالم کی صفات اور احکام کا علم۔

(۳) اس کے افعال اور اس کی حکمت کا علم۔

اس طرح تصوف کے دائرے سے علم و عمل کا کوئی شعبہ خارج نہیں بلکہ عبادت و ریاضت' معرفت'

اخلاق، معاشرت اور ان سب کے آداب کو محیط ہے۔

اب حضرات صوفیہ کے مشاہدات و مجاہدات و طریق ریاضت کے مختلف منازل و مناسک و ذکر و شغل کا بطریق اختصار بیان ہوگا۔ میرا ماخذ علامہ ہجویری کی مشہور کتاب کشف المحجوب ہے۔

ملامت: ہمارے پیشوا حضرت رسولؐ پر جب تک وحی نازل نہیں ہوئی تھی اپنے جاننے والوں میں سب سے زیادہ نیک نام اور خوش خُلق شمار کیے جاتے تھے مگر جب رسالت کا خلعت عطا ہوا تو خلق نے ملامت میں زبان کھولی اور طرح طرح کے الزام لگائے۔ حتیٰ کہ مجنون کہہ دیا۔

ملامت انسان کو غرور اور تکبر سے محفوظ رکھتی ہے۔ خداوند عالم کا ارشاد ہے کہ میرے دوست میری قبا کے نیچے ہیں۔ میرے سوا ان کو کوئی نہیں پہچانتا۔

سُکر و صحو: مقام صحو مراد کا حاصل ہونا ہے۔ مقام صحو انسانیت کی تکمیل اور اعتدال سے صورت پذیر ہوتا ہے اور حق تعالےٰ سے ایک پردہ ہے۔ مقام سُکر زوال آفت اور صفات بشری اور نقصان اور اس کی تدبیر و اختیار سے بیگانہ ہونے کا نام ہے۔ سُکر عبارت ہے صحت حال سے حق کے ساتھ اور صحو عبارت ہے نہایت شوق اور بے حد محبت سے۔

ایثار: اس سے مراد خدمت خلق ہے۔ مثلاً دعاے حضرت نوری کہ بارخدایا تو دوزخ والوں پر عذاب کرے گا۔ تو اس پر بھی قادر ہے کہ مجھ سے دوزخ کو پُر کردے اور ان سب کو داخل بہشت کردے۔ ایثار سے یہ بھی مراد ہے کہ جو چیز سب سے زیادہ عزیز ہو خدا کی راہ میں صرف کردی جائے۔

نفس: امانت میں خیانت اور طلب رضا سے منع کرنے والا ہے۔

مجاہدۂ نفس: اپنے نفس کے فاسد رجحانات سے برسرپیکار رہنا۔ اپنے نفس پر قہر کرنا جہاد اکبر ہے۔

محاضرہ و مکاشفہ: محاضرہ شواہد آیات میں اور مکاشفہ شواہد مشاہدات میں ہوتا ہے۔ محاضرہ نشانیوں کو دیکھنے کی فکر میں رہنا ہے اور مکاشفہ کُنہِ عظمت میں متحیر رہنا۔

قبض و بسط: قبض حجاب ہے، بسط حالت کشف ہے۔ قبض میں گزارش و قہر ہے، بسط میں نوازش و لطف۔

اُنس و ہیبت: حق تعالےٰ کی تجلی دل پر شاہد جلال کے ساتھ ہونے کا حاصل ہیبت ہے۔ شاہد جمال

تجلی کرے تو اُنس ہے۔

نفی و اثبات | صفت بشریت کی نفی۔ برہانِ حقیقت کا اثبات۔

قہر و لطف | قہر آرزوؤں سے نفس کا باز رہنا۔ لطف تائیدِ حق۔

ہوا | شہوت نفس ہے جس کا ترک لازم ہے۔

فنا و بقا | انسانیت کے تعلقات سے کنارہ کرنا فنا ہے۔ اخلاص و اقرارِ عبودیت کا نام بقا ہے جو فنا کو خدا کی ذات میں فنا ہو جانا یا بقا کو خدا کی ذات سے واصل ہو کر باقی رہنا جانتا ہے وہ غلطی پر ہے اور زندیق و نصاریٰ کے مذہب کا پیرو ہے۔ کوچۂ فنا میں نہ محبت ہے نہ عداوت نہ بقا میں جمع و تفرقہ کی دوبیت ہے۔ یہ سمجھنا بھی خطا ہے کہ فنا سے مراد ذات کا گم ہونا اور اپنے وجود کا نیست و نابود ہو جانا ہے۔ اسی طرح خدا کے ساتھ بندے کی بقا محالات سے ہے۔ ہماری بقا یا فنا ہماری صفت ہے اور ہماری صفتوں کی خصوصیت میں ہماری بقا ہماری فنا کی طرح ہے اور ہماری فنا ہماری بقا کی طرح ہے۔ فنا سے مراد غیر کے ذکر کی فنا ہے اور بقا سے مراد خدا کے ذکر کی بقا ہے جو اپنی مراد سے فانی ہوتا ہے خدا کی مراد سے باقی ہوتا ہے۔

مقام، حال، تمکین | یہ خدائے عزّ و جل کی طرف راہیں ہیں۔ نعمت کی تکمیل تمکین ہے۔ مقام ایک درجہ ہے بلندیوں کا ہے۔ تمکین قرارگاہِ منتہیاں ہے۔ صاحبِ مقام اپنے مجاہدے کے ساتھ قائم ہوتا ہے۔ اور صاحبِ حال اپنے سے فانی ہوتا ہے۔

غیبت و حضوری | اپنے سے غیبت حق سے حضوری ہے اور حق سے حضوری اپنے سے غیبت ہے۔

جمع و تفرقہ | جمع وہ ہے جو اس کی صفتوں میں جمع کیا گیا ہو اور تفرقہ وہ ہے جو اس کے معنوں میں فرق بتلائے جمع توحید کا علم ہے۔ تفرقہ احکام کا علم ہے۔ اصُول کا علم جمع ہے فروع کا علم تفرقہ ہے۔ جو بندہ مجاہدے سے خدا کی طرف راہ پائے وہ تفرقہ میں ہے جس پر خدا کی عنایت و مہربانی ہے وہ جمع میں ہے۔ تفرقہ جدائی ہے جمع وصل ہے۔

حجاب حیرت | جس نے خدا کو پہچانا اس کا کلام گم ہو جاتا ہے اور اس پر حیرت طاری ہوتی ہے۔

حجاب کشف توحید | خدا ایک اور بے مثل ہے اور ہم یہ علم الیقین کے ساتھ کہہ سکیں۔ توحید حدوث سے قِدَم کا جدا ہونا ہے۔ مَیں نے اپنی ایک رباعی میں اس مطلب کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے بے شک نا کام

کوشش :

جس وقت ہوتی تیری طرف سے توفیق   تکوین تھا عقدہ نہ معمّا تخلیق
تو ہی ہے احد، و تو ہی ہے واحد   توحید ؟ حدوث اور قدم کی تفریق

انکشاف ایمان | قول اور تصدیق اور عمل سے مراد ایمان ہے ۔ ایمان کی اصل تصدیق دل سے ہے ۔

کشف طہارت | طہارت دو قسم کی ہے ۔ طہارت ظاہر و طہارت باطن ۔ بغیر ظاہری طہارت کے نماز درست نہیں ۔ دل کی پاکی بغیر معرفت حاصل نہیں ہوتی اور یہ توحید پر قائم ہوتا ہے ۔

علم اور معرفت | معرفت خدا کو بے دلیل کے پہچاننا ہے ۔ ضرور نہیں کہ عالم عارف بھی ہو ۔ عقل خود جہل میں مبتلا ہے وہ اپنے غیر کو کیونکر پہچان سکتی ہے ۔ معرفت کی حقیقت خدا کے بھیدوں پر اطلاع ہے ۔

شریعت اور طریقت | شریعت علم ہے ۔ طریقت عمل ہے ۔ حقیقت اس کا اثر ہے ۔ اعتقاد تین طریقوں سے پیدا ہوتا ہے ۔ تقلید سے، استدلال سے، کشف و حال سے ۔ پہلی دونوں قسموں کو شریعت کہتے ہیں تیسری قسم کا اعتقاد سلوک و تصوف و مجاہدہ و ریاضت کے بغیر حاصل نہیں ہوتا ۔

مشاہدہ | خدا کی معرفت میں اس کی قدرتوں کا مشاہدہ ہے اور اسی میں دل کی زندگانی ہے ۔ کیونکہ مشاہدہ سے مراد دل کا دیدار ہے اور دل پر تو انوار الٰہی ہے وسیلہ ہے حق تعالے کو ظاہر اور پوشیدہ طور پر دیکھنے کا ۔ مشاہدہ کی حقیقت دو طریق پر ہے ۔ یقین کی صحت، محبت کا غلبہ ۔ حب دوست کی محبت کا غلبہ اس درجہ ہو کہ اس کی کلیت دوست کی حدیث ہو جائے تو وہ اپنے دوست کے سوا کوئی چیز نہیں دیکھتا ۔ ایک بزرگ کا قول ہے کہ میں نے کسی چیز کو نہیں دیکھا ۔ مگر یہ کہ اس میں اللہ تعالےٰ کی قدرت کو دیکھا ہے ۔ دوسرے بزرگ کہتے ہیں کہ میں نے جس چیز کی طرف دیکھا ہے خداوند عالم کے لیے دیکھا ہے ۔ باطن کا مشاہدہ ظاہر کے مشاہدے سے ہوتا ہے ۔

محبت | جو اللہ تعالےٰ کو دوست رکھتا ہے اللہ تعالےٰ بھی اس کو دوست رکھتا ہے ۔ خدا کی محبت بندے کے واسطے اور بندے کی محبت خدا کے لیے ہے ۔ محبت دو طرح پر ہوتی ہے ۔ ایک جنس کی جنس سے اور وہ نفس کا میلان ہے ۔ جو لوگ خدا کی محبت کے گرویدہ ہیں وہ دو قسم کے ہیں ۔ ایک وہ جو اپنے اوپر خدا کا انعام دیکھتے ہیں اور انعام و احسان کا دیکھنا منعم اور محسن کی محبت کا تقاضا کرتا ہے ۔ دوسرے وہ ہیں جو انعام کو دوستی کے غلبہ سے محل حجاب میں رکھتے ہیں اور نعمتوں کے دیکھنے سے ان کا راستہ نعمت

دینے والے کی طرف ہوتا ہے اور یہ بہت بڑا درجہ ہے۔ بعض صوفیہ نے محبت کی صفائی کا نام صفوت اور محب کا نام صوفی قرار دیا ہے۔ بعض نے اس کو فقر سے تعبیر کیا اور محب کو فقیر یا درویش کہا ہے۔

محبت حال سے تعلق رکھتی ہے اور جو حال ہوتا ہے وہ کسی پر قال نہیں ہو سکتا۔ محبت خدا کی بخششوں میں سے ایک بخشش ہے جو کسب نہیں کی جا سکتی۔

عشق | بندے کا عشق خدا سے جائز ہے مگر خدا پر بندے کے عشق کا اطلاق روا نہیں کیونکہ محبت کا حد سے بڑھ جانا عشق ہے۔ خدا لامحدود ہے اس سے حدت گزر جانا منسوب نہیں کیا جا سکتا۔ بندہ خدا سے عشق کر سکتا ہے۔ خدا بندے سے عشق نہیں کرتا محبت کرتا ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالے نے اپنے لئے لفظ حُب (محبت) استعمال کیا ہے۔ عشق کہیں نہیں۔ مگر انسان کا خدا سے عشق رکھنا جس میں جذبہ سپردگی و تسلیم و رضا مضمر ہے تصوف کا سنگِ بنیاد ہے۔

علم الیقین - عین الیقین - حق الیقین | علم الیقین درجہ علما کا ہے بسبب اُن کی استقامت کے احکام و اوامر پر۔ عین الیقین عارفوں کا مقام ہے۔ حق الیقین فنا گاہ دوستاں ہے بسبب روگردانی کے جملہ موجودات سے۔ علم الیقین مجاہدہ سے حاصل ہوتا ہے، عین الیقین موانست سے، حق الیقین کی بنیاد مشاہدہ پر ہے۔

جبر و قدر | یہ مسئلہ ہے جسے مقاماتِ تصوف میں دخل نہیں بلکہ بربنائے اعتقاد ہے۔ جبریہ اور قدریہ دو فرقے ہیں۔

تصوف کا دائرہ بہت وسیع ہے چنانچہ اس میں نماز روزہ حج زکوٰۃ حتیٰ کہ آداب مجلس و نشست و برخاست سب کچھ شامل ہے۔ ان کو بخوف طوالت نظر انداز کر دیا اور اُن حقائق و معارف کو وہ بھی اختصار کے ساتھ لے لیا ہے جو متصوفانہ شاعری کے سمجھنے میں معین ہوں۔

آجکل اُردو کے شاعر اور ناقد متصوفانہ شاعری کی ہنسی اڑاتے اور اس کو فعل عبث ٹھہراتے ہیں۔ حالانکہ یورپ کے دورِ جدید کا ایک معتدر شاعر اور نقاد ہربرٹ ریڈ (HERBERT READ) کہتا ہے کہ "تصوف یا علم باطن (MYSTICISM) ایک حقیقت ہے۔ راستی کی بعض اقسام ایسی ہیں جو کہنا چاہیئے کہ ذہن انسانی پر خود بخود بغیر کسی محرک کے نازل ہوتی ہیں۔ اُن کا اثر جذبات و کردار پر بہت گہرا ہوتا ہے تاہم ان کو وثوق کے ساتھ تعینات کے حلقے میں نہیں لایا جا سکتا نہ ان کی وضاحت یا تعریف

کی جا سکتی ہے۔ ان کا راستہ دھندلا ہوتا ہے۔ ہم محسوس کرتے ہیں کہ وہ کوئی دیکھی ہوئی چیز ہے مگر بخوبی ذہن میں نہیں آتی۔ ایسے مدرکات میں عموماً ایک غیر متعین مرموزی عنصر ہوتا ہے جسے ٹھیک ٹھیک بیان نہیں کیا جا سکتا۔ گویا ایک ابتدائی اصول ایک جدید میلان ہے جو ہماری ذہنی ساخت کا ایک جزو ہے جسے محسوس کرنا ناگزیر ہے لیکن اصطلاحات یا الفاظ کے دائرے میں محصور کرنا دشوار ہے۔"

فرائڈ (FREUD) نے اسی مرموزی کیفیت کو شاعری میں الہام کا سرچشمہ قرار دیا ہے اور آنڈ (ID) سے مخصوص کیا ہے۔ اس کی ترتیب، تشکیل اور شیرازہ بندی انا (ego) کرتی ہے اور اس کا امکان ہوتا ہے کہ یہ کیفیت ماوراء انا (SUPER-EGO) میں جذب ہو کر وہ روحانی تلذذ یا تخیل بن جائے جو ماوراء انا میں کارفرما ہوتا ہے۔

○

اب میر کے چند اشعار جن کا موضوع تصوّف ہے مع مختصر اشارات کے ساتھ سنیئے آخر میں ایسے اشعار کا ایک مختصر انتخاب شامل کر دیا ہے۔

وحدت الوجود	تھا مستعار حسن سے اس کے جو نور تھا ✤ خورشید میں بھی اُس ہی کا ذرہ ظہور تھا
مَن عَرَفَ نفسہٗ فقد عرفَ ربّہٗ	پہنچا جو آپ کو تو میں پہنچا خدا کے تئیں ✤ معلوم اب ہوا کہ بہت میں بھی دور تھا
انسان احسنِ تقویم	تھا تو وہ رشکِ حورِ بہشتی ہمیں میں میر ✤ سمجھے نہ ہم تو فہم کا اپنے قصور تھا
معرفتِ اشیاء اضداد سے ہوتی ہے	کفر کچھ چاہیئے اسلام کی زینت کے لیے ✤ حسن زنار ہے تسبیح سلیمانی کا
دنیا جمالِ حق کا آئینہ ہے	جہاں جلوے سے اُس محبوب کے یکسر لبالب ہے ✤ نظر پیدا کر اول پھر تماشا دیکھ قدرت کا
مناظرِ قدرت مظاہرِ وحدت ہیں	جلوہ ہے اُسی کا سب گلشن میں زمانے کے ✤ گل پھول کو ہے اُن نے پردا سا بنا رکھا
دنیا ایک طلسم خیال ہے	ہیں عناصر کی یہ صورت بازیاں ✤ شعبدے کیا کیا ہیں ان چاروں کے بیچ
پہلے کثرت کو وحدت میں تحلیل کرو	نیرنگ حسن دوست سے کر آنکھیں آشنا ✤ ممکن نہیں وگرنہ ہو دیدار اک طرح
اس کے بعد	دیکھیں جدھر وہ رشک پری پیش چشم ہے ✤ حیران رہ گئے ہیں یہ اسرار دیکھ کر
ساز ایک ہے نغمے مختلف	گوش کو ہوش کے ٹک کھول کے سن شورِ جہاں ✤ سب کی آواز کے پردے میں سخن ساز ہے ایک
دہر ایک آئینہ خانہ ہے	چاہے جس شکل سے تمثال صفت اس میں در آ ✤ عالم آئینے کے مانند در باز ہے ایک
معرفت کی دشواریاں	اگر راہ میں اس کی رکھا ہے گام ✤ گئے گزرے خضر علیہ السّلام

انسان کے لیے بسط عالم بچھائی گئی ہے | اپنی ہی سیر کرنے ہم جلوہ گر ہوئے تھے ٭ اس رمز کو ولیکن معدود جانتے ہیں

پنہاں و آشکارا سب وہی وہ ہے | آئینہ ہو کے صورت معنی سے ہے لبالب ٭ راز نہان حق میں کیا خود نمائیاں ہیں

کُنتُ کنزاً مخفیاً | لایا ہے مرا شوق مجھے پردے سے باہر ٭ میں ورنہ وہی خلوتی راز نہاں ہوں

انسان ایک طرف کتنا بلند، اور ایک طرف کتنا پست ہے

اگرچہ نشہ ہوں ہیں سب خم جہاں میں لیک ٭ برنگ مَے عرق انفعال اپنا ہوں

انسان خود حجاب اکبر ہے | مری نمود نے مجھکو کیا برابر خاک ٭ میں نقش پا کی طرح پائمال اپنا ہوں

اسی حجاب کو داغ شرم سے تعبیر کیا ہے | اس آفتاب حسن کے ہم داغ شرم ہیں
اتنے ظہور پر بھی جو منہ کو چھپا رہے

سیروافی الارض | شیخ عزلت تو تہ خاک بھی پہنچے گی بہم ٭ مفت ہے سیر کہ یہ عالم ایجاد نہیں

دیدار خدا کے لیے صفائے قلب درکار ہے | دل صاف ہو تو جلوہ گہ یار کیوں نہ ہو
آئینہ ہو تو قابل دیدار کیوں نہ ہو

مادّہ پرستوں کا جواب | آیات حق ہیں سارے یہ ذرات کائنات ٭ انکار تجھ کو ہووے تو اقرار کیوں نہ ہو

کُلّ یوم ہو فی شان | ہے ماسوا کیا جو میر کہیے ٭ آگاہ سارے اس سے ہیں آگاہ
جلوے ہیں اسکے شانیں ہیں اسکی ٭ کیا روز کیا خور کیا رات کیا ماہ
اوّل کہ آخر ظاہر کہ باطن ٭ اللہ اللہ اللہ اللہ

تغیّرات زمانہ اس کی ادا سے بے نیازی ہیں | کوئی ہو محرم شوخی ترا تو میں پوچھوں
کہ بزم عیش جہاں کیا سمجھ کے برہم کی

حجاب خودی دور ہونے پر شاہد ہی مشہود ہو جاتا ہے | کب سے نظر لگی تھی دروازۂ حرم سے
پردا اٹھا تو لڑیاں آنکھیں ہماری ہم سے

ترک مدعا ہو تو انسان خدا سے مل جائے | سراپا آرزو ہونے نے بندہ کر دیا ہم کو
وگرنہ ہم خدا تھے گر دل بے مدعا ہوتے

ماسوی اللہ کا وجود محض اعتباری ہے | اگر چشم ہے تو وہی عین حق ہے
تعصّب تجھے ہے عبث ماسوا سے

خدا رب العالمین ہے | راہ سب کو ہے خدا سے جان اگر پہنچا ہے تو ٭ راستے ہوں مختلف کتنے ہی منزل ایک ہے

مسئلہ تکوین | کوئی بیگانہ گر نہیں موجود ٭ منہ چھپانا یہ کیا ہے پھر ہم سے

منزلِ فنا | ہم گرم رو ہیں راہ فنا کے شرر صفت ٭ ایسے نہ جائیں گے کہ کوئی کھوج پا سکے

فریفتۂ عشق | جب سے ناموس جنوں گردن بندھا ہے تب سے میر

جیب جاں وابستۂ زنجیر تا داماں ہوا

منزلِ حیرت | حیراں ہے لحظہ لحظہ طرز عجب عجب کا ٭ جو رفتۂ محبت واقف ہے اُس کے ڈھب کا

قرب و دوری | بے خودی لے گئی کہاں ہم کو ٭ دیر سے انتظار ہے اپنا

لا موجود الا اللہ | ہستی ہے اپنے طور پہ جوں بحر جوش میں ٭ گرداب کیسا موج کہاں ہے حباب کیا

صحو و سکر | رہتا ہے ایک نشہ انھیں جن کو ہے شناخت ٭ زاہد کو مستئ مئے عرفاں کی کیا خبر

فنائے کامل | محو کر آپ کو یُوں ہستی میں اس کی جیسے ٭ بُوند پانی کی نظر آتی نہیں پانی میں

یہ اشعار بطور مثال تھے۔ اب ایک مختصر انتخاب شامل کیا جاتا ہے۔ سلسلہ قائم رکھنے کو مندرجہ بالا اشعار دوبارہ درج ہو جائیں تو معافی کا خواستگار ہوں۔

میر کے متصوفانہ اشعار

انتخابِ دیوانِ اوّل

تھا مستعار حسن سے اُس کے جو نور تھا — خورشید میں بھی اُس ہی کا ذرّہ ظہور تھا
آتش بلند دل کی نہ تھی ورنہ اے کلیم — یک شعلہ برقِ خرمنِ صد کوہ طور تھا
تھا وہ تو رشکِ حورِ بہشتی ہمیں میں میر — سمجھے نہ ہم تو فہم کا اپنے قصور تھا

○

کفر کچھ چاہیے اسلام کی زینت کے لیے — حسن زنار ہے تسبیحِ سلیمانی کا

○

کہا میں نے کتنا ہے گل کا ثبات — کلی نے یہ سن کر تبسم کیا

○

ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی
چاہے ہیں سو آپ کرے ہیں ہم کو عبث بدنام کیا
کس کا قبلہ کیسا کعبہ کون حرم ہے کیا احرام
کوچے کے اُس کے باشندوں نے سب کو یہیں سے سلام کیا

○

منعم نے بنا ظلم کی رکھ گھر تو بنایا — پر آپ کوئی رات ہی مہمان رہے گا

○

جس سر کو غرور آج ہے یاں تاجوری کا — کل اُس پہ یہیں شور ہے پھر نوحہ گری کا
لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام — آفاق کی اس کارگہِ شیشہ گری کا

○

آخر کو مر گئے ہیں اُس کی ہی جستجو میں　　جی کے تئیں بھی کھویا لیکن اُسے نہ پایا

○

ناحق شناسی ہے یہ زاہد نہ کر برابر　　طاعت سے سو برس کی سجدہ اُس آستاں کا

○

دل نے ہم کو مثالِ آئینہ　　ایک عالم کا روشناس کیا

○

موقوف حشر پر ہے سو آتی بھی وہ نہیں　　کب درمیاں سے وعدۂ دیدار جائے گا

○

ہر قدم پر تھی اُس کی منزل لیک　　سر سے سودائے جستجو نہ گیا

○

ہم رہروانِ راہ فنا ہیں برنگِ عمر　　جاویں گے ایسے کھوج بھی پایا نہ جائے گا

○

دھوکا ہے تمام بحرِ دُنیا　　دیکھے گا کہ ہونٹ تر نہ ہوگا
دُنیا کی نہ کر تو خواستگاری　　اس سے کبھو بہرہ ور نہ ہوگا

○

جز مرتبۂ کل کو حاصل کرے ہے آخر　　اِک قطرہ نہ دیکھا جو دریا نہ ہوا ہوگا

○

حق ڈھونڈنے کا آپ کو آتا نہیں ورنہ　　عالم ہے سبھی یار کہاں یار نہ پایا

○

یہ توہّم کا کارخانہ ہے　　یاں وہی ہے جو اعتبار کیا

○

ہیں مشتِ خاک لیکن جو کچھ ہیں میرؔ ہم ہیں　　مقدور سے زیادہ مقدور ہے ہمارا

○

غلط تھا آپ سے غافل گزرنا　　نہ سمجھے ہم کہ اس قالب میں تو تھا
گل و آئینہ کیا خورشید و مہ کیا　　جدھر دیکھا تدھر تیرا ہی رو تھا
مگر دیوانہ تھا گل بھی کسو کا　　کہ پیراہن میں سو جاگہ رفو تھا

○

ہم نہ کہتے تھے کہ مت دیر و حرم کی راہ چل　　اب یہ دعویٰ حشر تک شیخ و برہمن میں رہا

○

وہ دشت خوفناک رہا ہے مرا وطن　　سن کر جسے خضر نے سفر سے حذر کیا

○

کچھ نہ دیکھا پھر بجز یک شعلۂ پر پیچ و تاب　　شمع تک تو ہم نے دیکھا تھا کہ پروانہ گیا

○

مرا جی تو آنکھوں میں آیا یہ سنتے　　کہ دیدار بھی ایک دن عام ہوگا

○

رسم قلمرو عشق مت پوچھ کچھ کہ ناحق　　ایکوں کی کھال کھینچی ایکوں کو دار کھینچا

○

سب پہ جس بار نے گرانی کی　　اس کو یہ ناتواں اٹھا لایا

○

یاں نام یار کس کے وردِ زباں نہ پایا　　پر مطلقاً کہیں ہم اس کا نشاں نہ پایا
پایا نہ یوں کہ کریے اس کی طرف اشارت　　یوں تو جہاں میں ہم نے اسکو کہاں نہ پایا
یہ دل کہ خون ہووے برجا نہ تھا، وگرنہ　　وہ کون سی جگہ تھی اس کو جہاں نہ پایا

○

فلک کا منھ نہیں اس فتنے کے اٹھانے کا　　ستم شریک ترا ناز ہے زمانے کا

○

دیر و حرم سے گزرے اب دل ہے گھر ہمارا　　ہے ختم اس آبلے پر سیر و سفر ہمارا

○

سرسری تم جہان سے گزرے   ورنہ ہر جا جہان دیگر تھا
خوش رہا جب تلک رہا جیتا   میر معلوم ہے قلندر تھا

○

آدم خاکی سے عالم کو جلا ہے ورنہ   آئینہ تھا تو مگر قابل دیدار نہ تھا
صد گلستاں نہ یک بال تھے اسکے جبتک   طائر جاں قفس تن میں گرفتار نہ تھا

○

ہوتا ہے یاں جہاں میں ہر روز و شب تماشا   دیکھا جو خوب تو ہے دنیا عجب تماشا

○

جس صید گاہ عشق میں یاروں کا جی گیا   مرگ اس شکارگہ کا شکار رمیدہ تھا
حاصل نہ پوچھ مشہد الفت کا بوالہوس   یاں پھل ہر اک درخت کا حلق بریدہ تھا

○

جہاں جلوے سے اس محبوب کے یکسر لبالب ہے   نظر پیدا کر اول پھر تماشا دیکھ قدرت کا

○

گئی تسبیح اس کی نزع میں کب میر کے دل سے   اسی کے نام کی سمرن تھی جب منکا ڈھلکتا تھا

○

عاشق ہیں ہم تو میر کے بھی ضبط عشق کے   دل جل گیا تھا اور نفس لب پہ سرد تھا

○

یاں بلبل اور گل پہ تو عبرت سے آنکھ کھول   گلگشت سرسری نہیں اس گلستان کا

ق

گل یادگار چہرۂ خوباں ہے بے خبر   مرغ چمن نشاں ہے کسو خوش بیان کا

○

جلوہ ہے اسی کا سب گلشن میں زمانے کے   گل پھول کو ہے ان نے پردا سا بنا رکھا

○

موندے رکھنا چشم کا ہستی میں عین دید ہے — کچھ نہیں آتا نظر جب آنکھ کھولے ہے حباب
کچھ نہیں بحرِ جہاں کی موج پر مت بھول میر — دور سے دریا نظر آتا ہے لیکن ہے سراب

○

اب تو چپ لگ گئی ہے حیرت سے — پھر کھلے گی زبان جب کی بات

○

چشم ہو تو آئینہ خانہ ہے دہر — منہ نظر آتا ہے دیواروں کے بیچ
ہیں عناصر کی یہ صورت بازیاں — شعبدے کیا کیا ہیں ان چاروں کے بیچ

○

منظور اس کو پردے میں ہیں بے حجابیاں — کس سے ہوا دوچار وہ عیار اک طرح
گہ گل ہے گاہ رنگ گہے باغ کی ہے بو — آتا نہیں نظر وہ طرحدار اک طرح
نیرنگ حسن دوست سے کیا آنکھیں آشنا — ممکن نہیں وگرنہ ہو دیدار اک طرح

○

کس ڈھب سے راہ عشق چلوں ہے یہ ڈر مجھے — پھوٹیں کہیں نہ آبلے ٹوٹیں کہیں نہ خار

○

تجلی جلوہ ہیں کچھ بام و در غم خانے کے میرے — وہ رشک ماہ آیا ہم نشیں بس اب دیا گل کر

○

دیکھیں جدھر وہ رشک پری پیش چشم ہے — حیران رہ گئے ہیں یہ اسرار دیکھ کر

○

ایکوں کی کھال کھینچی ایکوں کو دار کھینچا — اسرار عاشقی کے پچتائے یار کہہ کر

○

سہل مت بوجھ یہ طلسم جہاں — ہر جگہ یاں خیال ہے کچھ اور
نہ ملیں گو کہ ہجر میں مر جائیں — عاشقوں کا وصال ہے کچھ اور

○

مرگ اِک ماندگی کا وقفہ ہے — یعنی آگے چلیں گے دم لے کر
اِس کے اُوپر کہ دل سے تھا نزدیک — غم دوری چلے ہیں ہم لے کر

○

یاں جہاں میں کہ شہر کوراں ہے — سات پردے ہیں چشم بینا پر

○

منزلِ کی میرؔ اس کے کب تجھ سے راہ نکلی — یاں خضر سے ہزار ول مر مر گئے بھٹک کر

○

مجنوں کا دل ہُوں محمل لیلیٰ سے ہوں جُدا — تنہا پھروں ہوں دشت میں جوں نالۂ جرس

○

ہر جزر و مد سے دست و بغل اٹھتے ہیں خروش — کس کا ہے راز، بحر میں یارب کہ یہ ہے جوش

ق

ابروے کج ہے موج کوئی چشم ہے حباب — موتی کسو کی بات ہے سیپی کسو کا گوش

○

شب اس دلِ گرفتہ کو وا کر بزورِ مے — (ق) بیٹھے تھے شیرہ خانے میں ہم کتنے ہرزہ کوش
آئی صدا کہ یاد کرو دورِ رفتہ کو — عبرت بھی ہے ضرور ٹک اے جمع تیز ہوش
جمشید جس نے وضع کیا جام کیا ہوا — وے صحبتیں کدھر گئیں کیدھر وہ ناؤ نوش
جز لالہ اس کے جام سے پاتے نہیں نشاں — ہے کو کنار اس کی جگہ اب سبو بدوش
جھومے ہے بید جاے جوانانِ میگسار — بالاے خم ہے خشت سر پیر مے فروش

○

یہ نہ ہووے تو نظمِ کل اُٹھ جائے — سچے ہیں عاشقاں خدا ہے عشق

○

گوش کو ہوش کے ٹک کھول کے سُن شورِ جہاں — سب کی آواز کے پردے میں سخن ساز ہے ایک
چاہے جس شکل سے تمثال صفت اس میں درآ — عالم آئینے کے مانند دربار ہے ایک

○

کرتا جبینِ الست، گلچیں نے کل چمن میں   توڑا تھا شاخ گل کو، نکلی صدائے بلبل
یک رنگیوں کی راہیں طی کر کے مر گیا ہے   گل میں رگیں نہیں یہ، ہیں نقش پائے بلبل

○

سالک بہر طریق بدن ہے وبالِ جاں   یہ بوجھ تیرے ساتھ جو ہے اسکو ڈال چل

○

اس بزم خوش کے محرم نا آشنا ہیں سارے   کس کو کہوں کہ واں تک میری خبر کرو تم

○

مواجس کے لیے اس کو نہ دیکھا   نہ سمجھے میر کا کچھ مدعا ہم

○

اگر راہ میں اُس کی رکھا ہے گام   گئے گزرے خضر علیہ السلام

○

کام کیا آتے ہیں گے معلومات   یہ تو سمجھے ہی نہ کہ کیا ہیں ہم

○

از خویش رفتہ ہر دم فکر وصال میں ہوں   کتنا میں کھویا جاؤں یارب کہ تجھ کو پاؤں

○

آوازہ ہی جہاں میں ہمارا سنا کرو   عنقا کی طرح زیست ہے اپنی بنام یاں

○

رخصتِ جنبشِ لب عشق کی حیرت سے نہیں   مدتیں گزریں کہ ہم چپ ہی رہا کرتے ہیں

○

یارب کوئی تو واسطہ سرگشتگی کا ہے   اک عشق بھر رہا ہے تمام آسمان میں
پھاڑا ہزار جا سے گریبان صبر میر   کیا کہہ گئی نسیم سحر گل کے کان میں

○

زباں رکھ غنچہ ساں اپنے دہن میں   بندھی مٹھی چلا جا اس چمن میں

○

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

○

ہم آپ ہی کو اپنا مقصود جانتے ہیں
اپنے سوائے کس کو موجود جانتے ہیں

عجز و نیاز اپنا اپنی طرف ہے سارا
اِس مشتِ خاک کو ہم مسجود جانتے ہیں

صورت پذیر ہم بن ہرگز نہیں وہ معنی
اہلِ نظر ہمیں کو مشہود جانتے ہیں

اپنی ہی سیر کرنے ہم جلوہ گر ہوئے تھے
اس رمز کو ولیکن معدود جانتے ہیں

○

ہوں سیہ مستِ سرِ زلفِ صنم معذور رکھ
شیخ اگر کعبے میں آ کر گفتگو درہم کروں

○

آئینہ ہو کے صورتِ معنی سے ہے لبالب
رازِ نہاں حق میں کیا خود نمائیاں ہیں

○

لایا ہے مرا شوق مجھے پردے سے باہر
میں ورنہ وہی خلوتیِ رازِ نہاں ہُوں

○

اگرچہ نشہ ہوں سب میں خُمِ جہاں میں لیک
برنگِ مَی عرقِ انفعال اپنا ہُوں

مری نمود نے مجکو کیا برابر خاک
میں نقشِ پا کی طرح پائمال اپنا ہُوں

○

تا پھونکیے نہ خرقۂ طامات کے تئیں
حسنِ قبول کیا ہو مناجات کے تئیں

کیفیتیں اُٹھی ہیں یہ کب خانقاہ میں
بدنام کر رکھا ہے خرابات کے تئیں

○

کبھو آتے ہیں آپ میں تجھ بن
گھر میں ہم میہمان ہوتے ہیں

○

عام ہے یار کی تجلّی میر
خاصِ موسیٰ و کوہِ طور نہیں

○

شیخ عزلت تو تہِ خاک بھی پہنچے گی بہم — لعنت ہے سیر کہ یہ عالمِ ایجاد نہیں

○

منصور کی حقیقت تم نے سنی ہی ہوگی — حق جو کہے ہے اُس کو یاں دار کھینچتے ہیں

○

دل صاف ہو تو جلوہ گہ یار کیوں نہ ہو — آئینہ ہو تو قابل دیدار کیوں نہ ہو
آیات حق ہیں سارے یہ ذرات کائنات — انکار تجکو ہووے تو اقرار کیوں نہ ہو

○

کامل ہو اشتیاق تو اتنا نہیں ہے دور — حشر دگر پہ وعدۂ دیدار کیوں نہ ہو
مقصود درد دل ہے نہ اسلام ہے نہ کفر — پھر ہر دگلے میں سُبحہ تو زنار کیوں نہ ہو

○

صُورت تو تیری صفحۂ خاطر پہ نقش ہے — ظاہر میں اب ہزار تو مستور کیوں نہ ہو

○

بودِ آدم نمودِ شبنم ہے — ایک دو دم میں پھر ہوا ہے یہ
شکر اس کی جفا کا ہو نہ سکا — دل سے اپنے ہمیں گلا ہے یہ

○

شاید کہ سربلندی ہووے نصیب تیرے — جوں گرد راہ سب کے پاؤں سے تو لگا رہ

○

اس پر کہ تھا وہ شہرگ سے اقرب — ہرگز نہ پہنچا یہ دستِ کوتاہ

ق

ہے ماسوا کیا جو میرؔ کہیئے — آگاہ سارے اس سے ہیں آگاہ
جلوے ہیں اُسکے شانیں ہیں اس کی — کیا روز کیا خور کیا رات کیا ماہ
ظاہر کہ باطن، اوّل کہ آخر — اللہ اللہ اللہ اللہ

○

کہتے ہیں اڑ بھی گئے جل کے پر پروانہ — کچھ سُنی سوختگاں تم خبر پروانہ
کس گنہ کا ہے پس از مرگ یہ عذر جانسوز — پانو پر شمع کے پاتے ہیں سر پروانہ
بزمِ دُنیا کی تو دلسوزی سنی ہوگی میر — کس طرح شام ہوئی یاں سحر پروانہ

○

شوق کا کام کھنچا دور کہ اب مہر مثال — چشم مشتاق لگی جائے ہے طومار کے ساتھ

○

ہمت اپنی ہی تھی یہ میر کہ جوں مرغِ خیال — اک پرافشانی میں گزرے سرِ عالم سے بھی

○

شوخیٔ جلوہ اُس کی تسکین کیونکہ بخشے — آئینے میں دِلوں کے جو ہے بھی اور نہیں بھی

○

جلایا جس تجلی جلوہ گر نے طور کو ہمدم — اُسی آتش کے پرکالے نے ہم سے بھی شرارت کی

○

دیا دکھائی مجھے تو اُسی کا جلوہ میر — پڑی جہان میں جاکر نظر جہاں میری

○

آن میں کچھ ہیں آن میں کچھ ہیں — تحفۂ روزگار ہیں ہم بھی

○

کوئی ہو محرمِ شوخی ترا تو میں پُوچھوں — کہ بزمِ عیشِ جہاں کیا سمجھ کے برہم کی

○

رکھنا نہ تھا قدم یاں جوں بار بے تامل — سیر اس جہاں کی رہرو پر تو نے سرسری کی

○

کیا خوبی اس چمن کی موقوف ہے کسو پر — گل گر گئے عدم کو گھر سے نظیر آئے

○

کب سے نظر لگی تھی دروازۂ حرم سے — پردا اُٹھا تو لڑیاں آنکھیں ہماری ہم سے

بات احتیاط سے کر ضائع نہ کر نفس کو   بالیدگیٔ دل ہے مانند شیشہ دم سے

○

بلا کا شکر کر اے دل کہ اب معلوم ہوتی ہے   حقیقت عافیت کی اُس گلی کے رہنے والوں سے
نہیں خالی اثر سے تصفیہ دل کا محبت میں   کہ آئینے کو ربطِ خاص ہے صاحب جمالوں سے

○

اگر چشم ہے تو وہی عین حق ہے   تعصّب تجھے ہے عبث ماسوا سے

○

کہتے ہیں حجابِ رُخِ دلدار ہے ہستی   دیکھیں گے اگر یوں ہے بھلا جان بھی جاوے

○

سراپا آرزو ہونے نے بندہ کر دیا ہم کو   وگرنہ ہم خدا تھے گر دلِ بے مدعا ہوتے
اب ایسے ہیں کہ صانع کے مزاج اوپر بہم پہنچے   جو خاطر خواہ اپنے ہم ہوئے ہوتے تو کیا ہوتے

○

تری آہ کس سے خبر پائیے   وہی بے خبر ہے جو آگاہ ہے

○

قابلِ آغوشِ ستم دیدگاں   اشک سا پاکیزہ گہر چاہیے
خوفِ قیامت کا یہی ہے کہ میر   ہم کو جیا بار دگر چاہیے

○

ہستی اپنی حباب کی سی ہے   یہ نمائش سراب کی سی ہے

○

خاک تھی موج زن جہاں میں اور   ہم کو دھوکا یہ تھا کہ پانی ہے

○

سرمایۂ صد آفت دیدار کی حسرت ہے   دل کی تو سمجھ لیجے گر چشم کہا مانے

○

عشق میں وصل و جدائی سے نہیں کچھ گفتگو   قرب و بُعد اس جا برابر ہے محبت چاہیے

○

مر گئے پر ہے یہ صولت فقر کی چشمِ شیر اپنا چراغِ گور ہے

○

جس کے تئیں ڈھونڈے ہیں وہ سب ہیں یہی کس کے طلب گار ہوا چاہیے
کچھ نہیں خورشید صفت سر کشی سایۂ دیوار ہوا چاہیے

○

کہاں ہیں آدمی عالم میں پیدا خدائی صدقے کی انسان پر سے

○

اپنے جی ہی نے نہ چاہا کہ پئیں آبِ حیات یُوں تو ہم میرؔ اُسی چشمے پہ بے جان ہوئے

○

ہم آپ سے جاتے رہے ہیں ذوقِ خبر میں اے جان بلب آمدہ رہ تا خبر آوے

○

حرم کو جائیے یا دیر میں بسر کریے تری تلاش میں اِک دِل کدھر کدھر کریے

○

عشق وہ ہے کہ جو تھے خلوتیٔ منزلِ قدس وے بھی رسوائے سر کوچہ و بازار ہوئے
اس ستم گار کے کوچے کے ہواداروں میں نام فردوس کا ہم لے کے گنہگار ہوئے
وعدۂ حشر کو موہوم نہ سمجھے ہم آہ کس توقع پہ ترے طالبِ دیدار ہوئے

○

کہاں اے رشکِ آبِ زندگی ہے تو کہ یاں تجھ بن ہر اک پاکیزہ گوہر جی سے اپنے ہاتھ دھوتا ہے

○

تو جو نیری اے حیرت مری آنکھوں پہ کیا کم ہے جو میں ہر اک مژہ دیکھوں کہ یہ تر ہے کہ یہ نم ہے

○

راہ سب کو ہے خدا سے جان اگر پہنچا ہے تو راستے ہوں مختلف کتنے ہی منزل ایک ہے

○

آلودہ اُس گلی کی جو ہوں خاک سے تو میرؔ آبِ حیات سے بھی نہ وہ پانو دھوئیے

○

نہ ہو کس طرح فکرِ انجام کار
بھروسا ہے جس پر وہ مغرور ہے

○

ہر قطعے پر چمن کے ٹک گاڑ کر نظر کر
بگڑیں ہزار شکلیں تب پھول یہ بنائے

○

نے بُت کدہ ہے منزلِ مقصود نہ کعبہ
جو کوئی تلاشی ہو ترا آہ کدھر جائے

○

برنگِ بوئے غنچہ عمر اک ہی رنگ میں گزرے
میسّر میرؔ صاحب گر دلِ بے مدّعا آوے

○

غمِ فراق ہے دنبالہ گردِ عیشِ وصال
فقط مزا ہی نہیں عشق میں بلا بھی ہے

○

جو سوچے ٹک تو وہ مطلوب ہم ہی نکلے میرؔ
خراب پھرتے تھے جسکی طلب میں مدّت سے

○

ق

کوئی بیگانہ گر نہیں موجود
مُنھ چھپانا یہ کیا ہے پھر ہم سے

وجہ پردے کی پُوچھیے بارے
ملیے اس کے کسو جو محرم سے

○

ہم گرم رو ہیں راہ فنا کے شرر صفت
ایسے نہ جائیں گے کہ کوئی کھوج پا سکے

○

دکھائی دیے یُوں کہ بے خود کیا
ہمیں آپ سے بھی جدا کر چلے

دیوان دوم

ہر ذی حیات کا جو سبب ہے حیات کا
نکلے ہے جی ہی اس کے لیے کائنات کا

اسکے فروغِ حسن سے جھمکے ہے سب میں نور
شمعِ حرم ہو یا کہ دیا سومنات کا

بالذّات ہے جہاں میں وہ موجود ہر جگہ
ہے دیدِ چشمِ دل کے کھلے عین ذات کا

○

لذّت سے نہیں خالی جانوں کا کھپا جانا　　کب خضر و مسیحا نے مرنے کا مزا جانا

○

کچھ گل سے ہیں شگفتہ کچھ سرو سے ہیں قد کش　　اُس کے خیال میں ہم دیکھے ہیں خواب کیا کیا

○

جھمکی دکھا کے طور کو جن نے جلا دیا　　آئی قیامت اُن نے جو پردا اٹھا دیا

○

چھوٹا جو مر کے، قید عبارات میں پھنسا　　القصّہ کیا رہا ہو گرفتار عشق کا

○

عالم کی سیر میر کی صحبت میں ہو گئی　　طالع سے میرے ہاتھ یہ بیدست و پا لگا

○

غم ابھی کیا محشر مشہور کا　　شور سا ہے تو ولیکن دور کا

○

جدا جدا پھرے ہے میر سب سے کس خاطر　　خیال ملنے کا اُس کے اگر نہیں رکھتا

○

اس موج خیز دہر میں تو ہے حباب سا　　آنکھیں کھلیں تری تو یہ عالم ہی خواب سا

○

از خویش رفتہ میں ہی نہیں اُس کی راہ میں　　آتا نہیں ہے پھر کے اُدھر کا گیا ہوا
جس شعر پر سماع تھا کل خانقاہ میں　　وہ آج میں سنا تو ہے میرا کہا ہوا

○

پھرتا ہے زندگی کے لیے آہ خوار کیا　　اس وہم کی نمود کا ہے اعتبار کیا

○

میر اُس بے نشاں کو پایا جان　　کچھ ہمارا اگر سراغ لگا

○

جیب سے ناموس جنوں گردن بندھا ہے تب سے میر　　جیب جاں وابستۂ زنجیر تا داماں ہوا

○

اک رنگ پر نہ رہنا یاں کا عجب نہیں ہے — کیا کیا نہ رنگ لائے تب یہ جہاں بنایا
اس صحن پر یہ وسعت، اللہ رے تیری صنعت — معمار نے قضا کے دل کیا مکاں بنایا

○

غافل تھے ہم احوالِ دلِ خستہ سے اپنے — وہ گنج اسی کنج خرابی میں نہاں تھا

○

بے خودی لے گئی کہاں ہم کو — دیر سے انتظار ہے اپنا

○

جو کچھ نظر پڑے ہے حقیقت میں کچھ نہیں — عالم میں خوب دیکھو تو عالم ہے خواب کا

○

ایک تھے ہم وے نہ ہوتے ہست اگر — اپنا ہونا بیچ میں حائل ہوا

○

حیراں ہے لحظہ لحظہ طرزِ عجب عجب کا — جو رفتۂ محبت واقف ہے اس کے ڈھب کا

○

کیا تو نمود کس کی، کیسا کمال تیرا — اے نقش وہم آیا کیدھر خیال تیرا
پہلا قدم ہے انساں پامالِ مرگ ہونا — کیا جانے رفتہ رفتہ کیا ہو مآل تیرا

○

کبھو تو دیر میں ہوں میں کبھو ہوں کعبے میں — کہاں کہاں لیے پھرتا ہے شوق اس در کا

○

چمن بھی ترا عاشق زار تھا — گل وَرد اِک زرد رخسار تھا

○

نخچیر گاہِ عشق میں افراطِ صید سے — روح الامیں کا نام شکارِ زبوں ہوا

○

ہستی ہے اپنے طور سے جوں بحر جوش میں — گرداب کیسا موج کہاں ہے حباب کیا

○

خلطہ ہمارا اس کا حیرت ہی کی جگہ ہے — ڈھونڈا جہاں ہم اس کو واں آپ ہی کو پایا

○

جن و ملک زمین و فلک سب نکل گئے — بار گران عشق و دل ناتواں ہے اب

○

بیتابیاں بھری ہیں مگر کوٹ کوٹ کر — ہر قطرے میں جیسے برق ہمارے ہے اضطراب

○

گفتگو شاہد و مے سے ہے نہ غیبت نہ گلہ — خانقہ کی سی نہیں بات خرابات کی بات
گفتگو وصفوں سے اس ماہ کے کریے اے میر — کاہش افزا ہے کروں اس کی اگر ذات کی بات

○

ہم سرکشوں میں آتشِ سرکش کا ذکر کیا — چل بھی پڑی ہے بات تو اس تند خو کی بات

○

مستی میں شرم گنہ سے میں جو رویا ڈاڑھ مار — گر پڑا بے خود ہو واعظ جمعہ کو منبر سمیت

○

ہم نہ کہتے تھے کہیں زلف کہیں رخ نہ دکھا — اختلاف آیا نہ ہندو و مسلمان کے بیچ
باوجودِ ملکیت نہ ملک میں پایا — وہ تقدس کہ جو ہے حضرتِ انسان کے بیچ

○

سرسری مت جہاں سے جا غافل — پاتو تیرا جہاں پڑے ٹک سوچ
گل و رنگ و بہار پردے ہیں — ہر عیاں میں ہے وہ نہاں ٹک سوچ

○

کچھ خبر ہوتی تو نہ ہوتی خبر — صوفیاں بے خبر گئے شاید

○

کچھ ہو رہے گا عشق و ہوس میں بھی امتیاز — آیا ہے اب مزاج ترا امتحان پر

○

مستانِ عشق و اہلِ خرابات میں ہے فرق — میخوارگی کچھ اور ہے یہ ہے نشا کچھ اور
صورت پرست ہوتے نہیں معنی آشنا — ہے عشق سے بتوں کے مرا مدعا کچھ اور

○

اگر ساکت ہیں ہم حیرت سے پُر ہیں دیکھنے قابل — کہ اک عالم رکھے ہے عالمِ تصویر بھی آخر

○

اُس گوہر مراد کو پایا نہ ہم نے میرؔ　　پایان کار مر گئے یوں خاک چھان کر

○

رہتا ہے ایک نشہ انھیں جنکو ہے شناخت　　ہے زاہدوں کو مستیٔ عرفاں کی کیا خبر

○

آلودہ کر نہ ہستی سے جامے کو جسم کے　　ہشیار رہ یہ عاریتی ہے لباس پاس

○

صد رنگ جلوہ گر ہے ہر جادہ غیرت گل　　عاشق کی ایک پا دے کیونکر قرار خواہش

○

اے رشک برق تجھ سے مشکل ہے کار عاشق　　اک جھمکی میں کہاں پھر صبر و قرار عاشق

○

عشق ہی عشق ہے جہاں دیکھو　　سارے عالم میں بھر رہا ہے عشق
عشق معشوق عشق عاشق ہے　　یعنی اپنا ہی مبتلا ہے عشق
عشق ہے طرز و طور عشق کے تئیں　　کہیں بندہ کہیں خدا ہے عشق
دلکش ایسا کہاں ہے دشمن جاں　　مدعی ہے پہ مدعا ہے عشق

○

پتے کو اس چمن کے نہیں دیکھتے ہیں گرم　　جو محرم روش ہیں کچھ اُس بدگماں کے لوگ

○

بے گہ شکستہ رنگیٔ خورشید کیا عجب　　ہوتا ہے زرد بیشتر اہل فنا کا رنگ

○

مظاہر سب اُس کے ہیں ظاہر ہے وہ　　تکلف ہے یاں جو چھپاتے ہیں لوگ
رہے ہم تو کھوئے گئے سے سدا　　کبھو آپ میں ہم کو پاتے ہیں لوگ

○

وقفۂ مرگ اب ضروری ہے　　راہ طی کرتے تھک رہے ہیں ہم

○

یہی جانا کہ کچھ نہ جانا ہائے　　سو بھی اک عمر میں ہوا معلوم

گرچہ تو ہی ہے سب جگہ لیکن　　ہم کو تیری نہیں ہے جا معلوم

○

نیا آناً فاناً اُس کو دیکھا　　جدا تھی شان اس کی ہر زماں میں

○

کہے ہے ہر کوئی اللہ میرا　　عجب نسبت ہے بندے اور خدا میں

○

مُدت ہوئی کہ اپنی خبر کچھ نہیں ہمیں　　کیا جانیے کہ میر گئے ہم کدھر کے تئیں

○

آب سب ہوتا ہوں پا کر آپ کو جیسے حباب　　یعنی اس ننگ عدم ہستی سے شرماتا ہوں میں

○

گرچہ عالم جلوہ گاہ یار یُوں بھی تھا ولے　　آنکھیں جب مُوندیں عجب عالم نظر آیا ہمیں

○

محو کر آپ کو یُوں ہستی میں اُس کی جیسے　　بُوند پانی کی نہیں آتی نظر پانی میں

○

رکھا کر اشک افشاں چشم فرصت غیر فرصت میں　　کہ مِل جاتا ہے ان بُوندوں کا پانی بحرِ رحمت میں

○

ہستی اپنی ہے بیچ میں پردا　　ہم نہ ہوویں تو پھر حجاب کہاں

○

الف کی رمز اگر سمجھا، اُٹھا دل بحث علمی سے　　اسی اک حرف کو برسوں سے ہم تکرار کرتے ہیں

○

کیا کیا کیا تامل اس فکر میں گیا گھُل　　سمجھا نہ آپ کو میں کیا جانیے کہ کیا ہوں

○

کھنچتا چلا ہے اب تو تصدیق کو تصوّر　　ہر لحظہ اُس کے جلوے پیشِ نظر رہے ہیں

○

اے کاش ہم کو سُکر کی حالت رہے مدام　　تا حال کی خرابی سے ہم بے خبر رہیں

○

کیا کہیئے آہ جی کو قیامت ہے اِنتظار | آتا نہ کاش وعدۂ دیدار درمیاں

○

سو رنگ وہ ظاہر ہوا کوئی نہ جاگہ سے گیا | دل کو جو میرے چوٹ تھی طاقت نہ لایا ایک میں
جن جن نے دیکھا تھا اُسے بیخود ہوا جیتا بھی پھر | پر میرؔ جیتے جی بخود ہرگز نہ آیا ایک میں

○

کیا عبث مجنوں پئے محمل ہے میاں | یہ دِوانا باؤلا عاقل ہے میاں
رنگ بے رنگی جدا تو ہے، دلے | آپ سا ہر رنگ میں شامل ہے میاں

○

ہے اس چمن میں وہ گل صد رنگ محو جلوہ | دیکھو جہاں وہی ہے کچھ اُس سوا نہ دیکھو

○

دیر رہنے کی جا نہیں یہ چمن | بوئے گل ہو صفیرِ بُلبُل ہو

○

یہی مشہور عالم ہیں دو عالم | خدا جانے ملاپ اُس سے کہاں ہو
جہاں سجدے میں ہم نے غش کیا تھا | وہیں شاید کہ اس کا آستاں ہو

○

جنت کی منت اُن کے دماغوں سے کب اٹھے | خاک رہ اُس کی جن کے کفن کا عبیر ہو

○

درویشی سے بھی اپنی نکلے ہے میرزائی | نقشِ حصیر تن پر ایسے ہیں جوں ’تو‘ ہو

○

کھینچا ہے آدمی نے بہت دور آپ کو | اس پردے میں خیال تو کر ٹک خدا نہ ہو

○

جیسے ہوتی ہے کتاب ایک ورق بن ناقص | نسبت نام اسی طور ہے جُز سے کُل کو

○

بندے کے درد دل کو کوئی نہیں پہنچتا   ہر ایک بے حقیقت یاں ہے خدا رسیدہ

○

ایسے ظاہر کا لطف ہے چھپنا   کم تماشا نہیں یہ پردا کچھ

○

بود نقش و نگار سا ہے کچھ   صورت اک اعتبار سا ہے کچھ

○

آدمی سے ملک کو کیا نسبت   شان ارفع ہے میر انساں کی

○

وہم جس کو محیط سمجھا ہے   دیکھیے تو سراب ہے وہ بھی

○

مرتبہ واجب کا سمجھے آدمی ممکن نہیں   فہم سودائی ہوا یاں عقل دیوانی ہوئی

○

گردش میں ہیں جو میر مہ و مہر ستارے   دن رات ہمیں رہتی ہے یہ چشم نمائی

○

ہشیار کہ ہے راہ محبت کی خطرناک   مارے گئے ہیں لوگ بہت بیخبری سے

○

سجدہ کوئی کرے تو دربار پر کرے   ہے جائے پاک شرط عبادت کے واسطے

○

مقصود کے خیال میں بہتوں نے چھانی خاک   عالم تمام وہم ہے یاں ہاتھ کیا لگے

○

سو رنگ کی جب خوبی پاتے ہیں اسی گل میں   پھر اس سے کوئی اس بن چاہے بھی تو کیا چاہے

○

اس آفتاب حسن کے ہم داغ شرم ہیں   اتنے ظہور پر بھی جو منھ کو چھپا رہے

○

مقصود گم کیا ہے تب ایسا ہے اضطراب — چکر میں ورنہ کا ہے کو یوں آسماں رہے

○

اب سمجھ آئے ، مرتبا سمجھے — گم کیا خود کے تئیں خدا سمجھے
میر صاحب کا ہر سخن ہے رمز — بے حقیقت ہے شیخ کیا سمجھے

○

ربط صاحب خانہ سے مطلق بہم پہنچا نہ میر — مدتوں سے ہم حرم میں تھے پہ نامحرم گئے

○

ساکن دیر و حرم دونوں تلاشی ہیں ترے — تو خدا جانے کہاں ہے کیوں کے تجھکو پائیے
دوری سے ہوش کھو دیتی ہے اس کی بوے خوش — آپ میں رہیے تو اس کے پاس بھی ٹک جائیے

○

روے سخن کدھر ہے اہل جہاں کا یارب — سب متفق ہیں اس پر ہر ایک کا خدا ہے
نایاب اُس گہر کی کب ہے تلاش آساں — جی ڈوبتا ہے اس کا جو تہ سے آشنا ہے

○

حرم سے دیر اُٹھ جانا نہیں عیب — اگر یاں ہے خدا واں بھی خدا ہے
کب اُس بیگانہ خو کو سمجھے عالم — ق — اگرچہ یار عالم آشنا ہے
نہ عالم میں ہے نے عالم سے باہر — یہ سب عالم سے عالم ہی جدا ہے

○

ٹک گریباں میں سر کو ڈال کے دیکھ — دل بھی دامن وسیع صحرا ہے

○

سرگرم جلوہ اس کو دیکھے کوئی سو جانے — طرز خرام کیا ہے حسن و جمال کیا ہے
گہ آپ میں نہیں ہو گہ منتظر کہیں ہو — یہ میر جی تمھارا ان روز دل حال کیا ہے

○

ہم آپ سے گئے تو الٰہی کہاں گئے — مدت ہوئی کہ اپنا ہمیں انتظار ہے

○

نیاز اپنا جس مرتبے میں ہے یاں   اُسی مرتبے میں وہ مغرور ہے

○

گہ دیر میں ہیں گہے حرم میں   اپنا تو یہی دوانہ پن ہے

○

شوق وصال ہی میں جی کھپ گیا ہمارا   با آنکہ ایک دم وہ ہم سے جدا نہیں ہے
ہر صبح اٹھ کے تجھ سے مانگوں ہوں میں تجھی کو   تیرے سوائے میرا کچھ مدعا نہیں ہے

○

اس منزل دلکش کو منزل نہ سمجھیے گا   خاطر میں رہے یاں سے درپیش سفر بھی ہے

○

دل سے نزدیک اور اتنا دُور   کس سے اُس کو کچھ آشنائی ہے

○

کس کو کہتے ہیں نہیں میں جانتا اسلام و کفر   دیر ہو یا کعبہ مطلب مجکو تیرے در سے ہے

○

سہل ہے میر کا سمجھنا کیا   ہر سخن اُس کا اک مقام سے ہے

○

گرچہ پردا کرے جوں ماہِ شب ابر وہ شوخ   کب چھُپا رہتا ہے ہر چند چھپا نکلے ہے

○

برسوں لگی رہے ہیں جب مہر و مہ کی آنکھیں   تب کوئی ہم سا صاحب، صاحبِ نظر بنے ہے

○

دیوان سوم

جاننا باطل کسو کو یہ قصورِ فہم ہے   حق اگر سمجھو تو سب کچھ حق ہے یاں باطل ہی کیا
وہ حقیقت ایک ہی ساری نہیں ہے سب میں تو   آب سا ہر رنگ میں یہ اور کچھ شامل ہے کیا

○

ہو باغ و بہار آیا، گل پھول کہیں پلیا　　جلوہ اُسے یاں اپنا صد رنگ دکھانا تھا

○

جسم خاکی کا جہاں پردہ اٹھا　　ہم ہوئے وہ میر سب وہ ہم ہوا

○

جو خوب دیکھو تو ساری وہی حقیقت ہے　　چھپانا چہرے کا عشاق سے تکلف تھا

○

کبھو وہ توجہ ادھر کر رہے گا　　ہمیں عشق ہے تو اثر کر رہے گا

○

تحقیق کروں کس سے حقیقت کے لینے کو　　خضر آب اُسے کہتا ہے آتش کہے موسےٰ

○

مرید پیرِ مغاں صدق سے نہ ہم ہوتے　　جو حق شناس کوئی اور بھی نظر آتا

○

ہوا ہے عارفانِ شہر کو عرفان بھی اندھا　　کہ ہر درویش ہے مارا ہوا شوقِ الہٰی کا

○

مسلم ہیں رفتہ رو گئے، کافر ہیں بستہ مو کے　　یہ بیچ سے اٹھے گا کس طور اختلاف اب

○

بجلی سی اک تجلی آئی تھی آسماں سے　　آنکھیں لگا رہے ہیں اہل نظر اُدھر سب

○

تم کس خیال میں ہو تصویر سے جو چپ ہو　　کرتے ہیں لوگ کیا کیا تقریر میر صاحب

○

پھرتی ہے اُڑی خاک بھی مشتاق کسو کی　　سر مار کے کرتا ہے پہاڑوں میں بسر آب
کس شکل سے اک رنگ پہ رہنا ہو جہاں کا　　رہتی ہیں کوئی صورتیں یہ نقش ہیں بر آب

○

غم زمانہ سے فارغ ہیں مایہ باختگاں   قمار خانۂ آفاق میں ہے ہار ہی جیت

مجھ بے نوا کی یاد رہے میرؔ یہ صدا   اس مے کدے میں رہیو بہت ہوشیار دوست

شیخ جنّت تجھے مجھے دیدار   واں بھی ہر اک کی ہی جدا قسمت

دیر سے سوئے حرم آیا نہ ٹک   ہم مزاج اپنا ادھر لائے بہت

ہمیں عشق میں میرؔ چپ لگ گئی   نہ شکر و شکایت نہ حرف و حکایت

تو پیدا ہے لیکن ہویدا نہیں   یہ تصدیع ہموارہ کی ہے عبث

ہم جانتے ہیں تازہ بنا سے جہاں کو لیک   یہ منزل خراب ہوئی ہے کبھو کی طرح
آخر کو اس کی راہ میں ہم آپ گم ہوئے   مدت ہیں پائی یار کی یہ جستجو کی طرح

ثباتِ قصر و در و بام خشت و گل کتنا   عمارت دل درویش کی رکھو بنیاد

تھے جملہ تن لطافت عالم میں جاں کہ ہم تو   مٹی میں اَٹ گئے ہیں اس خاکداں میں آکر
سعی و طلب بہت کی مطلب کے تئیں نہ پہنچے   ناچار اب جہاں سے بیٹھے ہیں ہاتھ اٹھاکر

مذہب سے میرے کیا تجھے میرا دیار اور   میں اور یار اور مرا کار و بار اور

جو ہے سو مست بادۂ وہم و خیال ہے   کس کو ہے یاں نگاہ کسو دُرد نوش پر

چشم پوشی نہ کر فقیر ہے میرؔ
مہر کی اس کو اک نظر ہے بس

○

جہانِ تنگ رکھنے ہی کی جا تھی
کوئی دن میں تکلف سے رہا خوش

○

ہم تو دریا پر کیا ترکِ خروش
دل کے دل ہی کھپائے اپنے جوش

○

حیرت حسن یار سے چپ ہیں
سب سے حرف و کلام ہے موقوف

○

کیا حقیقت کہوں کہ کیا ہے عشق
حق شناسوں کا ہاں خدا ہے عشق
اور تدبیر کو نہیں کچھ دخل
عشق کے درد کی دوا ہے عشق
عشق سے جا نہیں کوئی خالی
دل سے لے عرش تک بھرا ہے عشق
کون مطلب کو عشق بن پہنچا
آرزو عشق مدّعا ہے عشق

○

وصل و جدائی سے ہے مبرّا وہ کام جاں
معلوم کچھ ہوا نہ ہمیں یاں سوائے شوق
کیا پوچھتے ہو شوق کہاں تک ہے ہمکو میرؔ
مرنا ہی اہل درد کا ہے انتہائے شوق

○

کیا کوئی اس کے رنگوں گل باغ میں کھلا ہے
شور آج بلبلوں کا جاتا ہے آسماں تک

○

اس بیاباں میں میرؔ محو ہوئے
ناتواں اک غبار کے سے رنگ

○

مصروف یار چاہیئے مرغ چمن سا ہو
دل نذر و دیدہ پیشکش و جاں فدائے گل

○

ہمارا خاص مشرب عشق اس میں
پیمبر دل ہے قبلہ دل خدا دل

○

نہ کھینچیں کیونکہ نقصان ہم تو قیدی ہیں تعین کے — خودی سے کوئی نکلے تو اُسے ہو وے خدا حاصل

○

اپنے خیال ہی میں گزرتی ہے اپنی عمر — پر کچھ نہ پوچھو سمجھے نہیں جاتے ہم سے ہم

○

اس معنی کے ادراک سے حیرت ہی ہے حاصل — آئینہ نمط صورت دیوار نہ ہو تم

○

حور و قصور و غلماں نہر و نعیم و جنت — یہ کلہم جہنم مشتاق یار ہیں ہم

○

ہاں آپ ہی آپ آکر گم آپ میں ہوئے ہو — پیدا نہیں کہ کس کی کرتے ہو جستجو تم
چاہیں تو تم کو چاہیں دیکھیں تو تم کو دیکھیں — خواہش دلوں کی تم ہو آنکھوں کی آرزو تم
نسبت تو ہمدگر ہے گو دور کی ہو نسبت — ہم ہیں نوائے بلبل ہو گل کی رنگ و بو تم

○

برسے اگر شمشیر سروں پر منھ موڑیں زنہار نہیں — سیدھے جانے والے اُدھر کے کس کے پھیرے پھرتے ہیں

○

نقش کسی کا درونِ سینہ گرم طلب ہے ویسے رنگ — جیسے لیے تصویر خیالی پاس چتیرے پھرتے ہیں

○

عرش تک تو خیال پہنچا میر — وہم پھر ہے کہیں قیاس کہیں

○

خراب و خوار ہیں سلطاں شکستہ حال امیر — کسو فقیر سے شاید کہ صحبت انکو نہیں

○

صفا سے دل جو ہوئی ٹک تو دیکھے ہیں کیا کیا — ہم ایسے آئینے کو اپنے کیوں جلا نہ کریں

○

یہ تصرف عشق کا ہے سب وگرنہ ظرف کیا — ایک عالم غم سمایا خاطر ناشاد ہیں

○

جس چمن زار کا ہے تو گلِ تر
بلبل اُس بوستاں کے ہم بھی ہیں
وجہِ بیگانگی نہیں معلوم
تم جہاں کے ہو واں کے ہم بھی ہیں

○

رہے پھرتے دریا میں گرداب سے
وطن میں بھی ہیں ہم سفر میں بھی ہیں

○

تھا شوق مجھے طالبِ دیدار ہوا میں
سو آئینہ ساں صورتِ دیوار ہوا میں
اب پست و بلند ایک ہے جوں نقشِ قدم یاں
پامال ہوا خوب تو ہموار ہوا میں

○

عشق وہ خانماں خراب ہے میاں
جس سے دل آگ چشم آب ہے میاں
تن میں جب تک ہے جاں تکلف ہے
ہم میں اُس میں ابھی حجاب ہے میاں
چشم وایاں کی چشم بسمل ہے
جاگنا یہ نہیں ہے خواب ہے میاں

○

عالم آئینہ ہے جسکا وہ مصور بے مثل •
ہائے کیا صورتیں پردے میں بناتا ہے میاں

○

جائے ہے جی نجات کے غم میں
ایسی جنت گئی جہنم میں
بے خودی پر نہ میر کی جاؤ
تم نے دیکھا ہے اور عالم میں

○

مرنا ہے خاک ہونا، ہو خاک اُڑتے پھرنا
اس راہ میں ابھی تو درپیش مرحلے ہیں

○

نگین عاشق و معشوق کے رنگ
جدا رہتے ہیں ہم کھڑے ایک گھر میں
بگولے کی روش وحشت زدہ ہم
رہے برچیدہ دامن اس سفر میں

○

اثر ہوتا اگر اپنی دعا میں
لگ اٹھتی آگ سب ارض و سما میں

○

خدا ساز تھا آزر بت تراش / ہم اپنے تئیں آدمی تو بنائیں
کہیں میر عشق مجازی ہے بد / حقیقت ہو معلوم گر دل لگائیں

○

جیسے بجلی کے چمکنے میں کسو کی سدھ جائے / بے خودی آئی اچانک ترے آجانے میں

○

یاں جیسے شمع بزم اقامت نہ کر خیال / ہم دل کباب پردے میں سرگرم راہ ہیں

○

تم "بن چمن کے گل" نہیں چڑھتے نظر کبھو / یہ کیا روش ہے آؤ چلے ٹک ادھر کبھو

○

یہ سرا سونے کی جاگہ نہیں بیدار رہو / ہم نے کر دی ہے خبر تم کو خبردار رہو
گرچہ وہ گوہر تر ہاتھ نہیں لگتا لیک / دم میں دم جب تئیں ہے اسکے طلبگار رہو

○

کرنا شعار خوب ہے عجز و نیاز کو / بے وقر جانتے ہیں دل بے گداز کو
جوں شمع سر کٹے ہے بیاں حال کا کئے / لانا زباں پہ خوب نہیں دل کے راز کو

○

دل ایک تڑپنے میں پرے عرش کے پایا / اس طائر بے بال کی پرواز تو دیکھو

○

بہر فردوس ہو آدم کو الم کاہے کو / وقف اولاد ہے وہ باغ تو غم کاہے کو

○

بارے دنیا میں رہو غمزدہ یا شاد رہو / ایسا کچھ کر کے چلو یاں کہ بہت یاد رہو

○

کیا آنکھ بند کر کے مراقب ہوئے ہو تم / جاتے ہیں کیسے کیسے سمے چشم وا کرو
موقوف ہرزہ گردی نہیں کچھ قلندری / زنجیر سر اتار کے زنجیر پا کرو

○

پایا گیا وہ گوہر نایاب سہل کب ۔۔۔ نکلا ہے اس کو ڈھونڈنے تو پہلے جان کھو

○

لطف سے لے ابرِ رحمت ایک دو بارش ادھر ۔۔۔ کشت زرد ناامیداں بھی تو ٹک سیراب ہو

○

رستے سے چاک دل کے ہو آگاہ ۔۔۔ یاں تک پھر تو کس قدر ہے راہ
ہیں مسلمان ان بتوں سے ہمیں ۔۔۔ عشق ہے لا الٰہ الا اللہ

○

ہے تمنا سے وصال اسکی مری جان کے ساتھ ۔۔۔ جان ہی جائیگی آخر کو اس ارمان کے ساتھ
بحر پر نہر پہ برسے ہے برابر ہی ابر ۔۔۔ پیش ہر اک سے کریم آتے ہیں احسان کے ساتھ

○

آنکھیں جو ہوں تو عین ہے مقصود ہر جگہ ۔۔۔ بالذات ہے جہاں میں وہ موجود ہر جگہ
واقف ہو شان بندگی سے قید قبلہ کیا ۔۔۔ سر ہر کہیں جھکا کہ ہے مسجود ہر جگہ
پھرتی ہے اپنے ساتھ لگی متصل فنا ۔۔۔ آبِ رواں سے ہم ہوئے نابود ہر جگہ

○

کیا عہدہ بر آئی ہو اس گل کی دو رنگی سے ۔۔۔ ہر لحظہ ہے خود رائی ہر آن ہے رعنائی

○

خانہ خراب ہو خواہشِ دل کا آہ نہایت اس کو نہیں
جان لبوں پر آئی ہے تو بھی گرم طلب سی ہے

○

کچھ چیز مال ہو تو خریدار ہو کوئی ۔۔۔ دُنیا کی قدر کیا کہ متاعِ قلیل ہے

○

ہم طائر بے پر ہیں وے جنکو بہاراں ہیں ۔۔۔ گلگشتِ گلستاں کا شوق اور اسیری ہے

○

سر کسو سے فرو نہیں آتا — حیف بندے ہوئے خدا نہ ہوئے

○

تسبیحیں ٹوٹیں خرقے مصلے پھٹے، جلے — کیا جانے خانقاہ میں کیا میرؔ کہہ گئے

○

رنگ لیتی ہے سب ہوا اس کا — اُس سے باغ و بہار ہیں رستے

○

پامال یوں کیا کہ برابر ہیں خاک کے — کیا ظلم ہو گیا کہ خریدار ہم ہوئے

○

درویش جب ہوئے ہم تب ہے ہمیں برابر — کشکولِ واژگوں ہے یا افسرِ شہی ہے

○

آئینہ وار اسی سے پاتے ہیں شش جہت کو — دیکھیں تو منھ دکھاوے وہ کام جاں کدھر ہے

○

لوہو پانی ایک کر دیتا ہے عشق — پانی کر دے چشم دل لوہو کرے

○

چراغانِ گل سے ہے کیا روشنی — گلستاں کسو کی قدم گاہ ہے

○

جیسے گرداب ہے گردش مری ہر چار طرف — شوق کیا جانے لیے مجکو کدھر جاتا ہے

○

کی عمر صرف ساری پر گم ہے مطلب اپنا — منزل نہ پہنچے ہم تو طی کر کے راہ کو بھی

○

مرگ کیا منزلِ مراد ہے میرؔ — یہ بھی اک راہ کا توقف ہے

○

جہاں شطرنج، بازندہ فلک، ہم تم ہیں سب مُہرے — بسان شاطرِ نو ذوق اسے مُہروں کی ضد سے ہے

○

بات کیا آدمی کی بن آئی — آسماں سے زمین نپوائی
چرخ زن اسکے واسطے ہے مدام — ہو گیا دن تمام رات آئی
ماہ و خورشید و ابر و باد سبھی — اس کی خاطر ہوئے ہیں سودائی
کیسے کیسے کیے تردد جب — رنگ رنگ اس کو چیز پہنچائی
اس کو ترجیح سب کے اوپر دے — لطفِ حق نے کی عزت افزائی
حیرت آتی ہے اسکی باتیں دیکھ — خودسری خودستائی خودرائی
شکر کے سجدوں میں یہ واجب تھا — یہ بھی کرتا سدا جبیں سائی
سو تو اس کی طبیعتِ سرکش — سر نہ لائی فرو کہ ٹک لائی
میرؔ ناچیز مشت خاک اللہ — اُن نے یہ کبریا کہاں پائی

○

دست افشاں پاپے کو باں شوق میں — صومعہ سے میرؔ بھی باہر گئے

دیوان چہارم

کرتا ہوں اللہ اللہ درویش ہوں سدا کا — سرمایۂ توکل یاں نام ہے خدا کا
کیا فقر میں گزر ہو چشمِ طمع ہے بن — ہے راہ تنگ ایسی جیسے سوئی کا ناکا
ابر اور جوش گل ہے چل خانقہ سے صوفی — ہے لطف میکدے میں دہ چند اس ہوا کا
آلودہ خوں سے ناخن ہیں شیر کے سے ہر سو — جنگل میں چل بنے تو پھولا ہے زرد ڈھاکا
یہ دو ہی صورتیں ہیں یا منعکس ہے عالم — یا عالم آئینہ ہے اُس یارِ خود نما کا

○

واعظ کہے سو سچ ہے وے میفروش سے — میں ذکر بھی سنا نہیں صوم و صلوٰۃ کا
عالم کسو حکیم کا باندھا طلسم ہے — کچھ ہو تو اعتبار بھی ہو کائنات کا

○

حقیقت نہ میر اپنی سمجھی گئی — شب و روز ہم نے تامل کیا

سرگرمِ طلب ہو کر کھویا گیا میں آپی — کیا جانیے پاؤں گا یا اس کو نہ پاؤں گا

غم قرب و بعد کا تھا جب تک نہ ہمنے جانا — اب مرتبہ جو سمجھے وہ اتنا دور کیا تھا
اے وائے یہ نہ سمجھے لالے پڑینگے اس میں — اظہارِ عشق کرنا ہم کو ضرور کیا تھا

جیسے پرچھائیں دکھائی دے کے ہو جاتی ہے محو — میر بھی اس کامِ جاں کا یوں ہی تھا سایا گیا

شکر کیا اس کی کریمی کا ادا بندے سے ہو — ایسی اک ناچیز مشتِ خاک کو انساں کیا

مکے گیا، مدینے گیا، کربلا گیا — (ن) جیسا گیا تھا ویسا ہی چل پھر کے آ گیا
دیکھا ہو کچھ اس آمد و شد میں تو میں کہوں — خود گم ہوا ہوں بات کی تہ اب جو پا گیا

آستاں کی کسو کے خاک ہوا — آسماں کا بھی کیا ستارا تھا

محروم نہ جائیں کہیں بعدِ فنا بھی — ہے شبہ ہمیں یار کے دیدار میں صاحب
گو فہم نہ ہو کفر سے اسلام کی نسبت — رشتہ ہے عجب سبحہ و زنار میں صاحب

التفاتِ زمانہ پر مت جا — میر دیتا ہے روزگار فریب

چار دیواریٔ عناصر میر — خوب جاگہ ہے پر ہے بے بنیاد

مت اس چمن میں غنچہ روش بود و باش کر　　مانندِ گُل شگفتہ جبیں یاں معاش کر

○

تقدیسِ دل تو دیکھ ہوئی جس کو اس سے راہ　　سر دے ہیں لوگ اس کے قدم کے نشان پر

○

مست و بے خود ہم اس کے در پہ گئے　　لوگ اُس کو خبر کریں کیوں کر

○

کب سے نگاہ گاڑے ہے یاں روزنِ آفتاب　　ہم دیکھے ہیں جہاں کے تئیں سرسری ہنوز

○

لوگ بہت پُوچھا کرتے ہیں کیا کہیے میاں کیا ہے عشق
کچھ کہتے ہیں سرِ الٰہی، کچھ کہتے ہیں خدا ہے عشق

○

دل کا مطالعہ کر اے آگہِ حقائق　　ہیں فنِ عشق کے بھی مشکل بہت دقائق

○

نزدیک عاشقوں کے زمیں ہے قرارِ عشق　　اور آسماں غبارِ سرِ رہگزارِ عشق
مارا پڑا ہے اُنس ہی کرنے میں ورنہ میر　　ہے دُور گردِ وادیٔ وحشت شکارِ عشق

○

سمجھا بھی تو کہ دل کسے کہتے ہیں دل ہے کیا　　آتا ہے جو زباں پہ تری بار بار دل

○

اگرچہ وصل ہے پر ہیں طلب میں سرگرداں　　یہ وہم کار ہے جانتے ہیں جستجو کو ہم
مریدِ پیرِ مغاں یوں نہ صدق سے ہوتے　　سمجھتے عارف اگر اور بھی کسو کو ہم

○

خاک ہے اصلِ طینتِ آدم چاہیے اس کو عجز کرے
بات کی تہ کو کچھ پاتے تو اتنا سر نہ اٹھاتے تم

○

اک نورِ گرم جلوہ فلک پر ہے ہر سحر　　کوئی تو ماہ پارہ ہے میر اس رواق میں

○

صبح ہوئی گلزار کے طائر دل کو اپنے ٹٹولے ہیں
یاد میں اُس خود رو گلِ تر کی کیسے کیسے بولے ہیں

○

ہم بھی عالمِ فقر میں ہیں پر ہم سے جو مانگے کوئی فقیر
ایک سوال میں دو عالم دیں ایسے دل کے تنگ نہیں

○

صورتوں سے خاکداں یہ عالمِ تصویر ہے　　لیں کیا اہلِ نظر خاموش ہیں حیرت سے یاں
کیا سرِ جنگ و جدل ہو بے دماغِ عشق کو　　صلح کی ہے میر نے ہفتاد و دو ملت سے یاں

○

عالمِ علم میں ایک تھے ہم وے حیف ہے اُن کو گیان نہیں
اب کہتے ہیں خلط کیسا، جان نہیں پہچان نہیں

○

کیا جانیے کہ کیا کچھ پردے سے ہووے ظاہر　　رہتے ہیں دیکھتے ہم ہر صبح آسماں کو
بعد از نماز تھے کل میخانے کے در اوپر　　کیا جانے میر اٹھ کر داں سے گئے کہاں کو

○

کھول آنکھیں صبح سے آگے کہ شیر اللہ کے　　دیکھتے رہتے ہیں غافل وقت گرگ و میش کو

○

ساری وہی حقیقت ملحوظ سب میں رکھی　　کہیئے نمود ہووے جو اس کے ماسوا کچھ

○

یک معنیٔ شگفتہ سو رنگ بندھ گئے ہیں　　الوانِ گل ہیں ہر سو اب کے بہار بھی

○

کچھ نہیں اور دیکھے ہیں کیا کیا　　خواب کا سا ہے یاں کا عالم بھی

○

گزرے بسان صرصر عالم سے بے تامل　　افسوس میر تم نے کیا سیر سرسری کی

○

آگے کسو کے کیا کریں دست طمع دراز　　وہ ہاتھ سو گیا ہے سرہانے دھرے دھرے

○

نگاہ غور سے کر میر سارے عالم میں　　کہ ہے جو عینِ حقیقت وہی تو ساری ہے

○

عالم ہیئت مجموعی سے ایک عجیب مرقع ہے
ہر صفحے میں ورق میں اس کے دیکھے تو عالم دیکھے

دیوان پنجم

دل رفتۂ جمال ہے اُس ذوالجلال کا　　مستجمعِ جمیع صفات و کمال کا
ادراک کو ہے ذاتِ مقدس میں دخل کیا　　اودھر نہیں گزار گمان و خیال کا
ہے قسمتِ زمین و فلک سے غرض نمود　　جلوہ وگرنہ سب میں ہے اسکے جمال کا
مرنے کا بھی خیال رہے میر اگر تجھے　　ہے اشتیاق جانِ جہاں کے وصال کا

○

رہے ہم عالم مستی میں اکثر　　رہا کچھ اور ہی عالم ہمارا

○

خیال چھوڑ دے واعظ تو بے گناہی کا　　رکھے ہے شوق اگر رحمتِ الٰہی کا

○

آگے عالم عین تھا اس کے اب عینِ عالم ہے وہ　　اس وحدت سے یہ کثرت ہے یاں ہر اک یاں گیا

گل تھے سو سو رنگ پر ایسا شورِ طیورِ بلند نہ تھا
اس کے رنگ چمن میں شاید کوئی پھول نظر آیا

○

ایک اللہ کا بہت ہے نام　　جمع باطل ہوں سو الٰہ تو کیا

○

بہت کی جستجو اس کو نہ پایا　　ہمیں درپیش ہے اب جی کا کھونا

○

ملنے والو پھر ملیے گا ہے وہ عالمِ دیگر میں　　میر فقیر کو سکر ہے یعنی مستی کا عالم ہے اب

○

کم ناز سے ہے کس کے بندے کی بے نیازی　　قالب میں خاک کے یاں پنہاں خدا ہے شاید

○

تو بھی رباطِ کہن سے صوفی سیر کو چل ٹک سبزے کی
ابرِ سیہ قبلے سے آکر جھوم پڑا میخانے پر
بعد مرے سُبحہ کو مرے ہاتھوں ہاتھ ملک لیں گے
سو سو بار لیا ہے میں نے نام اُس کا ان دانوں پر
دل کی حقیقت عرش کی عظمت سب ہے معلوم ہمیں
سیر رہی ہے اکثر اپنی ان پاکیزہ مکانوں پر

○

مسلم و کافر کے جھگڑے میں جنگ و جدل سے ہاتھ نہیں　　لوتھوں پہ لوتھیں گرتی رہیں گی کتنے رہیں گے سر کے سر

○

بڑی دولت ہے درویشی جو ہو ہمرہ قناعت کے　　کہ عرصہ تنگ ہے حرصِ ہوا سے تاجداروں پر

○

اس وقت ہے دعا و اجابت کا وصل میر　　اک نعرہ تو بھی پیشکشِ صبحگاہ کر

اُسے ڈھونڈتے میر کھوئے گئے　　　کوئی دیکھے اس جستجو کی طرف

○

عشق سے نظمِ کل ہے یعنی عشق کوئی ناظم ہے خوب
ہر شئے یاں جو پیدا ہوئی ہے موزوں کر لایا ہے عشق

عشق ہے باطن اس ظاہر کا، ظاہر باطن عشق ہے سب
اودھر عشق ہے عالمِ بالا ایدھر کو دنیا ہے عشق

دائر سائر ہے یہ جہاں میں جہاں تہاں متصرّف ہے
عشق کہیں ہے دل میں پنہاں اور کہیں پیدا ہے عشق

موج زنی ہے میر فلک تک ہر لجّہ ہے طوفاں زا
سرتاسر ہے تلاطم جس کا وہ اعظم دریا ہے عشق

○

ارض و سما میں عشق ہے ساری چاروں اور بھرا ہے عشق
ہم ہیں جنابِ عشق کے بندے، نزدیک اپنے خدا ہے عشق

ظاہر و باطن، اوّل و آخر، پائیں بالا عشق ہے سب
نور و ظلمت، معنی و صورت سب کچھ آپ ہوا ہے عشق

ایک طرف جبریل آتا ہے ایک طرف لاتا ہے کتاب
ایک طرف پنہاں ہے دلوں میں ایک طرف پیدا ہے عشق

خاک و باد و آب و آتش سب ہیں موافق اپنے تئیں
جو کچھ ہے سو عشق یہاں ہے کیا کہئے اب کیا ہے عشق

○

مقصود گم ہے پھرتا جو رہتا ہے رات دن　　　ہلکان ہو کے ہوگا کبھو آسماں ہلاک
اس ظلم کیش کی ہے طرب گاہ ہر کہیں　　　عاشق خدا ہی جانے ہوا ہے کہاں ہلاک

○

پایا نہ کنھوں نے اسے کوشش کی بہت میرؔ
سب سالک و مجذوب گئے اسکی طلب میں

○

عشق کے دیوانے کی سلاسل ہلتی ہے تو ڈریں ہیں ہم
گرگڑے پیل مست کی سی زنجیروں کی جھنکاریں ہیں

○

میخانے میں اس عالم کے لغزش پرستوں کی نہ جا
سُکر میں اکثر دیکھے ہم نے بڑے بڑے یاں ہشیاراں

○

مثال برق وہ جھمکی دکھا دے
وے دل شرط ہے جو تاب لاوے

○

نہ بک شیخ اتنا بھی واہی تباہی
کہاں رحمت حق کہاں بے گناہی

○

عالم عالم عشق و جنوں ہے دنیا دنیا تہمت ہے
میں دریا دریا روتا ہوں صحرا صحرا وحشت ہے

○

یمن نجر دستے اپنے میں روز جہاں سے گزرتا ہوں
وحشت ہے خورشید نمط اپنے بھی مجکو سائے سے

○

دامن پر فانوس کے تھائیں ہی سا نشان خاکستر
شوق کی میں جو نہایت پوچھی جان جلے پروانے سے

○

گر بزاں ہوں سائے سے خورشید ساں
جہاں جب سے ہے مجکو تجرید ہے
تصرف میں جب ڈال دیتے ہیں بات
خدا رس کہے ہیں یہ توحید ہے

○

ہستی موہوم و یک سر و گردن
سیکڑوں کیوں کے حق ادا کریے

○

جو ہے سو میر اس کو میرا خدا کہے ہے
کیا خاص نسبت اس سے ہر فرد کو جدا ہے

○

استخواں کانپ کانپ جلتے ہیں
عشق نے آگ یہ لگائی ہے

○

نہیں اتحادِ تن و جاں سے واقف
ہمیں یار سے جو جدا جانتا ہے

دیوان ششم

نہ خودسر کیوں کے ہوں ہم یار اپنا
خود آرا خود پسند و خودستا تھا

○

تجرید کا فراغ ہے اک دولت عظیم
بھاگا جو اپنے سائے سے ہی خوشتر آفتاب
پیدا ہے روز مشرقِ نو کی نمود سے
نکلے ہے کوے یار سے بچ بچ کر آفتاب

○

طریقِ عشق میں ہے رہنما دل
پیمبر دل ہے قبلہ دل خدا دل

○

عالم کا عین اُسی کو معلوم کر چکے ہیں
اس وجہ سے اب اُسکا دیدار ہے ہمیشہ

○

زمیں اور ہے آسماں اور ہے
کہ آناً فاناً سماں اور ہے
ہوا رنگ بدلے ہے ہر آن میر
زمیں و زماں ہر زماں اور ہے

○

صحبت عجب طرح کی پڑی اتفاق ہائے
کھو بیٹھیے جو آپ کو تو اس کو پا جیے

کڑھا کرے ہیں ہوا ہے مورد جہانِ اجسام جب سے اپنا
غمِ جدائی جہانِ جاں کا ہمارے دِل میں جہاں جہاں ہے

○

صولت فقیری کی نہ گئی مرگئے پہ بھی
اب چشمِ شیر گور کا میری چراغ ہے

○

ہوا طالع جہاں خورشید دل ہے
تردد کیا ہے ہستی میں خدا کی

○

ڈاکٹر گیان چند

میر کی عشقیہ مثنویاں

میر نے مثنوی نگاری میں ایک طرحِ نو ڈالی۔ وہ شمالی ہند کے پہلے بڑے مثنوی نگار ہیں۔ یوں تو انہوں نے کُل ملا کر ۳۷ مثنویاں لکھیں لیکن ادبی حیثیت سے عشقیہ مثنویاں زیادہ جاذبِ توجہ ہیں، ان کی تعداد نو ہے۔

(۱) مثنوی جوان و عروس (۲) معاملاتِ عشق (۳) جوشِ عشق (۴) خواب و خیال (۵) دریائے عشق (۶) اعجازِ عشق (۷) شعلۂ شوق (شعلۂ عشق) (۸) مثنوی عشقیہ عُرف عشقِ افغان پسر (۹) مورنامہ۔

پہلی اور آخری مثنوی راقم الحروف نے دریافت کرکے رسائل میں شائع کرا دی ہیں اور ڈاکٹر عبادت بریلوی نے ان کو اپنے مرتبہ کلیات میں شامل کر لیا ہے۔ پہلی مثنوی کا مخطوطے میں کوئی نام نہیں۔ سہولت کے لئے ہم اسے جوان و عروس کہہ کر پکار سکتے ہیں۔

میر کی مثنویوں کا مطالعہ ان کی افتادِ طبع، اُن کے سوانحِ حیات، اُن کے عہد کے سیاسی و معاشی خلفشار کے پس منظر میں کرنا چاہیئے۔ میر ایک درویش کے بیٹے تھے۔ اور بچپن سے سید امان اللہ اور باپ ایسے درویشوں کے زیرِ اثر تربیت پائی۔ صوفی باپ[1] میر کو ہمیشہ یہی سبق دیتا تھا۔

[1] ذکرِ میر طبع اوّل ص ۵

"اے پسر عشق بورز۔ عشق است کہ دریں کارخانہ متصرف است۔ اگر عشق نمی بود نظم کل صورت نمی بست۔ عشق بسازد، عشق بسوزد، در عالم ہر چہ ہست ظہورِ عشق است۔"

میر کے مزاج میں ابتدا ہی سے خستگی و برشتگی بسی ہوئی تھی۔ لڑکپن کے بے فکر زمانے میں بھی یہ کھوئے کھوئے سے رہتے تھے۔ اُن کے والد دریافت کرتے تھے :

"اے سرمایۂ[1] جاں ایں چہ آتشے است کہ در دلت نہان است۔"

یہ دس سال کے تھے کہ اُن کے والد کا انتقال ہو گیا۔ باپ کی وفات کے بعد اُن کے سوتیلے بھائی حافظ محمد حسن نے بڑی بے رُخی دکھائی۔ جس کے باعث یہ گھر سے نکل کھڑے ہوئے۔ دِلّی کے پہلے سفر سے واپس آنے پر یہ ایک پری تمثال کو دِل دے بیٹھے۔ جس نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ تذکرہ بہارِ بے خزاں میں لکھا ہے :

" بہ شہر خویش بہ پری تمثالے کہ از عزیزانش بود در پردہ تعشقِ طبع و میلِ خاطر داشت۔ آخر عشق او خاصیتِ مشک پیدا کردہ۔"

انشائے رازِ پردہ دوبارہ ترکِ وطن کرکے دِلّی چلے گئے اور اپنے سوتیلے ماموں خان آرزو کے پاس ٹھہرے۔ اُن کے بھائی محمد حسن نے خان آرزو کو لکھ بھیجا کہ میر تقی فتنۂ روزگار ہے۔ اِس پر خان موصُوف نے میر کے ساتھ بدسلوکی کو شیوا بنا لیا۔ اعزا کی ستم رانی اور ہجرِ محبوب کی سینہ کاوی دونوں نے مِل کر اُن کی طبیعت میں جنُون کی کیفیت پَیدا کر دی۔ جس کی تفصیل مثنوی "خواب و خیال" اور "ذکرِ میر" دونوں میں ہے۔ معاملاتِ عشق اور جوشِ عشق بھی اسی داستانِ خونین کی فصلیں ہیں۔ تذکرۂ خوش معرکۂ زیبا میں میر کے قیامِ لکھنؤ کے ایک معاشقے کا انکشاف کیا گیا ہے۔ مرقوم ہے :

"آخر میر صاحب کو ولولۂ عشق پَیدا ہوا اور صُورت کسی کی آئینہ خورشید میں معائنہ ہوتی تھی۔ پیرِ جواں ہمّت ایسوں کو کہتے ہیں۔ کسی نے پُوچھا کہ پیرانہ سالی میں کدخدائی ہونے کا کیا باعث ہوا فرمایا اِس لیے سسرال والے کہیں لڑکا آیا۔"

یہ بیان کسی خلاق ذہن کی اختراع معلوم ہوتا ہے۔ صاحبِ تذکرہ نے آئینۂ ماہ کی جگہ آئینۂ خورشید میں صُورت پَیدا کر دی لیکن یہ نہ سوچا کہ آئینۂ خورشید پر نظر ڈالنے کی تاب کس کو

---

[1] ذکر میر طبع اوّل ص،

ہے۔ کسی دوسرے ذریعے سے میر کی مندرجہ بالا کتخدائی کی تصدیق نہیں ہوتی۔

عشق میں ناکامی، فاقہ کشی، اہلِ دُنیا سے مایوسی، توکل و استغنا اور آئے دن کی آفات نے انہیں بد دماغ بنا دیا تھا۔ ساتھ ہی انہیں اپنے کمال کا شدید احساس اور ناقدری کا شکوہ تھا جس کی وجہ سے وہ کسی کو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ آصف الدولہ کے حضور میں مثنوی شکار نامہ پیش کی تو اس کے خاتمہ میں برملا اعلان کیا:

بہت کچھ کہا ہے کرو میرؔ بس کہ اللہ بس اور باقی ہوس

جواہر تو کیا کیا دکھایا گیا خریدار لیکن نہ پایا گیا

متاعِ ہنر پھیر لے کر چلو بہت لکھنؤ میں رہے گھر چلو

میر کی عشقیہ مثنویاں ان کے مزاج و سیرت سے کلیتاً ہم آہنگ ہیں۔

فارسی اور اُردو کی رومانی مثنویاں دو گروہوں میں تقسیم کی جا سکتی ہیں (۱) طویل مافوق الفطرت منظوم داستانیں (۲) خالص وارداتِ عشق کو پیش کرنے والی مختصر مثنویاں۔ ان میں قصے کا پہلو کمزور رہتا ہے لیکن دل کی کیفیات اور واردات بیان کرنے پر زور دیا جاتا ہے۔ فارسی میں ان کی مثال لیلےٰ مجنوں اور شیریں فرہاد ہیں۔ میر نے اس نوع کو ترقی دے کر ایک مخصوص رنگ روپ دیا۔

میر کی مثنویاں دراصل ایک طویل غزل ہیں۔ ان کا تصورِ عشق غزل سے مستعار لیا گیا ہے ان مثنویوں کا منشا عشق کی عالمگیری اور جہاں سوزی کا بیان کرنا ہے۔

یہ ہے میرؔ وہ عشقِ خانہ خراب کہ جی جتنے مارے ہیں یاں بے حساب

غزل کا عاشق میر کی مثنوی کا ہیرو بن گیا ہے۔ ایک غزل میں فرماتے ہیں۔

جان اپنا جو ہم نے مارا تھا کچھ ہمارا اسی میں وارا تھا

ہم تو تھے محو دوستی اس کے گو کہ دشمن جہاں ہمارا تھا

عشق بازی میں کیا موئے ہیں میرؔ آگے ہی جی انہوں نے ہارا تھا

کیا یہ ان کی مثنویوں کے ہیرو کی سرگزشت نہیں؟ اب معاملاتِ عشق کی تمہید کے یہ اشعار ملاحظہ کیجیے:

کچھ حقیقت نہ پوچھو کیا ہے عشق — حق اگر سمجھو تو خدا ہے عشق
عشق عالی جناب رکھتا ہے — جبرئیل و کتاب رکھتا ہے
عشق نے چھاتیاں جلائی ہیں — آگیں کس کس جگہ لگائی ہیں
خستۂ عشق کچھ نہ میر ہوئے — بادشہ عشق میں فقیر ہوئے

ان میں سے ہر شعر کسی غزل کا مطلع ہو سکتا ہے۔ ان میں اس قسم کا ربط نہیں کہ اگر درمیان سے ایک دو شعر نکال لیے جائیں تو معنی میں خلل پڑ جائے۔ ان میں مسلسل غزل کی سی وحدت خیال ہے۔ گو یا مثنویاتِ میر میں افسانہ ایک ایسا قالب ہے جس پر عاشقِ مہجور کی آشفتہ مغزی کا لبادہ ڈال دیا گیا ہو۔ قدیم مثنوی نگاروں مثلاً افضل۔ فضائل علی خاں۔ جعفر علی زکی کے یہاں عشق کا بیان حقیقت سے قریب تھا۔ میر نے اسے ناقابلِ حصول آدرش کا روپ دے دیا۔

میر کا تصورِ عشق مثالیت کے ملاءِ اعلیٰ کا ہے۔ انہوں نے جذبِ عشق کی تاثیر دکھانے کے لئے ایک غیر صنّاعانہ ہتھکنڈے سے کام لیا۔ یعنی انجام کو غیر فطری بنا دیا۔ عاشق کی موت پر محبوب بھی جان دینے کو مجبور ہو جاتا ہے۔ اور لاشیں اس طرح واصل ہو جاتی ہیں کہ ہزار کوشش کے باوجود جدا نہیں ہوتیں۔ یہ انوکھا خیال اردو میں سب سے پہلے مقیمی کی دکنی مثنوی چندربدن و مہیار میں پیش کیا گیا۔ ظاہر ہے کہ میر مقیمی سے واقفیت نہ رکھتے تھے۔ عہدِ عالم گیر کی بعض فارسی مثنویوں میں بھی وصل پس از مرگ کا بیان ہے۔ میر نے وہیں سے یہ مضمون اُڑایا ہوگا۔ گویا میر کے نزدیک عشق ایسا روگ ہے جو موت کے بعد بھی پیچھا نہیں چھوڑتا۔ دوسرے یہ کہ اگر فریقین ایک دوسرے پر صدق دل سے فدا ہیں تو کبھی نہ کبھی مل ہی جاتے ہیں۔ اِس دنیا میں نہیں تو اُس دنیا میں۔ ظاہر ہے کہ یہ غیر فطری انجام آج قارئین کو نہ متاثر کرتا ہے نہ قائل۔ پھر بار بار ہر مثنوی میں اسی خیال کو دہرانا آرٹ کے تقاضوں کو بھی نظر انداز کرنا ہے۔

میر کی مثنوی کا ہیرو عشقیہ مثنویوں کی دوسری شق یعنی داستانی مثنویوں کے ہیرو افسانہ کی بالکل ضد ہے۔ سحر البیان۔ گلزار نسیم اور اسی قبیل کے قصّوں کا ہیرو ہمیشہ دودمانِ شاہی کا چشم و چراغ ہوتا تھا۔ لیکن مثنویاتِ میر کا ہیرو ہمیشہ طبقۂ عوام میں سے ہوتا ہے۔ میر کبھی نوابوں اور بادشاہوں کے گرویدہ نہ تھے۔ ع پر مری گفتگو عوام سے ہے ——— ان کا مسلک تھا۔ ان کا عوامی

ہیرو مجنوں صفت نغانی العشق کا رُونیا سے نابلد اور بے نیاز ہوتا ہے۔ داستانی مثنویوں کے ہیرو میں طبقۂ بالا کے تمام کمالات و اکتسابات جمع کر دیے جاتے تھے۔ وہ حسن و شجاعت کے ساتھ ساتھ دنیادار اور مصلحت بیں بھی ہوتا تھا۔ فقرہ بازی اور ضلع جگت کے معرکوں میں کبھی بند نہ ہوتا تھا۔ ضرورت پڑنے پر کسی دیو یا ساحرہ کو زک بھی دے سکتا تھا اور کسی پری کو فریب بھی لیکن مثنویاتِ میر کا ہیرو بڑا مسکین و وفادار۔ مغموم۔ بے چارہ جانباز عاشق ہوتا ہے جس کی زندگی پر رحم آتا ہے اور جس کی موت پر افسوس۔ داستانی مثنوی کا ہیرو مخالف قوتوں کو روندتا کچلتا کامرانی کی جانب بڑھتا جاتا ہے لیکن خالص واردات عشق کی مثنویوں کا ہیرو مخالف قوتوں کا شکار ہو کر جان سے گزر جاتا ہے۔

اگر داستانوں کا ہیرو ہرفن مولا تھا تو میر کا ہیرو یک فنا ہے۔ اس میں بس ایک کمال ہے کہ وہ شدت کے ساتھ عشق کرتا ہے۔ اور دُنیا و مافیہا سے غافل ہو جاتا ہے۔ وہ سرِ راہ یا لبِ بام کہیں حُسن کی جھلک دیکھ لیتا ہے تو وہیں ڈٹ کر بیٹھ جاتا ہے۔ وہ بھی کیا زمانے تھے۔ شاید اس ہیرو سے بھی زیادہ قابلِ رحم محبوبہ کا والد ہے۔ جس کے در پہ ایک ہفتہ سے اُس کی قرۃ العین کا قدردان ستیہ گرہ کیے بیٹھا ہے۔

میر کی کئی مثنویوں میں ہیرو کسی منکوحہ عورت سے عشق کرتا ہے۔ مثلاً جوان دعروسِ عشق افغان پسر اور مورنامہ میں۔ نازنین بھی ہیرو کی چاہ میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ اور وفا کے ثبوت میں جان قربان کر دیتی ہے۔ گویا میر کے نزدیک یہ مستحسن ہے کہ ایک کتخدا عورت شوہر سے خیانت کر کے ایک نامحرم سے عشق بازی کرے۔ انسانی سماج کی تنظیم خاندان کی بنا پر کی گئی ہے میر نے اپنی مثنویوں میں ازدواج پر وار کر کے سماجی نظام ہی نہیں اخلاقی نظام کو بھی درہم برہم کر دیا ہے۔

جُوں جُوں میر صاحب کی عمر بڑھتی گئی ان کی مثنویوں میں غیر فطری عناصر زیادہ ہوتے گئے۔ شعلۂ شوق میں انہوں نے فریقین کے جسم کو شعلہ میں تبدیل کر دیا۔ عشقِ افغان پسر کے خاتمے میں ایک زندہ اِنسان مَوت کے دروازے سے گزرے بغیر ایک روحِ لطیف سے مل جاتا ہے مورنامہ میں ایک طاؤس رانی پر عاشق ہو جاتا ہے۔ اس سادہ لوح راجہ اور شاعر کو یہ موٹی سی بات نہ سُوجھی کہ ایک عَورت اور مور میں جنسی عشق نہیں ہو سکتا۔

بظاہر تو میر کے ہیرو اور ہیروئن طبقۂ عوام سے ہیں یعنی حقیقت نگاری کے تقاضوں کو داستانوں سے بہتر طریقے پر آسودہ کرتے ہیں لیکن نہ میں دیکھا جائے تو یہ حضرات اس زمین کے باشندے نہیں معلوم ہوتے۔ ان کا عشق اس بلندی پر ہے جہاں فرشتوں کے پر جلتے ہیں۔ یہ لوگ کسی اور سیارے کے باشندے معلوم ہوتے ہیں۔ ہمیں اپنے اِردگرد نہ اس طرح کے ستیہ گرہی عاشق دکھائی دیتے ہیں نہ اس طرح جاں باز عشاق یا وفا شعار محبوبوں کی فرمائش پر موت تشریف لے آتی ہے۔ وصل بعدِ موت کی تو ادھر کی صدیوں میں رسم ہی اٹھ گئی۔ گویا میر کے عشقیہ افسانے شروع سے آخر تک خلافِ حقیقت ہیں۔

میر کی عشقیہ مثنویوں میں افسانوی دلچسپی نہیں۔ کردار نگاری کے شاہکار نہیں۔ ان کی واحد کائنات رودادِ عشق ہے اور اگر یہ بھی تشفی بخش نہیں تو پھر ان مثنویوں میں کیا ہے جس کی وجہ سے آج بھی یہ شاداب و تازہ ہیں۔

بظاہر یہ مثنویاں عشاق کی سرگزشت ہیں۔ لیکن اس تمثیلی سرگزشت کی کوئی اہمیت نہیں۔ ان نظموں میں جو شے جاذبِ توجہ ہے وہ عشاق کا ماجرا نہیں بلکہ مجرّد و مطلق عشق کا تصوّر ہے۔ اقبال کے یہاں عشق کائنات کو رواں دواں رکھنے والی قوت ہے۔ میر کے عشق کا تصوّر بھی کچھ اسی طرح ہمہ گیر ہے۔ غزل میں کہہ ہی چکے ہیں۔

ع اِک عشق بھر رہا ہے زمین آسمان میں

درویش باپ واضح کر چکا تھا۔ "عشق است کہ دریں کارخانہ متصرّف است ...... در عالم ہر چہ ہست ظہورِ عشق است"

میر عشقِ مجازی کو وہ رُتبۂ بلند دیتے ہیں جو اب تک عشقِ حقیقی کا اِجارہ تھا۔ یہ ہر مثنوی کی ابتدا میں اور کبھی کبھار خاتمہ میں بھی عشق کی طویل توصیف رقم کرتے ہیں۔

نہ ہو عشق تو انس باہم نہ ہو — نہ ہو درمیاں یہ تو عالم نہ ہو

(جوان و عروس)

عشق ہے تازہ کار تازہ خیال — ہر جگہ اس کی اک نئی ہے چال الخ

(دریائے عشق)

محبت نے ظلمت سے کاڑھا ہے نور — نہ ہوتی محبت نہ ہوتا ظہور
محبت ہی اس کارخانے میں ہے — محبت سے سب کچھ زمانے میں ہے
(شعلۂ شوق)

نظمِ کُل کا ڈول ڈالا عشق نے — مِلّس سے انساں نکالا عشق نے
وہ حقیقت سب میں یہاں ساری ہُوئی — ہے گی ہر شئے عشق کی ماری ہُوئی
چار سُو ہنگامہ آرا عشق ہے — عشق کیا کہیئے کہ کیا کیا عشق ہے
(مورنامہ)

مثنویاتِ میر کا یہی حصّہ سب سے زیادہ دل نشین ہوتا ہے ۔ ہاں تو میر کا مثالی عشق ہمہ گیر ہی نہیں ہمہ سوز بھی ہے ۔ اس کا انجام ہمیشہ المیہ ہوتا ہے ۔ یہ وہ سانحہ ہے ۔ جس سے کسی کو مفر نہیں ۔ متعدد مثنویوں میں اس کی جہاں سوزی کی طرف اشارہ کرتے ہیں ۔

ع — ہے گی ہر شئے عشق کی ماری ہوئی

عشق سے کیا میر اتنی گفتگو — خاک اڑا دی عشق نے ہر چار سو
(مورنامہ)

عجب عشق ہے سرِ کار آمدہ — جہاں دونوں اس کے ہیں برہم زدہ
(شعلۂ شوق)

عشق کی اسی برہم زنیِ آفاق کی تفصیل کے طور پر میر کوئی حکایت پیش کرتے ہیں اور اسے اسی نہج پر ترتیب دیتے ہیں ۔ چنانچہ ہر موقع اور ہر قدم پر عشق کی دل سوزی و جاں سوزی نمایاں رہتی ہے ۔ مثنوی لکھتے وقت میر کا واحد مقصد عشق کی جہاں سوزی کا بیان ہے ۔ اُن کی تمام توجہ اسی نقطے پر مرکوز رہتی ہے ۔ وہ وحدتِ اثر کے قائل ہیں ۔ اِس لئے بالعموم اعجاز عشق مثنوی کی رسمی تمہید سے گریز کرتے ہیں ۔ ہڈیوں کو سُلگا دینے والے اور رُوح کو گھلا دینے والے عشق کا بیان حمد و نعت و مناجات وغیرہ کا متحمل نہیں ہو سکتا ۔ میر پہلے مصرع سے جو فضا باندھتے ہیں وہ آخر تک قائم رہتی ہے ۔ عاشق کا کردار و گفتار ہو کہ ہجر کا عالم ۔ محبوبہ کی وفا کا بیان ہو کہ اعزا کی ستم رانیں کا ہر ایک سے اسی مقصد کو تقویت ملتی ہے ۔ تفصیلات پیش کرنے کی ضرورت نہیں ۔

جذبۂ عشق کی شرح کے لیے میر نے جامہ حرف بھی اسی کے مطابق چُنا۔ ان مثنویوں کی زبان میں بھی نرمی اور گھلاوٹ، خستگی و بستگی رسی بسی ہوئی ہے۔ موضوع کے ساتھ ساتھ لہجہ بھی یاس و حرماں سے بھرا ہے۔

آہ جو ہم دمی سی کرتی ہے — اب تو وہ بھی کمی سی کرتی ہے
کہتے ہیں ڈوبتے اُچھلتے ہیں — لیکن ایسے کوئی نکلتے ہیں
عشق نے آہ کھو دیا اس کو — آخر آخر ڈبو دیا اُس کو

(دریائے عشق)

جگر غم میں یک لخت خوں ہو گیا — رُکا دل کہ آخر جنوں ہو گیا

(شعلۂ شوق)

میر کی طرزِ مثنوی گوئی اس قدر مقبول ہوئی کہ ان کی تقلید میں متعدد مثنویاں لکھی گئیں۔ راسخ عظیم آبادی کی مثنویاں تو بالکل میر کا چربہ ہیں۔ قائم کی مثنوی جذبِ الفت، مصحفی کی بحر المحبت۔ جذبۂ عشق، شعلۂ شوق اور گلزارِ محبت۔ میر کے شاگرد ذوالفقار علی خاں صفا لکھنوی کی مثنوی چھوٹی منتر، سنبھل فیض آبادی کی حسن و عشق اور پارسانامہ۔ جعفر علی خاں راغب دہلوی کی مثنوی شمائلِ دیوان۔ قاضی اختر کی سراپا سوز اور سوز و ساز۔ طالب علی خاں عیشی کی مثنوی سوز و ساز اور شیخ عبدالرؤف شعور شاگرد مصحفی کی مثنوی کم و بیش میر سے متاثر ہیں۔ لکھنؤ پر جب تک دہلوی اثرات رہے وارداتِ عشق کی مثنویوں میں میر کی تقلید فرض تھی۔ جب لکھنؤ نے دلی سے اپنی خود مختاری کا اعلان کیا تو مثنوی میں بھی اپنی ڈگر جُدا نکالی۔ ادھر زمانہ بھی بدل چکا تھا۔ مزاج لہو و لعب کی طرف مائل ہو گئے تھے۔ نواب مرزا شوق نے اپنی کارستانیوں کا ڈھنڈورا اس زور سے پیٹا کہ میر کی مہذب اور نحیف آواز دب کر رہ گئی۔ لیکن وقت منصف ہے۔ آج میر کی تصانیف کو اُردو مثنوی کی ایک گراں بہا طرز تسلیم کیا جاتا ہے۔ اور اس طرز کے متعدد لکھنے والوں میں میر کے رشحاتِ فکر ہی سرِ فہرست ہیں

سید محمد

میر اپنی مثنویوں کے آئینے میں

یہ سچ ہے کہ تصنیف مصنف کا آئینہ ہوتی ہے۔ اس سے اس کی معلومات، خیالات اور اعتقادات وغیرہ پر روشنی پڑتی ہے لیکن ایک انسان کی حیثیت سے اس کے مزاج اس کی افتادِ طبیعت اور اس کے دل کی اندرونی کیفیات کا خاطر خواہ اظہار نہیں ہوتا۔ ہماری شاعری کا رسمی رنگ تو ایسا ہے کہ ظاہر میں کسی شاعر کے کلام کو پڑھ کر اس کی فطرت کے اصلی خط و خال کو پہچان لینا آسان نہیں۔ اسی لئے کہا جاتا ہے کہ ہمارے شاعروں کے کلام اور ان کی زندگی میں بہت کم مطابقت پائی جاتی ہے لیکن اردو شاعری کے امام میر تقی میر ایک ایسے شاعر ہیں جن کے کلام میں ان کی اصلی روح اور حقیقی زندگی کی جھلکیاں ہی نہیں بلکہ نہایت نمایاں اور صاف عکس نظر آتا ہے۔ ان کی فطرت کا غالب پہلو یعنی قنوطیت تو ان کی غزلوں سے اس طرح واضح ہے کہ ہر شخص پہلی نظر ہی میں انہیں پہچان لیتا ہے اور خود بھی یہ کہتے ہیں کہ "درد و غم کتنے کئے جمع تو دیوان کیا"۔ لیکن اُن کی مثنویاں ان کی زندگی کا ایک ایسا مرقع ہیں جس میں ان کے رہن سہن، دکھ درد، گھر دار، سفر و حضر، سیر و تفریح کی تصویریں ہی نہیں ملتیں بلکہ ان کے مزاج کی خصوصیات اور افتادِ طبع کا بھی صحیح اندازہ ہو جاتا ہے۔ میر کی مثنویاں ایک ایسا روشن آئینہ ہیں جس میں میر کی سیرت اور ان کی زندگی کے خط و خال بہت ہی صاف اور نمایاں نظر آتے ہیں۔ ان کی مثنویاں گویا آپ بیتی ہیں جس کو شاعرانہ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

میر نے کم و بیش (۳۴) مثنویاں لکھی ہیں جن میں کچھ عشقیہ ہیں۔ چند مثنویاں آصف الدولہ کے شکار اور ہولی وغیرہ سے متعلق ہیں۔ چند ہجویہ مثنویاں ہیں اور باقی ان کی ذات، ان کے مشاغل اور گھریلو زندگی سے تعلق رکھتی ہیں۔

میر نے اپنی عشقیہ مثنویوں میں جو قصے بیان کئے ہیں وہ سب ان کی فطری قنوطیت کے مطابق بالکل حزنیہ ہیں۔ ان میں شاہد پرستی اور بوالہوسی کا شائبہ نہیں صرف ایک مثنوی "معاملات عشق" ایسی ہے جسے کسی حد تک "بوالہوسانہ" کہا جا سکتا ہے۔

اُن کی مثنویوں میں عاشق اور معشوق دونوں محبت کی آگ میں جلنے والے اور عشق صادق کی قربان گاہ پر اپنی جانوں کی بھینٹ چڑھانے والے ہیں۔ ان مثنویوں میں میر نے عشق کی جو تفریق و توضیح کی ہے وہ وہی ہے جو اُن کے صاحب دل اور عشق الٰہی میں سرشار والد بزرگوار علی متقی نے بچپن میں ان کے آگے بیان کی تھی۔

میر، ذکر میر میں اپنے والد کی زبانی لکھتے ہیں۔

"اے پسر عشق بورز، عشق است کہ دریں کارخانہ متصرف است اگر عشق نمی بود نظم کل صورت نمی بست، بے عشق زندگانی وبال است، دل باختۂ عشق بودن کمال است، عشق بساز عشق بسوزد، در عالم ہر چہ ہست ظہور عشق است، آتش سوز عشق است، آب رفتار عشق است، خاک قرار عشق است، باد اضطرار عشق است، موت مستی عشق است، حیات ہوشیاری عشق است، شب خواب عشق است، روز بیداری عشق است، مسلم جمال عشق است، کافر جلال عشق است، صلاح قرب عشق است، گناہ بعد عشق است، بہشت شوق عشق است، دوزخ ذوق عشق است ۔ ۔ ۔"

یہی خیالات میر صاحب کے دل پر نقش ہیں۔ وہ مثنوی شعلۂ عشق میں فرماتے :

محبت نے ظلمت سے کاڑھا ہے نور — نہ ہوتی محبت نہ ہوتا ظہور
محبت مسبب، محبت سبب — محبت سے آتے ہیں کار عجب
محبت بن اس جا نہ آیا کوئی — محبت سے خالی نہ پایا کوئی
محبت ہی اس کارخانے میں ہے — محبت سے سب کچھ زمانے میں ہے
محبت ہے آب رخ کار دل! — محبت ہے گرمی بازار دل
محبت اگر کار پردازہ ہے — دلوں کے تئیں سوز سے ساز ہے
محبت ہی ہے تحت سے تا بہ فوق — زمیں آسماں سب ہیں لبریز شوق

مثنوی جوش عشق تو خود ان کے دل کے راز نہانی کی کہانی انھی کی زبانی ہے۔ اس میں وہ صاف باطنی سے

اپنی روداد محبت بیان کر دیتے ہیں۔

یعنی میر اک خستۂ غم تھا | سرتاپا اندوہ و الم تھا
آنکھ لڑی اُس کی اک جاگہ | بیخود ہو گئی جانِ آگہ
صبر نے چاہی دن سے رخصت | تاب نے ڈھونڈھی یک دم فرصت
تاب و تواں تسکیب و تحمل | رخصت اُس سے ہو گئے بالکل
سینہ فگاری سامنے آئی | بیتابی نے طاقت پائی
خونِ جگر ہو بہنے لاگا | پلکوں ہی پر رہنے لاگا
خواب و خورش کا نام نہ آیا | ایک گھڑی آرام نہ آیا
سوز سے چھاتی تا بہ گویا | اور پلک خونابہ گویا
دل میں تمنا، داغ جگر میں | شیون لب پر یاس نظر میں

جب ان کا محبوب ترک وطن کر کے ان سے رخصت ہو گیا تو وہ گویا ایک قالب بے جان ہو کر رہ گئے۔

یار سفر کا مائل ہو کر! | حب وطن کو دل سے دھو کر
رخصت کو اس پاس بھی آیا | جلتے کے تیئں اور جلایا
یار گئے پر میر جواب ہے | جان سے خالی اک قالب ہے

کم عمری میں والد کا انتقال، بھائی اور دوسرے عزیزوں کی بے وفائی اور بے مروتی آگرے سے نکل کر دہلی جانا، تلاش معاش میں دربدر پھرنا، سراج الدین علی خاں آرزو کے یہاں قیام، ان کی توجہ اور شفقت، ان کے ہاں ان کی تعلیم و تربیت، پھر بھائی کا خانِ آرزو کو ان کے خلاف بھڑکانا، خان آرزو کی خفگی و بدسلوکی، میر صاحب کا صبر و تحمل، دل گرفتہ رہنا اور دل ہی دل میں کوفت کھانا۔ طبیعت کے رکنے سے جنون و خفقان کے مرض کا لاحق ہونا، جنون کی حالت، علاج معالجہ، رفتہ رفتہ طبیعت کا اصلاح پانا اور مرض سے نجات حاصل کرنا یہ سب کیفیتیں بڑی صداقت اور پر درد انداز میں مثنوی خواب و خیال میں بیان کی گئی ہیں۔ چند شعر ملاحظہ ہوں

زمانے نے رکھا مجھے متصل | پراگندہ روزی پراگندہ دل

گئی کب پریشانیٔ روزگار | رہا میں تو ہم طالع زلف یار
وطن میں نہ اک صبح میں شام کی | نہ پہنچی خبر مجھ کو آرام کی
اٹھاتے ہی سر پہ پڑا اتفاق | کہ دشمن ہوے سارے اہل وفاق
جلاتے تھے مجھ پر جو اپنا دماغ | دکھانے لگے داغ بالائے داغ
زمانے نے آوارہ چاہا مجھے | مری بے کسی نے نبھاہا مجھے
رفیقوں سے دیکھی بہت کوتہی | غریبی نے ایک عمر کی ہم سری
مجھے یہ زمانہ جدھر لے گیا | غریبانہ چندے بسر لے گیا
بندھا اس طرح آکے بار سفر | کہ نے زاد در کچھ نہ بار سفر
گرفتار رنج و مصیبت رہا | غریب دیار محبت رہا
چلا اکبرآباد سے جس گھڑی | در و بام پر چشم حسرت پڑی
کہ ترک وطن پہلے کیونکر کروں | مگر ہر قدم دل کو پتھر کروں
بس از قطع رہ لائے دلّی میں بخت | بہت کھینچے یاں میں نے آزار سخت
جگر جور گردوں سے خوں ہو گیا | مجھے رکتے رکتے جنوں ہو گیا

جب ان کا جنوں کم ہو گیا اور یہ صحت یاب ہو گئے تو پھر تلاش روزگار و فکر معاش کے چکر میں مبتلا ہوئے۔ آج ایک امیر کی رفاقت میں بسر کی تو کل دوسرے امیر کی مصاحبت میں لیکن کہیں بھی صبر و قرار نصیب نہ ہوا۔ دہلی کی سیاسی صورت حال بگڑی ہوئی تھی۔ بادشاہ، برائے نام بادشاہ تھے۔ سکھ، جاٹ مرہٹے، سارے شہر میں اودھم مچائے ہوئے تھے۔ امیروں کی جان تباہ ہو رہی تھی۔ غریب پریشاں حال و تباہ روزگار تھے۔ میر صاحب جن امیروں کے دامنِ دولت سے وابستہ ہوئے ان میں سے بعض تو جاٹوں کے ساتھ لڑتے ہوئے مارے گئے یا خود لٹ لٹا کر مفلس و نادار ہو گئے۔ اس انتشار گردی میں جہاں اور بہت سے شاعر اور باکمال دلی سے کوچ کر گئے میر صاحب کو بھی اس دلّی کو جس کے گلی کوچوں کو وہ کبھی اوراق مصور کہتے تھے خیر باد کہنا پڑا۔ میر صاحب دلّی سے نکلے مگر کس حال میں کہ ایک امیر کی مصاحبت میں، بیوی بچے، گھر کا ساز و سامان، پالتو جانور سب ہی کو ساتھ لے کر۔ راستہ پُر خطر، بارش کا موسم۔ راستے میں ندی حائل۔ وہ بھی چڑھاؤ پر۔ ناؤ میں بیٹھ کر جان مٹھی میں لئے ہوئے بہ ہزار دقت و خرابی ندی کو پار کیا۔ جب کنارے

پر پہنچے تو جان میں جان آئی۔ شاہ درا گنج میں قیام ہوا۔ بارش کی وجہ سے ہر جگہ کیچڑ پانی۔ میر صاحب کے سرپرست ہی کو ایک معمولی سا مکان ملا۔ باقی حالی موالی جہاں سینگ سمائے وہاں ٹھہر گئے۔ میر صاحب بھی ایک پرانی سرائے میں اُترے۔ سرائے کی بھٹیاری خوش ہوئی کہ ملوان کا کھانا پکا کر خود بھی اپنا پیٹ پال لے گی۔ ان سے معلوم ہوا کہ یہ تو مصاحب ہیں۔ جن کے ساتھ میں انہی کے ہاں سے دو وقتہ پکا پکایا کھانا مل جاتا ہے۔ میر صاحب نے خوشامد کرکے اس کو راضی کر لیا۔ چند روز رہ کر یہ سب لوگ غازی آباد روانہ ہوئے۔ غازی آباد میں بھی میر صاحب کو سرائے میں ہی ٹھہرنا پڑا۔ چند روز وہاں ٹھہر کر پھر سفر پر روانہ ہوئے۔ کوچ کی رو داروی میں میر صاحب کی پالتو بلی سوہنی کہیں گم ہو گئی۔ میر صاحب کو اس کا بڑا دکھ ہوا۔ وہ اس کے لئے کفِ افسوس ملتے رہے۔ اگرچہ اس بلی کی ایک بہن موہنی میر صاحب کے پاس موجود تھی مگر میر صاحب سوہنی کو اُس کی اچھی عادتوں کی وجہ سے کبھی نہیں بھولتے تھے۔ یہاں سے نکلے تو پہلے بیگم آباد اور پھر میرٹھ پہنچے۔ میرٹھ سے نکل کر دوسری منزل جہاں یہ ٹھہرے وہاں ایک گڑھی تھی۔ یہ عدد درجہ خراب حالت میں تھی۔ یہاں کے باشندے کالے کلوٹے اور کنگال اور نادار تھے۔ نہ مسجد نہ ملاّ۔ دکان داروں کا حال چال بھی ٹھیک نہیں تھا۔ نہ ان کے ہاں کوئی جنس برابر تھی نہ وہ ایمان دار بیوپاری تھے۔ سب اچکے اور لفنگے تھے۔ اس پر وہاں کے زمین داروں کی آپس میں نااتفاقی تھی جس سے وہاں کی صورت حال اور خراب ہو گئی تھی۔ ان سب خرابیوں سے بڑھ کر مصیبت یہ تھی کہ یہ علاقہ سکھوں کی وجہ سے بہت خطرناک بنا ہوا تھا، ہر وقت جان و مال کو خطرہ لگا رہتا تھا۔ کبھی چین سے سونا نصیب نہیں ہوا۔ اسی پریشان حالی میں میر صاحب بیمار پڑ گئے۔ ایک دن کچھ جسمانی مشقت کا کام کرنا پڑا جس سے ان کے سینے میں درد ہو گیا۔ آب و ہوا مرطوب تھی درد کے ساتھ نزلے اور کھانسی نے شدت اختیار کی۔ بخار رہنے لگا دق کا مقدمہ نظر آنے لگا۔ بارے خدا نے فضل کیا اور میر صاحب ان تمام مصیبتوں کو سہہ کر زندہ بچ نکلے۔ سرگذشت سفر کے عنوان سے جو مثنوی لکھی ہے اس میں اپنی ساری سرگذشت کو بیان کیا ہے۔

اس گڑھی کی خستہ حالی اور وہاں میر صاحب کی زبوں حالی کے بارے میں چند شعر ملاحظہ ہوں

اک گڑھی بود و باش کو پائی — کچھ نہ کھانے کو جس میں جز کھائی
چھوٹی سی چار دیواری — اور میدان تھی گڑھی ساری
کھنڈر سے اس میں تین چار مکان — جن کا گرنے پہ سخت ہے میلان
باؤ جنگل کی تند، کچھ نہ رکاؤ — مینھ میں چل پڑے تو کانپے جاؤ

ایک گڑھی جس میں سیکڑوں ساہیں
واں ٹھہرنے کو چاہیئے باہیں

باد سے دن کو سائیں سائیں کرے
رات ہووے تو بھائیں بھائیں کرے

گر شکستہ ہوئی کہیں دیوار
بے زری سے بنانا ہے دشوار

ہفتہ ہفتہ تلک پڑی ہے خراب
پردہ کا ہے کا، پھر ہے رفعِ حجاب

گھاس ہی گھاس اس مکاں میں تمام
تِس میں لساع جانور اقسام

جیسی زنبور زرد ایسے ڈانس
کاٹ کھاویں تو اچھلو دو دو بانس

ہاتھ بینڈوں پہ سب چلے جاتے
شب گزوں سے بدن جلے جاتے

ان کے کاٹے بدن پہ دانہ ہے
مرچ جدوار پھر لگانا ہے

کتوں کے چار دن اور رستے تھے
کتے ہی واں کبھو تو بستے تھے

دو کہیں ہیں کھڑے کہیں بیٹھے
چار لوگوں کے گھر میں ہیں بیٹھے

ایک نے پھوڑے باسن ایکوں نے
کھود مارے گھروں کے سب کونے

کوئی گھورا کرے کوئی بھونکے
خفتہ خفتہ بھی شور سے چونکے

سانجھ ہوتے قیامت آئی ایک
شور عف عف سے آفت آئی ایک

گلہ گلہ گھروں میں پھرنے لگے
روٹی ٹکڑے کی بو پہ گرنے لگے

ایک نے آکے دیگچہ چاٹا!
ایک آیا سو کھا گیا آٹا!

ایک نے دوڑ کر، دیا پھوڑا!
پھر پیا آکے تیل اگر چھوڑا

گھورنے اک لگا اندھیرا کر
ایک نے اور ایک پھیرا کر

گھر میں چھینکے اگر تھے توڑ دیے
ہانڈی باسن گرا کے پھوڑ دیے

لوگ سوتے ہیں کتے پھرتے ہیں
لڑتے ہیں، دوڑتے ہیں، گرتے ہیں

جب کہ ہڈی پہ چار چار لڑیں
گوشت پر بھیڑئیے سے دوڑ پڑیں

کتے ہی واں دو چار رہتے ہیں
دو گئے بھی تو چار رہتے تھے

جاگتے ہو تو دوبدو کتے
سو کر اٹھو تو روبرو کتے

جب میر صاحب دہلی سے نکل کر لکھنؤ پہنچے تو وہاں ان کی خاص قدر و منزلت ہوئی۔ نواب آصف الدولہ

نے بڑے اعزاز و احترام کے ساتھ ان کا خیر مقدم کیا اور معقول مشاہرہ مقرر کر دیا لیکن معلوم ہوتا ہے کہ میر صاحب کبھی فارغ البال اور خوشحال رہنا نہیں چاہتے۔ ان کا خاندان خاصا وسیع تھا۔ رہنے کو جو مکان ملا وہ تنگ و تاریک اور ناکافی تھا۔ بارش میں تو اس کی حالت اور بھی خراب و خستہ ہو گئی تھی۔ مکان کے بیٹھ جانے کا اندیشہ پیدا ہو گیا تو دب کے مرنے سے پانی میں ڈوب مرنے کو ترجیح دے کر میر صاحب نے مکان کا تخلیہ کر دیا۔ جس سراسیمگی میں وہ اور اُن کے اہل و عیال گھر سے سامان لے کر نکلے ہیں اس کے بارے میں وہ خود کہتے ہیں

میر جی اس طرح سے آتے ہیں — جیسے کنجر کہیں کو جاتے ہیں

بارے ایک عزیز کے گھر پناہ مل گئی۔ اب دوسرے مکان کی تلاش ہے مگر وہ ملتا نہیں ہے

تب سے رہنے کو اب تلک ہیں خراب — نہیں ملتا ہے گھر بقدر حباب
جس میں خوش یک نفس معاش کریں — طور پر اپنے بود و باش کریں

یہ سب صورت حال خانہ میر اور مثنوی کی طغیانی والی مثنویوں میں من و عن بیان ہوئی ہے۔

میر صاحب کو جانور پالنے کا بہت شوق تھا۔ ایک بلی سوہنی کے گم ہو جانے کا ذکر سرگذشتِ سفر میں آ چکا ہے۔ ایک اور مثنوی میں اس کی بہن موہنی کی تعریف کی ہے۔ بلی کے ساتھ میر صاحب نے ایک کتا بھی پال رکھا تھا اور یہ کتا اور بلی دونوں مل جل کر رہتے تھے۔ میر صاحب ان دونوں کی دوستی اور محبت کو دیکھ کر خوش ہوتے اور یوں ان کی تعریف کرتے ہیں۔

باہم اس کتے بلی کا یہ ربط! — کوئی دیکھے نہ ہو دے اس سے ضبط
کبھو جاتا جو ہے یہ کوٹھے پر — لگی رہتی ہے اُس کی چھت سے نظر
اور سے دشمنی جانی ہے — اس کی یہ بائولی دیوانی ہے

اسی طرح ان کے ہاں ایک مرغ بھی تھا جو بہت اچھی ذات کا اور ذرا طاقت ور تھا ایک دن وہ ایک مرغ سے لڑ پڑا اور مر گیا۔ میر صاحب کو اس کا بہت ہی افسوس بلکہ صدمہ ہوا اور انھوں نے مثنوی میں ایک مرثیہ اس کی موت پر لکھ کر اس کا ماتم کیا ہے جس کے آخر میں کہتے ہیں

خموش میر تجھی کو نہیں یہ رنج و تعب — کباب آتشِ غم میں ہے مرغ و ماہی سب

انھوں نے ایک مرتبہ ایک بکری بھی مول لی تھی جس کے بارے میں وہ خود کہتے ہیں

کہتے ہیں جو غم نہ داری بز بخر — مول لی میں ایک بکری ڈھونڈ کر
شعر زور طبع سے کہتا ہوں چار — دزدی بز گیری نہیں اپنا شعار
میں پڑھوں ہوں اس کے آگے شعر کہ — اپنے ہاں گویا بز اخفش ہے یہ

میر صاحب اپنے عہد کے مانے ہوئے استاد فن تھے۔ اس عہد کے جو بڑے شاعر اور سخن شناس اور قدردانِ فن تھے سب ہی اُن کی اُستادی کو مانتے تھے۔ اس کے ساتھ میر صاحب بڑے خود دار اور خود شناس تھے۔ نازک مزاج تھے۔ ان کے آگے جن شاعروں کا چراغ نہیں جل سکتا تھا وہ اکثر میر صاحب کو دیکھ کر جلتے تھے۔ بعض نے ان کو بد دماغ کہا اور بعض بر خود غلط اور خود پرست شاعروں نے ان کے کلام پر حرف گیری کی جرأت بھی کی۔ اُس زمانے میں شاعری کا شوق کچھ ایسا عام ہو گیا تھا کہ بہت سے اَن پڑھ، جلاہے، بھٹیارے بھی شاعری کر لیتے تھے۔ یہ جاہل اور اجلاف میر صاحب کو کیا سمجھیں۔ بعض شاعروں نے اپنی شہرت کے لئے ایسے اجلاف کو منہ لگایا اور چار شعر لکھ کر دے دیے۔ مشاعرے میں اپنے ساتھ لے آتے تاکہ اپنی تعریف کروائیں۔ اب یہ نااہل بقول میر صاحب

سر میں رکھ کر دعویٰ طبعِ لطیف — میرو مرزا کے ہوئے آخر حریف

بھلا میر صاحب اس بدتمیزی کو کہ گوارا کر سکتے ہیں انھوں نے اژدرنامہ، تنبیہہ الجہال، ہجو نا اہل اور مذمت آئینہ دار نامی مثنویوں میں دل کھول کر ان کی ہجو کی اور بری طرح خبر لی ہے لیکن میر صاحب کی ان ہجویہ مثنویوں میں سودا کی شگفتگی طبع نہیں بلکہ سخت برہمی اور خفگی پائی جاتی ہے۔

ایک مثنوی میں لکھنؤ کی مرغ بازی کا بہت دلچسپ نقشہ کھینچا ہے اور بتایا ہے کہ اس دور کے نکری میں کس طرح مرغ باز خود بھی پالی مرغوں کے ساتھ ایک دوسرے سے لڑا کرتے تھے۔ اسی طرح ایک مثنوی میں ایک مینڈو اور ایک مثنوی میں ایک سگ پرست کی بھی خبر لی ہے۔

میر صاحب نے بڑی عمر پائی تھی۔ نوے برس کے قریب اس دنیائے آب و گل کی سیر کی۔ سرد و گرم زمانہ کے تمام تجربے اُٹھائے۔ بڑھاپے میں کمزوری، ضعف بصارت و سماعت اور دوسری تکلیفوں کو برداشت کیا۔ "دنیا" کے عنوان سے ایک مثنوی میں بڑے پر درد اور پُر اثر انداز سے دنیا کی بے ثباتی اور جوانی کے بعد بڑھاپے کی تکالیف کی کیفیت قلمبند کی کس حسرت سے لکھا ہے کہ

سنو اے عزیزان ذی ہوش و عقل — کہ اس کارواں گہ سے کرنا ہے نقل

پیمبر ہے، شہ ہے کہ درویش ہے
سبھوں کو یہی راہ درپیش ہے

کہو گے کہ آگے تھا کہتا کوئی
نہیں اس سرا بیچ رہتا کوئی

گدا ہو کہ ہو شاہ عالی تبار
تہہ خاک سب کا ہے دار القرار

نہ جدول رہے گی نہ سرو رواں
گلستاں کھاویں گے مٹّی کا مکاں

زمیں کا رہے گا یہی کیا سبھاؤ
لپٹ جائیں گے آسماں جیسے ناؤ

جہاں ایک ماتم سرا ہے عجب
نہیں جائے باش اور جا ہے عجب

جوانی گئی موسمِ شیب ہے
شہود ایک دو روز کو غیب ہے

گیا شور سر سے، جھکا ہے بہت
گئی و اشد، اب دل رکا ہے بہت

نہ وہ ذائقہ ہے نہ ہے وہ مشام
مزا کچھ نہیں، ہو چکی صبح شام

بلا ارتعاشِ تنِ زار ہے
ہر اک عضو چلنے کو تیار ہے

ہوا حافظہ لسکہ نسیاں کا صرف
نہیں یاد آتا ہے دوشینہ حرف

ہوئے شعر کیا کیا فراموش ہائے
کہوں کیا گزرتی ہے خاموش ہائے

نہیں گور کے کام سے کچھ فراغ
کسے ذوقِ صحبت کہاں ہے دماغ

نہ کچھ یونہی عینک نظر چڑھ گئی
بصارت کی بے طاقتی بڑھ گئی

رہیں دیکھ منھ، حرف زن ہو حریف
رہا سننے کا گوں نہ سمع شریف

جوانی کی شب کیا بسر ہو گئی
سفیدیٔ مُو سے سحر ہو گئی

شباب آہ داغِ جگر دے گیا
قدِ خم زمیں کی طرف لے گیا

جو بازو ہیں اپنے وہ بازو نہیں
اگر منھ کو دیکھو تو وہ رُو نہیں

لبوں پر نہایت ضعیف ایک آہ
درو بام پر حسرتوں سے نگاہ

اور آخر میں یہ کہہ کر قلم رکھ دیا

قلم رکھ دے، کر میرؔ ختم کلام
تمام اپنی صحبت ہوئی والسلام

کلب علی خاں فائق رام پوری

میر اور معاملاتِ عشق

میرؔ خدائے سخن صنفِ غزل میں ٹھہرے، مگر مثنویوں میں بھی انفرادیت قائم کی، اُن کی ایک مثنوی معاملاتِ عشق بھی ہے، اس کی طرف تذکرہ نگاروں نے توجہ نہ کی، چونکہ یہ مثنوی[1] اُن کی رائے میں دُوسری مثنویوں سے کم تر تھی، اس لیے درخورِ اعتنا نہ سمجھا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میرؔ کی زندگی کے بعض گوشے بے نقاب نہ ہو سکے، اور تذکرہ نویس[2] دبے الفاظ میں اُن کو تقدس مآب ثابت کرتے

---

[1] آبحیات، مولانا آزاد (طبع ۱۹۵۴ء ص ۲۰۸): معاملاتِ عشق ان سے بڑی ہے مگر رتبہ میں گھٹی ہوئی ہے۔

[2] میر تقی میرؔ "حیات اور شاعری" از ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی ص ۳۰۲ تا ۳۰۵:

"... تذکرۂ بہارِ بے خزاں میں لکھا ہے کہ میرؔ اپنے شہر میں ایک پری تمثال عزیزہ کے ساتھ درپردہ تعشقِ طبع اور میلِ خاطر رکھتے تھے، اس وقت ان کی عمر سترہ اٹھارہ سال سے کم نہ تھی جوان تھے حساس تھے بہت ممکن ہے خان آرزو کو اسی تعشقِ طبع کی ناگواری ہوئی ہو ..... میرؔ کے دیوان میں جا بجا اس قسم کے اشارے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا دل تیغِ عشق کا زخم خوردہ ہے، اور ان کی شاعری اسی زندگی کی سچی اور بے لاگ تصویر ہے ..... میرؔ کو عشق میں ناکامی ہوئی، یہ ناکامی معمولی نہیں، اس سے ان کے تن بدن کا ایک ایک تار تلبلا اٹھا اور ان کا محبوب ایک خاموش درد کی طرح ان کی ساری زندگی میں سما گیا .... میرؔ ایک نفسیاتی کشمکش میں مبتلا ہیں .... ایک طرف اپنی بڑائی کا احساس ہے اور دوسری طرف اپنی محرومی اور بے کسی کا احساس ..... میرؔ کے یہاں دبے ہوئے صنفی رجحانات بھی ملتے ہیں ...."

رہے، میر نے اپنی زندگی میں کبھی تقدس کا دعوا نہیں کیا۔

میر مقدس آدمی ہیں نتھے شیخ بکف میخانے ہیں ۔۔۔۔ صبح جو ہم بھی جا نکلے تو دیکھ کے کیا شرماتے ہیں

مثنوی معاملات عشق میں میر نے اپنی داستانِ محبت قلم بند کی ہے۔ میر سے پہلے جعفر علی خان زکی نے اپنی روداد عشق قلمبند کر کے معاصرین کے ساتھ تبصرہ کے لیے پیش کی۔ میر نے بھی شاید یہ رسم کرکے آنے والوں کے لیے راستہ ہموار کیا، مومن اور داغ کی مثنویاں اسی رسم قدیم کو زندہ کرنے کے لیے لکھی گئیں۔" نواب امداد امام اثر (کاشف الحقائق) لکھتے ہیں کہ مومن نے اپنی محبوبہ سے ملاقات کا جو حال لکھا ہے وہ حقائق اور واقعات کے خلاف ہے، پردہ اور حجاب کی بندشوں کے ہوتے ہوئے ان روابط کا ہونا ممکن نہیں، لیکن میر صاحب بھی ان ہی مراحل سے گذرے، بچپن سے عشق و عاشقی کی حکایات سنتے سنتے وہ اس کوچے سے نابلد نہ رہ سکے، ذکر میر میں سید امان اللہ منہ بولے چچا اور والد (محمد علی) کی لمبی تقریریں نقل کی ہیں، یہ تقریریں اُن بزرگوں کی نہیں، میر صاحب نے اپنے خیالات ظاہر کیے ہیں، دس گیارہ برس کی عمر میں جو واقعات دیکھے ہوں وہ یاد رہ سکتے ہیں تقریریں نہیں۔

میر نے اپنی دیوانگی کا واقعہ مثنوی "خواب و خیال" میں قلم بند کیا ہے، اس میں لکھتے ہیں کہ ایک حسینہ چاند میں جلوہ گر نظر آتی، اشارے اور کنائے کرتی، ہوش اور حواس رخصت ہو گئے میر کی عمر اس وقت سترہ سال تھی، ان کے صنفی رجحانات بیدار ہو چکے تھے، ہو سکتا ہے کہ پیکر جمیل خیالی، حقیقی وجود کا عکس ہو، اشعار ذیل حالت دیوانگی کی وضاحت کرتے ہیں:

توہم کا بیٹھا جو نقش درست ۔۔۔۔ لگی ہونے وسواس سے جان سست
اگر ہوش میں ہوں و گر بے خبر ۔۔۔۔ وہ صورت رہے میرے پیش نظر
نگہ گردش چشم سے فتنہ ساز ۔۔۔۔ مژہ آفت روزگار دراز
سراپا میں جس جا نظر کیجیے ۔۔۔۔ وہیں عمر اپنی بسر کیجیے
کبھی صورت دلکش اپنی دکھائے ۔۔۔۔ کبھی اپنے بالوں میں منہ کو چھپائے
کبھو چیں بہ ابرو، کبھو ہنس کے بات ۔۔۔۔ کبھو بے وفائی، کبھو التفات

میر دیوانگی کا باعث خان آرزو کا معاندانہ رویّہ قرار دیتے ہیں، مگر ہمیں اس پر اعتبار نہیں، "آرزو کا مکان اُدبا کے لیے وقف تھا" ۱۱۶۲ھ سے وہ اپنے مکان پر مشاعرے کراتے تھے، میر کا اگر کوئی سرپرست دہلی میں ہوتا تو وہ آرزو سے ضرور جُدا ہو جاتے، پھر دیوانگی کے بعد بھی آرزو کے یہاں قیام کے کیا معنی؟ اُن کا مشفقانہ رویّہ ہی میر کے قیام کا باعث ہوگا۔ ممکن ہے میر کو آرزو کی کڑی نگرانی ناپسند ہو اور آرزو نے آزادہ روی پر سرزنش بھی کی ہو، چاند والی حسینہ کوئی حقیقی وجود ہو اور آرزو نے اس سے ملاقات پر بندش لگائی ہو، جس کا نتیجہ دیوانگی کی صورت میں نکلا، یہ قیاسات بے بُنیاد بھی ہو سکتے ہیں، اگر دستاویزی شہادت اس کے خلاف مل جائے، مثنوی "خواب و خیال" کو محض تخئیلی مثنوی نہیں کہا جا سکتا، میر دہلی کی آزاد فضا میں جلد ہی گھُل مل گئے، میر کی غزلوں میں امرد پرستی کا بھی بیان ہے، میر نے ممکن ہے جگ بیتی بیان کی ہو، مگر معاصرین شعرا میں امرد پرستی رائج تھی، عبدالحیّ تاباںؔ دلّی کے حسین ترین افراد میں شمار ہوتے تھے، اور بقول مولوی کریم الدین (طبقات شعرائے اردو) یہ امردوں کو آراستہ کر کے ڈولیوں میں بٹھا کر امرا کے مکانات پر بھیجا کرتے تھے، خان آرزو نے مجمع النفائس[1] میں حیات نامی امرد سے محبت کا اعتراف کیا ہے:

مرگ ہم از عشق او ندادنجاتم مردہ ام امّا ہماں بہ قیدِ حیاتم

میر نے نکات الشعرا میں رسوا کی عاشقی اور مہوّسی کا بیان کیا ہے (ص ۱۲۹ طبع اوّل) قائم کے بیان میں اس کی افتادِ طبع کا ذکر کیا ہے (ص ۱۳۰):

"قائم جوانے است خیرہ و طیرہ و حُسن پرست"

حسن نے تذکرۂ شعرائے اردو (ص ۲۰۰، ۲۰۱ طبع جدید) میں یار تخلص میر احمد نام کا حال لکھا ہے:

محبوبِ روزگار و یار طرح دار ـــ متوطّن شاہ جہان آباد۔ ایک جوان تھا نہایت ہی حسین و جمیل، جسے یوسف ثانی کہہ سکتے تھے، احمد شاہ بادشاہ کے عہد میں (۱۱۶۱ھ تا شعبان ۱۱۶۷ھ

---

[1] صفحہ ۸۰، مخطوطہ رضا لائبریری

مطابق ۱۰ اپریل ۱۷۴۶ء تا ۲ جون ۱۷۵۲ء) اس کے حسن کا ہنگامہ گرم تھا، یہ تمام متوسطین شاعر پروانہ وار اس کے شعلۂ حسن پر جلتے تھے، اور وہ بھی ان سے ملتا تھا۔ اکثر اصلاحِ شاعری میر محمد تقی سلمہٗ اللہ سے لیتا تھا..... میر ضیا اس سے محبت کرتے تھے، چنانچہ اب تک جس وقت یار یاد آتا ہے روتے ہیں، یار عین آغازِ شباب میں دنیا سے چل بسا۔

یار سے میر کے تعلقات تھے، حسن کا تمام شعراے متوسطین کو پروانۂ شمعِ حسن قرار دینا اظہارِ واقعہ ہے، میر کے چند شعر اس طرف رہبری کرتے ہیں:

میر کی عیاریاں معلوم لڑکوں کو نہیں — کرتے ہیں کیا کیا ادا اُس کو سادا سا سمجھ

کیا قہر ہوا دل جو دیا لڑکوں کو میں نے — چرچا ہے یہی شہر کے اب پیر و جواں میں

میر ہر چند میں نے چاہا لیک — نہ چھپا عشق، طفلِ بدخو کا

میر اپنے باپ کی وصیت کا بھی ذکر کرتے ہیں کہ وہ لڑکوں سے محبت کرنے کو منع کرتے تھے ؎

ہے تیرہ روز اپنا لڑکوں کی دوستی سے — اس دن ہی کو کہے تھا، اکثر پدر ہمارا

میر ۱۱۶۵ھ کے متصل متاہلانہ زندگی گذارنے لگے، اسد یار خاں بخشی افواج نواب بہادر کے ذریعہ نواب بہادر سے متوسل ہو کر وہ فکرِ معاش سے آزاد ہو گئے، شادی اسی زمانہ میں کی ہوگی، چونکہ یہ میر کی خوشحالی کا دور تھا۔ احمد شاہ کے عہد میں نواب بہادر اور صفدر جنگ کی جاگیروں سے آمدنی وصول ہو رہی تھی، بقیہ امرا کی جاگیریں، مختلف با اقتدار اشخاص نے دبالی تھیں، اس لئے میر کے لئے یہ زمانۂ فراغت تھا، ۲۷ اگست ۱۷۵۲ء کو صفدر جنگ نے نواب بہادر کو قتل کرا دیا، میر بیکار ہو گئے، ۱۷۵۳ء میں میر نے امیر خاں انجام کا مکان کرایہ پر لے لیا، غالباً اسی مکان میں ۱۷۵۵ء میں فیض علی پیدا ہوئے، میر کی آزادہ روی میں کافی فرق آگیا، لیکن دہلی کی رنگین مجالس کون چھوڑتا، میر نے ۱۱۷۰ھ اور ۱۱۷۳ھ میں دہلی کی تباہی اپنی آنکھوں سے دیکھی اور شعبان ۱۱۷۴ھ مارچ ۱۷۶۱ء میں تباہی ابدالی فوجوں کے ہاتھوں بھرت پور سے آکر دیکھی، ذکرِ میر میں اس کا نثری مرثیہ قابلِ دید ہے، ذوق جمال سے متعلق رائے ملاحظہ ہو:[1]

بازار کہاں جو بتاؤں، طفلانِ نہ بازار کہاں، حسن کہاں جو پوچھوں، یارانِ زرد رخسار کہاں.... اچانک جس محلے میں میری سکونت تھی وہاں گذر ہوا، جہاں میں جلسے کرتا، شعر پڑھتا، عاشقانہ

---

[1] ذکرِ میر۔ ص ۹۹، ۱۰۰

زندگی بسر کرتا، ان حسینوں سے محبت کرتا، ان کی تعریف کرتا، ان کے ساتھ وقت گزارتا ..... ان کو بلاتا، مہمانی کرتا، عیش کرتا، کوئی شناسا نظر نہیں آیا، جس سے بات کرتا ......"

میر کی اس روایت کو ہم کیوں ٹھکرا دیں، وہ شادی کے بعد بھی آزادی سے زندگی بسر کرتے تھے، پھر اس دور میں حسن پرستی معیوب نہیں سمجھی جاتی، میر شعبان ۱۱۷۳ھ[1] تک بھرت پور میں مقیم رہے، اسی زمانے میں راجہ ناگرمل کے ہمراہ کمبھیر کی سکونت چھوڑ کر کاماں علاقہ راجہ پرتھی سنگھ والیٔ جے پور میں مقیم ہو گئے، آغاز ۱۱۸۵ھ میں جب شاہ عالم ثانی فرخ آباد کے علاقے میں مقیم تھے، راجہ ناگرمل نے میر صاحب کو حسام الدین خاں (جو بادشاہ کے مزاج میں دخیل تھا) کے پاس بھیجا۔ میر نے حسام الدین خاں[2] سے عہد و پیمان کئے، ان کے پیچھے راجہ ناگرمل کے چھوٹے بیٹے نے اپنے باپ کو سمجھایا کہ وہ مرہٹوں کے پاس جائے (میر سے راجہ ناگرمل کے بڑے بیٹے رائے بہادر سنگھ سے تعلقات تھے) چنانچہ میر واپس آئے تو راجہ ناگرمل بادشاہ کے لشکر میں شامل ہونے نہ گیا، سیدھا دہلی روانہ ہوا، مجبوراً میر صاحب مع اپنے متعلقین اس کے ساتھ ہو لئے، جب شہر[3] میں (۱۶ شعبان ۱۱۸۵ھ مطابق ۲۳ نومبر ۱۷۷۱ء متصل مقبرہ ہمایوں پہنچے (نقوش اکتوبر نومبر ۱۹۵۳ء مضمون قاضی عبدالودود صاحب "کچھ میر کے بارے میں") تو میر صاحب نے بیوی اور فیض علی لڑکے کو عرب سرائے میں اُتار دیا اور راجہ ناگرمل سے علیحدہ ہو گئے۔

میر نے دلی ذی حجہ ۱۱۷۳ھ (اپریل ۱۷۶۰ء) میں چھوڑی تھی اور شعبان ۱۱۸۵ھ مطابق نومبر ۱۷۷۱ء میں واپس آئے، اس طرح گیارہ سال بعد وہ دہلی لوٹے۔ ۲۹ رمضان[4] ۱۱۸۵ھ کو شاہ عالم دہلی میں داخل ہوا، ۱۰ شوال ۱۱۸۵ھ کو شاہ عالم ثانی نے ضابطہ خاں کے خلاف فوج کشی کی، میر بھی اس سفر میں ساتھ رہے، واپسی[5] کی تاریخوں میں اختلاف ہے، مارچ یا مئی ۱۷۷۲ء میں شاہ عالم دہلی آئے۔

۱؎ ذکر میر ص ۱۲۰ ۲؎ ذکر میر ص ۱۲۱ ۳؎ تنقیح الاخبار فی آثار الادوار۔ مخطوطہ رضا لائبریری ص ۱۱۰: آخر رمضان ۱۱۸۵ھ پیر کے دن چھ گھڑی دن رہے جنا عبور کی، اوّل جامع مسجد میں آئے۔ صبح کو عید الفطر تھی (۲۹ رمضان ۱۱۸۵ھ مطابق ۵ جنوری ۱۷۷۲ء)

۴؎ ذکر میر ص ۱۲۱، ۱۲۲ ۵؎ تاریخ اودھ۔ ج ۲ ص ۹۱ تا ص ۹۵

اسی سال میر کی زندگی میں ایک انقلاب آیا، یعنی مثنوی معاملات عشق والی محبوبہ سے سامنا ہوگیا، میر جو پچاس سال کے لپیٹ میں تھے، کوچۂ عاشقی میں داخل ہوئے، اس کا تعین کہ یہ واقعہ ۱۱۸۶ھ میں پیش آیا، حسب ذیل دلائل سے ثابت ہے:

مثنوی معاملاتِ عشق میں نسنگ نامہ کا حوالہ دیا گیا ہے کہ سفر کے حالات اس سے واضح ہوں گے، مثنوی نسنگ نامہ میں بھٹیاری نے میر کے جواب میں ایک فقرہ "شاہ عالم" طنزیہ کہا ہے، اس سے قرینہ پایا جاتا ہے کہ شاہ عالم ثانی کی بے سر و سامانی پر چوٹ ہے اور اس پیرائے میں میر کو ذلیل کیا ہے:

سو تو نکلے ہو کورے بالم تم ہو گدا جیسے شاہِ عالم تم

میر نے نسنگ نامہ میں یہ بھی کہا ہے کہ جس علاقے میں مقیم رہا، وہ سکھوں کا گھر تھا، اور خدا ہی محافظ تھا جو جیتا آ گیا، نسنگ[1] کے متصل دیہات، بانسہ اور لاڈوہ کا بھی ذکر کیا ہے اگرچہ کلیات میں ان کا تلفظ بدلا ہوا ہے:

واں سے لادر، نسنگ، پھر واں سے جا کے واں تنگ آ گئے جاں سے
بڑی آفت خطر تھا سکھوں کا کیوں کہ وہ ملک گھر تھا سکھوں کا
اس میں آ جاتے تو قیامت تھی مال و جاں غرض سب کی رخصت تھی
نہ کوئی دادرس نہ وقتِ داد مفت ہی ہم گئے تھے، سب برباد
کیا کہ ڈھب چرخِ کج نے پھینکا تھا پر خدا کچھ ہمارا سیدھا تھا
جس نے قدرت نمائی کی اپنی اس بلا سے رہائی کی اپنی

---

[1] تحصیل کیتھل ضلع کرنال میں نسنگ نامی گاؤں اب بھی موجود ہے۔ میر صاحب نے جن ذاتوں کی آبادی کا بیان کیا ہے وہ تقسیم سے قبل موجود تھیں، مسلم راجپوت اور سید اب ترکِ وطن کر چکے ہیں، یہاں پہلے تحصیل بھی تھی جس کو پاٹ دیا گیا ہے، متصل گاؤں لادر نہیں بلکہ لاڈوہ ہے، وانسہ بھی اب بانسہ کہلاتا ہے، تحصیل کیتھل پٹیالہ سے متصل ہے، مولانا آزاد نے اس مثنوی کا تعلق سفرِ میرٹھ سے کیا ہے جو صحیح نہیں، نسنگ نامی گاؤں ضلع مظفر نگر میں بھی ہے مگر میر نے نسنگ ضلع کرنال کا واقعہ لکھا ہے۔

سکھوں کی چیرہ دستی کا ذکر پانی پت کی مشہور لڑائی کے بعد تاریخ میں آتا ہے، احمد شاہ ابدالی کی واپسی پر سکھوں نے بہت تنگ کیا، ابدالی کے عاملوں کو پنجاب سے نکال دیا (۱۷۶۲ء / ۱۷۶۳ء) میں جواہر سنگھ نے دہلی پر حملہ کیا تو سکھوں کو بھی بلایا تھا، مگر احمد شاہ ابدالی کی خبر آمد مشہور ہوئی اور جواہر سنگھ نے صلح کر لی، پنجاب میں سکھوں کی طاقت بڑھتی گئی اور احمد شاہ ابدالی ان کے بندوبست کے لئے آتا رہا، جاٹوں اور راجپوتوں (بھرت پور اور جے پور) کی جنگ میں بھی سکھوں کی خدمات حاصل کی گئیں، مگر یہ سب واقعات میر صاحب کے قیام بھرت پور کے زمانے میں پیش آئے، اگر یہ کہا جائے کہ ۱۱۶۹ھ اور ۱۱۷۳ھ کے مابین سفر ہو سکتا ہے تو اس کا جواب یہی ہوگا کہ حکومت دہلی کی گرفت نواحی علاقے پر مضبوط تھی اور جاٹ اور راجپوت دہلی سے متصل علاقے پر قبضہ جمائے ہوئے تھے، سکھوں سے نہ عوام کو اس وقت تک خطرہ ہوا تھا نہ حکومت کو، اس بنا پر مثنوی نسنگ نامہ ۱۱۸۶ھ کی نشاندہی کرتی ہے۔

مثنوی معاملاتِ عشق میں اپنی بیوی اور بچے کی موجودگی کا اقرار کیا ہے، وہ کہتے ہیں:

برسوں تک میں پھرا ہوں سرگرداں　　روز و شب دونوں تھے مجھے یکساں

نے فقط جان سے جہاں سے گیا　　زن و فرزند و خانماں سے گیا

فیض علی کی ولادت آغاز ۱۱۶۹ھ میں مان لینے پر ۱۱۸۶ھ میں اس کی عمر سترہ سال ہوگی، میر نے قیام بھرت پور کے آغاز میں (محرم ۱۱۸۰ھ مطابق اگست ۱۷۶۶ء) اعظم خاں سے ملاقات کا واقعہ لکھا ہے کہ سورج مل جاٹ کے طویلے میں ہماری باتیں ہو رہی تھیں کہ ہمشیرہ سعدالدین خاں خانساماں کی ملازمہ شیرینی لائی، اعظم خاں نے کہا میرا حصہ مجھے دے دو، باقی گھر بھیج دو، میر نے عذر کیا، کہا تمہارے بیٹے فیض علی کے کام آئے گی، قیاس چاہتا ہے کہ فیض علی چار پانچ سال کے ہوں، صاحب مجموعۂ نغز نے ۱۲۲۱ھ کے متصل انہیں جوان لکھا تھا۔ پچاس سال سے متجاوز عمر کے آدمی کو جوان کہنا درست نہیں، مگر صاحب مجموعۂ نغز نے بہت مدت پہلے انہیں دیکھا تھا، اس لئے قیاساً جوان لکھ دیا ہے، اس صورت میں ۱۱۶۹ھ اور ۱۱۷۳ھ کے زمانے میں جب کہ وہ راجہ ناگر مل سے متوسل ہو چکے تھے، سفر نسنگ درست نہ ہوگا۔

اس کا سبب یہ ہے کہ میر نے جس محبوبہ سے دل لگایا وہ کسی اور کے تصرّف میں تھی ~

وے تو ہر چند اپنے طور کے تھے — پر تصرف میں ایک اور کے تھے
کرتے ظاہر میں احتیاط بہت — مجھ سے بھی رکھتے اختلاط بہت

آگے بیان کرتے ہیں کہ محبوبہ کو سفر درپیش آیا (ننگ) میں بھی اس سفر میں ساتھ تھا، ننگ نامہ میں میرِ کارواں کو صاحب کے نام سے یاد کیا ہے، راجہ ناگرمل یا اُس کے بیٹے رائے بہادر سنگھ کی محبوبہ سے رسم و راہ پیدا کرنا مابین ۱۱۶۹ھ - ۱۱۸۹ھ خلافِ قیاس ہے، جس پر ذریعۂ معاش کا انحصار ہو اُس کی امانت میں خیانت میر گوارا نہ کرتے، ہاں کسی جدید معتقد یا مربی کے خلاف قدم اُٹھایا جا سکتا ہے، اس کی فہرست ذکرِ میر نسخہ رام پور میں یہ ہے:

ابوالقاسم خاں برادر خورد عبدالاحد خاں مجدالدولہ و وجیہ الدین خاں برادر حسام الدین خاں و بیرم خاں خلف الصدق بہرام خاں (بیرم خاں) کلاں کہ در آدمی روشی یکتا ے روزگار خود اند و قطب الدین خاں پسر سعد الدین خاں خانساماں اگرچہ سنش کم است اما فہمے درستے دارد و خالی از سعادت مندی نیست و قاضی لطف علی خاں کہ آدمیانہ می زید، گاہ گاہ ملاقات کردہ می آید، خواہ از دست ایشاں انتفاعے برسد یا نرسد مایۂ توکل ہمیں صاحباں اند........"

نسخۂ رام پور میں آخری واقعہ حسام الدولہ کی نظربندی (۱۴ ربیع الاول ۱۱۸۷ھ مطابق ۵ جون ۱۷۷۳ء) کا ہے، اس میں پچاس سال عمر ہونے کا ذکر ہے، نسخۂ مطبوعہ ذکرِ میر (ص ۱۲۲) میں ۱۱۸۶ھ کے حالات میں وجیہ الدین خاں برادر خورد حسام الدولہ کی دلدہی کا بیان ہے۔ اور ۱۱۸۸ھ کے سوانحات کے ذیل میں (ذکرِ میر مطبوعہ ص ۱۲۵) ابوالقاسم خاں پسر ابوالبرکات خاں صوبہ دارِ کشمیر کا بیان ہے۔ ابوالقاسم خاں ۲۳ محرم ۱۱۹۰ھ کو مارا گیا (تاریخ محمدی ص ۲۶۳) اس کا باپ ابوالبرکات خاں صوفی تخلص (مجمع النفائس۔ تاریخ محمدی ص ۲۰۱۸) (متوفی ۱۱۵۰ھ)

قطب الدین خاں خلف نواب ضیاء الدولہ سعد الدین خاں خانساماں پسر نواب سعد الدین خاں میرِ آتش — مجدالدولہ کیحل بوتے پر شاہ عالم ثانی کے دربار میں صاحبِ رسوخ ہوا، ۶ ذی قعدہ ۱۱۹۳ھ مطابق ۱۵ نومبر ۱۷۷۹ء، مجدالدولہ گرفتار ہو کر مقید ہوا، اسے بھی نجف خاں نے قید کر لیا، ۲ رمضان ۱۱۹۶ھ مطابق ۱۱ اگست ۱۷۸۲ء کو افراسیاب خاں نے مجدالدولہ کو رہا کیا، یہ بھی رہا ہوا، اس طرح تین امرا ابوالقاسم خاں بنی عم عبدالاحد خاں، قطب الدین خاں

داماد عبدالاحد خاں اور وجیہ الدین خاں برادر حسام الدولہ میرؔ کے مددگار رہے تھے اور بیرم خاں اور قاضی لطف علی خاں بھی امداد کرتے تھے، حسام الدولہ کا زوال ۴ ربیع الاول ۱۱۸۷ھ کو ہوا۔ اور وجیہ الدین خاں بھی پس پردہ چلے گئے، وجیہ الدین خاں کا ذکر نسخۂ مطبوعہ میں بھی ہے، رائے بہادر سنگھ نے ۱۱۸۵ھ کے آخر میں کچھ امداد کی تھی۔ مگر بقول میرؔ صاحب متصدیانِ حضور نے دلّی کے اُمرا کی جاگیریں بھی ضبط کرلیں، اس وجہ سے رائے بہادر سنگھ کی بھی ۱۱۸۶ھ کے وسط میں حالت بگڑ گئی، اس سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ ۱۱۸۶ھ میں نسنگ کا سفر ابوالقاسم خاں۔ وجیہ الدین خاں۔ رائے بہادر سنگھ۔ قطب الدین خاں۔ بیرم خاں اور قاضی لطف علی خاں کے ساتھ ہو سکتا ہے۔

ذکرِ میر میں میرؔ صاحب اپنے سفروں کا بھی بیان کرتے ہیں، جن کی ترتیب اس طرح ہے:
(۱) سفر دہلی ۱۱۴۸ھ (۲) سفر دہلی ۱۱۵۲ھ (۳) سفر پنجاب ۱۱۶۱ھ (۴) سفر راجپوتانہ ۱۱۶۲-۶۳ھ (۵) سفر اودھ ۱۱۶۳ھ (۶) سفر سکندرہ ۱۱۶۷ھ (۷) سفر کمبھیر ۱۱۷۳ھ۔
(۸) سفر آگرہ ۱۱۷۶ھ (۹) سفر آگرہ ۱۱۸۰ھ (۱۰) کمبھیر سے کاماں (جے پور) کا سفر ۱۱۸۴ھ (۱۱) کاماں سے فرخ آباد کا سفر ۱۱۸۵ھ (۱۲) کاماں سے دہلی کا سفر شعبان ۱۱۸۵ھ (۱۳) دہلی سے مشرق کی طرف سہارن پور و نجیب آباد وغیرہ کا علاقہ نواب ضابطہ خاں شاہ عالم ثانی کے لشکر کے ساتھ بمعیت رائے بہادر سنگھ (۱۴) دہلی سے سفر لکھنؤ براہ فرخ آباد ۱۱۹۶ھ۔

اِس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ دہلی میں رہ کر شادی کے بعد میر صاحب نے دو سفر کیے، احمد شاہ بادشاہ کے ساتھ سکندرہ کا سفر، ۱۱۶۷ھ میں اور ذی حجہ ۱۱۷۳ھ میں کمبھیر کا سفر، بھرت پور سے کوئی سفر دہلی کی طرف نہیں، ہاں کاماں سے فرخ آباد ۱۱۸۵ھ میں گئے اور کاماں سے دہلی شعبان کے مہینے میں آئے، اب وہ سفر شوال ۱۱۸۵ھ کا رہ جاتا ہے جس میں شاہ عالم ثانی کے لشکر کے ساتھ میرؔ صاحب بمعیت رائے بہادر سنگھ پسر کلاں راجہ ناگرمل ضابطہ خاں کے علاقے میں گئے، اس کے بعد کسی سفر کا جو دہلی سے شاہدرہ، میرٹھ اور نسنگ کی طرف کیا گیا ہو ثابت نہیں، اس سفر میں محبوبہ کی فرمائش پر چلے ہوں قرینہ نہیں، شعبان ۱۱۸۵ھ میں دہلی میں داخل ہوئے۔ سوا مہینہ بعد ۱۰ شوال کو شاہی فوج کے ساتھ روانہ ہو گئے۔ اس عرصے میں تمام

مراحلِ محبت کس طرح طے ہوئے'، پھر میر نے نسنگ نامہ میں ہمراہیوں کی جو تفصیل لکھی ہے' وہ معمولی ہے'، فوج کے ساتھ ہونے کا گمان نہیں کیا جا سکتا' اور ۱۰ ر شوال ۱۱۸۵ھ مطابق ۱۶ ر جنوری ۱۷۷۲ء ہے' یہ برسات کا مہینا نہیں نہ دریاؤں میں ان دنوں طغیانی ہوتی ہے' اِس لئے یہ سفر ۱۱۸۵ھ کے بعد کا سفر کہا جا سکتا ہے' ہماری نظر میں یہ سفر وجیہ الدین خاں کی معیت میں ہوگا۔ میر نے اس کی امداد کا ذکر بھی کیا ہے' وجیہ الدین خاں شاعر بھی تھا' حسام الدولہ نے بعض اُمرا کی جاگیریں ضبط کر کے شاہی مصارف کا انتظام کیا تھا' نیز اپنے مصارف کے لئے بھی اس نے جاگیریں ضبط کی ہونگی' جن کا ذکر میر صاحب نے بھی کیا ہے' میر کے بیان سے پتا چلتا ہے کہ میرِ کارواں نسنگ میں جاکر ٹھہر گئے تھے اور مقصد مالگزاری وصول کرنے کا تھا' ہو سکتا ہے کہ وہ وہاں کی جھیل کے مناظر سے لطف اندوز ہونا چاہتے ہوں' یہاں سیدوں کے بھی چند مکان تھے' ممکن ہے کہ ان سے صاحبِ کارواں کے روابط ہوں اس لئے حسام الدولہ کی گرفتاری ربیع الاول ۱۱۸۷ھ سے پہلے یہ سفر ۱۱۸۶ھ میں ہوا ہوگا۔ قطب الدین خاں کی معیت میں سفر کا امکان اس وجہ سے نہیں کہ میر صاحب نے اس کی نوجوانی کا ذکر کیا ہے' وہ مجد الدولہ کا داماد تھا' ایسی صورت میں اس کی محبوبہ سے تعلقات پیدا ہونا خلافِ قیاس ہوگا۔

ابوالقاسم خاں کی تاریخِ ولادت معلوم نہیں' اس کے والد ابوالبرکات خاں ۱۱۵۸ھ میں فوت ہو چکے تھے' وہ میر صاحب کا ہم عمر ہو سکتا ہے' لیکن اُس کا عُروج ۱۱۸۷ھ میں ہوا' (بعد زوال حسام الدولہ) اس لئے قرینہ یہی ہے کہ وجیہ الدین خاں کے ساتھ سفر ہوا ہو' مجد الدولہ کا اقتدار ۱۱۸۷ھ سے ۶ ر ذی قعدہ ۱۱۹۳ھ تک رہا اور دوبارہ ۲ ر رمضان ۱۱۹۶ھ سے دیوانی خالصہ شریفہ کا عہدہ ملا' اس کے بعد وجیہ الدین خاں شاہ عالم ثانی کے عہد میں باعزت زندگی گذارتا رہا' صاحبِ مجموعۂ نغز کا بیان ہے (جلد ۲ ص ۲۹۴)۔

وجیہ تخلص نواب وجیہ الدولہ وجیہ الدین خاں بہادر مبارز جنگ برادر کوچک نواب حسام الدولہ حسام الدین خاں بہادر مبارک جنگ' مختار کار سرکار بادشاہی کا ہے' اپنے بھائی کے زمانۂ اقتدار میں بڑی شان سے بسر کرتے اور ہر ایک سے لطف و مدارا سے پیش

آتے اور مخلوق کی کاربرآری کرتے .... عروض اور قافیہ میں مہارت رکھتا ہے، شاعری میں صنائع بدائع کا استعمال بہت کرتا ہے، بارہ ہزار اشعار کی ضخیم مثنوی ریختہ میں کہی ہے، اکثر فارسی غزلیں پختگی سے کہتا ہے اور مرزا فاخر مکین اپنے استاد کے ایما سے بریں تخلص مجھ پر بھی بڑی مہربانی کرتا ہے۔"

میر صاحب ذکر میر (ص ۱۳۸ تا ۱۴۰) میں لکھتے ہیں کہ میرے لکھنؤ آنے کے بعد نجف... جو بستر بیماری پر دراز تھا، چل بسا، واقعات دارالحکومت دہلی حصہ سوم (ص ۴۷۲) میں ۲۶ اپریل ۱۷۸۲ء تاریخ وفات درج ہے، اور وقائع عالم شاہی مصنفۂ فراقی میں عرشی صاحب نے ۲ اپریل ۱۷۸۲ء ہے، نقوش اکتوبر نومبر ۱۹۵۳ء میں قاضی عبدالودود صاحب نے بحوالہ تاریخ شاہ عالم ۱۷ محرم ۱۱۹۶ھ کو خفیف تپ ہونا، اور عبرت نامہ کی رو سے ۲ ربیع الثانی کو حویلی قمرالدین خاں سے حویلی صفدر جنگ میں تبدیلی اور شدتِ مرض ۲۲ ربیع الآخر ۱۱۹۶ھ مطابق ۶ اپریل ۱۷۸۲ء کو وفات لکھی ہے، اس سے واضح ہوتا ہے کہ میر صاحب نے ربیع الاول ۱۱۹۶ھ کے تیسرے ہفتے میں (مارچ ۱۷۸۲ء) لکھنؤ کی طرف سفر کیا، معاملاتِ عشق اس سے پہلے پیش آئے اور مثنوی تسنگ نامہ صاحبوں کی فرمائش پر لکھی گئی، اس طرح دونوں مثنویوں کی تاریخ تصنیف ۱۱۸۶ھ رہے گی، اگر ہم مابین ۱۱۸۶ھ اور ربیع الاول ۱۱۹۶ھ ان واقعات کا درپیش آنا تسلیم کرلیں، تو اس سے یہ بات ماننی پڑیگی کہ پچاس اور ساٹھ سال کی عمر کے درمیان محبت کی گئی، محبت طرفین سے ہوتی ہے، میر خود کہتے ہیں کہ محبوبہ کی طرف سے بھی تحریک ہوئی تھی۔ اور اسی بنا پر ان کی بھی ہمت ہوئی :

بات کی طرز میری ہی بھائی — میری آزردگی نہ خوش آئی
پیار چتون سے پھر نکلنے لگا — دیکھنا دل کو میرے ملنے لگا
کچھ کچھ آزار مجھ کو دینے لگے — قسم اقسام مجھ سے لینے لگے
دیکھ کر روتے، آپ بھی روتے — دل نہی کرتے، جب تلک سوتے

آگے چل کر محبوبہ کے مذہبی عقیدہ کی طرف بھی اشارہ کرتے ہیں کہ اس نے منقبت کہنے کی فرمائش کی، فرمائش میر صاحب نے پوری کردی اور وہ راضی ہوگئی :

منقبت ایک مجھ سے کہوایا — جس کا مَیں نے صلہ اُنہیں پایا
پھر وہی کرتے ہیں جو کچھ کہتا — ایک پردہ سا بیچ میں رہتا

..ن روشنی میں بھی یہ واقعہ ۱۱۹۶ھ میں پیش آنا درست ہوگا' اعتراض ہوگا کہ بوڑھے مُنہ مہاسے یہ ممکن نہیں' پچاس کی عمر' بیوی' بچے موجود' اور پھر یہ چلن' داغ کی مثال ہمارے سامنے موجود ہے۔ تاریخ ولادت ۲۵ مئی ۱۸۳۱ء ہے' پچاس سال کے تھے کہ مارچ ۱۸۸۱ء میں میلۂ بے نظیر رام پور میں منی بائی حجاب سے ملاقات ہوئی' دل دے بیٹھے' دو بہت سال حجاب کی فرمائش پر کلکتے پہنچے (انشا سے داغ مرتبہ احسن مارہروی ص ۱۶ تا ۲۰) جون ۱۸۸۲ء۔ اصل میں رقیبوں کے بہکانے سے حجاب نے داغ کا امتحان لیا۔ داغ کی عمر اس وقت باون سال کی تھی اور قمری حساب سے تریپن سال' فریادِ داغ اسی واقعہ کی یادگار ہے (مضمون راقم۔ داغ نمبر نگار جنوری فروری ۱۹۵۳ء ص ۱۵) عالمگیر ثانی نے ۶۹ سال کی عمر میں محمد شاہ بادشاہ مرحوم کی سولہ سالہ لڑکی حضرت بیگم سے زبردستی شادی کرنی چاہی اور انکار پر اُسے قید کر دیا (فروری ۱۷۵۷ء)

ایسی اور بھی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔

میر نے محبُوبہ کے ساتھ سفر جمادی الآخر ۱۱۸۶ھ مطابق ستمبر ۱۷۷۲ء میں کیا' خود میر کا بیان ہے:

ہم کو درپیش تب سفر آیا — جب کہ برسات سر ہی پہ آیا
ابر ہونے لگے سپید و سیاہ — پانی رستوں میں کیچ ساری راہ

راستے میں جمنا عبُور کر کے شاہ درہ آیا۔ پھر غازی آباد پہنچے' میر صاحب کے ساتھ سوہنی بلی بھی تھی وہ سوار ہوتے وقت رہ گئی' اس سے اگلی منزل بیگم آباد تھی' اور پھر میرٹھ آگیا' میرٹھ سے باغپت پر جمنا عبُور کر کے' لاڈوہ پہنچے' میرٹھ سے لاڈوہ چالیس میل پر ہے' لاڈوہ سے متصل ایک گاؤں "راودر" ہے۔ یہ دونوں گاؤں پختہ سڑک پر ہیں' لاڈوہ سے لسنگ براہ خام ۲۵ میل ہے' کرنال سے لسنگ کا فاصلہ ۱۲ میل ہے' لسنگ سے سات میل پر بالنسہ براستۂ خام ہے' لسنگ میں جھیل مان سرور کا نشان باقی ہے' آبادی دو ڈھائی

ہزارہ تھانہ اور لوئر مڈل اسکول ہے (زبانی شیخ محمد عمر پانی پتی ایس، وی ٹیچر ڈی ۔ بی مڈل اسکول ہیڈ غانگی گوجرانوالہ) ۔

اب مثنوی معاملات عشق کے کچھ اشعار ملاحظہ ہوں ۔ بقول نواب امداد امام اثر میر کی مثنویوں میں داخلیت پائی جاتی ہے اور خارجی عنصر کی کمی ہے ۔

مثنوی معاملاتِ عشق

کچھ حقیقت نہ پوچھو کیا ہے عشق — حق اگر پوچھو تو خدا ہے عشق
عشق ہی عشق ہے نہیں ہے کچھ — عشق بن تم کہو، کہیں ہے کچھ
عشق تھا جو رسول ہو آیا — اُن نے پیغامِ عشق پہونچایا
عشق حق ہے کہیں، نبی ہے کہیں — ہے محمدؐ کہیں، علیؓ ہے کہیں
عشق عالی جناب رکھتا ہے — جبرئیل و کتاب رکھتا ہے

خستۂ عشق کچھ نہ میر ہوئے — بادشہ، عشق میں، فقیر ہوئے
عشق کے دل فگار سارے ہیں — ان نے کیا کیا، جوان مارے ہیں
سیر قابل ہیں، اس کے دیوانے — سننے کے گوں ہیں، ان کے فسانے
وصل میں جن کے دل رہیں، بے جا — فصل ہو تو انہوں کا حال ہو کیا
اس بلا سے بھی مجھ کو کام ہوا — عاشقِ زار میرا نام ہوا

معاملہ اوّل

ایک صاحب سے جی لگا میرا — اُن کے گیسوؤں نے، دل ٹھگا میرا
ابتدا میں تو یہ رہی صحبت — نام سے اُن کے تھی، مجھے اُلفت
خوبی اُن کی، جو سب کہا کرتے — گوش میرے اُدھر رہا کرتے

بخت برگشتہ پھر جو یار ہوئے
اِک طرح مجھ سے وہ دوچار ہوئے

کیا کہوں طرز دیکھنے کی آہ
دل جگر سے گذر گئی وہ نگاہ

چُپکے مُنہ اُن کا دیکھ رہتا میں
جی میں کیا کیا، پہ کچھ نہ کہتا میں

وے تو ہر چند اپنے طور کے تھے
پر تصرف میں ایک اور کے تھے

کرتے ظاہر ہیں احتیاط بہت
مجھ سے بھی رکھتے، اختلاط بہت

بات کی طرز، میری ہی بھاتی
میری آزردگی، نہ خوش آتی

پیار چتون سے پھر نکلنے لگا
دیکھنا دل کو میرے ملنے لگا

کہیں دیکھوں تو بات دیر کہیں
بے دماغ اور بے گمان رہیں

کچھ کچھ آزار مجھ کو دینے لگے
قسم اقسام مجھ سے لینے لگے

میں جو کھاتا قسم تو ہو برہم
کہنے لگتے کہ کیا "گدا" کی قسم

ایک دو دن میں بعدِ رفعِ ملال
لطف سے پوچھتے، کہو کیا حال

جو گذرتی تھی مجھ پہ میں کہتا
یا کوئی اشک آنکھ سے بہتا

دیکھ کر روتے، آپ بھی روتے
دل دہی کرتے، جب تلک سوتے

معاملۂ دوم

ایک مُدت تلک یہ صحبت تھی
کبھو اُلفت، کبھو یہ کلفت تھی

رفتہ رفتہ، سلوک بیچ آیا
ہاتھ پانوؐ کو اپنے، لگوایا

گاہ بے گاہ، پانوؐ پھیلاتے
میری آنکھوں سے تلوے مَلواتے

چل کے آتے تھے جب کبھو ایدھر
پانوؐ رکھتے تھے میری آنکھوں پر

دیکھنے میں تو پائمالی تھی
حُسن سے چال یہ نہ خالی تھی

جلتی چھاتی تو ہوتا ہیں سائل — کہ ٹک اے سرد ہو، ادھر مائل
کف پا رکھیے یاں تو احساں ہے — تیرے پانو تلے مری جاں ہے
ہنس کے سینے پہ ہاتھ رکھ دیتے — دل مرا یُوں بھی ہاتھ میں لیتے

سراپائے محبوبہ

کیا کہوں کیسا قدِ بالا ہے — قالب آرزو میں ڈھالا ہے
ایک جاگہ سے ایک جاگہ خُوب — پیکرِ ناز اُس کے سب محبُوب
موے سر ایسے جی بھی کریے نیاز — بل ہی کھایا کرے یہ عُمرِ دراز
اُس کی کاکل سے حرف سر نہ کرو — کاکلِ صبح پہ نظر نہ کرو
سطح رخسار آئینے سے صاف — جو نہ ٹھہرے نگہ تو رکھیے معاف
کیا جھمکتا ہے ہائے رنگِ قبول — جیسے مُکھڑا، گلاب کا سا پھُول
ان لبوں سے جو کوئی کام رکھے — قند و مصری کو کیوں نہ نام رکھے
جب وہ کھاتے ہیں بیڑۂ پاں کو — رو نہیں دیتے لعل و مرجاں کو
ایسی ہوتی نہیں ہے سُرخ لبی — رنگ گویا ٹپک پڑے گا ابھی
ہو تبسم سے لعل کا دل خوں — ہنستے دیکھا تھا، سو مجھے ہے جنوں
نہیں دیکھے مسی مَلے دنداں — برقِ ابرِ سیہ ہے تب خنداں
کیا نظر گاہ کی کروں خُوبی — نظریں اٹھتی نہیں، یہ محبوبی
سر سے پالو تلک وہ محبوبی — ساتھ اِن خُوبیوں کے یہ خوبی
کہ بہت دل ہے آشنائے رحم — دردمندوں کو جانئے جائے رحم
اب جو ثابت ہوئی ہے میری چاہ — اُس کو مدِّ نظر ہے مجھ سے نباہ
طعن و تعریض بیچ میں آئے — کچھ نہ خاطر میں وے مجھے لائے
رہتے ہیں اک طرف وفا کے لیے — چلے جاتے ہیں مجھ پہ لطف کیے
نہیں آزار کی روا داری — مہر ورزی ہے یا وفا داری

پر جو معشوقِ آب و گِل میں ہے　　چھیڑ رکھنے کا شوق دل میں ہے

معاملۂ سوم

ایک دِن فرش پر تھا میرا ہاتھ　　باتیں کرتے تھے وے بھی میرے ساتھ
پانوٗ سے ایک اُنگلی مَل ڈالی　　لُطف سے درد وہ نہ تھا خالی
درد سے کی جو مَیں نے بیتابی　　دستِ نازک سے دیر تک دابی

معاملۂ چہارم

ایک دِن پان وہ چباتے تھے　　سُرخ لب اُن کے مجھ کو بھاتے تھے
کہہ اُٹھا میں اگر اُگال مجھے　　مُنہ سے دو تو کرو نہال مجھے
بولے یُوں ہی ہے، میں کہا ہاں سچ　　جھُوٹا کھاتے ہیں میٹھے کی لالچ
ہنس کے اُس وقت مجھ کو ٹال دیا　　پھر اُسی رنگ سے اُگال دِیا
ایسی صد رنگ مہربانی تھی　　تب سیہ رُو کی زندگانی تھی

اب کے سے رنگ گر فلک لاتا　　خاک کے رنگ میں مجھے پاتا

معاملۂ پنجم

منقبت ایک مجھ سے کہوایا　　جس کا میں نے صلہ اُنہیں پایا
پھر وہی کرتے ہیں جو کچھ کہتا　　ایک پردہ سا بیچ میں رہتا
دوستی، رابطہ، وفا، اخلاص　　ساتھ میرے تھا اُن کو رابطہ خاص
دِل تو تھا رحم آشنا ازبس　　کڑھتے تھے جان کر مجھے بے کس
جانتے تھے کہ ہے یہ دِل دادہ　　سیدِ خستہ، خاک افتادہ
دیکھتے مجھ کو جو پریشاں دِل　　کہتے "اے میر" کچھ نہیں حاصل

دیکھ ٹک تو ہی تیرا حال ہے کیا — جانے دے اب بھی، یہ خیال ہے کیا
آفتِ جاں ہے دوستی کرنا — کب تلک گھٹ کے اس طرح مرنا

معاملۂ ششم

شب کئی صورت خیالی سے — دن کو ہوں ہیں شکستہ حالی سے
گرچہ روزانہ بھی تصوّر تھا — لیکن اندوہ سے مکدر تھا
کہیں تصویر سی نظر آئی — کہیں مُنہ پھیر جیسے شرمائی
کبھی دل اُن کے رو و مُو میں رہے — کبھی ملنے کی آرزو میں رہے
صورتِ حال اور کچھ ہر دم — گاہ لب خشک، گاہ مژگاں نم
مَیں بھی مقدور تک وفا کی ہے — جانِ غم ناک پر جفا کی ہے
برسوں تک میں پھرا ہوں سرگرداں — روز و شب دونوں تھے مجھے یکساں
نے فقط جان سے، جہاں سے گیا — "زن" و "فرزند" و "خانماں" سے گیا
کیچ، پانی، ہو، مینہ ہو یا برسات — روزِ روشن ہو یا اندھیری رات
ان تلک میرے تئیں پہنچ رہنا — بیٹھے، مُنہ دیکھنا نہ کچھ کہنا
آشنا، یار، سارے بیگانے — کہ ہوئے مِیر جی تو دیوانے
رشتۂ ربط، اُنھوں نے توڑ دیا — مِلنا، جُلنا، سبھوں نے چھوڑ دیا
نظر آتے نہیں ہیں مدت سے — اُنس پیدا کیا ہے وحشت سے
صبح ہوتے ہی گھر سے چلتے ہیں — جیسے کھوئے گئے، نکلتے ہیں
کیا بیان کریے بے قراری کا — ذکر کیا حالِ اضطراری کا
پاس اُن کے رہُوں تو دل کو قرار — پھر نہ ٹھہرے ٹک ایک کریے ہزار
گئی برباد عزت، اُن کے لیے — جلف لوگوں نے مُنہ پہ طعنے دیے
گھورے پر سے جو اُٹھ نہ سکتے تھے — وے بھی کتّاس پوچ بکتے تھے
سفر | سفر آیا جو اُن کے تئیں درپیش — ساتھ اُس رنج میں بھی تھا درویش

کیا کہوں جو اذیتیں دیکھیں ہر قدم پر قیامتیں دیکھیں
جو پڑھے گا نسنگ نامہ یاں ہوگی ساری حقیقت اُس پہ عیاں
یاں نہ تفصیل کرنے کا تھا مقام کہ محبت سے یاں ہے صرف کلام

معاملۂ ہفتم

بارے کچھ بڑھ گیا ہمارا ربط ہو سکا پھر نہ دو طرف سے ضبط
تب ہوا بیچ سے یہ رفعِ حجاب جب بدن میں رہی نہ مطلق تاب
ایک دن ہم و وے متصل بیٹھے اپنے دل خواہ، دونوں مل بیٹھے
شوق کا سب کہا قبول ہوا یعنی مقصودِ دل حصول ہوا
واسطے جس کے تھا میں آوارہ ہاتھ آئی، مرے وہ مہ پارہ

چند روز اس طرح رہی صحبت پیار، اخلاص، رابطہ، اُلفت
ہو گئے بخت اپنے برگشتہ پھر گیا آسماں نے سرگشتہ
بات ایسی ہی اتفاق پڑی کہ ہوئی سر پہ فرقت آن کھڑی
لگی کہنے کہ مصلحت ہے یہ کتنے روزوں جدا تو مجھ سے رہ
یوں بھی آنا ہے عشق میں درپیش کہ نشانِ بلا ہوں اُلفت کیش
میں اُٹھایا نہیں ہے تجھ سے ہاتھ کہ خصومت تو ہے میری جان کے ساتھ
اِس جدائی کا مجھ کو بھی غم ہے کیا کروں آبرو مقدم ہے

میں کہوں کیا مجھے نہ اپنا ہوش جیسے تصویر سامنے خاموش
آنسو، آنکھوں میں پڑ پیے جاؤں وے کہیں کچھ تو "ہاں" کہے جاؤں
ان سے رخصت ہوے جو بعدِ شام تیرہ دیکھا جہاں کو ہر گام
دِل ٹھہرتا نہ تھا، ملالت تھی جان کو رفتگی کی حالت تھی

یوں ہوا، ان کے کوچے سے آنا — جیسے ہووے جہان سے جانا
اب جو گھر میں ہوں تو فسردہ سا — چارپائی پہ ہوں، تو مردہ سا
جی اُٹھوں میں فسردہ قالب یاں — متحرک ہو گیا تنِ بے جاں
حال دل کا کہوں جو ہمدم ہو — کروں پیغام کچھ، جو محرم ہو
جی میں کچھ آیا، رو کے بیٹھ رہا — دل زدہ، چپکا ہو کے بیٹھ رہا
کوئی آیا جو واں سے جی آیا — سو نہ آیا، کبھی، کبھی آیا
یاد کر روؤں اُن کی کونسی بات — کس طرح کاٹوں ہجر کے اوقات
ملنا اُن سے ہو پھر گھٹے غم بھی — آئے جیتوں میں، جانیے ہم بھی
مدتِ ہجر اگر تمام ہوئی — ورنہ اپنی تو صبح شام ہوئی

نثار احمد فاروقی

مثنوی دریائے عشق

اُردو کے شاعروں میں جو مقبولیت میرؔ کو نصیب ہوئی وہ کم ہی کسی کے حصے میں آتی ہے، ناسخؔ، غالبؔ، ذوقؔ، جلالؔ، حسرتؔ موہانی سب نے ان کی شاعرانہ عظمت کے اعتراف میں احترام و عقیدت سے سر جھکایا ہے۔ بنیادی طور پر میرؔ غزل گو ہیں۔ ان کی غزلوں میں بیان کی سادگی، سوز و گداز اور جذبے کی کسک ایسی صفات ہیں جن کی تقلید کسی سے نہ ہو سکی اور ذوقؔ کو یہ اعتراف کرنا پڑا:

نہ ہوا پر نہ ہوا میرؔ کا انداز نصیب
ذوقؔ یاروں نے بہت زور غزل میں مارا

میرؔ نے اُردو غزل کو جیسا اور جتنا سرمایہ دیا۔ وہ تو سب ہی جانتے ہیں۔ ان کی مثنویاں بھی صفائی، سلاست، پاکیزگی اور ربط و تسلسل میں غزلوں سے کم پایہ نہیں۔ ان مثنویوں کی تعداد چھوٹی بڑی سب ملاکر، تین درجن کے لگ بھگ ہے۔ ان میں کچھ مثنویاں عشق و محبت کے دردناک قصوں سے بنائی گئی ہیں۔ کچھ سوانحی حیثیت رکھتی ہیں جن میں میرؔ نے اپنی زندگی، اپنے ماحول اور

اپنے تجربات کا بیان کیا ہے۔ بعض مثنویاں واقعاتی ہیں، بعض ہجویہ اور بعض تفریحی ــــــ عشقیہ مثنویوں میں دریاے عشق، اعجازِ عشق، شعلۂ شوق اور معاملاتِ عشق کے نام لیے جا سکتے ہیں۔ لیکن دریاے عشق ان سب سے زیادہ مقبول ہوئی۔ اس کی مقبولیت میر کے زمانے میں بھی تھی جس کا ایک ثبوت مثنوی بحر المحبت ہی ہے جو مصحفی نے دریاے عشق کے جواب میں لکھی تھی، اور آج بھی اسے میر کی نمایندہ مثنوی کہا جا سکتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ میر کے بعد لکھی جانے والی مثنویوں پر میر کی روشِ مثنوی نگاری کا بالواسطہ یا بلاواسطہ اثر بھی ملتا ہے۔ در اصل میر کو شمالی ہندستان کا اولین مثنوی نگار کہنا چاہیئے۔ جس طرح ولی سے پہلے بھی بہت سے شاعروں نے اُردو غزل میں طبع آزمائی کی، لیکن غزل کا سانچا، اس کا مزاج اور اس کی داخلی فضا سب سے پہلے ولی نے قائم کی۔ اسی طرح گو میر سے بہت پہلے دکن میں اور خود شمالی ہند میں بھی بہت سی واقعاتی یا عشقیہ مثنویاں لکھی گئیں ــــــ لیکن میر پہلا شاعر اس اعتبار سے ہے کہ اس نے مثنوی کا مزاج بنایا۔

میر عاشق پیشہ تھے۔ ان کی شاعری میں عشق کا دوگونہ تصوّر ملتا ہے یعنی ایک فلسفیانہ یا روحانی تصوّر، دوسرا مادّی اور مجازی۔ وہ خود عشق و محبت کی کانٹوں بھری وادی سے گذرے تھے۔ ان کی ابتدائی تعلیم و تربیت صوفیانہ ماحول میں ہوئی اور زندگی میں اُنھوں نے مجازی عشق کی کڑیاں بھی جھیلیں۔ ان کی شخصیت اور ان کی زندگی جذبہ و احساس کی کٹھالی میں تپ کر غمِ عشق کی آنچ سے کندن بن گئی تھی۔ اِسی لیے وہ ان نازک جذبات کی گرمی کو شعر کے شیشوں میں اتار سکتے تھے۔ ان کی سب عشقیہ مثنویاں المیہ ہیں جو عاشق و معشوق دونوں کی زندگی کے ساتھ ختم ہوتی ہیں۔ ڈاکٹر سید عبداللہ نے ایک جگہ لکھا ہے کہ میر کے ذہن کو المیہ تصورات سے بڑی دلچسپی ہے۔ اُن کے نزدیک عشق اور ٹریجڈی لازم ملزوم ہیں۔ ان کی غزلیات میں بھی "مارے جانے" کا مضمون بڑی کثرت سے آیا ہے۔ ان قصّوں میں زمانے کے رواج کے مطابق وہ طلسماتی عنصر بھی شامل کر دیتے ہیں جس سے مثنوی کی صداقت اور واقعیت ضرور مجروح ہوتی ہے مگر اس کی دلچسپی میں فرق نہیں آتا۔

میر کی غزلوں کے علاوہ ان کی آپ بیتی "ذکرِ میر" اور فیض میر وغیرہ پڑھنے سے عشق کے بارے

میں ان کے بنیادی تصورات کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ دریائے عشق کی ابتدا بھی عشق کی تعریف سے ہوتی ہے۔ ان کا تصورِ عشق عالمگیر ہے اور کارخانۂ عالم اسی سے چل رہا ہے:

عشق ہی عشق ہے جدھر دیکھو
سارے عالم میں بھر رہا ہے عشق

زندگی کا بہترین مصرف یہ ہے کہ وہ عشق میں کھپ جائے اور انسان کی معراج یہ ہے کہ راہِ عشق میں مارا جائے۔ ذکرِ میر میں انھوں نے اپنے والد کی طرف یہ کلمات منسوب کیے ہیں کہ "بیٹا عشق کرو" عشق ہی اس کارخانۂ ہستی کا چلانے والا ہے۔ اگر عشق نہ ہوتا تو نظامِ عالم قائم ہی نہ ہو پاتا۔ بغیر عشق کے زندگی وبال ہے۔ عشق میں جی جان کی بازی لگا دینا ہی کمال ہے۔ عشق ہی بناتا ہے۔ عشق ہی جلا کر کندن کر دیتا ہے۔ جو کچھ ہے وہ عشق کا ظہور ہے۔ آگ میں سوزش اور پانی میں روانی عشق سے ہے۔ خاک میں عشق کا قرار ہے اور ہوا میں اس کا اضطرار ہے۔ موت عشق کی مستی اور زندگی اس کی ہوشیاری ہے۔ دن عشق کی بیداری اور رات اس کی نیند ہے۔ مسلمان عشق کا جمال اور کافر اس کا جلال ہے۔ نیکی عشق کا قرب اور گناہ اس سے دوری ہے۔ جنت عشق کا شوق اور دوزخ اس کا ذوق ہے۔ عشق کا مقام و مرتبہ بندگی سے، زہد و عرفان سے، سچائی اور خلوص سے، اشتیاق اور وجدان سے بھی بلند و بالاتر ہے۔ کچھ لوگ تو یہاں تک کہتے ہیں کہ آسمانوں کی یہ گردش بھی عشق ہی کے باعث ہے یعنی وہ اپنے محبوب تک پہنچنے کی دُھن میں برابر سرگرداں ہیں۔" میر کی شاعری میں جو تصورِ عشق اُبھرتا ہے وہ انہیں خیالات کی صدائے بازگشت ہے۔ مثنوی دریائے عشق کے چند شعر ملاحظہ ہوں:

عشق ہے تازہ کار و تازہ خیال — ہر جگہ اس کی اک نئی ہے چال
کہیں آنکھوں سے خون ہو کے بہا — کہیں سر میں جنوں ہو کے رہا
دل میں جا کر کہیں یہ درد ہوا — کہیں سینے میں آہِ سرد ہوا
کہیں رونا ہوا ندامت کا — کہیں ہنسنا ہوا جراحت کا
کہیں باعث ہے دل کی تنگی کا — کہیں موجب شکستہ رنگی کا

کہیں عشاق کا نیاز ہوا — کہیں اندوہِ جاں گداز ہوا
کسو چہرے کا رنگ زرد ہوا — کسو محمل کے آگے گرد ہوا
ایک عالم میں دردمندی کی — ایک محفل میں جا پسندی کی
کہیں بیٹھے ہے جی میں ہو کر چاہ — کہیں رہتا ہے قتل تک ہمراہ
کہیں شیون ہے اہلِ ماتم کا — کہیں نوحہ ہے جانِ پُرغم کا
آرزو ہے امیدواروں کی — دردمندی جگر فگاروں کی
حسرت آلودہ آہ ہے یہ کہیں — شوق کی اِک نگاہ ہے یہ کہیں
کون محروم وصل یاں سے گیا — کہ نہ یار اس کا پھر جہاں سے گیا

اسی طرح ۲۴ شعروں میں عشق کی کیفیت بیان کرنے کے بعد اصل قصہ شروع کیا ہے۔ یہ قصہ ایک ٹریجڈی ہے اور اس طرح شروع ہوتا ہے:

ایک جا اِک جوانِ رعنا تھا — لالہ رخسار، سروِ بالا تھا
عشق رکھتا تھا اس کی چھاتی گرم — دل وہ رکھتا تھا موم سے بھی نرم
شوق تھا اس کو صورت خوش سے — اُنس رکھتا تھا وضع دلکش سے
تھا طرح دار آپ بھی لیکن — رہ نہ سکتا تھا اچھی صورت بن
دیکھتا گر کہیں وہ چشم سیاہ — دل سے بے اختیار کرتا آہ

قصے کا ہیرو خود بھی اچھے ناک نقشے کا قبول صورت نوجوان تھا لیکن عشق کی نظرِ بد اُسے کھا گئی۔

ایک دن بے کلی سے گھبرایا — سیر کرنے کو باغ میں آیا
ناگہ اک کوچے سے گذار ہوا — آفتِ تازہ سے دوچار ہوا
ایک غرفے میں ایک مہ پارا — تھی طرف اس کے گرم نظارہ
پڑ گئی اس پہ اِک نظر اُس کی — پھر نہ آئی اُسے خبر اُس کی
ہوش جاتا رہا نگاہ کے ساتھ — صبر رخصت ہوا، اک آہ کے ساتھ
جھاڑ دامن کے تئیں وہ مہ پارا — اُٹھ گئی سامنے سے یک بارا

وہ گئی، اس کے سر بلا آئی خاک میں مل گئی وہ رعنائی
طبع نے اک جنوں کیا پیدا اشک نے رنگ خوں کیا پیدا
خلق اس کی ہوئی تماشائی پر نہ وہ دیکھنے کبھو آئی
کچھ کہا گر کسی نے شفقت سے رو دیا اس نے ایک حسرت سے
جاکے اس کے قریب در بیٹھا اپنے مرنے کا قصد کر بیٹھا
دل نہ سمجھا کہ اضطراب کیا شوق نے کام کو خراب کیا
جو کہ سمجھے تھے اس کو دیوانہ رحم کرتے تھے آشنا بیانہ
عاشق اس کو کسو کا جان گئے سب برا اس ادا سے مان گئے

غرض رفتہ رفتہ محبت کی رسوائی ہونے لگی اور ہیروئن کے عزیز و اقرباء ہیرو کی جان کے لاگو ہو گئے۔

وارث اس کے بھی بدگمان ہوئے درپئے دشمنیٔ جان ہوئے
مشورت تھی کہ مار ہی ڈالیں دفعتہً اس بلا کو یوں ٹالیں
پھر یہ ٹھہری کہ ہونگے ہم بدنام سن کے آخر کہیں گے خاص و عام
کیا گنہ تھا کہ یہ جواں مارا کس نے مارا اسے کہاں مارا
کیجیے ایک ڈھب سے اس کو تنگ تا نہ عائد ہو اپنی جانب ننگ
تہمتِ خبط رکھیے اس کے سر کیجیے سنگ سار اس کو پھر
دے کے دیوانہ اس جواں کو قرار ہو گئے سارے درپئے آزار
ایک نے سخت کہہ کے تنگ کیا ایک نے آکے زیرِ سنگ کیا
کی اشارت کہ کودکانِ شہر آئے لبریزِ غصہ و پُر قہر

لیکن ان سب باتوں کا میر قصہ پہ کوئی اثر نہیں، وہ مئے محبت سے چھکا ہوا ہے اور اپنے محبوب کی یاد میں سرشار ہے۔

گرچہ ہنگامہ اس کے سر پر تھا لیک رو سے دل اس کا اودھر تھا
محو تھا اس کے یہ خیال کے بیچ تھا گرفتار اپنے حال کے بیچ

کہیں عشاق کا نیاز ہوا — کہیں اندوہِ جاں گداز ہوا
کسو چہرے کا رنگ زرد ہوا — کسو محمل کے آگے گرد ہوا
ایک عالم میں دردمندی کی — ایک محفل میں جا پسندی کی
کہیں بیٹھے ہے جی میں ہوکر چاہ — کہیں رہتا ہے قتل تک ہمراہ
کہیں شیون ہے اہلِ ماتم کا — کہیں نوحہ ہے جانِ پُر غم کا
آرزو ہے امیدواروں کی — دردمندی جگر فگاروں کی
حسرت آلودہ آہ ہے یہ کہیں — شوق کی اِک نگاہ ہے یہ کہیں
کون محروم وصل یاں سے گیا — کہ نہ یار اس کا پھر جہاں سے گیا

اسی طرح ۲۴ شعروں میں عشق کی کیفیت بیان کرنے کے بعد اصل قصہ شروع کیا ہے۔ یہ قصہ ایک ٹریجڈی ہے اور اس طرح شروع ہوتا ہے:

ایک جا اِک جوانِ رعنا تھا — لالہ رخسار، سروِ بالا تھا
عشق رکھتا تھا اس کی چھاتی گرم — دل وہ رکھتا تھا موم سے بھی نرم
شوق تھا اس کو صورت خوش سے — اُنس رکھتا تھا وضع دلکش سے
تھا طرح دار آپ بھی لیکن — رہ نہ سکتا تھا اچھی صورت بن
دیکھتا گر کہیں وہ چشم سیاہ — دل سے بے اختیار کرتا آہ

قصے کا ہیرو خود بھی اچھے ناک نقشے کا قبول صورت نوجوان تھا لیکن عشق کی نظرِ بد اُسے کھا گئی۔

ایک دن بے کلی سے گھبرایا — سیر کرنے کو باغ میں آیا
ناگہ اک کوچے سے گذار ہوا — آفتِ تازہ سے دو چار ہوا
ایک غرفے میں ایک مہ پارا — تھی طرف اس کے گرم نظارہ
پڑ گئی اس پہ اِک نظر اُس کی — پھر نہ آئی اُسے خبر اُس کی
ہوش جاتا رہا نگاہ کے ساتھ — صبر رخصت ہوا، اک آہ کے ساتھ
جھاڑ دامن کے تئیں وہ مہ پارا — اُٹھ گئی سامنے سے یک بارا

وہ گئی، اس کے سر بلا آئی خاک میں مل گئی وہ رعنائی
طبع نے اک جنوں کیا پیدا اشک نے رنگِ خوں کیا پیدا
خلق اس کی ہوئی تماشائی پر نہ وہ دیکھنے کبھو آئی
کچھ کہا گر کسی نے شفقت سے رو دیا اُس نے ایک حسرت سے
جاکے اُس کے قریب در بیٹھا اپنے مرنے کا قصد کر بیٹھا
دل نہ سمجھا کہ اضطراب کیا شوق نے کام کو خراب کیا
جو کہ سمجھے تھے اس کو دیوانہ رحم کرتے تھے آشنا بیانہ
عاشق اس کو کسو کا جان گئے سب بُرا اس ادا سے مان گئے

غرض رفتہ رفتہ محبت کی رسوائی ہونے لگی اور ہیروئن کے عزیز و اقرباء ہیرو کی جان کے لاگو ہو گئے۔

وارث اس کے بھی بدگمان ہوئے درپئے دشمنیٔ جان ہوئے
مشورت تھی کہ مار ہی ڈالیں دفعتہً اس بلا کو یوں ٹالیں
پھر یہ ٹھہری کہ ہونگے ہم بدنام سُن کے آخر کہیں گے خاص و عام
کیا گنہ تھا کہ یہ جواں مارا کس نے مارا اسے کہاں مارا
کیجیے ایک ڈھب سے اس کو تنگ تا نہ عائد ہو اپنی جانب ننگ
تہمتِ خبط رکھیے اس کے سر کیجیے سنگ سار اس کو پھر
دے کے دیوانہ اس جواں کو قرار ہو گئے سارے درپئے آزار
ایک نے سخت کہہ کے تنگ کیا ایک نے آکے زیرِ سنگ کیا
کی اشارت کہ کودکانِ شہر آئے لبریزِ غصّہ و پُر قہر

لیکن ان سب باتوں کا میرِ قصّہ پر کوئی اثر نہیں، وہ مئے محبت سے چھکا ہوا ہے اور اپنے محبوب کی یاد میں سرشار ہے۔

گرچہ ہنگامہ اس کے سر پر تھا لیک روئے دِل اس کا اودھر تھا
محو تھا اس کے یہ خیال کے بیچ تھا گرفتار اپنے حال کے بیچ

جی میں کہتا کہ آہ مشکل ہے — اُس طرف اِک نگاہ مشکل ہے
اِن بلاؤں میں کوئی کیوں کہ جیے — جان پر آ بنی ہے تیرے لیے
جان دُوں تیرے واسطے اور تو — آنکھ اُٹھا کر ادھر نہ دیکھے کبھو
رفتہ رفتہ ہوا ہوں سودائی — دُور پہنچی ہے میری رسوائی

غرض جب حسن و عشق کا یہ افسانہ خاص و عام کی زبان تک پہنچ گیا اور ہیروئن کے گھر والے فکرمند ہوئے تو لڑکی کو ایک عزیز کے گھر بھیج دینے کی صلاح کی۔ اُسے ایک پالکی میں سوار کیا۔ حرفوں کی بنی ہوئی ایک دایا اس کے ساتھ کی اور دَریا کے پار روانہ کر دیا۔

عشقِ بے پردہ جب فسانہ ہوا — مضطرب کد خدائے خانہ ہوا
گھر میں جا بہرِ دفعِ رسوائی — بیٹھ کر مشورت یہ ٹھہرائی
یاں سے یہ غیرتِ مہِ تاباں — جا کے چندے رہے کہیں پنہاں
شب محافے میں کر کے اس کو سوار — ساتھ دی ایک دایۂ مکّار
پارِ دریا کے جلد رُخصت کی — اس طرح فکرِ رفعِ تہمت کی
گھر تھا اک آشنا کا تا بہ نگاہ — واں ہو روپوش تا یہ غیرتِ ماہ

جب وہ ماہ پارا محافے میں سوار ہو کر گھر سے چلی تو عاشق ناشاد کو بھی کسی طرح پرچہ لگ گیا اور یہ "علمِ آہ" بلند کیے ہوئے ساتھ ساتھ چلنے لگے۔

گھر سے باہر محافہ جو نکلا — اُس جواں پاس ہو کے وہ نکلا
طپشِ دل سے ہو کے یہ آگاہ — ہو لیا ساتھ اس کے بھر کر آہ
رفتہ رفتہ سخن ہوئے نالے — اُڑنے لاگے جگر کے پرکالے
اضطرابِ دلی نے زور کیا — دل نے بے اختیار شور کیا
دل کے غم کو زبان پر لایا — آفتِ تازہ جان پر لایا
کاے جفا پیشہ و تغافل کیش — یک نگہ سے زیاں نہیں کچھ بیش
منہ چھپایا ہے تُو نے اس پر بھی — نگہ التفات ادھر بھی
منزلِ وصل دور، میں کم پا — تجھ کو اس مرتبے میں استغنا

ہے تو نزدیک دل سے اسے طنّاز	لیک تجھ تک سفر ہے دُور و دراز
تو تو واں زلف کو بنایا کی	جان یاں پیچ و تاب کھایا کی

دایہ نے یہ شور فریاد و فغاں سن کر اُسے اپنے پاس بُلایا۔ وصال محبوب کا جھوٹا وعدہ کرکے دم دلاسا دیا اور عاشق کو اپنے ساتھ کشتی میں سوار کرکے روانہ ہوئی۔

گوشِ زد دایہ کے ہوئے یہ سخن	تھی وہ استادِ کارِ حیلہ وفن
پاس اس کو بُلا تسلّی کی	وعدۂ وصل سے تشفّی کی
زار نالی نہ کر شکیبا ہو	عشق کا راز تا نہ رسوا ہو
سخت دل تنگ تھی یہ غیرتِ ماہ	قطع تجھ بن نہ ہو سکی تھی راہ
بزم عشرت کریں گے باہم ساز	ہو جیو اپنی دوست کا دم ساز
دے کر اس کو فریب ساتھ لیا	دِل عاشق کو اپنے ہاتھ لیا

جب کشتی عین وسطِ دریا میں پہنچی تو دایا کو ایک ترکیب سُوجھی۔ اس نے ہیروئن کی ایک جُوتی کسی بہانے سے دریا میں پھینک دی اور عاشق کو غیرتِ عشق کا حوالہ دے کر کہا کہ اگر عاشق صادق ہے تو اپنی محبوبہ کو برہنہ پا چھوڑنا مناسب نہیں یہ جُوتی تلاش کرکے لا۔

بیچ دریا کے دایہ نے جا کر	کفش اُس گل کی اِس کو دِکھلا کر
پھینکی پانی کی سطح پر یک بار	اور بولی کہ او جگر افگار
حیف تیرے نگار کی پاپوش	مَوج دریا کی ہووے ہم آغوش
غیرتِ عشق ہے تو لا اس کو	چھوڑ مت یُوں برہنہ پا اس کو
اس طرف آب کے اترنا ہے	اُس نواحی کی سَیر کرنا ہے
پا تو اس کے جو ہیں نگار آلود	ظلم ہے ہوئیں گر غبار آلود
جس کفِ پا کو رنگِ گل ہو بار	منصفی ہے کہ خار سے ہو فگار

یہ سُنتے ہی غیرتِ عشق نے جوش مارا۔ جوان رعنا نے کشتی سے چھلانگ لگا دی اور غرق ہو گیا۔

کہتے ہیں ڈوبتے اُچھلتے ہیں	یُوں جو ڈوبے کہیں نکلتے ہیں

ڈاکٹر سید امیر حسن عابدی

میر کا سبکِ فارسی

ملک الشعرا بہار نے "سبک شناسی" جیسی اہم کتاب کو تین جلدوں میں لکھ کر فارسی ادب اور خاص کر فارسی نثر کے مطالعہ کرنے والوں کے لئے ی رہنمائی کی ہے۔ ایک لکھنے والے کو کس طرح لکھنا چاہئے اور نثر کی فطری اور مصنوعی رفتار کیا ہے اور کیا رہی ہے، یہ سب چیزیں ہمیں ایک ایرانی ادیب کی اس کتاب سے معلوم ہو جاتی ہیں۔ نیز اس کی مدد سے ہم اپنے ادب کا جائزہ لے سکتے ہیں کہ کہاں تک ہمارے فارسی نثر نگار ایرانی نقطۂ نظر سے اپنی تحریروں میں کامیاب ہوئے ہیں۔ ملک الشعرا لکھتے ہیں:

"تحریر اس لئے ہوتی ہے کہ افکار باقی رہ سکیں اور علوم و فنون نیز اس کے مقاصد کا بیان ہو سکے۔ اس بنا پر لکھنے والے کو کوشش کرنا چاہئے کہ اپنے مقاصد اور افکار کو سادے سے سادہ طریقہ سے بیان کرے تاکہ لوگ اسے آسانی سے سمجھ سکیں۔

"پس معلوم ہوا کہ تحریر کی بنیادی چیز سادگی اور روانی اور الفاظ و معانی کی آسانی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ لکھنے والے کا مقصد اپنے ذوق و ہنر کا اظہار یا سننے والوں میں تعجب اور حیرت کا پیدا کرنا ہو۔ یا وہ خاص طور سے یہ چاہتا ہو کہ لغز و معماً اور پیچیدہ اور مشکل مطالب سے پڑھنے والوں کو ایک مصیبت میں ڈالے اور نتیجہ یہ ہو کہ اس کی تحریروں سے لوگ اس کے خیال کے علاوہ کسی اور مطلب کو پیدا کریں......

"اسی وجہ سے ہر زمانہ میں اس زمانہ کی مناسبت سے تاریخی کتابیں... درباری خطوط... اور علمی کتابیں سادہ سے سادہ انداز میں لکھی گئی ہیں۔ البتہ اس عہد میں جب کہ تمام چیزیں فطرت کے خلاف ہوں اور لوگ بالکل بدل گئے ہوں اس وقت لکھنے والے بھی طبعاً فطری روکے خلاف مشکل پسندی

اور فضل فروشی کا تقلید میں جُٹ جاتے ہیں۔"[1]

بہار نے فارسی نثر کو چار دوروں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا دور چوتھی صدی ہجری کے وسط سے شروع ہو کر پانچویں صدی ہجری تک جاتا ہے جب کہ ایرانی خود مختار حکومتیں بننی شروع ہوئیں اور پہلے پہل فارسی میں کتابیں لکھی جانے لگیں۔ اس زمانہ کی فارسی نثریں سادہ، طبیعی اور اصیل ہوتی تھیں۔ دوسرا دور کلیلہ و دمنہ یعنی چھٹی صدی ہجری کے وسط سے شروع ہو کر ساتویں اور آٹھویں صدی ہجری تک جاتا ہے جس میں عربی کا اثر فارسی پر رفتہ رفتہ بڑھتا چلا جاتا ہے۔ اس زمانہ میں مرسل و سادہ اور مسجع و مقفی دونوں قسم کی نثروں کا رواج ہوا۔ لیکن اس دور میں بھی اچھی نثر تکلف و تصنع سے خالی رہی ہے اور گلستانِ سعدی اس کا بہترین نمونہ ہے۔

تیسرا دور آٹھویں صدی ہجری سے تیرہویں صدی ہجری تک چلتا رہا ہے۔ اگرچہ اس دور میں بھی سادہ نثریں لکھی گئیں مگر سجع و قافیہ اور تکلف و تصنع کا غلبہ رہا ہے اور یہ طرز ایران، ترکی اور ہندوستان سبھی جگہ پورے زور و شور سے رائج ہوا اور بقول بہار کے یہ دور نثر فارسی کی خرابی کا عہد ہے۔ اس خرابی کو کچھ بہار ہی کے الفاظ میں پڑھنے سے لطف آتا ہے:

"این بود حالت نثر در ایران و بعینہ ہمیں بود حالت نثر در ہندوستان جز اینکہ فضلاء و علمائے ہندی در اظہارِ فضیلت زیادتر از منشیان و نویسندگان ایرانی می کوشیدہ اند۔ در مناشید و مکاتیبی کہ رجال ہند بہ رجال ایران نوشتہ اند و در سفینہ ہا یافت می شود معلوم است کہ نویسندۂ مقیم ہند بیشتر می خواہد اظہار فضل کند و کمتر مطالب بیان کردنی دارد، یا اگر دارد بجای اینکہ حرف خود را بنویسد از در و دیوار صحبت داشتہ و کلماتی مناسب فضل فروشی خود بدست آوردہ است نہ مناسب مطلبی کہ باید بنویسد۔"[2]

اس دور کے بعد چوتھے دور میں ایرانی بیدار ہو کر سنبھلنے لگے اور انھوں نے نثر کو اسی طبیعی اور فطری راستہ پر چلانا شروع کیا۔ لیکن ہندوستان میں اس کی نوبت نہ آئی اس لئے کہ اب یہاں فارسی کا رواج ہی ختم ہونے لگا۔

---

[1] سبک شناسی (تہران، چاپخانۂ خودکار) ج ۱، ص ۲۸ - ۲۳۔ [2] سبک شناسی ج ۳، ص ۲۶۰۔

پس ظاہر ہے کہ میر اس زمانہ کی پیداوار ہیں جب ہندوستان میں فارسی نثر بالکل خراب ہو چلی تھی اور لوگ انشاپردازی میں مبالغہ سے کام لے کر اس کو معمّا اور دوراز فہم بناتے چلے جا رہے تھے۔ لیکن جس طرح ہر دور میں اس عہد کی مناسبت سے اچھے نثر نگار رہے ہیں جنھوں نے باوجود زمانہ کی بگڑی ہوئی روش کے بڑی حد تک اچھی اور صحیح قدروں کو اپنایا ہے۔ میر بھی انھیں لوگوں میں ہیں جو زمانہ کی رو میں آنکھ بند کرکے بہنے والے نہ تھے اور جنھوں نے صحیح قدروں اور توازن و تناسب کو حتی الامکان باقی رکھنے کی کوشش کی ہے۔ اور ان کی نثریں اس کا کافی حد تک ثبوت ہیں۔ وہ چھوٹے چھوٹے جملوں اور ٹکڑوں میں آئے ہر قسم کے مطلب کو بیان کرتے ہیں اور طویل اور الجھی ہوئی عبارت کے قائل نہیں ہیں۔

"فیض میر" کے مقدمہ میں پروفیسر مسعود حسین رضوی صاحب فرماتے ہیں:

"میر کو فارسی زبان پر عبور تھا اور فارسی نثر لکھنے کی جو قدرت تھی وہ ان لوگوں سے پوشیدہ نہیں ہے جنھوں نے "ذکر میر" اور ان کا تذکرہ "نکات الشعرا" دیکھا ہے۔ میر کے ہمعصر بھی ان کی نثر نگاری کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ میر حسین نے ان کی نظم کے ساتھ ان کی نثر کی بھی تعریف کی ہے۔۔۔

میر بالعموم مقفٰی عبارت لکھتے ہیں۔ لیکن قافیہ کے التزام سے عبارت کی شگفتگی، بے ساختگی اور روانی میں فرق نہیں آتا۔ شاید کہیں کہیں تصنع آگیا ہو۔ لیکن زیادہ تر عبارت کا حسن بڑھ جاتا ہے"[1]

اس میں شک نہیں کہ میر نے قافیہ و سجع کے التزام کا کافی خیال رکھا ہے اور اس میں بھی کوئی شبہہ کی گنجائش نہیں ہے کہ ہر صنعت کے استعمال سے کلام میں تصنّع پیدا ہو جاتا ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ میر کا یہ التزام پڑھنے والے کو گراں معلوم نہیں ہوتا۔ نیز اس سے کلام کی روانی اور سآمد میں بہت زیادہ فرق نہیں آتا۔ یہاں مثال کے طور پر بعض مقفٰی و مسجع جملے نقل کیے جاتے ہیں:

" وقتے کہ آں جوان گل رخسار و آں سرو ندر در رفتار آگاہ شد کہ درویش دل آگاہ شد عروس را بخانہ آورد و آنجا آب ہم نخورد، یعنی ہماں دم اشک ریزاں، افتاں و خیزاں سر بصحرا نہاد و قدم در تلاش او کشاد۔ ہر کرا در راہ می دید، احوال

---

[1] فیض میر، ص ۱۱ (نظامی پریس لکھنو)

درویش می پرسید"[1]

"چوں گردباد وحشت آمادہ ام، اگر از طاق دلت افتادہ ام۔ ہر چند از کم پائی خود در آزار م، امّا ہنوز۔ سر تو قع بی خارم۔ گرد بشتم آوارۂ داغم، دریکجا ام سنگدانم۔ رخسارم کہ برگل تر نوا خوانی کردی، از تاب آفتاب تفسیدہ، چشمم کہ برغزال سیاہی زدی۔ فریب بہ سفیدی رسیدہ۔ تو آفتابی دمن سایۂ افتادہ، تو سوار دولتی دمن پا پیادہ از ہر غبار۔ کہ بلند نشود منظر تو باشم، چوں بچشم تر آنی ناچار از نالہ گلوی خراشم۔ تو تمام اجزائی یعنی کاملی۔ از حال غافلان چرا غافلی"[2]

"شکرانۂ ایں نعمت رواندا ختگاں رانبواز یعنی رد از سنگ وآہن مدار وروی ایشان برخاک مینداز۔ از خدا اردار دبر خود مبیں، درکار غربا روی کسے مبین۔ زنہار کہ از بیکسان روبتابی، مبادا کہ در عرصات رونیابی"[3]

میر کی نثر میں ایک خاص چیز جو قابل ذکر ہے وہ غیر معمولی الفاظ و محاورات کا استعمال ہے۔ پروفیسر مسعود حسین صاحب فرماتے ہیں:

"میر کے قبضہ میں فارسی لفظوں اور محاوروں کا بہت بڑا ذخیرہ ہے۔ اور ان کے استعمال پر ان کو جو غیر معمولی قدرت حاصل ہے اس کے ثبوت میں کوئی مثال پیش کرنا ضروری نہیں معلوم ہوتا ہے۔ کتاب کا ہر صفحہ اس پر شہادت دے رہا ہے"[4]

لیکن میرے خیال میں صرف یہ کہنا کہ کسی نثر نگار کو الفاظ و محاورات پر پوری قدرت ہے، کافی نہیں ہے۔ اور نہ اس سے نثر کی خوبی معلوم ہو سکتی ہے۔ ظہوری کو الفاظ اور زبان پر پوری قدرت حاصل تھی مگر اس سے "سہ نثر" کو بلند نثروں میں شمار نہیں کیا جا سکتا۔ "وصاف حضرت" کو عربی و فارسی دونوں زبانوں پر پورا عبور تھا۔ مگر اس سے "تاریخ وصاف" کی نثر کو بہت اچھی نثر نہیں کہا جا سکتا۔ میر کو الفاظ و محاورات پر جتنی قدرت حاصل تھی لیکن ان کا بکثرت استعمال عبارت کو بغیر ضرورت کے مشکل بنا دیتا ہے اور اس سے تحریر کی روانی اور سلاست میں کسی قدر فرق آجاتا ہے۔ نیز اس قسم کے تصرف کو آورد سے

---

[1] ذکر میر، ص ۱۴ (انجمن اردو پریس، اورنگ آباد) [2] ذکر میر، ص ۱۵-۱۶۔ [3] ایضاً ص ۳۲-۳۳
[4] فیض میر، ص ۱۵۔

خالی نہیں کہا جا سکتا۔ بہت سے ایسے الفاظ اور محاورے بھی ہوں گے جن کے سمجھنے سے شاید ایرانی بھی قاصر ہوں گے، نیز بہت سے محاورے شاید ہندہی میں بنے ہوں گے۔

میر کو کیا معلوم تھا کہ کچھ دنوں میں فارسی جاننے والوں کا اتنا قحط ہو جائے گا کہ ان کی تحریروں کو ترجمہ کرنے کی ضرورت پڑے گی۔ بہرحال نثار احمد فاروقی صاحب نے "ذکرِ میر" کا "میر کی آپ بیتی" کے نام سے ترجمہ کر کے بہت بڑی علمی خدمت کی ہے۔ ترجمہ کرتے وقت ان کو جو دقتیں پیش آئی ہوں گی ان کا ذکر وہ ان الفاظ میں کرتے ہیں:۔

"مولوی عبدالحق نے میر کی فارسی کی تعریف کی ہے اور ان کی نثر کو سادہ و شیریں بتایا ہے۔ یہ ایک حد تک صحیح ہے۔ لیکن اس میں کچھ شک نہیں کہ اس کا ابتدائی حصّہ میر نے خاصی محنت سے لکھا ہے اور اس دور کے "مرزایانِ ایران" کی تقلید کے شوق میں عبارت کو اتنا ادق بنا دیا ہے کہ بعض الفاظ کی تشریح خود انھیں حاشئے پر لکھنے کی ضرورت محسوس ہوئی . . . . ذکرِ میر کے الفاظ اور محاورے "چراغ ہدایت" کے سوا کسی دوسری لغت میں مشکل ہی سے ملتے ہیں۔"[1]

ذکرِ میر میں اگر آب گردش، بیدار، بسیار دوختن، چشم چراندن، سگ روی یخ، سرکن، سر شمع بی دہل رقص، نان جواں، رواز سنگ و آہن نداشتن، نازہائی ہرمزی ، ازسروا کردن، اہل بجیۂ احسان بہشت، کلک حسب، شیشہ بند کردن، معتبر، کباب سنگ، بابتی، تہ پا، پای چراغ ، بال دگر پال، فردتی، بالاچاتی، سرگاوی زدن، جیسے الفاظ و محاورات کی کثرت نہ ہوتی تو میر کی نثر اور بھی شگفتہ اور رواں ہوتی۔ ایک جگہ تو "دست" کے پیچھے پڑ گئے تو اس کو ہر طرح سے استعمال کرنے کی کوشش کی ہے:۔

"دست دست ظالمان بود، دست کجی میکردند، دست پلشتی می مرنمودند، دست چرب بر سری کشیدند، دست بازوی زنان میرسیدند، تیغہای آختند دستگاہ می ساختند از دست شہریان ہیچ نمی آمد، زیرا کہ دست و دل ایشاں سرد شدہ بود، کسی دست دست پاچہ می شد و کسی دست بزیر سرستون می نمود، بر ہر درے درون سیاہے۔"[2]

---

[1] میر کی آپ بیتی، ص ۲۲ (مکتبہ برہان دہلی)۔ [2] ذکرِ میر، ص ۸۷۔

اس قسم کی دقیق اور مصنوع عبارتوں کے علاوہ میر کی نثر میں بخوبی ایسے حصے بھی ملتے ہیں جو بے حد صاف سادہ اور رواں ہیں اور انھیں سہل ممتنع کہا جاسکتا ہے۔ مثلاً لکھتے ہیں:

"شبی گجگفتۂ او پیش پسر ایشان رفتم، دربانی ممانعت کرد و گفت دیدن ایشان این وقت امکان ندارد۔ ناچار برگشته آمدم۔ دیگر بعد از نماز عشا باز رفتم، دیدم که بی دربان است پرسیدم که "دربان کجا رفت؟ گفتند" امروز درد سرش شدتی گرفته بود که نمی توانست نشست"[1]

"این جا چنان مسموع شد که بشهر شهرت گرفت که صمد خاں فوجدار سرہند با چند زمیندار و فوج بسیاری آید، و ارادۂ لشکر شاہ دارد۔ بھاؤ سردار دکن که جوان برخود چیده بود کسی را پیش خود نمی گذاشت، اسباب زاید در قلعه شاه جهان آباد گذاشته بمقتضای حرارت ذاتی قصد حرکت آں طرف نمود"[2]

میر ایک زبردست فن کار اور مصور تھے، وہ الفاظ کی مدد سے کسی منظر یا کیفیت کی تصویر کشی کر دیتے تھے۔ اگر کسی جوان کی تصویر کشی کرتے ہیں لکھتے ہیں:

"جوانی دیدم، شیر اندام خورشید دار، ہیبت حق از چہرۂ او نمودار، چادر سردی بر سر آفتابی در کمر، چشم سرخش"[3]

اگر درویشوں اور فقیروں کی کیفیت بیان کرنا چاہتے ہیں تو یوں کہتے ہیں:

"بحر ند، نمی جوشند، سیل اند و نمی خروشند؛ خاک شو یان سر کوچۂ محبت اند، پویان بیابان وحشت، بندگان با خدا واصل، دور گردان نزدیک بدل، دل دادگان جلوۂ یار، خاک افتادگان سایۂ دیوار، آشنایان بحر حقیقت، مجردان بادیۂ طریقت"[4]

اگر اپنے جنون کے بعد صحت کا بیان کرنا چاہتے ہیں تو اس طرح لکھتے ہیں:

"پیر نجومان افسون دمیدند، طبیبان خون کشیدند۔ تدبیر اطباسود مند افتاد، پائیز آمد و بہار ریخت، سلسلۂ جنون از ہم گسیخت۔ نقشے که وہم بسته بود، از صفحۂ خاطر محو شد،

---

[1] ذکر میر ص ۶۹۔ [2] ذکر میر ص ۹۳۔

[3] ذکر میر ص ۲۵ [4] ذکر میر ص ۲۷

درسی کہ از جنون خواندہ بودم فراموش گشت۔ لب با سکوت مالوف شد، پریشان گوئی موقوف شد۔"[1]

اور جب درّانیوں کے ہاتھوں دہلی شہر کی تباہی کی کیفیت بیان کرنا چاہتے تو اس طرح نظروں کے سامنے نقشہ کھینچ دیتے ہیں۔

"صبح کہ صبح قیامت بود تمام فوج شاہی و روہیلہ ہا تاختند و بہ قتل و غارت پرداختند، درہا شکستند، مردمان را بستند، اکثرے را سوختند و سر بریدند، عالمی را بخاک و خون کشیدند، تا سہ شب و روز دست ستم برنداشتند، از خوردنی و پوشیدنی ہیچ نگذاشتند، سقفہا شکافتند، دیوارہا شکستند، جگرہا سوختند، سینہ ہا خستند۔"[2]

اگر کسی حسینہ کا ذکر کرتے ہیں تو انتہائی ایجاز کے باوجود حسن و عشق کی ایک دنیا کو بیان کر جاتے ہیں:

"در آں زمان جمیلہ چہرۂ رنگ، شوخ و شنگ، از قبیلہ چیت سازان، سبو چہ گل بر دوش، آفت عقل و ہوش، با چہرہ آراستہ، چوں سرو نوخاستہ، بہ بہانہ آب صبح و شام ہمراہ از دہام بر لب دریا می آمد خوبی خود می نمود۔ عالمی دیوانہ او شدہ بود، بر سر زبان حرف زنان۔ پشت چشم نازک کنان، با فقیر چہرہ شد۔ گفت کہ ای رہزن دین و دل ایں ہمہ خود را گم کردن۔ بر دُرام رام میگفتہ باش۔ بمجرد شنیدن لباس درید۔ خاک لب آب بر رو مالید۔ موی سر پیچیدن گرفت رام گویاں دوید ن گرفت۔ آخر دل ہمگی خون شد، و مردہ کار جنون شد۔ چند روز ہیچ نخورد بر ہماں حال جان سپرد۔"[3]

اور جب دہلی آ کر سعید خاں جیسے کامل انسان سے ملتے ہیں تو اس مجسمہ شرافت و اخلاق کو اس طرح پیش کرتے ہیں:

"او مردی بود کامل۔ ہمہ تن دست و دل۔ بالا بلند۔ وقت پسند۔ گرم جوش۔ سراپا ہوش۔ چسپیان اختلاط۔ خوش ارتباط۔ وضع مربوط۔ حال مضبوط۔ دل با یار۔ دست در کار۔ قائم اللیل صائم النہار۔ دست از دہش باز نداشتی۔ مدار بر توکّل گذاشتی۔ سیر چشم تمام حیا۔ گرسنہ دل نام خدا۔ ہر جا خستہ جانی می دید۔ سر زخمش می مالید۔ گوش بر صدائے گدا بودے۔ گوشدار عاجزاں نمودے۔"[4]

---

[1] ذکر میر ص ۶۵۔ [2] ایضاً ص ۸۵۔ [3] فیض میر، ص ۱۱-۱۲۔ [4] ایضاً ص ۲۱-۲۲۔

میر اصلاً شاعر ہیں اور ان کی نثر میں بھی شعر کا لطف آتا ہے۔ فارسی شعرا کا کلام ان کے دل و دماغ میں اس طرح گھر کر گیا تھا کہ وہ موقع موقع سے اسے صرف کرتے رہتے ہیں۔ فارسی کا مشہور شعر ہے:

بہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش
من انداز قدت را می شناسم

اس کو میر نے فارسی نثر میں یوں لکھا ہے:۔

"اے یار عزیز ان معشوق یکتا پیرہن بہر رنگی کہ میخواہد جامہ می پوشد، گاہے گل است و گاہے رنگ۔ جائے لعل است و جائے سنگ۔ بعض از گل دل خوش می سازند۔ بعضے بارنگ عشق میبازند۔ جمعی لعل را عنبر بدانند، جماعتے سنگ را غدا می خوانند۔ ہشیار کہ ایں مقام منزلۃ الاقدام است، چنینے باید کہ بر غیر رد انشود، ولے تا باید کہ از حال خود بر رود" دشمن و دوست ہمساز اوست کہ دلہا در تصرف اوست، ہدایت و ضلالت ہر دو مظہر اوئیند"[1]

---

[1] ذکر میر ص ۳۰۔۳۱۔

محمود حسن قیصر امروہوی

میر بحیثیت فارسی شاعر

غالباً اہلِ ادب پر اب یہ حقیقت مخفی نہیں ہے کہ میر تقی میرؔ جس طرح اُردو زبان کے ایک بلند پایہ شاعر ہیں، اسی طرح فارسی نظم میں بھی وہ بجا طور پر استاد کہلائے جانے کے مستحق ہیں؛ ان کی شاعری کا یہ پہلو اتنا اہم ہے کہ بغیر اس کے میرؔ کی عظمت کا صحیح اندازہ نہیں ہو سکتا۔ یہ ضرور ہے کہ عرفیؔ و نظیریؔ اور صائبؔ وغیرہ جیسے اساتذۂ فارسی کے پہلو میں ان کو جگہ نہیں دی جا سکتی، لیکن ان کو چھوڑ کر ریختہ گو شعرا میں وہ اس حیثیت سے بھی میرؔ نظر آتے ہیں۔

افسوس ہے کہ ان کی شاعری کا یہ پہلو اب تک بالکل تشنہ رہا، جس کی وجہ یا تو ہمارے اہلِ قلم کی قناعت پسندی ہو، یا میرؔ کے فارسی کلام کی نایابی یا دونوں وجہیں کارفرما ہی ہوں۔

غالباً اس سلسلہ میں سب سے پہلا مضمون عزیزؔ لکھنوی کا ہے جو بہ عنوان "میرؔ کا فارسی کلام" نیرنگ میر نمبر مورخہ ۱۹۲۸ء میں شائع ہوا تھا، اس کے بعد دوسرا مضمون ابو اللیث صدیقی صاحب کا ہے، جو ماہنامہ معارف اعظم گڑھ مورخہ جون ۱۹۴۳ء میں شائع ہو کر اہلِ ادب کے سامنے آیا، اس مقالہ کی تمہید میں فاضل مؤلف نے لکھا ہے:

"عرصہ ہوا، ان کے فارسی کلام کے متعلق کسی صاحب کا مضمون کسی رسالہ میں نظر سے گذرا تھا، لیکن خود کلام نظر سے نہیں گذرا تھا، ابھی کچھ دنوں سے

مولانا کیفی صاحب چڑیاکوٹی، مسلم یونیورسٹی میں قلمی کتابوں کی ایک توضیحی فہرست تیار کرنے پر مقرر ہوئے ہیں، مولوی سجان اللہ صاحب مرحوم کے عطا کردہ کتب خانہ میں کیفی صاحب کی ایک قلمی بیاض ملی جس کے متعلق پرانی فہرست میں صرف بیاض اشعار قلمی تحریر تھا، غور کرنے سے معلوم ہوا کہ یہ میر تقی میر کا فارسی کلام ہے، چنانچہ پہلے ورق پر جس کی نصف سطر جلد بندی میں کٹ گئی ہے، یہ عبارت صاف پڑھنے میں آتی ہے۔

"دیوانِ نظم فارسی کہ میر تقی میر گفتہ اند"

(معارف جون ۱۹۴۳ء)

یہ مضمون اگرچہ مفید اور اہم ہے لیکن اس میں میر کے صرف وہی فارسی اشعار نقل کیے گئے ہیں جن میں انہوں نے اپنے اُردو اشعار کے بعض مضامین کو نظم کیا ہے۔ چنانچہ مؤلف نے میر کے فارسی اشعار کی صرف اسی حیثیت پر روشنی ڈالی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس سے میر کی فارسی شاعری کا کوئی اہم پہلو سامنے نہیں آتا۔

ڈاکٹر خواجہ احمد صاحب فاروقی نے اپنی کتاب "میر تقی میر" میں "میر کا فارسی کلام" کے عنوان کے تحت میر کے فارسی دیوان کے تین قلمی نسخوں کا ذکر کیا ہے۔ چنانچہ موصوف لکھتے ہیں:

"آسی نے ایک مکمل دیوانِ قلمی کا ذکر کیا ہے، پروفیسر مسعود حسن رضوی کے کتب خانہ میں بھی ایک نسخہ فارسی دیوان کا موجود ہے، جو آسی کے بیان کے مطابق دو سو صفحات پر مشتمل ہے، کتب خانہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے سجان اللہ سکیشن میں ایک پرانی قلمی بیاض ہے، جس میں ۲۹۰۰ اشعار ہیں۔ اس میں یہ عبارت درج ہے:

"دیوان نظم فارسی کہ میر تقی میر نوشتہ اند"

عزیز لکھنوی مرحوم نے اس نسخے سے استفادہ کیا تھا اور ایک دلچسپ مضمون بعنوان "میر کا فارسی کلام" نیرنگ میر نمبر (۱۹۲۸ء) میں شائع کیا تھا۔ یہ نسخہ اصل میں عزیز مرحوم کو حاصل ہوا تھا جو انہوں نے مولوی سجان اللہ گورکھپوری کو دے

دیا تھا" (میر تقی میر صفحہ ۴)

اس تمہید کے بعد ڈاکٹر صاحب موصوف نے میر کے کچھ فارسی اشعار بھی نقل کئے ہیں مگر ان کی تعداد "میر تقی میر" جیسی ضخیم کتاب کے لحاظ سے بہت کم ہے، اس پر بھی زیادہ وہی اشعار ہیں جن میں میر نے اپنے اُردو اشعار کے مضامین کو فارسی نظم کا جامہ پہنایا ہے اور جو اس سے پہلے ابواللیث صاحب کے مضمون میں بھی نقل ہو چکے ہیں۔ ظاہر ہے کہ میر کی فارسی شاعری کی یہ حیثیت کسی طرح بھی اتنی اہم نہیں ہے جس کو بار بار دُہرایا جائے۔

رضا لائبریری رام پور میں میر تقی میر کی کلیات کا ایک نہایت نادر نسخہ ہے جو ان کے چھ اُردو دواوین، ایک دیوانِ فارسی نیز نسخۂ فیض میر و ذکرِ میر پر مشتمل ہے۔ اس میں فارسی دیوان ورق د ۷۰ ب سے شروع ہو کر ورق ۷۶ الف پر ختم ہوتا ہے، اس میں غزلیات کی کل تعداد ۵۴ ہے اور کل اشعار جن میں مثنویات و قطعات وغیرہ بھی شامل ہیں ۲۷۴ ہیں۔

پورا کلیات ۸۲۳ اوراق پر مشتمل ہے، خاتمہ کی عبارت حسبِ ذیل ہے:

"الحمد للہ کہ بفضلِ ایزد مستعان و عنایات ائمہ علیہم الصلوٰۃ السلام کہ کلیات میر تقی صاحب غفر اللہ ذنوبہ بتاریخ سلخ شہر رمضان المبارک سنہ یک ہزار دو صد و چہل و شش ہجری بروز دوشنبہ یک پاس روز باقی ماندہ از خطِ بد ربطِ احقر العباد شیخ لطف علی حیدری بپاسِ خاطر و فرمایش مرزا قنبر علی صاحب زاد اشفاقہ صورتِ اختتام پذیرفت"

میر کی فارسی شاعری پر ایک نظر

اس میں شک نہیں کہ میر اصلاً اُردو کے شاعر ہیں اور اسی حیثیت سے وہ اب تک اہلِ ادب کے سامنے آتے رہے ہیں، بایں ہمہ فارسی میں بھی انہوں نے جو کچھ کہا ہے، اس کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، شیخ مصحفی جو اُردو شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ فارسی میں بھی اُستاد کی حیثیت رکھتے ہیں، میر کی فارسی شاعری کے بارے میں لکھتے ہیں:

"دعویٰ شعرِ فارسی ندارد، مگر فارسیش ہم کم از ریختہ نیست۔ می گفت کہ سالے ریختہ موقوف کردہ بودم دراں حال دو ہزار شعر گفتہ تدوین کردم" (عقدِ ثریا)

سراج الدین علی خاں آرزو مجمع النفائس میں لکھتے ہیں:

"در اوّل مشق اشعارِ ریختہ کہ بزبانِ اُردو شعریست بطرزِ شعرِ فارسی توغل بسیار نمودہ چنانچہ شہرۂ آفاق است و بعد آں بگفتنِ اشعارِ فارسی بطرزِ خاص گردیدہ قبولِ خاطرِ اربابِ سخن و دانایانِ این فن گشت طبعش بمضامینِ تازہ و غیرِ مبتذل معنی پرداز است و اشعار او بلطافت ادا و انداز لبسکہ ذہنِ مناسب و طبع ثاقب یافتہ در ابتدا سے عشقِ شعر رتبہ سخن را بپایۂ انتہا رسانیدہ"

(مجمع النفائس قلمی کتاب خانہ رام پور۔ ورق ۴۳ الف)

مذکورہ بالا دونوں استادوں کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ میر کی شاعری کی ابتدا اُردو سے ہوئی لیکن ان کے زمانہ تک اہلِ قلم کی زبان چونکہ فارسی تھی اور ہر ریختہ گو شاعر فارسی میں کچھ نہ کچھ طبع آزمائی کرتا تھا، اس لئے میر کے لئے بھی یہ ناممکن تھا کہ وہ اس میدان میں کسی سے پیچھے رہتے، چنانچہ یہی جذبہ ان کی فارسی شاعری کا محرک ہے۔

بہر حال میر کے فارسی کلام کا بالاستیعاب مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اُردو کی طرح فارسی میں بھی انہوں نے قریب قریب ہر صنفِ شعر کو لیا ہے اور ہر قسم کے مضامین کو نظم کیا ہے بلکہ اکثر مقامات پر فارسی میں انہوں نے جو بلند مضامین نظم کئے ہیں ان کی مثال ان کی اُردو شاعری میں کمی کے ساتھ ملتی ہے۔ ملاحظہ ہوں ذیل کے اشعار:

این نہ پنداری کہ مردن موجبِ آسودن است مرگ ہم یک منزل است از راہِ بے پایانِ ما

نشمری سہل ز غیب این بشہود آمدہ را رہ بسے طے شدہ باشد بوجود آمدہ را
گرچہ موجود نگشتیم و لے سہل مگیر این غلط کاری وہم بنمود آمدہ را
اشک گرمم ہمہ درد است خدا را دریاب از رہِ دور دل این قاصدِ زود آمدہ را

بے پردہ اَشش بجلوہ تماشا نکردہ ایم تا این ظہور حسن بغایت حجاب داشت

وعدۂ دورِ قیامت ہم پئے تکمیلِ ماست　　ذوق تا حاصل نگردد لذتِ دیدا نیست

بے ثباتیِ دنیا کا مضمون اردو کی طرح فارسی میں بھی انہوں نے جگہ جگہ نظم کیا ہے۔

میرؔ دنیا رہگذارے بیش نیست　　آسماں گرد و غبارے بیش نیست

بستۂ وہم است نقشِ زندگی　　ورنہ ہستی اعتبارے بیش نیست

بندگی کے لئے کسی مخصوص سمت اور جہت کی ضرورت ہے " اینما کنتم فثم وجہ اللہ " میرؔ نے اس مضمون کو کس قدر شاعرانہ پیرایہ میں نظم کیا ہے۔

بندگی کیشم نیم زنہار در بندِ جہت　　رو بہر جانب کہ می آرم سجودے می کنم

عقل اور عشق دونوں متضاد ہیں۔

صحبتِ شیخ و منِ رند چساں درگیرد　　عشق راہِ دگر و عقل طریقِ دگر است

اوپر کی چند مثالوں سے معلوم ہوا کہ میرؔ کی فارسی شاعری کا اگر بغور مطالعہ کیا جائے تو اس میں بہت سے وہ موتی بھی مل جائیں گے، جن سے ان کی اُردو شاعری کا دامن خالی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ خیالات و معانی کو کسی خاص زبان اور انداز میں محدود نہیں سمجھا جا سکتا۔ اس لئے کسی بھی شاعر کی صحیح عظمت کا اندازہ اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک ہر پہلو سے اس پر نظر نہ ڈالی جائے۔ ذیل میں میرؔ کے فارسی اشعار کا ایک سرسری اور مختصر انتخاب ہدیۂ ناظرین کرتا ہوں جن سے ان کے عام رنگ کا اندازہ ہو جائیگا۔ افسوس ہے کہ وقت کی کمی کی وجہ سے میں میرؔ کے فارسی اشعار کا گہرا مطالعہ نہ کر سکا ورنہ اس سے زیادہ کچھ پیش کر سکتا۔

یک رہ تو ہم بپرس از ولے نسیم صبح　　من خود نیافتم سببِ داغِ لالہ را

من نمی گفتم فریبِ اختلاطِ او مخور　　دیدی آخر میرؔ طورِ آں وفا بیگانہ را

ببیں کہ موسمِ گل شد سببِ خزانِ مرا　　بہار آمد و آتش زد آستانِ مرا

بجمعِ ماتمیاں حرفِ من اثر دارد — بہ بزمِ عیش نفہمد کسے زبانِ مرا
زضعف میر بچشمِ کسے نمی آیم — لطافتے است چو جاں جسمِ ناتوانِ مرا

بحقِ دیدۂ نمناک ساغرِ مئے ناب — بہ بخش بارِ خدایا شرابخواراں را
زباز پرسِ قیامت چہ غم کہ بس باشد — وسیلۂ سرِ زلفش سیاہ کاراں را

ہمچو میر آزردہ جانے دیر پیدا می شود — مغتنم دانید روزے چند ایں درویش را

دامن بمیاں برزدہ چوں شمعِ سحر باش — کیں بزمِ دل افروزِ جہاں گذراں است

غافل مشو زرفتنِ کیں طاقِ چرخِ نیلی — از گردِ راہِ یاراں برخاستہ غبار است

وقتِ آنکس خوش کہ گلزارِ جہاں را دید و رفت — ہمچو گل بر بے ثباتی ہائے خود خندید و رفت

گریہ موجب صفائے قلب ہے، یہ مضمون میر نے کس قدر انوکھے انداز میں نظم کیا ہے۔ تشبیہ کی ندرت خاص طور سے قابلِ ملاحظہ ہے۔

سینہ صافیہائے من از گریۂ دیرینہ است — سیل ہا جاروب کش بودہ است ایں ویرانہ را

لاغری اور نقاہت کا مضمون طرح طرح سے شعراء نے نظم کیا ہے میر کی نازک خیالی بھی ملاحظہ ہو۔

زضعف میر بچشمِ کسے نمی آیم — لطافتے است چو جانِ جسمِ ناتوانِ مرا

وحشت کا مضمون کس قدر ندرت کے ساتھ میر نے نظم کیا ہے۔

عرصۂ گیتی اگر وحشت کنم بسیار نیست — دامنِ صحرا بایں وسعت گریباں وار نیست

اس شعر میں "گریباں وار" کی ترکیب نے بلاغت کا حق ادا کر دیا ہے۔

ابرو کی تشبیہ شمشیر سے ایک پامال مضمون ہے جس میں کسی تنوع کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ میر نے جس طرح اس کو نظم کیا ہے، حق ادا کر دیا ہے۔ ملاحظہ ہو:

در نقشۂ ابروے تو بس دیر کشیدہ نقاش بتنگ آمد و شمشیر کشیدہ

انسان کو چاہیے کہ زمانہ اس کو کتنا ہی نیچا گرا دے لیکن ہر حال میں وہ اپنا حوصلہ بلند رکھے اس مضمون کو میر نے اس طرح نظم کیا ہے:

بہر لباس کہ باشی بلند ہمت باش گرت بخاک بپوشند قصد گردوں کن

اپنی گراں قدری کو ایک جگہ اس طرح نظم کیا ہے:-

باایں قد خمیدہ بلاے زمانہ ام امروز در جہاں نہ کند کس کمان من
دل کہ در سینہ می طپید مرا ایں زماں از مژہ چکید مرا
آنکہ شب دید آتشم بہ فلک صبح در رنگ خاک دید مرا
دست ہر دم بہ تیغ بُردن او میر در خاک و خوں کشید مرا

جور و جفاست کار تو من زسادگی موقوف رحم داشتہ ام کار خویش را
سوداے ماست میر بعیار پیشۂ کو بارہا فروخت خریدار خویش را

ما تازہ واردان جہان کہن نئیم پُر دیدہ ایم گردش لیل و نہار را

شد ز پہلو دل یگانۂ ما بے سبب نیست درد شانۂ ما
گوئیا سرگذشت مجنوں است می چکد درد از فسانۂ ما

نالۂ بلبلانِ تیز آہنگ — می دہد یاد از ترانۂ ما
حیف در شورہ زارِ عالم میر — سبز ناگشتہ سوختہ دانۂ ما

چہ می پرسی کہ حالم گفتنی نیست — تو ہم مکشا سرِ ایں داستاں را

انداز دیدن او درخوں کشید مارا — از چشمِ یار آخر چشمے رسید مارا

ہر صید کہ ہست صید دامت بادا — ور طائر سدرہ است رامت بادا
ساقی مے خرّمی بجامت بادا — گردیدنِ آسمان بکامت بادا
باروے تو گر صبح مقابل گردد — خورشید گرفتار بشامت بادا

حیف باشد جبہ سائی گر نیفتد اتفاق — کز ہجومِ سجدہ ہا آں آستاں معلوم نیست
میرود زیں خاکداں خلقے نمی آید بچشم — گرد بسیار است در رہ کارواں معلوم نیست
تا چہ پیش آمد ندانم میر را در راہِ عشق — روزگارے شد کہ حال آں جواں معلوم نیست

دعویٰ مہرِ تو شائستۂ صاحب جگر است — عشق کفر است اگر صرفۂ جاں درنظر است
وقت فرصت خنک آں کس کہ نگہ می دارد — آہ ازیں عمر کہ چوں آب رواں درگزر است

از خرامش بہار می ریزد — رفتنِ یار بسکہ رنگین است
قامتش را بخلق بنمودم — کافتِ روزگارِ من این است
گاہ در مسجد است و گہ در دیر — میر را تا چہ دین و آئین است

عشق از روزنے کہ ایں دیوانہ را برکار بست — کوہ کن از کوہ و مجنوں از بیاباں بار بست

روزگارے شد کہ از دینِ قدیم خویشتن — میرؔ در عشقِ بتاں برگشتہ و زنار بست

چو گلبن پائے تا سر داغ گشتم — ز باغش ایں چنیں گلہا کہ چیداست

قطرۂ اشک ز سوز جگرم اخگر بود — از مژہِ دوش بیفتاد و گریبانم سوخت

کم کم مژہ برہم زدنش تازہ جفائے است — وز دیدہ نگہ کردن او طرفہ بلائیست

بوسیدن دہانِ تو دل در خیال داشت — ایں سادہ لوح خواہشِ امرِ محال داشت

تا بگوشت چہ سخن گفت نسیم اے گل تر — بر سحر گہ لب خنداں تو بے چیزے نیست
میرؔ از طورِ تو پیداست کہ سودا داری — ایں ہمہ حرف پریشان تو بے چیزے نیست

ز داغِ گل بسینہ من دستہ دستہ است — وز اشک لالہ گوں مژہ ام غنچہ بستہ است
ہا نیامدہ است بہ شور از نو عندلیب — گل ہم بروزگار تو در خوں نشستہ است

بوالہوس را بہ بزمِ ما جا نیست — عاشقی ہا ست ایں تماشا نیست
آہ ازیں خود نمائی پنہاں — ہمہ جائی و ہیچ پیدا نیست
ما رضامند تا بہ مرگ خودیم — کو ہنی در محبت ما نیست

نالہ دل خراش میرؔ آخر — خواب از چشم دوستاں برداشت

دل برائے تو جستجوئے داشت — جامہ خوں بود و آرزوئے داشت

طرز گفتار میر را دیدم ‌ ‌ ‌ ‌ بے دماغانہ گفتگوے داشت

مرغانِ سحر در چمن از حیرت خفتند ‌ ‌ ‌ ‌ چوں طائر تصویر پریدن نتوانند

ایں بے‌کسی نگر کہ کسے چشم تر نہ کرد ‌ ‌ ‌ ‌ یک ابر ہم بخاک غریباں گذر نہ کرد

راہے نتواں برد بسر کوچہ زلفش ‌ ‌ ‌ ‌ ایں بخت نگر باد صبا واشتہ باشد
بر وقت سجودے بدر او نتواں برد ‌ ‌ ‌ ‌ ایں نیست نمازے کہ قضا واشتہ باشد

بے ترشح بادۂ گلرنگ بے‌کیفیت است ‌ ‌ ‌ ‌ دامن ابرے سوئے گلزار می باید کشید

از دردِ سحرگاہ نشد خاطرِ من شاد ‌ ‌ ‌ ‌ صد عقدہ چو تسبیح بکار دلم افتاد

لالہ از خاک و گل از شاخ بروں می آید ‌ ‌ ‌ ‌ مژدہ اے عقل کہ ہنگام جنوں می آید

اے پرتو رخسار تو در جلوہ گری بود ‌ ‌ ‌ ‌ آئینہ خورشید چراغ سحری بود

بگوش اہل دل آوازۂ ہوس نرسد ‌ ‌ ‌ ‌ بوادئی کہ منم نالۂ جرس نہ رسد

عشق یارب چہ داشت با فرہاد ‌ ‌ ‌ ‌ آں بلاکش خراب شد آخر
جستجو بیش ازیں نمی باشد ‌ ‌ ‌ ‌ در رہش میر خاک شد آخر

روشن نشد کہ عشق درونم چگونہ سوخت ‌ ‌ ‌ ‌ افتاد آتشے و شرارے ندید کس

جانے بداد میر بایں بیکسی کسے | در مردن تو گریہ و زاری نہ دید کس

خواہم چو ابر بے تو بصحرا گریستن | دامن بر وکشیدن و دریا گریستن
بر چشم ما کسے نہ کشید آستیں ز لطف | مائیم و کلبۂ غم و تنہا گریستن
فرصت غنیمت است اگر یک نفس بود | اے صبح خندہ از تو و از ما گریستن

بیا بلطف شہید نگاہ خوباں را | بہ بیں مروت چشم سیاہ خوباں را
بلند انداختم چوں قدِ آں را | نمودم پست سرو بوستاں را
وفائے گل اگر معلوم می بود | نمی بستم دریں باغ آشیاں را
سر رہ میر جاں دشوار می داد | چہ پیش آمد ندانم آں جواں را

حرف بد کو نقش خاطر بود محبوب مرا | زد بغرق نامہ بر ناخواندہ مکتوب مرا

شب شیخ دید گردش رنگ پیالہ را | برباد داد زاہدی دیر سالہ را

حالیا در دل نمی گنجد غم بسیار ما | یک دو روزے اے بے وفا کم کن آزار ما
کوچہ اورا چمن کردیم چوں رخصت شدیم | ریخت رنگ تازہ صد جا دیدہ خوں بار ما

یک غنچہ خوں نخوردہ ازیں بیشتر کہ ما | یک گل نداشت ایں ہمہ چاک جگر کہ ما
برقے بخست خندہ زناں ایں چنیں کہ تو | ابرے نخواست گریہ کناں ایں قدر کہ ما
دعوئ ضرور نیست بہ بینیم میر دی | زیں بزم اے چراغ تو پیش از سحر کہ ما

آنم کہ خوفِ جاں سبب شادیٔ من است | چشمان شیر شرزہ گل وادیٔ من است

ہر آفتے کہ تازہ نمودار می شود — از اختراع قوت ایجادئی من است
من خود بحال مرگم و دشمن گماں برد — کیں حالتم زغایت استادی من است

آوارہ گرد عشق تو چشمم پر آب داشت — ہر جا کہ رفت گریہ برنگ سحاب داشت
آیا چہ شد کہ میر گدائے شراب شد — دیروز ایں جوانِ عزیز احتساب داشت

از دل من تا غم جانانہ رفت — رونق سرتا سرایں خانہ رفت
من چہ دانم راہ و رسم خانقاہ — عمر من در خدمتِ میخانہ رفت
آخر آخر بر دکانِ مے فروش — آبروئیم بہر یک پیمانہ رفت
نیست شور میر در بازارہا — غالباً از شہر آں دیوانہ رفت

مشنو سخن شیخ کہ از بے بصراں است — او منکر دیدار رخ خوش پسراں است
ما لطف زبانے ہم از و گاہ ندیدیم — دیریست کہ روے سخنش با دگراں است
دامن بمیاں بر زدہ چوں شمع سحر باش — کیں بزم دل افروز جہان گذراں است
آئینہ مگر دیدۂ میر است کہ ہر صبح — بر صورت خوب تو بحسرت نگراں است

بیاد ناوک مژگاں دلم زجاں سیر است — شکار وحشیم از مدتے سرِ تیر است
چہ شد کہ شعلہ فشاں نیست لیک می سوزد — نہال قامتِ من ہمچو شمع تصویر است
بابروے خم او چشم را سیاہ مکن — دگر نہ میر جہان من و تو شمشیر است

اندکے باید ستاد و زاری باید گریست — بر سرم اے ابر تر بسیار می باید گریست
گریہ را در یاد رویش ضبط نتواں کرد میر — ہمچو ابر قبلہ ام ناچار می باید گریست

نگاہِ مستِ او سرگرم کار است　　　رگِ خوابِ جہاں در دستِ یار است

چوں غنچہ دل بہ پہلو پر خوں ز مہر یار یست　　　رنگِ شکستۂ من از عشق یادگار یست
غافل مشو ز رفتن کیں طاق چرخ نیلی　　　از گرد راہ یاراں بر خاستہ غبار یست
میر اینہمہ ندارد تغییر حال عاشق　　　وقتیست التفاتیست عہدیست روزگار یست

ایں ادائے او فراموشم نخواہد گشت میر　　　چوں سرِ زلفش گرفتم دست من پیچید و رفت

بوعدہ ات ندہم دل کہ اعتبار تو نیست　　　وفاست رسم قدیمے کہ در دیار تو نیست
ز آہ و نالہ زارت دلا نمی رنجم　　　کہ بیقراری و اینہا باختیار تو نیست

بوسیدن دہانِ تو دل در خیال داشت　　　ایں سادہ لوح خواہشِ امر محال داشت
اے آنکہ از دیارِ غریباں رسیدۂ　　　بارے بگو کہ میر در آنجا چہ حال داشت

خاموش ازاں شدم کہ تفِ سوزش درون　　　مانند شمع سوخت سخن بر زبانِ من
با ایں قد خمیدہ بلائے زمانہ ام　　　امروز در جہاں نہ کشد کس کمان من

در حضرتِ تو بردہ ام ازبسکہ سجدہ ہا　　　سائیدہ شد لبان مہ نو جبینِ من

ما را و ماغ دیدن گلہا نبودہ است　　　در گلشن زمانہ ببوئے تو آمدیم
تسکین نیافتیم پس از مرگ زیر خاک　　　آخر غبار گشتہ بکوئے تو آمدیم

چناں صبح داد فغاں می دہم　　　کہ مرغِ چمن را زباں می دہم

زلف با دستار می پیچد ادا را بندہ ام   شرم از آئینہ می دارد حیا را بندہ ام
پیچش زلفش نہ امروز نیست با جانم ولے   ہر گہ و بیگاہ تحریک صبا را بندہ ام

معتبر نیست اگر حرف پریشاں گفتیم   عذر ما را بپذیرید کہ سودا زدہ ایم

اشک من لغزاں بر رخسار آمدہ   ہمچو طفل نو بہ رفتار آمدہ
سالہا باید کہ آید از سحاب   آنچہ شب از گریہ زار آمدہ

ڈاکٹر ابواللیث صدیقی

میر کا فارسی کلام

میر تقی میر جن کا کلام اُردو میں ناقدین کے نزدیک وہی درجہ رکھتا ہے جو فارسی میں سعدی یا حافظ کا ہے، عام طور پر صرف اُردو غزل گو کی حیثیت سے ہی متعارف ہیں، عرصہ ہوا ان کے فارسی کلام کے متعلق کسی صاحب کا مضمون کسی رسالہ میں نظر سے گزرا تھا لیکن خود کلام نظر سے نہیں گزرا تھا، ابھی کچھ دنوں سے مولانا کیفی صاحب چریا کوٹی مسلم یونیورسٹی میں قلمی کتابوں کی ایک توضیحی فہرست تیار کرنے پر مقرر ہوئے ہیں۔ مولوی سبحان اللہ صاحب مرحوم کے عطا کردہ کتب خانہ میں کیفی صاحب کو ایک قلمی بیاض ملی جس کے متعلق پرانی فہرست میں صرف بیاضِ اشعار قلمی تحریر تھا، غور کرنے سے معلوم ہوا کہ یہ میر تقی میر کا فارسی کلام ہے، چنانچہ پہلے ورق پر جس کی نصف سطر جلد بندی میں کٹ گئی ہے، یہ عبارت صاف پڑھنے میں آتی ہے

"دیوان نظم فارسی کہ میر تقی میر گفتہ اند"

ہر غزل میں مقطع میں میر بطور تخلص استعمال ہوا ہے اور رُباعیات سے بھی جن کی ایک کثیر تعداد دیوان غزلیات کے آخر میں شامل ہے اسی خیال کی تصدیق ہوتی ہے، بیاض پر تاریخ کتابت یا کاتب کا نام درج نہیں ہے، لیکن کاغذ نہایت پرانا اور بوسیدہ ہے، خط اگرچہ شکستہ ہے۔

لیکن نہایت پختہ اور پاکیزہ ہے اور سوائے دو چار مقامات کے اشعار ہر جگہ بخوبی سمجھ میں آجاتے ہیں۔

علاوہ تخلص کے جس کا ذکر اُوپر ہوا' داخلی شہادت یعنی کلام کے مطالعہ سے بھی اس خیال کی تائید ہوتی ہے کہ یہ کلام میر ہی کا ہے' اس سلسلہ میں سب سے نمایاں بات یہ ہے کہ فارسی کلام میں بکثرت ایسے اشعار موجود ہیں جن کے خیالات بعینہٖ اُردو اشعار میں بھی نظم ہوئے ہیں اور یہ اردو اشعار عام طور پر مشہور ہیں دوسرے میر کا مخصوص قنوطی رنگ' دُنیا کی بے ثباتی اور ناپائداری کا ذکر' محبت اور اس کے مختلف مدارج و منازل کا بیان' تصوّف کے مسائل' ریاکاری اور سالوسی کی مذمت جیسی اردو کلام میں موجود ہے' فارسی میں بھی ہے' اپنی برتری کا احساس' اپنی استادی کا یقین' اپنے کلام پر بھروسا جس طرح ان کے اُردو اشعار سے ظاہر ہے' فارسی سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے' امور بالا کو پیشِ نظر رکھ کر یہ خیال یقین میں بدل جاتا ہے کہ پیشِ نظر فارسی کا کلام میر تقی میر کا ہے۔

اس سلسلہ میں پہلے میر کے فارسی کلام سے بعض ایسے اشعار پیش کیے جاتے ہیں جن کا خیال اردو اشعار میں بھی نظم ہوا ہے۔ اردو کا یہ شعر بہت مشہور ہے:-

موقوف حشر پر ہے سو آتے بھی وے نہیں کب درمیان ہے وعدۂ دیدار جائیگا

اسی خیال کو کچھ بدل کر یوں ادا کیا ہے:

اُمیدوار وعدۂ دیدار مر چلے آتے ہی آتے یارو قیامت کو کیا ہوا

فارسی میں یہی بنیادی خیال اس طرح نظم ہوا ہے:

ہر چند گفتہ اند کہ اے میر روزِ حشر دیدارِ عام می شود امّا نمی شود

اُردو دیوان میں ایک شعر ہے:

نہ دیکھا میرِ آوارہ کو لیکن غبار اک ناتواں سا کو بکو تھا

فارسی میں بھی بالکل اسی مضمون کو نظم کیا ہے:

ندیدم میر را در کوے او لیک غبار ناتوانے باصبا بود

اسی اردو غزل میں ایک شعر معرفت کا ہے:

گل و آئینہ کیا خورشید و مہ کیا — جدھر دیکھا تدھر تیرا ہی رو تھا

فارسی میں یہ شعر یُوں ہے:

گُل و آئینہ و مہ و خورشید — ہر کسے روبسوے تو دارد

اسی غزل میں یہ شعر ہے:

غلط تھا آپ سے غافل گذرنا — نہ سمجھا میں کہ اس قالب میں تو تھا

اسی مضمون کو فارسی میں نظم کیا ہے:

غلط کردم کہ رفتم (؟) از خود — ندانستم دریں قالب خدا بود

اُردو کا یہ شعر بہت مشہور ہے:

جس شعر پر سماع تھا کل خانقاہ میں — وہ آج میں سنا تو ہے میرا کہا ہوا

فارسی میں اسی خیال کو اس طرح ادا کیا گیا ہے:

دوش بر شعرِ ترے در رقص آمد جانِ ما — چوں نظر کردیم بود آں شعرِ دیوانِ ما

اُردو میں ایک اور شعر ہے:

آیا تو سہی وہ کوئی دم کے لئے لیکن — ہونٹوں پہ مرے جب نفسِ بازپسیں تھا

فارسی میں اس خیال کو زیادہ نزاکت سے ادا کیا ہے:

بر سرِ ما بدمِ نزع رسیدی لعبث — ما کجائیم ؟ تو تصدیع کشیدی لعبث

اُردو میں ایک مضمون اس طرح نظم ہوا ہے:

سب کھلا باغِ جہاں الّا وہ حیران و خفا — جس کو دل سمجھے تھے ہم سو غنچہ تھا تصویر کا

فارسی میں یہ شعر یُوں ہے:

دلِ غنچۂ کدام گُلِ غیر موسم است — ہر چند می کنیم و لے وا نمی شود

اردو: سر نشینِ رہِ میخانہ ہوں میں کیا جانوں — رسم مسجد کے تئیں شیخ کہ آیا نہ گیا

فارسی: من چہ دانم راہ و رسم خانقاہ — عمرِ من در خدمتِ میخانہ رفت

اُردو: آہوں کے شعلے جس جا اٹھے ہیں میر شب کو — واں جا کے صبح دیکھا مشتِ غبار پایا

فارسی: میر جائے کہ بہ نیرانِ محبت می سوخت — صبح دیدیم بجا ماندہ کفِ خاک آنجا

اُردو: اِک موج ہوا پیچاں اے میرؔ نظر آئی — شاید کہ بہار آئی زنجیر نظر آئی
فارسی: دل میکشد بصحرا ہنگام کار آمد — شوریست در سرِ من شاید بہار آمد
اُردو: پھر نہ دیکھا کچھ بجز یک شعلۂ پُر پیچ و تاب — شمع تک تو ہم نے دیکھا تھا کہ پروانہ گیا
فارسی: سحر گہ بر سر پروانہ رفتم — کفِ خاکستر گرمے بجا بود
اُردو: منعم نے بنا ظلم کی رکھ گھر تو بنایا — پر آپ کوئی رات ہی مہمان رہے گا
فارسی: منعم اے خانہ خراب اینہمہ شوقِ تعمیر — سالہا ساختۂ جاہ و مکاں آخر ہیچ

مذکورالصدر مثالیں غالباً اس امر کی وضاحت کے لیے کافی ہیں کہ اکثر اشعار جو اُردو دیوان ہیں موجود ہیں، فارسی کلام میں بھی شامل ہیں، اس کا اندازہ مشکل ہے کہ پہلے اُردو شعر کہا یا فارسی، اور اس کا فیصلہ غالباً اس طرح کیا جا سکتا ہے کہ دو متحد المضمون اشعار سامنے رکھے جائیں، اور ان میں سے جو بہتر ہو اسے نقش ثانی قرار دیا جائے، اس کی تفصیل آگے آتی ہے:

میرؔ کی فارسی شاعری کے مضامین

جیسا کہ تمہید میں عرض کیا گیا ہے، فارسی دیوان میں بھی وہی مضامین نظم ہوئے ہیں جن سے اُردو میں کام لیا گیا ہے۔

ان میں میرؔ کا سب سے محبوب مضمون دُنیا کی بے ثباتی اور ناپانداری ہے اور اس مضمون کو میرؔ نے جس جس طرح نظم کیا ہے، اس کی نظیر کسی دوسرے اردو شاعر کے کلام میں مشکل سے ملے گی۔ فارسی کلام کے بھی چند اشعار دیکھیے جن میں اسی مضمون کو باندھا ہے:

میرؔ دنیا رہگذارے بیش نیست — آسمان گرد و غبارے بیش نیست

وقتِ آنکس خوش کہ گلزار جہاں را دید و رفت — ہم چو گل بر بے ثباتیہائے خود خندید و رفت

وقت فرصت خنک آنکس کہ نگہ می دارد — آہ ازیں عمر کہ چوں آب رواں درگذر است

پشتۂ ریگے کہ بینی کاروانے بودہ میرؔ — گردبادِ ایں بیاباں رہ نوردے بودہ است

دوسرا موضوع جو میر کو بہت عزیز ہے "یاس و حرماں" ہے۔ اس کا نمونہ یہ ہے:

بجمع ماتمیان حرفِ من اثر دارد　　به بزمِ عیش نه فهمد کسے زبانِ مرا

لب را گہے بخنده نیالوده ایم ما　　تا بوده ایم گریه کناں بوده ایم ما

بس کن اشعارِ ماتمِ دلِ میر　　بر مخواں واقعاتِ مقتل (؟) را

تیسرا موضوع جو غزل کی جان ہے، عشقیہ مضامین ہیں اور ان کے ادا کرنے میں بھی میر کو ید طولیٰ حاصل تھا، چنانچہ علاوہ اردو کلام کے جس پر قبول عام اور شہرت دوام کی مہر لگ چکی ہے، ذیل کے فارسی اشعار بھی اسی شمار میں آتے ہیں:

بیا اے میر در راہ محبت خویش را گم کن　　اگر خواہی کہ دریابی نشانِ بے نشاناں را

بامید ے کہ عشق آتش زند بر جانِ غمناکم　　بسانِ شمع یک جا کردہ ام رگہائے گردن را

خطر در عشق ہر گام است جانِ بیقرارم را　　عجب رہ آہ پیش آمد دلِ ناکردہ کامم را

در عشق کس نگشت حریفِ نبرد ما　　بر روے ما نیامدہ جز رنگِ زرد ما

زانچہ در دشت رفت بر مجنوں　　چہ خبر پردگیِ محمل را

باب لطفش نیستم لیکن چوں از رہ میرسم　　بر درِ او دیر می مانم نمی دانم چرا
چارۂ من دلربایان جملہ میدانند لیک　　کس نمی گوید کہ من دانم نمیدانم چرا

اس کے بعد تصوف کے مسائل ہیں:

بجویم ترا ہر کجا تا کجا　　بجاے رساں جستجوے مرا

رفتہ شوق شو و دیر و حرم را بگذار　　طوف کن میر بہر در بسجود آمدہ را

گل و آئینہ و مہ و خورشید　　ہر کسے رو بسوے تو دارد

اس قسم کے اشعار بھی بکثرت موجود ہیں جن میں میر نے اپنے ذاتی واقعات اور اس زمانہ کے خاص حالات کی طرف اشارہ کیا ہے۔ مثلاً

ہمچو میر آزردہ حالے دیر پیدا می شود　　مغتنم دانید روزے چند ایں درویش را

بمردن تسلی شدم ورنہ میر　　نہایت نبود آرزوے مرا

اپنے مذہب اور مشرب کی طرف بھی بعض اشعار میں اشارہ کیا ہے:

کس کما ہی بجہاں ذات علی رانشناخت　　شیعہ مولا و نصیریش خدا می گویند

اس سلسلہ میں دو رباعیاں بہت اچھی کہی ہیں:

اے ختم رسل چارہ نہ دارد دردم　　بخشای کہ جرم بے نہایت کردم
بر چہرۂ زرد خونم آید ہر دم　　یعنی کہ ز فرط شرم سرخ و زردم

کوتاہی اگر نمی کند عمر دراز　　ایں مرتبہ میر می روم سوے حجاز
انشاء اللہ نعرہ زن و گریہ کناں　　بر خاک مدینہ می نہم روے نیاز

میر کے اس نایاب فارسی دیوان کے تذکرہ کو بعض اشعار اور رباعیات پر ختم کیا جاتا ہے۔

رُباعیات

سنگم بسر از جورِ فلک می بارد — بر بسترِ آرام خسک می بارد
از چشمِ من آب شور آید ہر دم — یعنی کہ ز گریہ ام نمک می بارد

دیدن برخت چشمے تری می خواہد — رفتن بہ رہت برگ سری می خواہد
من صید بیک تیرِ بلاکم مگذار [بگذار] ؟ — آماج تو بودن جگرے می خواہد

ہمدم منشیں کہ با تو حرفے دارم — در زیرِ فلک حال تنگرفے دارم
از حادثہ می خورم شکستے ہر دم — جرمم نبود جز اینکہ ظرفے دارم

عشق تا بکجا ز دردِ مژگان ترکن — برخیز و فسانۂ محبت سرکن
شد روز غمت شام بسوزانی داغ — اے میر چہ مردہ چراغے برکن

متفرقات

بمردن تسلی شدم ورنہ میر — نہایت نبود آرزوے مرا
جور و جفاست کارِ تو و من بہ سادگی — موقوف رحم داشتہ ام کارِ خویش را
وفاے گل اگر معلوم می شد — نمی بستم درین باغ آشیاں را
از دلِ من تا غمِ جانانہ رفت — رونق سرتاسرِ آن خانہ رفت
آخر آخر بر دکانِ می فروش — آبروئیم بہ ہر یک پیمانہ رفت
من چہ دانم راہ و رسمِ خانقاہ — عمرِ من در خدمتِ میخانہ رفت
نے سرشکے نے چراغے نے گلے — از سرِ خاکم چہ بیرحمانہ رفت
نیست شورِ میر در بازارہا — غالباً از شہر آں دیوانہ رفت

این نہ پنداری کہ مردن موجب آسودن است   مرگ ہم یک منزل است از راہ بے پایان من

جرعہ بر خاک تمیر خواہد ریخت   یاد از ان مے کہ در سبو دارد

خواب امشب ہم بہ یاران شد حرام   قصۂ غم تمیر باز آغاز کرد

بارے تو خود بگو کہ چہ خواہی جواب گفت   گر روز حشر با تو مرا رو برو کنند

عشق یا رب چہ بلائیست کہ پیش ہمہ کس   میر و تمیر بحالے کہ گنہگار رود

نوٹ: مسلم یونیورسٹی کے کتب خانہ میں بکثرت نوادر موجود ہیں، موجودہ فہرست میں انہیں اس طرح شامل کیا گیا ہے کہ فہرست سے کتاب کا کچھ حال معلوم نہیں ہوتا، الحمدللہ کہ اب ہر شعبہ کی توضیحی فہرست تیار ہونے پر یہ دقت رفع ہو جائے گی، لیکن یہ بھی ضروری ہے کہ ان میں سے بعض نوادر کو ضروری مقدمات کے ساتھ شائع کرایا جائے، اس سے ایک طرف یونیورسٹی کی شہرت اور دوسری طرف علم کی خدمت پوری طرح حاصل ہو سکتی ہے۔

تصنیف: ڈاکٹر بھولا ناتھ تیواری*
ترجمہ: نثار احمد فاروقی

زبانِ میر کی خصوصیات

میر محمد تقی میر (۱۷۲۲ء - ۱۸۱۰ء) نے جس زبان کا استعمال کیا ہے وہ اُس زمانے میں "اردو" نہیں بلکہ "ہندی"[1] کہلاتی تھی۔ یوں کبھی کبھی اس کے لیے "ریختہ"، "زبان دہلوی" یا "زبان اردوئے معلّیٰ" کے نام بھی مروّج تھے۔ زبان میں دو باتیں اہم ہوتی ہیں، ایک تو اس کی گرامر اور دوسرے اس کا ذخیرۂ الفاظ۔ اور لسانیاتی اعتبار سے گرامر ہی زبان کی ریڑھ کی ہڈی ہوتی ہے۔ چناں چہ گرامر کے لحاظ سے (دو چار باتوں کو چھوڑ کر) اردو اور ہندی میں کوئی خاص فرق نہیں ہے۔ ان دونوں زبانوں کا خاص فرق محض ذخیرۂ الفاظ کا ہے؛ اردو میں بہت سے الفاظ عربی فارسی اور ترکی کے ہیں جب کہ ہندی میں معاملہ اس کے برعکس ہے یعنی سنسکرت یا پراکرت وغیرہ الفاظ زیادہ ہیں۔ میر کی زبان میں جہاں تک الفاظ کا تعلق ہے دوسرے اردو شعرا کی طرح عربی فارسی کے الفاظ کافی ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی خالص ہندی یا سنسکرت کے الفاظ بھی کم نہیں ہیں۔ سنسکرت سے جو الفاظ ہندی میں آئے ہیں انھیں دو خانوں میں تقسیم کیا جاتا ہے ایک کو "تت سم" کہتے ہیں دوسرے کو "تدبھو"۔ پہلی قسم یعنی تت سم الفاظ وہ ہیں جو خالص سنسکرت کے ہیں اور ان میں کسی طرح کی تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔ میر نے ایسے الفاظ کا استعمال بہت ہی کم کیا ہے۔ مثال کے طور پر "سمے"، "پریم" وغیرہ۔

---

[1] ع: آیا نہیں یہ لفظ تو ہندی زباں کے بیچ (میر)

* صدر شعبۂ ہندی، کروڑی مل کالج دہلی یونی ورسٹی دہلی ۶۔ حال: وزیٹنگ پروفیسر شعبۂ ہندی تاشقند یونی ورسٹی، روس۔

تدبھو وہ لفظ ہے جو ہو تو سنسکرت ہی کا مگر بگڑ کر اپنی اصلی شکل سے تبدیل ہو گیا ہو۔ میں سمجھتا ہوں کہ اردو میں ایسے لفظوں کی تعداد پچاس ہزار سے کم نہیں ہے۔ میرجی نے بھی ایسے الفاظ بہت استعمال کیے ہیں۔ بلکہ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ کلام میرجی میں ایسے لفظوں کی تعداد ہی سب سے زیادہ ہے جو سنسکرت سے نکلے ہیں، یہاں مشتے نمونہ از خروارے چند لفظوں کا ذکر کیا جاتا ہے:

آنکھ (سنسکرت: اَکشی अक्षि)، لوگ (سنسکرت: لوک लोक)، سچ (سنسکرت: سَتیہ सत्य)، ہاتھ (سنسکرت: ہَستَ हस्त)، گھر (سنسکرت: گرِہ गृह) کلیجا (سنسکرت: کالیہَ कालेय)، چولی (سنسکرت: چولَ चोल)، پسینا (سنسکرت: پَرَشویدَن प्रस्वेदन)، انوکھا (سنسکرت: اَنوک अ+नवक)، چھالا (سنسکرت: چھال छाल)، بڑھاپا (سنسکرت: وِردّھتوَ वृद्धत्व)، منھ (سنسکرت: مُکھ मुख)، چور (سنسکرت: چَور चौर)، رات (سنسکرت: راتری रात्रि)، بات (سنسکرت: وارتا वार्ता) جوگی (سنسکرت: یوگی योगी)، میت (سنسکرت: مِتر मित्र)، ریت (سنسکرت: رِیتی रीति)، اچھر (سنسکرت: اکشر अक्षर)، آج (سنسکرت: ادیہ अद्य)، کل (سنسکرت: کلیہ कल्य) سانجھ (سنسکرت: سَندھیا सन्ध्या)، سرسوں (سنسکرت: سَرشَپ सर्षप) پھول (سنسکرت: پھُلیہ फुल्ल)، کہانی (سنسکرت: کتھانک कथानक) وغیرہ۔

جیسا کہ ہم نے اوپر کہا ہے گرامر ہی زبان میں ریڑھ کی ہڈی کا حکم رکھتی ہے۔ میرجی نے بھی جس زبان کا استعمال کیا ہے اس کی گرامر لگ بھگ وہی ہے جس پر آج کی اردو اور ہندی زبانوں کا دارومدار ہے اس طرح لسانیاتی اعتبار سے میرا اردو اور ہندی دونوں کے شاعر ہیں۔ اُن کی زبان کی گرامر تاریخی اعتبار سے سنسکرت، پالی، پراکرت اور اپ بھرنش سے تعلق رکھتی ہے۔ اس کی صرف دو ہی خصوصیات ایسی ہیں جو بظاہر فارسی سے علاقہ رکھتی تھیں۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے تو کاف بیانیہ (کہ) لگا کر جملہ بنانے کا ذکر کیا جا سکتا ہے۔ کہ فارسی کا لفظ ہے اور اس طرح کی ہندی یا اردو کو جس میں کاف بیانیہ استعمال کیا گیا ہو فارسی زبان سے متاثر سمجھا جاتا ہے۔ دوسری خصوصیت اضافت ہے۔ ہندستانی قواعد میں مضاف الیہ

پہلے اور مضاف بعد میں آتا ہے جیسے ہرش شوک (हृदशोक) یعنی "دل کا غم"۔ جب فارسی قواعد کی رُو سے (سنسکرت کے برعکس) غمِ دل کہیں گے یعنی پہلے مضاف پھر مضاف الیہ۔ اردو کے دوسرے ادیبوں اور شاعروں کی طرح میر نے بھی فارسی قواعد کی اسی روایت کے مطابق اضافتوں کا استعمال کیا ہے۔

ان دو باتوں کو چھوڑ کر میر کی زبان قواعد کے لحاظ سے ہندی یا اردو کے عام قاعدوں سے آزاد نہیں ہے۔ ان کی زبان میں اسم، حالتِ فعل، حروفِ جار، تذکیر و تانیث کے قاعدے یا واحد سے جمع بنانے کے اصول، اسی طرح سابقے اور لاحقے، ضمائر، صفت، مصدر کے مادّے، امادی افعال، افعال کے مادّے، اسمائے اصوات، اسمائے جامد وغیرہ کے اصول اور طریقہ ہائے استعمال تقریباً وہی ہیں جو آج کل اردو یا ہندی میں رائج ہیں پس ایسی صورت میں یہاں ان پر تفصیلی بحث کرنا غیر ضروری ہوگا۔ یہاں صرف ان باتوں اور خصوصیتوں کا ذکر کیا جا سکتا ہے جو آج کی ہندی یا اردو سے کچھ مختلف انداز میں میر کے یہاں پائی جاتی ہیں۔ اگرچہ ایسی خصوصیات بہت زیادہ نہیں ہیں اور انھیں زیادہ سے زیادہ اس کلیہ کا استثنا ہی مانا جا سکتا ہے۔

حروفِ جار۔ ضمائر اور حروف جار کے استعمال میں چند ہی فرق ایسے ہیں جو میر کے کلام میں پائے جاتے ہیں۔ میر نے کہیں کہیں ضرورت شعری کی بنا پر بھی حرفِ جار کو ترک کر دیا ہے جیسے "تمھارے بنا" کی بجائے "تجھ بن"۔

جو تجھ بن نہ جینے کو کہتے تھے ہم

یا "اس کے بنا" کی جگہ "اس بن"

گھر میں جی لگتا نہیں اس بن

اس طرح کی مثالیں قدیم اردو اور ہندی میں کثرت سے ملتی ہیں۔

اس سلسلے میں "نے" کا استعمال بھی قابل لحاظ ہے۔ ہندی اور اردو میں یہ فاعل کی علامت ہے ہندستانی بولیوں میں صرف کھڑی بولی اور برج بھاشا وغیرہ میں اس کا استعمال ملتا ہے۔ پورب کی بولی میں یہ نہیں ہے اسی وجہ سے پورب کے لوگ اس کے استعمال میں عموماً غلطی کر جاتے ہیں۔ "نے" کا استعمال یوں تو میر نے کیا ہے اور بالکل صحیح کیا ہے۔ مثلاً:

(۱) مصرع : یوں کانوں کان گل نے نہ جانا چمن میں آہ

(۲) مصرع : ہم نے جانا تھا سخن ہوں گے زباں پہ کتنے

لیکن کہیں کہیں میرؔ نے اسے ترک بھی کر دیا ہے۔ جیسے :

سمجھے تھے ہم تو میرؔ کو عاشق اسی گھڑی

یہاں از روئے قواعد "ہم نے سمجھا تھا" ہونا چاہیئے۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہاں ضرورت شعری کی بنا پر بحر کی پابندی کرنے کی وجہ سے یہ غلطی ہوئی ہے لیکن یہ سبب نہیں ہے۔ ضرورت شعری اچھے شاعر کے نزدیک حتی الوسع قابل ترک ہوتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہاں میرؔ کی زبان پر اودھی وغیرہ پوربی بولیوں کا اثر ہے۔ اسی طرح ان کا ایک اور مصرع ہے :

اس دل کی مملکت کو اب ہم خراب دیکھا

اردو اور ہندی کے قدیم شاعروں کی طرح "تئیں" کا استعمال بھی میرؔ نے خوب کیا ہے۔ تئیں کے مادۂ اشتقاق میں اختلاف آرا ہے۔ لوگوں نے اسے हुन्ते، प्रा०، तावत्، स्थाने وغیرہ سے مشتق بتایا ہے مگر ان میں سے کوئی بھی رائے متفق علیہ نہیں ہے۔ تئیں کا مطلب "کو" یا "کے لیے" یا "سے" نکلتا ہے۔ میرؔ کے یہاں اس کے کچھ استعمال یوں ہوئے ہیں :

(۱) کھیل لڑکوں کا سمجھے تھے محبت کے تئیں

(۲) اب تو تیرے تئیں قرار ہوا

(۳) رسم مسجد کے تئیں، شیخ کہ آیا نہ گیا

(۴) ہم کو کہنے کے تئیں بزم میں جا دیتے ہیں

دلّی میں جامع مسجد کے علاقے میں تئیں یا تیں کا استعمال آج بھی انھیں معنوں میں سنائی پڑ جاتا ہے۔ جیسے

"پھر میرے تیں (یا تئیں) نہ کہنا" (یعنی پھر مجھ سے مت کہنا)

اسم صفت عددی

اسم صفت عددی کی کچھ ہی مثالیں میرؔ کے کلام سے ملتی ہیں : "ایک" کا استعمال انھوں نے یک یا اک کی شکل میں بھی کیا ہے۔ ایک کے استعمال کی کچھ مثالیں تو عجیب ہیں۔ جیسے :

(۱) قصر و مکان و منزل ایکوں کو سب جگہ ہے۔
(۲) ایکوں کو جا نہیں ہے دنیا عجب جگہ ہے۔
اسمائے صفتِ عددی کی دوسری مثالوں میں کوئی قابلِ ذکر بات نہیں ہے۔

ضمیریں

ضمائر کے استعمال میں بھی زبانِ میر کی کچھ خصوصیات ہیں۔ واحد غائب کی ضمیر میں اس نے کی جگہ وہ اُن نے لکھتے ہیں:

استغنا کی چوگنی اُن نے، جوں جوں میں ابرام کیا

"ای" کی جگہ کئی ضمیروں میں میر نے آو یا اوں کا لاحقہ استعمال کیا ہے مثلاً اُنھیں کی جگہ اُنھوں لاتے ہیں:

نام آج کوئی یاں نہیں لیتا ہے اُنھوں کا

(یہ اُنوں کا بھی ہو سکتا ہے۔ آج بھی دلی کی عوامی بولی میں اس طرح سنا جاتا ہے)

جو، سو کا اردو یا ہندی میں بہت کم استعمال ہوتا ہے، اب سو کی جگہ وہ یا وو (वो) بولا جاتا ہے دوسرے قدیم شعرا کی طرح یہ میر کے کلام میں بھی آیا ہے:

جو جو ظلم کیے ہیں تم نے سو سو ہم نے اُٹھائے ہیں

اُنھوں کی طرح جمع کی ضمیر میں بھی میر نے کسی کے بجائے کسو استعمال کیا ہے۔ دلی کی کرخنداری بولی اور کھڑی بولی میں بھی کسی کی جگہ کسو آتا ہے یہاں بھی ای کے بدلے او ہے کلامِ میر میں لفظ کسو اکیلا بھی آیا ہے اور تقریباً تمام حروفِ جار کے ساتھ بھی ملتا ہے۔ مثلاً:

(۱) ہمارے آگے ترا جب کسو نے نام لیا
(۲) شوق ہے، غم میں بے صبری ہے، آہ کسو کو کیا کہیے
(۳) نہ دماغ ہے کہ کسو سے ہم کریں گفتگو غمِ یار میں
(۴) میں بھی کبھو کسو کا سر پُر غرور تھا
(۵) کسو وقت پاتے نہیں گھر اُسے

کسی یا کسو کی جگہ، کہیں کہیں میر نے کوئی کا استعمال بھی کیا ہے:

میر جی کوئی گھڑی تم بھی تو آرام کرو

کسی کی جمع کنھیں یا کنھوں آتی ہے۔ میر نے کنھیں کی جگہ کنھوں استعمال کیا ہے:

بے سوز دل کنھوں نے کہا ریختہ تو کیا

ضمیر اضافی جن یا جنھیں کی جگہ زبان میر میں جنھوں ملتا ہے:

میر گھر بار جنھوں کے رہِ سیلاب میں ہیں

ضمیر متکلم شخصی (REFLEXIVE PRONOUN) میں اپنے کی جگہ قدیم شاعروں کے کلام میں آپ بھی لکھا جاتا تھا اور اس کی مثالیں کلام میر سے بھی ملتی ہیں:

کسو وقت پاتے نہیں گھر اُسے

بہت میر نے آپ کو گم کیا

ضمیر جمع (COLLECTIVE PRONOUN) میں سب کی جگہ سبھوں بھی میر نے باندھا ہے، یہ بھی میر صاحب کی زبان پر پوربی بولیوں کے اثر کی نشان دہی کرتا ہے:

نظر میں سبھوں کی خدا کر چلے

افعال

کلام میر میں جو افعال استعمال ہوئے ہیں ان میں جعلی مصدر کثرت سے ملتے ہیں۔ اس زمانے میں عربی اور فارسی الفاظ کی بنیاد پر جعلی مصدر بننے لگے تھے۔ جیسے شرمانا:

صبح جو ہم بھی جا نکلے تو دیکھ کے کیا شرمائے ہیں

اردو اور ہندی میں عام طور سے جتنے افعال امدادی رائج ہیں تقریباً سب کا استعمال میر کے یہاں بھی مل جاتا ہے، اس سلسلے میں اُن افعالِ امدادی کی دو خصوصیات یہاں قابلِ ذکر ہیں، ایک تو یہ کہ انھوں نے ہووے گا اور ہوگا دونوں کا استعمال کیا ہے:

(۱) بعد ہمارے اس فن کا جو کوئی ماہر ہووے گا

(۲) پھر نوحہ گری کہاں جہاں میں

ماتم زدہ میر اگر نہ ہوگا

دوسری بات یہ کہ کہیں کہیں میر نے ہے کی جگہ ہے گا بھی لکھا ہے۔ آج بھی دلی میں

بانا رسیتارام اور کوچہ پاتی رام کے ہندوؤں میں ہے کی جگہ ہے گا بولا جاتا ہے۔ میر نے یہ اثر بظاہر اپنے زمانے کی دلّی کی عوامی بولی سے قبول کیا ہے۔ ویسے ہے گا صرف دلّی تک محدود نہیں ہے۔ اگروال جاتی کے لوگوں میں مختلف مقامات پر یہ استعمال زباں زد ملتا ہے الہ آباد شہر کے پرانے لوگوں میں بھی ہے گا خوب بولا جاتا ہے۔ میر کا ایک شعر ہے:

گل بار کرے ہے گا اسباب سفر شاید
غنچے کی طرح بلبل دلگیر نظر آئی

میر کی عام روش کے لحاظ سے یہاں "گل بار کرے ہے" ہونا چاہیئے تھا۔

زمانۂ مستقبل کے لیے آج کل اردو اور ہندی میں ۔ ئے ۔ کے استعمال کی شکلیں ملتی ہیں (آئے گا، جائے گا، بنائے گا، پچھتائے گا، لائے گا وغیرہ) میر نے تقریباً ہر جگہ وہ شکل اختیار کی ہے جس میں ۔ وے ۔ آتا ہے (آوے گا، جاوے گا، بناوے گا وغیرہ) پہلی صورت کا استعمال بہت ہی کم ملتا ہے۔

فعل امر کے لیے آج کل اردو یا ہندی میں دو صورتیں رائج ہیں، امر زمانہ حال کے لیے دیکھو، پوچھو، کھاؤ، کرو، رہو، چراؤ وغیرہ یعنی جن کے آخر میں ۔ و ۔ آتا ہے۔ اور امر زمانۂ مستقبل کے لیے دیکھنا، پوچھنا، کھانا، کرنا، رہنا، چرانا وغیرہ یعنی وہ افعال جو ۔ نا ۔ پر ختم ہوتے ہیں۔ مگر میر نے امر زمانہ حال اور زمانہ مستقبل دونوں ہی کے لیے ۔ یو ۔ پر ختم ہونے والے صیغے استعمال کیے ہیں۔ مثلاً:

(۱) کل اُس کو دیکھیو تم نے تاج ہے نہ سر ہے
(۲) بہت پوچھیو تم مری اور سے
(۳) رکھیو قدم سنبھل کے کہ تو جانتا نہیں

اسی طرح لگیو، کریو، رہیو، جیئیو، سنیو، لیجیو، چرائیو وغیرہ مختلف شکلوں کا استعمال بھی انھوں نے کیا ہے۔ آج بھی دلّی میں جامع مسجد کے آس پاس، امر زمانۂ حال اور امر زمانۂ مستقبل کے لیے یہی شکلیں استعمال کی جاتی ہیں۔ زبانِ میر میں یہ دلّی کی عوامی بولی کا اثر ہے۔

جہاں ادب بھی ملحوظ ہوتا ہے وہاں امر کے لیے ۔ یے ۔ پر ختم ہونے والے صیغے اردو اور

ہندی میں استعمال ہوتے ہیں مثلاً ملیے جانیے، رہیے، کہیے، پوچھیے وغیرہ میر نے بھی ان صیغوں کا استعمال کیا ہے۔ ہوجے کی جگہ ہوجیے لکھتے ہیں:

کیا طرح ہے، آشنا گاہے گہے نا آشنا
یا تو بیگانے ہی رہیے، ہوجیے یا آشنا

ــ یے ــ والے روپ افعال متعدی کے ہی ملتے ہیں، افعال لازم کی شکلیں ــ جے ــ پر ختم ہوتی ہیں۔ مگر یہ جے والی سب شکلیں ہوجیے جیسی نہیں ہیں۔ مثلاً دیجیے کی جگہ دیجے:

کس کو لے مرتیے اور کس کو تہمت دیجے

یا لیجیے کی جگہ لیجے:

ابر رحمت ہے جام میں مے دے
یعنی ساقی گناہ کر لیجے

اسی طرح دوسرے مصادر سے صیغۂ امر جے پر ختم ہونے والے ملتے ہیں مثلاً کرنا سے کریے اور کیجے:

(۱) کہ دیدنی ہی نہیں جس پہ یاں نظر کریے
(۲) چل قلم غم کی رقم کوئی حکایت کیجے
ہر سر حرف پہ فریاد نہایت کیجے

متعلقات فعل (PARTICIPLES) کے معاملے میں بھی زبان میر کی کچھ خصوصیات ہیں متعلقات فعل کی چار شکلیں زیادہ اہم ہیں:

زمانہ حال کے افعال اور ان کے متعلقات۔ زمانہ ماضی کے متعلقات افعال۔ زمانہ مستقبل کے متعلقات افعال اور حاصل مصدر۔ ہندی اور اردو میں زمانہ حال کے صیغے ــ تا ــ لگا کر بنائے جاتے ہیں جیسے چلتا، روتا، گاتا وغیرہ۔ اور میر کے کلام میں یہ روپ کثرت سے ملتا ہے۔ لیکن فعل لازم کے واحد متکلم میں ؤ ــ اوں ــ آخر میں لگا کر حال کا صیغہ بناتے ہیں:

جس کا منھ دیکھ رہا ہوں سو وہی دیکھوں ہوں

اسی طرح ضمیر حاضر کے صیغوں میں ــ او ــ لگا کر حال بنایا ہے:

(۱) پچھتاؤگے سنو ہو یہ بستی اُجاڑ کر

(۲) کیا پوچھو ہو سانجھ تلک پہلو میں کیا کیا تڑپا ہے

اور غائب کے صیغوں میں ۔ اے ۔ آخر میں آتا ہے :

(۱) زیر فلک بھلا تو رووے ہے آپ کو میر

(۲) جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے

کرے ہیں، تکا ہی کرے ہے، نکلے ہے، تڑپھے ہے، ٹپکا ٹپکے ہے، پوچھیں ہیں، بھولے ہیں، جھکے ہے، وغیرہ بھی اسی سلسلے کی دوسری مثالیں ہیں ۔ ان صیغوں کا استعمال میر نے زمانۂ ماضی کے لیے بھی کیا ہے :

کھیلے تھا ایک مغبچہ مہرۂ نماز سے

اردو کے دوسرے اساتذہ متقدمین کی طرح میر نے بھی زمانہ ماضی یا زمانہ حال کے صیغوں کے لیے مادہ فعل میں ایک زائد آن لگا کر استعمال کیا ہے، مثلاً آ بیٹھے کی بجائے آن بیٹھے :

ہم فقیروں سے کج ادائی کیا

آن بیٹھے جو تم نے پیار کیا

اسی طرح دورِ حاضر میں قواعد کے لحاظ سے چاہیئے کے قبل مادہ فعل یا حاصل مصدر لانے کا اصول ہے جیسے کرنا چاہیئے مگر اردو کے دوسرے شاعروں کی طرح میر نے حاصل مصدر کی جگہ ماضی کا صیغہ بھی رکھا ہے :

کیا کروں، دل خوں کروں، شعر ہی موزوں کروں

چلتی ہے جب تک زباں، کچھ تو کیا چاہیئے

ہندی اور اردو دونوں زبانوں کے ماضی میں مادہ فعل میں کر لگا دیا جاتا ہے جیسے نہا کر، بیچ کر وغیرہ ۔ میر نے بھی یہ شکلیں استعمال کی ہیں :

وہ جی کو بیچ کر بھی خریدار ہو گیا

مگر عوامی بولی کی تقلید یا ضرورتِ شعری کے اعتبار سے انھوں نے کہیں کہیں کر کی جگہ کے استعمال کیا ہے جیسے آ کے ، جان کے ، دیکھ کے ۔

اس کا خرام دیکھ کے جایا نہ جائے گا

مگر لفظ "کر" یا "کے" دونوں ہی حذف کر دیے ہیں یعنی ان معنوں میں صرف مادۂ فعل ہی سے کام چلایا ہے:

(۱) عہد جوانی رو رو کاٹا، پیری میں لیں آنکھیں موند

(۲) فردوس کو بھی آنکھ اٹھا دیکھتے نہیں

ہندی اور اردو میں استعمال ہونے والے زمانہ ماضی کے صیغوں میں دیا، ہوا، نکلی وغیرہ جیسی عام شکلیں تو کلام میر میں ملتی ہی ہیں۔ ان کے علاوہ جمع مونث کے صیغہ میں۔ "ئیاں" کا اضافہ زبان میر کی خصوصیات میں سے ایک ہے۔ جیسے آئیاں، گائیاں، دکھلائیاں، سمجھائیاں وغیرہ۔ جیسے:

بارہا وعدوں کی راتیں آئیاں

طالعوں نے صبح کر دکھلائیاں

اسمائے صفات اور ضمائر میں بھی۔ "ئیاں" پر ختم ہونے والے الفاظ میر کے یہاں خاصی تعداد میں پائے جاتے ہیں:

(۱) چالیں ہی دلبروں کی سب سے نرالیاں ہیں

(۲) دل سے گئیں نہ باتیں تری پیاری پیاریاں

(۳) مدت رہیں گی یاد یہ باتیں ہماریاں

اسی، اُسی، کسی، جسی وغیرہ الفاظ حقیقت میں اس + ہی، اُس + ہی، کس + ہی، جس + ہی سے بنے ہیں۔ میر کے زمانے ان لفظوں کی اصلی شکل (اس + ہی) اور بگڑی ہوئی مستعملہ صورت (اسی) دونوں رائج تھیں اسی لیے انھوں نے کہیں کہیں ہی کے ساتھ بھی لکھا ہے۔ جیسے:

خورشید میں بھی اُس ہی کا ذرّہ ظہور تھا

کبھی کی جگہ میر نے اکثر و بیشتر کبھو استعمال کیا ہے۔ یہ بھی اُس عہد کی دلّی کی عوامی بولی کا اثر ہے آج بھی جامع مسجد کے علاقے میں عوام سے کبھی کی جگہ کبھو سننے میں آجاتا ہے۔ میر کہتے ہیں:

میں بھی کبھو کسو کا سر پُر غرور تھا

زبان میر کی خصوصیات سے بحث کرتے ہوئے بعض اُن باتوں کا ذکر بھی کیا جاسکتا ہے جو صوتی کیفیت یا آہنگ سے علاقہ رکھتی ہیں۔ مثلاً بعض الفاظ جن کے آخر میں ثقیل آواز ہو، وہ اس عہد کے دوسرے

شعرا کی طرح میر کے یہاں بھی خفیف آواز ہو جاتی ہے جیسے ہونٹھ کی جگہ ہونٹ۔ بھوکھ کے بدلے بھوک جھوٹھ کی بجائے جھوٹ یا ہاتھ کا مخفف ہات وغیرہ۔ مگر کہیں کہیں اس کلیہ کا استثنا بھی ہے مثلاً بھیک کی جگہ وہ بھیکھ ہی استعمال کرتے ہیں :

(۱) دلی میں آج بھیکھ بھی ملتی نہیں انھیں

(۲) دل تڑپے ہے، جان گھلے ہے، حال جگر کا کیا ہوگا

کبھی بحر کی پابندی اور وزن کی ضرورت پوری کرنے کے لیے میر نے مخفف کو اصلی روپ میں، یا اصل لفظ کو تخفیف کے ساتھ بھی لکھا ہے مثلاً میرا، مرا، تیرا، ترا، دیوانہ، دوانہ، کدھر، کیدھر، اُدھر، اودھر، پھر، پھیر، چند مثالیں :

(۱) مستند ہے میرا فرمایا ہوا

(۲) اشک نے بہ کے مرے چہرے پہ طوفان کیا

(۳) تیرا تو میر غم میں عجب حال ہو گیا

(۴) اے کشتۂ ستم تری غیرت کو کیا ہوا

(۵) کل میر کھڑا تھا یاں سچ ہے کہ دوانہ تھا

(۶) وہ صحبتیں کہاں گئیں کیدھر وہ ناؤ نوش۔ وغیرہ

محاورے اور ضرب الامثال

میر کے کلام میں محاورات اور ضرب الامثال کے استعمال بہت عمدہ ملتے ہیں ان میں بعض محاورے ایرانی روایت سے آئے ہیں، کچھ خالص ہندستانی تہذیب کی نمائندگی کرتے ہیں اور بعض میں ہند ایرانی مشترکہ تہذیب کا پرتو ملتا ہے۔ چند مثالیں یہ ہیں :

(۱) سحر کیا، اعجاز کیا، جن لوگوں نے تجھ کو رام کیا

(۲) پھاٹے میں پانوٗ دینے کو آئے کہاں سے تم

(۳) دیکھا اس بیماریِ دل نے آخر کام تمام کیا

(۴) دُکانیں حُسن کی آگے ترے تختہ ہوئی ہوں گی

(۵) بہتیرے عاشقی میں موئے سر کو پھوڑ پھوڑ

(۶) کیا جانوں دشمنوں نے کل اس سے کیا لگائی
(۷) کیا سر میں خاک ڈالتی ہے اب صبا کچھ اور
(۸) قیامت کی ہے جن نے آرسی تجھ کو دکھادی ہے
(۹) خدا نے دیکھنے کی لت سی آنکھوں کو لگادی ہے

میر کی شاعری میں زبان کی خصوصیات کے لحاظ سے جگہ کے بدلے جاگہ، نہ کی جگہ نے، وہاں کے لیے واں، یہاں کے بدلے یاں، جیوں جیوں کے لیے جوں جوں، کدھر کی جگہ کدھر کو، کیوں یا کس لیے کے محل پہ کاہے کو، آنکھ کی جگہ انکھڑیاں یا سنانا کے بدلے سناہٹا، وغیرہ الفاظ بھی ملتے ہیں جیسے:

(۱) کاہے کو یہ انداز تھا اعراضِ بتاں کا
(۲) سناہٹے میں جی کے گلستاں تلک گئے
(۳) صدقے ان انکھڑیاں لڑانے کے
(۴) کہ پیراہن میں سو جاگہ رفو تھا
(۵) کل اس کو دیکھیو تم نے تاج ہے نہ سر ہے

ان سب خصوصیات کے پیشِ نظر دیکھا جائے تو لسانیاتی نقطۂ نظر سے میر کی زبان اپنے انداز کی منفرد ہے، وہ حُسن، اثر انگیزی اور جامعیت میں اپنی مثال آپ ہی ہے۔

[یہ مضمون میر کے صرف اُن اشعار کا سرسری مطالعہ کرنے کے بعد لکھا گیا ہے جو ہندستانی بک ٹرسٹ بمبئی کے شائع کردہ دیوان میر میں شامل ہیں۔ شروع میں میرا ارادہ تھا کہ میر کا سارا کلام بنظرِ غائر پڑھنے کے بعد اس کی لسانی خصوصیات پر ایک سیر حاصل مضمون لکھوں گا، مجھے افسوس ہے کہ وقت کی تنگی کے باعث یہ ارادہ پورا نہ ہو سکا، یہاں میں نے فی الحال چند ہی بنیادی باتوں کی طرف سرسری اشارے کیے ہیں، ممکن ہے اس میں غلطیاں بھی رہ گئی ہوں، اگر ناظرین کرام اس مجلے کے مرتب کی وساطت سے مجھے خط لکھ کر میری غلطیوں کی طرف توجہ دلائیں گے تو میں ان کا شکر گزار ہوں گا]

وحید الدین سلیم

عہدِ میر کی زبان

شیکسپیر کی نسبت انگریزی ادب کے محققین نے یہ بات معلوم کی ہے کہ اس کی زبان میں وارک شائر کا اثر ہے۔ یہ ایک ضلع کا نام ہے جس کے ایک قصبہ میں شیکسپیر پیدا ہوا تھا۔ اس ضلع کی خاص زبان کی فرہنگ مرتب کی گئی ہے۔ اگر آگرہ کی خاص زبان کی فرہنگ مرتب ہو جائے تو اس میں ذرا شبہ نہیں کہ میر کی زبان میں اس خاص زبان کا اثر ضرور محسوس ہوگا۔ مثلاً 'کھسلنا' جو میر کی زبان میں ہے یا 'اور' کا لفظ جو طرف کے معنوں میں ہے آگرہ کی زبان کا پتا دیتا ہے۔ اور بھی بہت سے الفاظ ہوں گے جو آگرہ کی خاص زبان کا فرہنگ تیار ہونے پر معلوم ہو سکتے ہیں۔ اگرچہ ٹھیک سن معلوم نہیں ہے جس میں میر صاحب نے آگرہ سے دہلی کا رُخ کیا مگر یہ بات یقینی ہے کہ وہ باپ کے مرنے کے بعد جب دہلی میں آئے تو وہ جوان اور بالغ تھے اور شعر کہنا آگرہ میں شروع کر چکے تھے۔ اس لحاظ سے ضروری ہے کہ وہ کچھ نہ کچھ الفاظ اپنے وطن کی یادگار لائے ہوں گے مگر اس میں بھی شک نہیں کہ دلی پہنچ کر انھوں نے دلی کی زبان پر گہری توجہ مبذول کی۔ اور اس قدر مہارت پیدا کی کہ ان میں اور اہل زبان میں کوئی فرق نہیں رہا۔ لکھنو میں ایک موقع پر انھوں نے لوگوں سے کہا تھا کہ خاقانی، سعدی اور حافظ کا کلام سمجھنے کے لیے فارسی زبان کی فرہنگیں درکار ہیں۔ مگر میرا کلام کوئی نہیں سمجھ سکتا جب تک کہ وہ اس زبان سے واقف نہ ہو جو دلی کی جامع مسجد کی سیڑھیوں پر سنی جاتی ہے۔ فی الحقیقت میر صاحب نے محاورہ کے سامنے اس کی مطلق پروا نہیں کی کہ جن زبانوں سے الفاظ اردو زبان میں آئے ان میں اصلی شکل ان الفاظ کی کیا تھی مثلاً وہ مسجد کو مسیت۔ پلید کو پلیت۔ دستخط کو دسخط۔ شتاب کو شتابی۔ اضطراب کو اضطرابی۔ قرآن کو قران۔ امیری کو امرائی۔ خیال کو خیال (بر وزن حال)، نزدیک کو نزیک باندھ گئے ہیں۔

شاعری کے پہلے اور دوسرے دور میں ہندی الفاظ کثرت سے مستعمل تھے۔ تیسرے دور میں ان کی جگہ فارسی عربی الفاظ رواج پا گئے تھے لیکن اس دور میں بہت سے ہندی الفاظ رائج تھے جو چوتھے دور میں متروک ہوئے اور رفتہ رفتہ زبان فارسی عربی آمیز ہوتی چلی گئی۔ مثلاً تیسرے دور میں شام کی جگہ سانجھ، محبوب کی جگہ سجن، شہر کی جگہ نگر، جلائی کی جگہ برہ، ذرا کی جگہ تنک، چہرہ کی جگہ مکھ، خوشبو کی جگہ باس، دنیا کی جگہ جگ، ہوا کی جگہ باؤ پون وغیرہ الفاظ مستعمل تھے۔

اس دور میں بہت سے الفاظ زبانوں پر جاری تھے جن کی شکل چوتھے دور میں بدل گئی۔ مثلاً اُس زمانے میں مٹی کی جگہ ماٹی، لگا کی جگہ لاگا، پھٹنا کی جگہ پھاٹنا، کیچڑ کی جگہ کیچ، جگہ کی جگہ جاگھ، لہو کی جگہ لوہو۔ گھِسنا (بالکسر) کی جگہ گھَسنا (بالفتح)، ڈبویا کی جگہ ڈبایا وغیرہ الفاظ بولتے تھے۔

ولی کے زمانے سے میر کے زمانے تک بلکہ آگے چل کر غالب کے زمانے تک بھی شعرا برابر اس بات کی کوشش کرتے رہے ہیں کہ فارسی زبان کی ترکیبوں اور محاوروں کا ترجمہ اپنی زبان میں کریں اور اس طرح اردو میں نئی ترکیبوں اور نئے محاوروں کا اضافہ کیا جائے۔ ذیل میں اس کی مثالیں درج کی جاتی ہیں:

تر آمدن	تر آنا (شرمندہ ہونا)
تو گوئی	کہے تو (گویا)
نمود کردن	نمود کرنا (ظاہر ہونا)
حیف آناں	حیف وے (افسوس اُن پر)
خوش آمدن	خوش آنا (اچھا معلوم ہونا)
اے کہ۔ اے آنکہ	اے تو کہ۔ اے وہ کہ
درست کار داشتن	کسی کام میں درست ہونا (مہارت ہونا)
تو دہن ایں کار نداری	تو اس کام کا دہن نہیں رکھتا (یعنی لیاقت یا حوصلہ نہیں رکھتا)
گوش کردن	گوش کرنا (سننا)
بو کردن	بو کرنا (باس کرنا۔ سونگھنا)

خوابم برد یا ربود	مجھے خواب لے گیا (مجھے نیند آگئی)
زنجیر کردن	زنجیر کرنا (قید کرنا)
خاک بر سر کردن	سر پہ خاک کرنا (یعنی ڈالنا)
از عہدۂ چیزے بدر آمدن	کسی کام کے عہدہ سے برآنا (اس کام کو پورا کرنا)
با خاک برابر شدن	خاک سے برابر ہونا (خاک میں مل جانا)
سر بدیوار آمدن	دیوار سر پہ آنا (یعنی ٹکرانا)
نماز کردن	نماز کرنا (نماز پڑھنا)
خوشا حال کسانیکہ	احوال خوش انھوں کا (ان کا حال کیا ہی اچھا ہے)
ہمہ روے زمین گرفت	تمام روے زمین لیا (ساری زمین پہ چھا گیا)
دردِ سر دادن	درد سر دینا (تکلیف دینا)
سر فرو آوردن	سر فرو لانا (سر جھکانا)
سر فرو آمدن	سر فرو آنا (سر جھکنا)
رنجہ کردن	رنجہ کرنا (تکلیف پہنچانا)
قدم رنجہ کردن	قدم رنجہ کرنا (آنا)
تاب دادن	تاب دینا (بل دینا)
سر کشیدن	سر کھینچنا (غرور کرنا۔ نمودار ہونا)
داغ کردن	داغ کرنا (رشک سے جلانا)
داغ شدن	داغ ہونا (رشک سے جلنا)
بیک نگاہ ہم وفا نمی کند	ایک نگاہ کو بھی وفا نہیں کرتا (ایک نظر کے لیے بھی کافی نہیں)
وا شدن	وا ہونا (کھلنا مثلاً آنکھ کا) نیز بے تکلف ہونا۔
تسلی باش	تسلی رہ (تسلی سے رہ)
بہم رسیدن	بہم پہنچنا (حاصل ہونا)
جگر کردن	جگر کرنا (دلیری ظاہر کرنا)

سر کردن	سر کرنا (شروع کرنا)
طرح کردن	طرح کرنا (بنیاد ڈالنا)
طرف شدن	طرف ہوتا (مقابل ہونا) ہمسری کا دعویٰ کرنا۔
خوشا وقت آنکہ	وقت خوش اُن کا (ان کا کیا ہی اچھا حال ہے)
سرزد شدن	سرزد ہونا (باہر نکلنا مثلاً سبزہ کا)
تماشا کردن	تماشا کرنا (دیکھنا)
ساز کردن	ساز کرنا (سامان کرنا)
تعب کشیدن	تعب کھینچنا (تکلیف اُٹھانا)
راہ غلط کردن	راہ غلط کرنا (رستہ بھول جانا)
سفیدی کردن	سفیدی کرنا (بوڑھا ہونا)

بو از دہن می آید، بوے شیر از دہن می آید۔ بو آتی ہے دہاں سے (تم ابھی بچے ہو)

خو کردن	خو کرنا (عادی ہونا)
زبان کردن	زبان کرنا (زباں درازی کرنا)
نیاز کردن	نیاز کرنا (کسی کی طرف سر جھکانا)
گرد آمدن	گرد آنا (جمع ہونا)
تکلیف کردن	تکلیف کرنا (مجبور کرنا)
بروے کار آوردن	بروے کار لانا (ظاہر کرنا)
فرو شدن	فرو ہونا (دور ہونا مثلاً غم کا)
چشم دوختن	چشم سینا (طمع کرنا)
زبان تہ زبان داشتن	زبان تہ زبان رکھنا (منافقانہ باتیں کرنا)
گردن از مو باریک داشتن	گردن موسے باریک رکھنا (مطیع ہونا)

فارسی ترکیبوں اور محاوروں کے ترجموں کے علاوہ اس زمانے کے شعرا نے خالص فارسی کے الفاظ بھی جا بجا اپنے کلام میں استعمال کیے ہیں۔ یہاں چند ایسے مرکب الفاظ کی مثالیں درج کی

جاتی ہیں جن کو خود میرؔ نے اپنے کلام میں استعمال کیا ہے۔

تہ بال۔ کنج کاوی۔ سبحہ گرداں۔ پایاں کار ستم کشتہ۔ غبار ناتواں۔ پروانہ ساں۔ موج خیز دہر۔ سخن مشتاق۔ عاجز سخن۔ قادر سخن۔ حرف ناشنو۔ ناقباحت فہم۔ غنچہ پیشانی۔ شوق کشتہ۔ حلقہ درگوش ہنگامہ گرم کن۔ نمونہ یوم الحساب۔ حرف زیرلبی۔ دل غفراں پناہ۔ آفت دل عاشقاں۔ عہد فراموش کن۔ وارفتۂ بسیار گو۔ خاک افتادہ ویرانہ۔ سرنشین رہ میخانہ۔ غبار دیدۂ پروانہ۔ ذوق پیکاں دتیر۔ صفحۂ تصویر بے ہوشاں۔ درائے قافلہ ساں۔ شایستہ پریدن۔ سر بجیب تفکر۔ غرق بحر تحیّر۔ صحرا صحرا وحشت۔ دنیا دنیا تہمت۔ جہاں در جہاں غفلت۔ یک بیابان بےکسی و تنہائی۔ عالم عالم جنوں۔ دست زیر زنخ شدنی۔ برق خرمن صد کوہ طور۔ جوش اشک ندامت۔ پیشکش سادہ خود کام۔ صد سخن آغشتہ بخوں زیر زباں۔ یاس جوش دل و دل گرمی ایام وغیرہ وغیرہ۔

بعض پورے مصرعے فارسی ہیں مثلاً قابل آغوش ستم دیدگاں قدر ہفت آسمان ظلم شعار۔ دل خوبند بہ وصال دوام۔ وغیرہ

رفتہ رفتہ یہ بے بڑھتی گئی۔ غالبؔ کی ابتدائی شاعری میں اکثر اشعار ایسے ہیں کہ ان میں ایک آدھ لفظ مثلاً کا یا سے یا ہے اُردو ہے۔ باقی فارسی اور بعض اشعار میں تو ایک لفظ بھی اردو کا نہیں۔ خود میرؔ صاحب نے اپنے تذکرہ نکات الشعرا میں لکھا ہے کہ ریختہ کی چند قسمیں ہیں۔ اول یہ کہ ایک مصرع فارسی ہو اور ایک ہندی۔ دوم یہ کہ آدھا مصرع فارسی ہو اور آدھا ہندی۔ سوم یہ کہ حرف اور فعل بھی فارسی زبان کے لائے جائیں اور یہ نہایت قبیح ہے۔ چہارم یہ کہ فارسی ترکیبیں شعر میں لائی جائیں مگر وہ ترکیبیں ایسی ہونی چاہئیں جو زبان ریختہ سے مناسبت رکھتی ہوں۔ اس بات کو شاعر کے سوا کوئی نہیں پہچان سکتا کہ ترکیب غیر مانوس اور نامناسب بندش کا لانا سراسر عیب ہے۔ اور اس کا جاننا سلیقہ شاعری پر موقوف ہے۔ میں نے اپنی شاعری میں اسی بات کو پسند کیا ہے۔" مگر فارسی کی وہ ترکیبیں جو میرؔ صاحب نے استعمال کی ہیں اور جن کا ذکر ابھی ہوا ہے ان میں سے بعض ترکیبیں یقیناً ایسی ہیں کہ اردو زبان ان کا تحمل نہیں کر سکتی۔ لیکن میرؔ صاحب پر کون حرف رکھ سکتا ہے۔

جو زبان میرؔ کے زمانے میں جاری تھی اگر ہم اس کی گرامر پر غور کریں تو سب سے پہلے ہماری

نظر الفاظ کی تذکیر و تانیث پر پڑتی ہے۔ بہت سے الفاظ ہیں جن کی تذکیر و تانیث اس زمانے کی تذکیر و تانیث سے مختلف تھی۔ مثلاً اس زمانے میں ذیل کے الفاظ مذکر بولے جاتے تھے، سیر، دید، جراحت، جان، سطح، گشت، گلگشت، خلش، سوت (سرچشمہ)۔ الفاظ ذیل کو مونث بولتے تھے: تغلب، خواب، گلزار، مزار، نشتر، عشر وغیرہ۔

ندا کی حالت میں اور حروف مغیرہ کے ساتھ الفاظ کی فارسی جمع لاتے تھے اور اس میں کوئی تغیر نہیں کیا جاتا۔ مثلاً اے بتاں یعنی اے بتو، اے ہمصفیراں، بتاں کا عشق، آوارگاں کو۔ بلبلاں نے، موزوں طبعاں سے۔

عربی فارسی کے اسماء کے آخر میں ے لگا کر اس زمانے میں صفت بنا لیتے تھے مثلاً حیرتی، سفری، تلاشی (جس کو آج کل متلاشی بولتے ہیں) ودائی وغیرہ۔ صفت میں زیادتی کا اظہار منظور ہوتا تو بہت کی جگہ زور کا لفظ لگا دیتے، مثلاً زور مست، زور بے قرار۔ ایک لفظ فارسی اور ایک لفظ ہندی ملا کر بھی صفت بنا لیتے تھے۔ مثلاً کم گھیر، شیریں بچن وغیرہ۔ آج کل صفت عددی کے جو الفاظ غیر معین تعداد ظاہر کرنے کے لیے مستعمل ہیں ان میں سے ایک بعض کا لفظ ہے جس کی جمع بعضوں کی جگہ ایکوں کا لفظ بولتے تھے مثلاً ایکوں نے صبر کیا۔ ایکوں نے آہ وزاری کی۔

وہ اور یہ صفات ضمیری ہیں۔ ان کی جگہ اس زمانے میں کبھی وہ (بالفتح) کے الفاظ مستعمل ہوتے تھے۔ ضمیر شخصی واحد غائب حالت فاعلی میں کبھی وہ (بالضم) لائی جاتی تھی۔ کبھی وہ (بالفتح) اور کبھی وہ (بواو معروف بہ وزن یو) اگر اس کے ساتھ نے لانے کی ضرورت ہوتی تو اس کی جگہ ان نے کہتے۔ ضمیر شخصی جمع غائب فاعلی حالت میں لائی جاتی تو وے کہتے تھے۔ اضافی حالت میں انھوں کا اسی طرح جس نے کی جگہ جن نے اور کس نے کی جگہ کن نے بولتے تھے۔ جمع کی حالت میں جنھوں نے جنھوں کا۔ کنھوں نے کنھوں کا۔ نے اور کا کے علاوہ دیگر حروف ربط کے ساتھ بھی ان لفظوں کی یہی حالت ہوتی تھی۔ مثلاً انھوں سے۔ جنھوں کی۔ کنھوں تک ضمیر واحد مخاطب اور ضمیر واحد متکلم جب اضافی حالت میں لائی جاتی تو میرا اور تیرا کی جگہ مجھ اور تجھ کے الفاظ لائے جاتے تھے۔ مثلاً مجھ عشق یعنی میرا عشق۔ تجھ صفت یعنی تیری صفت۔ ضمیر جمع مخاطب اور ضمیر جمع متکلم حالت اضافی اور مضاف الیہ جمع مونث ہوتا تو کہتے تھے باتیں ہماریاں۔ راتیں تمھاریاں۔

ضمیر تنکیر کوئی کے ساتھ جب کوئی حرف ربط آئے تو اس کی تبدیلی آج کل کسی کے ساتھ ہوتی ہے مگر اس زمانہ میں یہ بات ضروری نہ تھی مثلاً " جوں جھنگیتی مسیں ہوں کوئی سرو نوجواں کی " ضمیر موصول جن کے مقابلے میں (جو جس کی جگہ لائی جاتی تھی) تن کا لفظ استعمال کیا جاتا تھا جس کے معنی ہیں - وہ -

فعل متعدی کے ساتھ اس زمانے میں نے کا لانا ضروری نہ تھا مثلاً کہتے تھے ہم شہر دیکھا۔ میں کام کیا۔ تم زید کو اداس کیا۔ میں اس ملک کی آب و ہوا تجربہ کی ہے۔ وغیرہ - لانا بھی فعل متعدی ہے مگر آج کل نے سے مستثنیٰ ہے۔ اُس زمانے میں تاباں نے لکھا " ہجر نے قیامت لائی "۔ یہی استعمال آج کل دکن میں ہے۔

فعل کے صیغہ جمع مونث غائب و متکلم میں آج کل لاحقہ ین لگایا جاتا ہے مگر اس زمانے میں لاحقہ اں لگایا جاتا تھا مثلاً آئیں اور لائیں کی جگہ آئیاں اور لائیاں یعنی وہ عورتیں آئیاں یا لائیاں۔ تم عورتیں آئیاں یا لائیاں۔ ہم عورتیں آئیاں یا لائیاں - اسی طرح پھولوں کی چھڑیاں لیاں۔ زلفیں کھلائیاں باتیں نہ مانیاں۔ یہ سب ماضی مطلق کی نشانیاں ہیں -

ماضی مطلق میں کہتے تھے آنکھیں ترستیاں ہیں۔ چنگاریاں برستیاں ہیں۔ آسمان نے کیا کیا شکلیں خاک میں ملائیاں ہیں -

ماضی بعید میں کہتے تھے - چہرے پر چھائیاں آئیاں تھیں - باتیں بہت بنائیاں تھیں -

ماضی ناتمام میں کہتے تھے - وہ آنکھیں مارتیاں تھیں - تم ہم سے ڈرتیاں تھیں -

ماضی احتمالی میں کہتے تھے - وہ آئیاں ہوں گی۔ مٹھائیاں کھلائیاں ہوں گی -

ماضی تمنائی میں کہتے تھے - کاش وہ لڑتیاں - کاش ان کی نگاہیں ہمارے دلوں میں گڑتیاں۔

فعل حال میں کہتے تھے - ہم مکان سجاتیاں ہیں، تم کاہے کو لڑتیاں جھگڑتیاں ہو؟ -

ماضی ناتمام کی پوری گردان اُس زمانے میں حسب ذیل تھی :

وہ ڈرے تھا۔ وہ ڈریں تھے۔ تو ڈرے تھا۔ تم ڈرو تھے - میں ڈروں تھا۔ ہم ڈریں تھے (مونث صیغے) وہ ڈریں تھیں۔ تو ڈرے تھی۔ تم ڈرو تھیں۔ میں ڈروں تھی - ہم ڈریں تھیں -

فعل حال کی گردان حسب ذیل طریقہ سے کرتے تھے :

وہ چلے ہے - وہ چلیں ہیں - تو چلے ہے - تم چلو ہو - میں چلوں ہوں - ہم چلے ہیں - یہ صیغے مذکر کے ہیں۔ مونث کے چھ صیغے بھی اسی شکل کے تھے -

ماضی ناتمام اور فعل حال کے ساتھ اگر کوئی فعل امدادی لایا جاتا تھا تو اس کی صورت حسب ذیل ہوتی تھی۔
(مذکر صیغے) وہ چلا جاوے تھا۔ وہ چلے جاویں تھے۔ (مونث صیغے) وہ چلی جاوے تھی۔ وہ چلی جاویں تھیں۔ تو چلی جاوے تھی۔ تم چلی جاؤ تھی۔ میں چلی جاؤں تھی۔ ہم چلی جاویں تھیں۔

یہ مثال ماضی ناتمام کی ہے۔ فعل حال کی مثال حسب ذیل ہے:
تو دکھائی دے ہے۔ تم دکھائی دو ہو۔ میں دکھائی دوں ہوں۔ ہم دکھائی دیں ہیں فعل امدادی لگانے کے بعد بھی فعل حال میں مذکر اور مونث کے صیغے یکساں رہیں گے۔ ان دونوں گردانوں کو دیکھ کر صاف معلوم ہوتا ہے کہ اصلی فعل اپنی جگہ پر بدستور رہتا ہے۔ مگر فعل امدادی میں تغیر ہوتا رہتا ہے۔

فعل کے صیغے جمع مونث غائب و مخاطب و متکلم کے آخر میں جب بجائے لاحقہ ین کے لاحقہ ان لگایا جاتا ہے تو ان صیغوں کے ساتھ فعل امدادی لانے سے صرف یہ تغیر ہوگا کہ اصلی فعل بدستور قائم رہے گا۔ اور لاحقہ ان فعل امدادی کے ساتھ لایا جائے گا۔ مثلاً ماضی مطلق میں تمام باتیں سمجھا دیاں۔ ہم مست ہو پڑیاں۔ ماضی قریب میں وہ نکاح کر بیٹھیاں ہیں۔ ماضی بعید میں یہ کتابیں ان کو دکھائیاں تھیں۔ ماضی احتمالی میں ساری نعمتیں چکھ لیاں ہوں گی۔ ماضی تمنائی میں کاش وہ فوجیں بکھر جاتیاں۔ فعل حال میں۔ ہم ہری ہری ٹہنیاں کاٹ ڈالتیاں ہیں۔

فعل کی مذکورہ بالا شکلوں کے علاوہ بعض اور شکلیں بھی ہیں جو اس زمانے میں رائج تھیں مثلاً ٹوٹ گیا کی جگہ ٹوٹا گیا۔ چھوٹ گیا کی جگہ چھوٹا گیا۔ پھوٹ گیا کی جگہ پھوٹا گیا۔ مرجھا گیا کی جگہ مرجھایا گیا۔ دیکھتا رہتا ہوں کی جگہ دیکھ رہتا ہوں۔ آتے ہیں کی جگہ آتے ہیں گے اور پوچھا کی جگہ پوچھنا کیا۔ وغیرہ۔

جن علامتوں میں علامت مصدر سے پہلے کوئی حرف علت ہے ان کے مضارع، مستقبل حال اور ماضی ناتمام میں فعل کے لاحقہ سے پہلے ایک واؤ بڑھا دیا جاتا تھا مثلاً بووے۔ کھاویگا۔ لیوے ہے۔ دیوے تھا۔

اگر ماضی مطلق یا ماضی تمنائی کے صیغے جمع غائب کے آگے اس زمانے میں کوئی حرف ربط نے اور کے کے علاوہ لایا جاتا تھا تو اس صیغے سے مصدری معنی مراد لیتے تھے۔ مثلاً مرگئے پہ یعنی

مر جانے پر۔ سر جھکے کا فائدہ کیا یعنی سر جھکنے کا۔ رکے رہتے جنون ہوتا ہے یعنی رُکے رہنے سے۔ کبھی حرف ربط حذف بھی کر دیا جاتا تھا۔ مثلاً آدم کی قدر جدا ہوئے ظاہر ہوتی ہے۔

ماضی معطوفہ کی شکلیں اس زمانے کی چار تھیں یعنی امر کے آخر میں کر یا کے یا کرکے یا تے بڑھاتے تھے مثلاً مرکر، ڈبوکے۔ مرکرکے۔ دیکھتے۔ جیسے میر کا یہ شعر ہے ؎

کسو کے بال درہم دیکھتے میر

ہوا ہے کام دل برہم ہمارا

اگر امر الف پر ختم ہوتا تھا تو ائے کر کا اضافہ کرتے تھے مثلاً ڈھائے کر، گائے کر، کھائے کر،

تمیز فعل جو وقت کے اظہار کے لیے آتی ہے۔ اس میں الفاظ جب، تب، آگے، ہمیشہ بعد ازاں کی جگہ الفاظ جد، تد، کد۔ آگو، بدان۔ جب نہ تب، نت اور بعد لائے جاتے تھے۔

اظہار سمت کے لیے اِدھر، اُدھر، جدھر کی جگہ ایدھر، اودھر، جیدھر، کیدھر لاتے تھے۔ اُور طرف کا مترادف ہے مثلاً دل کے اُور یعنی دل کی طرف۔ اسی طرح ذرا کی جگہ ٹک، تنک۔ بالکل کی جگہ نپٹ۔ نزدیک کی جگہ نزیک۔ پاس کی جگہ کنے۔ پر کی جگہ اوپر لایا جاتا تھا۔

تمیزوں میں سے الفاظ آگے۔ پاس۔ کنے۔ اوپر۔ بیچ۔ ساتھ کے استعمال میں اکثر ان سے پہلے حرفِ اضافت نہیں لاتے تھے۔ مثلاً پالکی آگے۔ مجھ پاس۔ ہم پاس۔ سب پاس۔ غیر پاس۔ کسی کنے۔ جھوں کنے۔ ان کنے۔ بلبل کنے۔ دوش اوپر۔ پالکی اوپر۔ ما حضر اوپر۔ تس اوپر۔ طویلے بیچ۔ سرا بیچ۔ دل ساتھ۔

حرف ربط میں سے نے کو بعض اوقات نیں لکھتے تھے۔ کو د معروف کے ساتھ بو کے وزن پر اور بعض دفعہ کوں جوں کے وزن پر بولا جاتا تھا۔ سے کی شکل ایک زمانے میں سوں تھی مگر میر کے زمانے میں سیں اور سیتی بھی لاتے تھے۔ تک کی جگہ تلک یا لگ استعمال ہوتا تھا۔ تئیں آج کل فقط اپنے ساتھ آتا ہے مگر اُس زمانے میں یہ لفظ بہت مستعمل تھا۔ کبھی اس کو حرف اضافت کے ساتھ اور کبھی بغیر اضافت کے استعمال کرتے تھے۔ یہ لفظ کبھی تک کے معنی میں آتا

تھا اور کبھی کو کے معنوں میں مثلاً یاں تئیں۔ کب تئیں۔ محشر تئیں (تک کے معنوں میں) اور دل کے تئیں۔ آقا کے تئیں۔

اپنے تئیں۔ میرے تئیں۔ رات کے تئیں (کو کے معنوں میں) پہ کی جگہ اوپر لاتے تھے جیسے ہونٹوں کے اوپر یعنی ہونٹوں پہ۔ میں کی جگہ بیچ آتا تھا جیسے چمن کے بیچ یعنی چمن میں۔ سوا بھی ربط کے لیے آتا تھا۔ پہلے زمانے میں اس سے پہلے حرف ربط لانا ضروری نہ تھا جیسے دل سوا یعنی دل کے سوا۔ سوا کی جگہ اُس زمانے میں دوسرا لفظ چھٹ آتا تھا۔ جیسے ان گلوں چھٹ یعنی ان گلوں کے سوا۔ چھٹ سے پہلے حرف اضافت نہیں لاتے تھے۔ تک، کو اور میں ایسے حروف ربط ہیں کہ وہ اکثر موقوں پہ حذف کر دیے جاتے تھے جیسے ہم وہاں دیر رو یا کیے یعنی دیر تک، دل کا حال مدت کہا یعنی مدت تک۔ میر تیرے کوچے سے آنے کہے ہے یعنی آنے کو۔ اپنے اعتقاد یعنی ہمارے اعتقاد یا خیال میں۔

میر کی زبان میں ایک خاص ترکیب ہے جو فارسی ترکیب کی نقل ہے اور جس میں مضاف مضاف الیہ کے درمیان سے حرف اضافت حذف کر دیا جاتا ہے مثلاً ہمیں سیر بہار خواہش ہے یعنی سیر بہار کی خواہش ہے۔ آج کل مروت قحط ہے یعنی مروت کا قحط۔ یہاں ایک تبسم فرصت ہے۔ یعنی ایک تبسم کی فرصت۔ اے ناصح تفحص فائدہ یعنی تفحص یا جستجو کا کیا فائدہ میں اس ملک کی آب و ہوا تجربہ کر چکا ہوں یعنی اس ملک کی آب و ہوا کا تجربہ۔ تیرا قصدا گر ترک پارسائی ہو یعنی تیرا ارادہ اگر ترک پارسائی کا ہو۔ انھیں بندگی خواہش ہے یعنی انھیں بندگی کی خواہش ہے۔ میں سب جہاں سیر کر چکا ہوں یعنی سب جہاں کی۔

واو عطف کا استعمال اُس زمانے میں شعرا عجیب طرح کرتے تھے۔ آج کل شاعر اس کو جائز نہیں سمجھے گا۔ اول۔ دو ایسے جملوں کے درمیان جن میں ہندی الفاظ شامل ہیں۔ مثلاً تلکے بدشت گردی و کب تک یہ خستگی۔ دوم۔ ایک فارسی لفظ اور ایک ہندی لفظ کے درمیان تھیڑہ و دہاں۔ سوم۔ دو ہندی لفظوں کے درمیان جیسے تو برا و تھان۔ چور۔

حرف علت سو مکرر جو جو کے مقابلے میں لایا جاتا تھا۔ مثلاً جو جو ظلم تم نے کیے سو سو ہم نے اٹھائے۔ ہم اس اور وہاں کے ساتھ حرف تخصیص ہی ملایا جاتا ہے۔ تو ہیں اسی اور

وہی کے الفاظ تیار ہوتے ہیں مگر اس زمانے میں ہم ہی، اس ہی، وہاں ہی اور وہ ہی الفاظ استعمال کرتے تھے۔

جوں اور جیسا حرف تشبیہ ہیں۔ ان لفظوں کی مثالیں حسب ذیل ہیں۔ جوں موج یعنی مانند موج، جیسے پکّا پھوڑا، پکّے پھوڑے کے مانند۔ جوں کے جس طرح بھی لیے جاتے تھے جیسے ع

"دل جانے ہے جوں رو کر شبنم نے کہا گل سے"

یعنی جس طرح رو کر۔ نمط، برنگ۔ بساں کے الفاظ بھی اسی غرض سے استعمال ہوتے تھے مثلاً صبح نمط یعنی مانند صبح۔ خامہ کے نمط یعنی قلم کی طرح۔ اسی نمط یعنی اس طرح۔ بہر نمط یعنی ہر طرح سے۔ برنگِ گل یعنی مانند گل۔ بسانِ ماہتاب یعنی چاند کی مانند۔

میرؔ کی زبان میں فارسی کا تا جس کے معنی جب تک جملہ کے اوپر لایا جاتا ہے مثلاً تا خرقہ کو نہ پھونکیے یعنی جب تک خرقہ کو نہ پھونکیے۔ بھلا سے اُس زمانے میں تعجب کا حرف تھا جیسے اللہ رے۔

اُس زمانے کی زبان کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ ترکیب اضافی میں اگر ایک لفظ ہندی کا ہوتا تھا تو فارسی اضافت لانے میں مضائقہ نہیں کرتے تھے۔ مثلاً مانند آرسی۔ پوشش چھینٹ۔ صاحب ارتھی۔ بیڑہ پان۔ اگر دو لفظوں کے درمیان حرف عطف اور ہوتا تو مرکب عطفی پہ بھی فارسی اضافت لے آتے تھے مثلاً جاے بود اور باش۔ بعض دفعہ مرکب عطفی کے درمیان حرف عطف نہیں لاتے تھے۔ اگر اس مرکب کے دونوں الفاظ کسی موصوف کی صفت ہوں تو ایک صفت کو موصوف سے ملا دیتے تھے اور دوسری صفت کو آزاد رکھتے تھے مثلاً دلِ مرحوم کا مغفور کا ذکر۔ جب کسی جملہ میں موصوف جمع مونث مبتدا ہوتا تھا تو خبر میں جمع مونث صفت لائی جاتی تھی۔ مثلاً یہ باتیں نہیں بھلیاں تمھاری ادائیں پیاریاں ہیں۔ راتیں اندھیاریاں ہیں۔ منزلیں کڑیاں ہیں۔ نیندیں بھاریاں ہیں۔

باب سوم

میر کی تصانیف

ریختہ رُتبے کو پہنچایا ہوا اُس کا ہے
معتقد کون نہیں میرؔ کی اُستادی کا

امتیاز علی عرشی

کلیاتِ میر کا ایک نادر نسخہ

رضا لائبریری رامپور میں میر تقی میر کے کلیات کا ایک بہت اچھا نسخہ محفوظ ہے۔ اس میں نکات الشعرا کے علاوہ اُن کی نظم و نثر کا سارا کام: دیوان اُردو (۶ تا ۶)، دیوان فارسی، فیضِ میر، اور ذکرِ میر شامل ہے۔

اس کی کتابت بھی اہتمام کے ساتھ کی گئی ہے۔ چنانچہ ذکرِ میر کو چھوڑ کر اور سب کتابوں کے شروع میں خوبصورت طلائی لوح، اور پوری کتاب میں رنگین جدول کھینچی گئی ہے۔ پوری کتاب کے اوراق کی تعداد ۸۲۳ ہے، اور فلسکیپ ناپ کا ۱۷ سطری مسطر کام میں لایا گیا ہے۔

کتابی کیڑوں نے اسے پڑھنے کی کوشش کی ہے۔ مگر شاید میر کی قنوطیت نے اُن کے کام و دہن پر اچھا اثر نہ کیا! اس لئے کتاب کے صفحے بدنمائی سے، اور اشعار کے لفظ قطع و بُرید سے محفوظ رہ گئے ہیں۔

دیوان اول کے خاتمے (ورق ۲۴۷ ب) میں کاتب نے لکھا ہے:

"دیوان اول من تصنیف میر محمد تقی صاحب بتاریخ بیست و ہفتم شہر رمضان سنہ یکہزار و دو صد و چہل و پنج ہجری، بخط بدربط فقیر حقیر پُرتقصیر بندہ شیخ لطف علی حیدری، حسب فرمایش مرزا صاحب کرم گستر مرزا قنبر علی صاحب دام اشفاقہ، اختتام پذیرفت"

کلیات کے آخر (ورق ۸۲۳ ب) میں لکھا ہے:

"الحمد للہ کہ بفضل ایزد مستعان و عنایات ائمہ علیہ الصلوات و السلام کہ کلیات میر محمد تقی صاحب غفر اللہ ذنوبہ بتاریخ سلخ شہر رمضان المبارک سنہ یکہزار و دو صد و چہل و شش ہجری بروز دوشنبہ یک پاس روز باقی ماندہ از خط بدربط احقر العباد شیخ لطف علی حیدری بپاس خاطر و فرمایش

مرزا قنبر علی صاحب زاد اشفاقہ صورت اختتام پذیرفت "

ان دونوں تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ لطف علی حیدری (غالباً یعنی شیعی) نے مرزا قنبر علی صاحب کے لیے ایک برس اور دو یا تین دن میں اسے لکھا، اور ۲۹ رمضان ۱۲۴۶ھ (۱۲۔ مارچ ۱۸۳۱ء) اس کی تاریخ اختتام تھی۔

اس کلیات کے فارسی حصّے (دیوان فیض میر۔ ذکر میر) کے بارے میں صرف اتنا کہنا ہے کہ اس میں ذکر میر کا پہلا ایڈیشن شامل ہے جو میر صاحب نے ۵۰ سال کی عمر میں لکھا تھا اور نسخۂ مطبوعہ کے صفحہ ۱۲۸ کی سطر ۹ کے اس مصرع پر ختم ہوتا ہے: "این شامت اعمال قیامت بسر آورد"

ہمارے نسخے میں اس مصرع کے بعد حسب ذیل عبارت بھی پائی جاتی ہے جو دوسرے ایڈیشن میں حذف کر دی گئی ہے:

"و آنچہ ظاہر است حسام الدین خاں درحقیقت از میان رفت، چراکہ بدستِ دشمنانِ جانی افتادہ است تا مقدور زندہ نخواہند گذاشت بیشتر اختیار خداست کہ او بر ہمہ چیز قادر است۔

احوالِ فقیر از سہ سال آنکہ چون قدردانی درمیان نیست، و عرصۂ روزگار بسیار تنگ است، توکّل بخدای کریم کہ او رزّاق ذی القوۃ المتین است کردہ بخانہ نشستہ ام ظاہر اسباب با اعزہ چند مثل ابوالقاسم خاں برادر خورد عبدالاحد خاں مجدالدولہ و وجیہ الدین خاں برادر حسام الدین خاں، و بیرم خاں صاحب خلف الصدق بہرام خاں کلان کہ در آدمی روشی یکتای روزگار خود اند، و قطب الدین خاں پسر سعد الدین خاں خانساماں اگرچہ سنّش کم است امّا فہم درستی دارد و خالی از سعادت مندی نیست، و قاضی لطف علی خاں کہ آدمیانہ می زید گاہ گاہ ملاقات کردہ می آید۔ خواہ از دست ایشان انتفاعی برسد یا نرسد۔ مایہ توکل ہمیں صاحبانند۔ و گاہی ایچنیں ہم اتفاق میشود کہ کسی فقیر و شاعر و متوکل دانستہ بطریق نذر چیزی میفرستد محلّ شکر است اکثر قرضداری باشم، و بعسرت تمام بسر میکنم " (ورق ۱۵۸ ب و ۱۶۸ الف)

کسی صاحب ذوق نے اس نسخے کے ابتدائی تین دیوان (دیوان سوم کی ردیف لام تک) بغور پڑھے ہیں۔ چنانچہ جگہ جگہ بین السطور اور حاشیوں میں الفاظ و محاورات کے معنی، مصرعوں اور شعروں کی تشریح اور قابل الفاظ درج کیے ہیں، جن میں سے اکثر اختلاف نسخ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ نیز میر صاحب کے بہت سے لفظوں کے عیوب گنائے اور اُن کی جگہ مناسب لفظ بھی اپنی طرف سے تجویز کیے ہیں۔

غالباً شعرائے اُردو کے کلام کے ساتھ یہ اعتنا اُس دور میں تنہا اس شخص نے کی ہے۔ اور یہ سب کچھ فارسی زبان میں کیا گیا ہے، جو اُس وقت کی مدرسی اور کاروباری زبان تھی۔

ذیل میں اس شرح و نقد کے کچھ نمونے ملاحظہ فرمائیے:

۱۔ تھا استعارِ حسن سے اُس کے، جو نور تھا ... خورشید میں بھی اُس ہی کا ذرّہ ظہور تھا

اس کے پہلے لفظ "تھا" کے نیچے لکھا ہے: "ہے باید"۔ دوسرے مصرع کے الفاظ "اُس ہی" پر لکھا ہے "جدا نوز لیسند" اور "ذرّہ ظہور" کی تشریح کی ہے: "ظہورِ اندک"۔

ہنگامہ گرم کن جو دلِ ناصبور تھا ... پیدا ہر ایک نالے سے شورِ نشور تھا

"ہنگامہ" کے معنی "شور" لکھے ہیں۔ "گرم کن" کے نیچے "بمعنی کنندہ است" اور اوپر "خوب نیست" لکھا ہے۔

۳۔ آتش بلند دل کی نہ ہوئی، ورنہ اے نسیم ... یک شعلہ، برقِ خرمنِ صد کوہِ طور تھا

"نہ ہوئی" کے نیچے لکھا ہے "عدم لفظ واو تخفیف ہمزہ، نشد"۔ دوسرے مصرع کے نیچے اُس کا مطلب تحریر کیا ہے: "یعنی اندک گرمی من سوزندۂ کوہ ست"۔

سردار جعفری صاحب کے نسخے میں "نہ ہوئی" کی جگہ "نہ تھی" چھپا ہے، اور تمام مطبوعہ نسخوں میں "نسیم" کی جگہ "کلیم" ملتا ہے، جو سیاق کے زیادہ مناسب ہے۔

۴۔ کل پاؤں ایک کاسۂ سر پر جو آگیا ... یکسر وہ استخوان شکستوں سے چور تھا

"کل" کے معنی "دیروز" لکھے ہیں، "آگیا" کے نیچے لکھا ہے "پڑ گیا باید" اور دوسرے مصرع کے معنی اس کے نیچے بتائے ہیں "استخوانہائی کاسۂ سر ریزہ ریزہ بود"۔

۵۔ کہنے لگا کہ دیکھ کے چل راہ بے خبر ... میں بھی کبھو کسو کا سرِ پُر غرور تھا

پہلے مصرع کے لفظ "بےخبر" کے نیچے لکھا ہے: "یعنی اے غافل"۔ اور دوسرے مصرع کے الفاظ "کبھو" اور "کسو" کے نیچے بتایا ہے کہ "زبان دہلی بود ندر حالا کبھی و کسی شدند"۔

اس عبارت سے مترشح ہے کہ شارح دہلی کے نہیں ہیں، بلکہ لکھنؤ اسکول سے تعلق رکھتے ہیں۔

۶۔ جامۂ مستیِ عشق اپنا مگر کم گھیر تھا ... دامنِ تر کا مرے دریا ہی کا سا پھیر تھا

پہلے مصرع کے نیچے لکھا ہے: "استفہام انکاریست۔ ای بسیار بود"۔

۷۔ شاید کسو کے دل کو لگی اُس گلی میں چوٹ ... میری بغل میں شیشۂ دل چور ہو گیا

مصرع اوّل کا مطلب بتایا ہے "کسی برباد من عاشق شد" اور دوسرے مصرع کے نیچے تحریر کیا ہے کہ "بہ رنگ وغیرت یار رقابت"

۸- فرہاد ہاتھ تیشے پہ ٹک رکھ کے ڈالتا   پتھر تلے کا ہاتھ ہی اپنا نکالتا

مصرع اول کے لفظ "رکھ" کی "ر" پر زبر اور پیش دونوں لگائے ہیں۔ دوسرے مصرع کے معنی بتائے ہیں: "برآوردن خود را از قید است۔ یعنی عشق را دور میکرد تا کہ ہلاک نمی شد"

لفظ "رکھ" میری دانست میں کاتب نے سہواً "رک" کی جگہ لکھ دیا ہے۔ مصحح نے اس بات کو محسوس نہ کیا ورنہ وہ اسے بفتح راکبھی نہ قرار دیتا۔

۹- گلبرگ کا یہ رنگ ہے، مرجاں کا ایسا ڈھنگ ہے   دیکھو نہ جھکے ہے پڑا وہ ہونٹھ لعلِ ناب سا

مصرع اول کے آخر میں لکھا ہے: "استفہام است یعنی بہ بینید"۔ دوسرے مصرع کے لفظ "نہ جھکے ہے" پر لفظ "بدلہ" لکھ کر حاشیے میں "جھکتا ہے" درج کیا ہے اور اس کے بعد لکھا ہے: "برائے لعل چمکتا ہے باید"

۱۰- مزا دکھا دیں گے بے رحمی کا تری صیاد   گر اضطراب اسیری نے زیرِ دام لیا

مصرع دوم کا مطلب لکھا ہے: "مارا کہ زیر دامیم، اگر بیقراری ما را گرفت، دام ترا خواہیم شکست"

۱۱- کو گل و لالہ، کہاں سنبل، سمن، ہم نسترن   خاک سے یکساں ہوئے ہیں ہائے کیا کیا آشنا

مصرع اول کے پہلے لفظ "کو" کے معنی "کجا" بتا کر لکھا ہے: "ازداد داو یک جا و حذف دز دیگر جا خوب نیست۔ بل یک طور باید"

۱۲- کھیل لڑکوں کا سمجھتے تھے محبت کے تئیں   ہے بڑا حیف ہمیں اپنی بھی نادانی کا

"کے تئیں" کے نیچے لکھا ہے "کو باید" اور دوسرے مصرع کے "بھی" کو بتایا ہے کہ "زائد و لغو است"

۱۳- منعم نے بنا ظلم کیا، گھر تو بنایا   پر آپ کوئی رات ہی مہمان رہے گا

مصرع اول کے لفظ "بنا" کے نیچے لکھا ہے "موقّت است۔ مگر رعایت ظلم باید"۔ اور "گھر تو بنایا" کے نیچے لکھا ہے "زائد است"

مطبوعہ نسخوں میں "بنا ظلم کی رکھ" ملتا ہے۔

۱۴- صد موسم گل ہم کو تہِ بال ہی گذرے   مقدور نہ دیکھا کبھو بے بال و پری کا

مصرع ثانی کے نیچے لکھا ہے: "مفلسئی من گاہے توانگری نشد کہ بباغ سیر رفتم"

۱۵۔ لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام   آفاق کی اس کارگہ شیشہ گری کا
اس شعر کے دوسرے مصرع کا مطلب لکھا ہے: "از دمِ شدید شیشہ ہنگام ساختن، می شکند۔ یعنی بسیار گفتگو موجب مُردنست۔"
۱۶۔ داغ آنکھیں سی کھل رہے ہیں سب   ہاتھ دستہ ہوا ہے نرگس کا
مصرع اول کے لفظ "آنکھیں" پر بدلہ لکھ کر حاشیے میں "آنکھوں" درج کیا ہے، اور مصرع دوم کے نیچے لکھا ہے "بشکل دانند چشمت۔" نسخہ آسی میں "داغ آنکھوں سے کھل رہے ہیں سب" مندرج ہے۔ لیکن میری ناقص رائے میں یہاں "آنکھیں سی" ہی درست ہے۔
۱۷۔ کبھو ہے چھیڑ، کبھو گالی ہے، کبھو چشمک   بیان کریے، جو ایک اُس کی بے ادائی ہو
"لفظ "کریے" کے نیچے لکھا ہے: "کیجیے باید۔"
۱۸۔ کس نے لی رخصت پرواز پس از مرگ نسیم   مشت پر باغ میں آتے ہیں پریشان ہوئے
اس کا مطلب لکھا ہے: "ای پر ما را اینقدر مہلت نشد کہ از گلہا حکم پرواز کردن گیرند۔"
۱۹۔ اے ہمصفیر، بے گل کس کو دماغ نالہ   مدت ہوئی ہماری منقار پر غبر ہے
مصحح نے قلف پر لفظ بدلہ لکھ کر حاشیے میں تحریر کیا ہے "جگر" اور مطلب بتایا ہو "ای قریب بہلاک رسیدم۔"

(ا) مثنوی در ہجو شاعراں

مثنوی در ہجو شاعراں کا پہلا شعر ہے:
۲۰۔ یہ موذی کئی نا خبردار فن   نئی ناگنیں جن کے ٹینگوں پہ پھن
اس کے دوسرے مصرع پر لکھا ہے: "ای خلاف وضع اند" پھر لفظ "پھن" پر لکھا ہے: "بر دہن می باشد" بعد ازاں لفظ "ٹینگوں" پر حاشیے میں تحریر کیا ہے: "انگشت زیر زبان دہقانی۔"
یہ آخری لفظ ایک پرانے ایڈیشن میں "ٹینگوں" چھپا ہے۔ لیکن بعد کی اشاعتوں میں "ٹیکوں" ہو گیا ہے۔
۲۱۔ سن اس ماجرے کو سبھوں نے کہا   کہاں کینچوے، اور کہاں اژدہا
مطبوعہ نسخوں میں دوسرا مصرع اس طرح ہے: "کہاں کینچوے یہ، کہاں اژدہا۔"
۲۲۔ حکایت بعینہ یہ ویسی ہے میر   سر راہ کہتا جو تھا اک فقیر
اور سب نسخوں میں پہلا مصرع یوں ہے: "حکایت بعینہ یہ دل سے ہے میر۔"
۲۳۔ گیا، ہوں اُنھوں سے بہت دور میں   ہوں اپنی جگہ شاد و مسرور میں

مطبوعہ نسخوں میں پہلا مصرع اس طرح ہے: " تو کیا نحوانحوں سے بہت دور میں "

(۲) مثنوی تنبیہ الجہال

اس مثنوی کا ایک شعر ہمارے نسخے میں یوں ہے:

۲۴- کذب جس جاگہ ہو رونق بخش سمع — وہاں کی دینداری ہے رکھو دل کو جمع

مطبوعہ نسخوں میں مصرع اول کے اندر، بجائے "جاگہ" "کے تجای" ہے۔ اور دوسرا مصرع یوں لکھا ہے: "واں کی دینداری رکھو اور دل کو جمع "

۲۵- جھوٹ آوے اس قدر جب درمیاں — کر یقین، ایماں کیسا، دیں کہاں

مطبوعہ نسخوں میں دوسرا مصرع ہے: "کر یقین، ایمان کیسا، دیں کہاں "

۲۶- وہ سراپا جہل ناآگاہِ کار — ہم سے تم سے کرنے لاگا افتخار

مطبوعہ نسخوں میں پہلا مصرع ہے: "وہ سراپا جہل ناگہ وقتِ کار "

۲۷- ہمارے نسخے میں:

اس قدر اس کا تنبہ تھا ضرور — تا خبر یہ پہنچے اب نزدیک و دور

کے بعد یہ شعر ہے۔

تا بلوں کی مار ناہموار کھائیں — تربیت ہونے کو استادوں کے جائیں

مطبوعہ میں یہ شعر اس طرح لکھا ہے:

جو سنے، سو خودسری سے باز آئے — تربیت ہونے کو استادوں کے جائے

۲۸- ہمارے نسخے میں دو شعر یوں ہیں:

قصّہ کوتہ، تھے میسّر درمیاں — سا ہے کو تھے گلّہ گلّہ شاعراں

اب جو دیکھو، ہر طرف ہے ازدحام — تنگ ہے کرم مزابل پر بھی کام

مطبوعہ نسخوں میں ان دو کی جگہ یہ ایک شعر ملتا ہے:

قصّہ کوتہ تھے میسّر درمیاں — تنگ ہے کرم مزابل پر بھی یہاں

(۳) مثنوی در ہجو نااہل

مطبوعہ نسخوں میں ایک مثنوی بعنوان "مثنوی در ہجو نااہل مسمّی بہ زبان زد عالم" شروع ہوتی ہے۔ ہمارے

نسخے میں اس کا عنوان ہے: "مثنوی در ہجو محمد بقا"۔ شارح نے اس کے مقابل لکھا ہے: "شاعر بود شناس" سے میں یہ قیاس کرتا ہوں کہ یہ مثنوی بقا اللہ خاں بقا کی ہجو میں ہوگی۔ بہر حال اس کا ایک شعر ہے۔

۲۹۔ ایک نے دیواں کی میرے نقل لی   مجھ دوانے کی کنھوں نے عقل لی

مطبوعہ میں دوسرا مصرع یوں ہے: "اس دوانے کی کنھوں الخ"

۳۰۔ مدعی میرا ہوا یہ بے ہنر   مردۂ صد سالہ سے بے نور تر

مطبوعہ میں دوسرا مصرع اس طرح ہے: "مردۂ صد سال سا بے نور تر"

۳۱۔ باپ اس کا سخت نادان نادرست   گھوڑے کی سی گندی بکلی قاق وسست

لفظ "کلی" پر شارح نے لکھا ہے: "مرادف بچھڑی است" اور "قاق" کے معنی "لاغر" (دبلا) بتائے ہیں۔ مطبوعہ نسخوں میں دوسرا مصرع یوں ہے: گوڑے کی سی گندی۔ تلی قاق وسست۔

۳۲۔ میں نے پاس اس کا کیا حد سے زیاد   پر بکی کرتا ہے یہ ابن زیاد

ہمارے شارح نے لفظ "بکی" کی بے کو معروف بتا کر اس کے معنی "بیہودہ گوئی" لکھے ہیں۔ مطبوعہ نسخوں میں اس کی جگہ "کمی" ملتا ہے۔

اس مثنوی، مثنوی در ہجو آئینہ دار کا ایک شعر ہمارے نسخے میں اس طرح ہے:

۳۳۔ سمجھے مرزا میر کو، مرزا کو میر   نے وہ رگ زن ہو نہ سمجھے شیر و شیر

دوسرے مصرع کے الفاظ "شیر و شیر" میں سے پہلے کے معنی شارح نے "اسد" بتائے ہیں، جس کا مطلب یہ ہوا کہ دوسرا لفظ دودھ کا مترادف ہے۔

مطبوعہ نسخوں میں یہ لفظ "سیر شیر" چھپے ہیں۔

(۴) مثنوی "تعریف آغا عبد الرشید"

اس مثنوی میں ایک شعر ہے:

۳۴۔ ایسا لکھنا کسو کی طاقت ہے   ہے جلی بھی، تو ایک بابت ہے

"بابت" کے معنی شارح نے "شئ عمدہ" بتائے ہیں۔

ہمارے اس شارح اور مصحح نے نسخۂ اصل کے حاشیوں میں وہ شعر بھی لکھ دیے ہیں، جو اس کے کاتب سے یا سہوا چھوٹ گئے تھے، یا منقول عنہ میں موجود نہ تھے۔ ان میں کچھ یہ ہیں:

ہر ذرہ خاک تیری گلی کی ہے بیقرار — یہاں کون سا ستم زدہ ماٹی میں مل گیا

شانِ تغافل اپنے تو خط کی کیا کہیں ہم — قاصد موا، تب اُس کے منہ سے جواب نکلا

مر گیا میں، ملا نہ یار افسوس — آہ، افسوس، صد ہزار افسوس

یہ غزل پوری کی پوری حاشیہ میں بڑھائی گئی ہے۔

جمشید، جن نے وضع کیا جام، کیا ہوا — وے صحبتیں کہاں گئیں، کیدھر وہ ناؤ نوش

نہ سمجھوں، گیا ابر کیا دیکھ کر — ہوا تھا مری چشم تر کی طرف

میں لہو پیوں ہوں غم میں عوضِ شراب، ساقی — شب تیغ ہو گئی ہے شبِ ماہتاب مجھ بن

مصحح نے اس کا التزام کیا ہے کہ متن کی معروف اور مجہول یاؤں کو ممتاز کرے۔ اس کے لیے اُس نے یاے معروف کے نیچے "ع" لکھا ہے، جو معروف کا مخفف ہے۔ یای مجہول کے نیچے یہ علامت (ف) بنائی ہے، جو بظاہر "ف" معلوم ہوتی ہے اور لفظ "خفیف" کا مخفف ہے۔

مصحح نے "شب تیغ" کے نیچے اُس کے معنی "شبخون" بتائے ہیں، مگر مطبوعہ نسخوں میں اس کی جگہ "شب میغ" ہے۔

کیسے کیسے روٹھے پھرے تم پر ہم تم کو منائے گئے — تم تیغ ناز اُٹھائے گئے، ہم فرقِ نیاز جھکائے گئے

قبلہ جو گر گرنے پہ میرے ایک نظر اُن کی نہ پڑی — بسمل ستم تھا اُن کو بہت، وہ تیغ پہ تیغ چلائے گئے

یہ دونوں شعر مطبوعہ نسخوں میں نادر ہیں۔ اس سے اور بھی اہم ہیں۔

لیکن مثنوی در ہجو نا اہل کے ۵۹ شعر ہمارے نسخے میں نہیں ہیں۔ نہ مصحح نے حاشیے میں ان کا اضافہ کیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ شعر کلیات میر کے ایک سے زائد نسخوں میں نہیں پائے جاتے۔

ہمارے نسخے میں کچھ نظم و نثر مطبوعہ سے زائد بھی ہے۔ میں نے اس امادے سے مقابلہ نہیں کیا اس لیے صرف دو شعر اور ایک طویل فارسی نثر نقل کرتا ہوں، جو مثنوی دریاے عشق سے پہلے بطور تمہید لکھی گئی ہے اور مثنوی کے قصے کو فارسی نثر میں دہراتی ہے۔

مثنوی در ہجو شاعراں میں یہ شعر زائد ہے:

غضب ہے کہ کھینچا ہے منڈوں نے سر — نکالے ہیں دو چار جینٹوں نے سر

مثنوی در ہجو آئینہ دار میں یہ شعر زائد ہے:

چھیڑیں نہ مجھ خاطر افسردہ کو — مردہ ہلکا جانتے اُکھاڑے سے نہ ہو

نثر فارسی حسب ذیل ہے :-

نثر مثنوی دریای عشق

عشق یعنی محبت مفرط ، در بیانِ این ملکهٔ فاضله که هیچ موجودی ازان خالی نیست ، زبانِ درازِ قلم قاصر است + اگرچه هر فرد کامل انسان دفترها دارد . رسالاتِ عشق انواعست + نظماً و نثراً جابجا نگاشته اند - چون خوب تأمل کنی سرازین مضمون برآری که از هزار یکی هم نتوانند که بزنگار د بیت سه جنابِ عشق را نازم که در هر کشوری دیدم : کتابی بر جبلی منبری ، پیغمبری دارد + عشق بی محابا چه بزرگانرا شور سرگر دیده چه جوانانرا جامه در خون کشید + دیدی که یعقوب چه دید + و بر سرِ شیخ صنعان چه رسید : یوسف را در زندان بگذاشت : پرده از روی زلیخا برداشت : دگوشه گیران رسوای بازار :

پہلوانان زار و نزار : شبلی با دلِ پُرخون رفت : بایزید از صومعه بیرون رفت : آن یکی را بر دار کشیدند : دیگر را پوست در بدند : صدرالدین را بدریا انداختند : نجم الدین را هلاک ساختند یکی غرق و دیگری حرق : یکی را تیغ تیز بر فرق : عالمی بر باد برفت : جهانی از شاد برفت : خلقی چنان گم شد که از یاد رفت : کسی به بستر غم افتاد : کسی بنومیدی جان داد : مجنون را بدشت دوانید : فرهاد را برسنگ نشانید : وامق دلسوخته فتیله مو : دل خراب شهره کو بکو : قمری طوق دار خسته : بلبل گرفتار شد : کتان همه تن چاک : ذره یکسان بخاک : حالات عشق را اختلاف : میدانِ معرکه اوصاف : خساره ازو گرد پاک : پهلو ازو دردناک : دردل از سوختگیش دودی : در چشم نگاهِ حسرت آلودی : کسی را از عشق شور در سری : کسی نشکل صورتِ دیوار بردری : پروانه از سوزِ عشق داغ : کف خاکستر او پای چراغ : جمعی مانند زلف پریشان : جماعتی چون آئینه حیران : شخصی از وطن آواره : شخصی را دل پاره پاره : یکی بر سر خاکی : دیگری در جگر چاکی : گریبان کسی یکسر دریده : دامن کسی بر روکشیده : جانِ کسی موقوفِ آهی : دیدهٔ کسی منتظر نگاهی : بساکس بالعب خاموش : بسیاری از عشق بیهوش : بسی را دردل مرض : کسی را مرد لِ خود غرض : بیدلی از عشق خمیازه کش : ناتوانی ازو در حالتِ غش : کسی از عشق بکنجی مرده : کسی بر سرِ راهی جان سپرده : گروهی از غمِ عشق دم بخود : بر سرِ گروهی قیامت شد : عاشقی را از عشق بر لب ناله : دالبی را جگر پرکاله پرکاله : نزلتیِ عشق نامدار : ناکام او کامگار : رفتهٔ عشق ناتوان : بیمارِ او گران : دردلی از و خواهش : درجانی همه کاهش : کسی را در عشق سفر در پیش : کسی در خانهٔ خود سر در پیش : شاهان در عشق فقیران : بیگانان اینجا اسیران : جائی از عشق ظالم تیز نگاه : جائی بدگمان تا خون همراه : عشق میسوزد ، عشق میسازد : عشق است که با خود عشق میبازد : رنگِ رُو از شکسته : مژگانِ چشم خون بسته : جای که از شعبدهٔ انگیخته : از خاکستر رنگ ناله

لہ اس کی نقل میں اصل املا کی پابندی کی گئی ہے لیکن یہ التزام نہ رہ سکا ہو تو اور بات ہے - (اڈیٹر)

ریختهٔ عشق گر کیمیا ساز است ؞ که عاشق ازو در گداز است ؞ جمعی پریشان گفتند که آسمان هم دل باختهٔ عشق است ؞ ندانستند که آنهم ساخته و پرداختهٔ عشق است ؞ رباعی: عشق را همسر و همتا عشق است ؞ با خدا عشق و خدا با عشق است ؞ کیست در خلوتِ وحدت گفتم ؞ آمد آواز که تنها عشق است ؞ حاصل که برقِ عالم سوزِ عشق خرمنِ عقل سوخت ؞ و جهانی از و جهان جهان درد و اندوه اندوخت ؞ رازِ عشق چون رسوا میشود ؞ جان عاشق مفت میرود ؞

حکایت در شهری ابروئی بود جوانِ رعنا ؞ در خوبی و تناسب اعضا یکتا ؞ گلبو و گل پیراهن ؞ افزایندهٔ رنگِ چمن ؞ بخوبی و خوش اسلوبی آراسته ؞ چون سروِ نوخاسته ؞ خوش چشم قامتِ بلندی ؞ معشوقِ عالم پسندی ؞ رنگین خرام رنگین ادا ؞ بهاری جلوه نما ؞ رنگش مهتابی ؞ لعلش عنابی ؞ طرزِ نگاه دلها کشیدی ؞ جنبش مژگان بجان خلیدی ؞ خود معشوقِ قرار داده ؞ دل بر بیقراری نهاده ؞ رفته رفته تماشای راه و روشِ دلبران ؞ عصر خوشِ ظاهرانِ فتنه درسران ؞ هر جا آهوی چشمی میدید ؞ عاشقانه چشمی میخرامید ؞ بیتابِ ملاقاتِ خوبان ؞ بیخواب از خیالاتِ محبوبان ؞ خودش طناز و پری رخسار ؞ از شوقِ خوبان چون پری بیدار ؞ پری دیوانهٔ پریرویان ؞ زنجیریِ اشتیاقِ سلسله مویان ؞ روزی بسببِ وحشتِ مزاج گرفتگی بر طبعِ نازکش کار مشکل کرده بود ؞ بسیرِ باغی رفت ؞ که شاید شگفتگی از دیدنِ گلها رو دهد ؞ سرد آهی برکشید و زار گریست ؞ رو بر روی گل نهاد و بسیار گریست ؞ برلبِ جوئی ایستاد ؞ در سبزه زاری افتاد ؞ پیچ و تابِ سنبل را دید ؞ از دلِ بیتاب آهی کشید ؞ بهر نهالی که رسید ؞ نوبادهٔ اشکی نمود ؞ در سایهٔ درختِ گل هزار نالی افزود ؞ از روشِ غنچه به بیتابی گذشت ؞ از بوی گلها بیدماغ گشت ؞ چون خاطرِ افسردهٔ او وا شدنی نشد، راهِ خانه سر کرد ؞ در رفتنِ راه دیوانگی بیشتر کرد ؞ ناگاه بر سرِ کوچه از مه پارهٔ دچار شد ؞ که از غرفه نظارهٔ عاشق روشی میکرد ؞ نگاهش بیهوش داروی بود که بیخود گردانید ؞ یا ناوکِ جگر دوزی بود که بخاک غلطانید ؞ آن از این سو رو گردانید ؞ این آواره بر درِ او ماند بیت عشقی که رفته رفته جنون آورد چه سود ؞ دیوانه گشتن از نگهِ اولین خوش است ؞ زیبائی او را چشمی رسید ؞ رعنائی او بخاکِ افتادگی کشید ؞ صبر و سکون از دلِ او رخت بست ؞ لباس دریده برخاک نشست ؞ چند روز بیخور و خواب افتاده ماند ؞ کس از رهِ رحم با او حرفی نراند ؞ رنگِ رخساره زرد شد ؞ دلِ خونین همه درد شد ؞ مژگان نمناک ؞ بر بدن خاک ؞ سخافتِ جسم و آشفتگی مو ؞ سربازی خاکِ آن سرکو ؞ نالیدی و گفتی ؞ با نسیمِ سحر گفتی ؞ رباعی، ای بادِ سحر که شدی عنبربار ؞ دانم که همی روی بسوی دلدار ؞ در کوچهٔ او دل است ما را زنهار ؞ آن سوخته را از ما به پرسی بسیار ؞ دیگر بگو که ای تغافل کیش ؞ رحمی بمن دلریش ؞ هنگامه بر سرِ من برپاست ؞ دمی اگر بیائی، تماشاست ؞ کارِ من برسوائی کشید ؞ کسی بدردِ من نرسید ؞ جائی و آشنائی ندارم ؞ از لطفِ تو امیدوارم ؞ چشمِ مشتاق

سوی تو بحسرت نگران است ؛ دل که رفته تست، از دوریت بیجان است ؛ بیا بیا که رفتنی در پیش دارم ؛ که جانِ بیقرار و دلِ ریش دارم ؛ خردمندان مرا دیوانه می شمارند ؛ من در راهِ توام، بدرادی سازند ؛ از نگاهِ پی در پیش که سوی آن خانه می رفت، پی بردند که این عاشق است، دیوانه نیست ؛ پدرِ آن دختر بدگمان شد ؛ در پی آزارِ این دل زده بیک پهلو افتادند ؛ و تهمت دیوانگی برو کرده طفلانِ شهر و ساکنانِ آن کوچه را رخصت آزار رسانیش دادند ؛ شاید که ازین جهت برخاسته بجائی رود ؛ و شور رسوائی که جهان جهان است، برطرف شود ؛ یکی سنگ زنان ؛ یکی ملامت کنان ؛ طفلان دیوانه گویان ؛ بان بان برگشت بی خم درد و توان ؛ قیامت بر سرِ آن رسوا ؛ او مستغنی و بے پروا ؛ شور و فتنه عجبی بر سر ؛ او روی دلش جانب دلبر ؛ پروایش نه که جانِ من میرود ؛ تماشیش گر به بنم چه میشود ؛ درین هنگامه یار هم می آید ؛ صورتِ خوب او روی نماید ؛ آزار لبِ یار از بسیار کشید ؛ خوبی در همان خاک نشینی دید ؛ این شعر میخواند- بیت

هوش از سر تاب از دل طاقت از پا رفته است ؛ حیف با از یک نگاهِ یار بر ما رفته است-

حیف با برادر رفت ؛ حرفِ حیف هم نگفت ؛ اذیت ها دادند، از انجا برنخاست ؛ منتظرِ آن ماه بود و بیکاست ؛ ازین قرار آن بیقرار ؛ پدرِ دختر ناچار ؛ تدبیری کرد و قرار داد ؛ که این ماه را ازین منزل بمنزلِ دیگر باید فرستاد ؛ چون آن پری در خانه نخواهد بود ؛ این دیوانه را کوچه بدر خواهد زد ؛ خانه آن نزدی آب که کنارِ شهر واقع بود، منظر داشت ؛ محافه را درست کرده، و سالخورده را همراه او داده، همت بر فرستادنِ آنجا گماشت ؛ که چند روز رفته بماند ؛ هرگاه دفع رسوائی شود ؛ رونق افزای خانه بود ؛ هرگاه محافه مطلوبه از برابر این گذشت، طپیدنِ دل ازینمعنی آگاه ساخت ؛ بهمان صورت بدنباله گردی پرداخت ؛ پس از طی دو سه کوچه و بازار ؛ آن بیطاقت، بیقرار ؛ از سوختگی عشق چون سپند نالید، و بآواز بلند گفت ؛ کای تمنای جانِ نیازمند ؛ و ای جمله ناز و خود پسند ؛ براه دوستی نمیروی ؛ آشنای ترحم نمیشوی ؛ بالای دلکشی داری ؛ و بر سر این خاک لیست نیامدی ؛ من خرابِ چشم تو بودم ؛ بلطف نگاه نکردی ؛ جسمِ زار من همه گداز گشت ؛ تو چون کیمیا بدست نیامدی ؛ من پامالِ راهِ تو گشتم ؛ تو این طرف گذاری نکردی ؛ من برای تو بیمار شدم تو از لطف مرا ندیدی ؛ من از درد و محنت زار شدم ؛ تو بتکلیف هم نرسیدی ؛ من فریاد زدم، در تو اثر نه ؛ من بیخبر شدم، ترا خبر نه ؛ لطفی نکردی که شاد از آن شوم ؛ رحمی نکردی که یاد از آن کنم ؛ بحالِ مرگ زنده ام ؛ از جان و دل شرمنده ام ؛ حیران کارم، چه سازم ؛ بےسر و پایم بچه سازم ؛ ای وای مهجوری و ناصبوری ؛ افسوس بدل نزدیکی و دوری ؛ سرِ دست من نگرفتی که افتاده (تو) ام ؛ دلدهی نکردی که دلدادهٔ توام ؛ آئینه ات فرصت نمیدهد ؛ که رو بسوی من کنی ؛ مشاطه ات نمیگذارد که این سو نمائی ؛ دماغم همگی بتو رفت، تو دماغی نداری ؛ فراغت از خود کردم،

تو فراغی نداری ∴ عزو جسنت که چه نماد که بمن پردازی ∴ نادت دل نمید هد که با بچو منی بسازی ∴ من از دست رفتم ∴ و دستم بتو نمیرسد ∴ من از پا افتادم ∴ کار پیش نمیرود ∴ چکنم که خود را بتو رسانم ∴ چه سازم که پیش تو بمانم ∴ دایهٔ غدار چون جتابی او دید ∴ و حرف ای درهم شنید ∴ بخود سنجید ∴ که این بیتاب چون ماهی بی آب میطپد ∴ بآب زنده بلاکش نمایم ∴ و از دریای رسوائی بکنار برایم ∴ گفت که ای دیوانهٔ عشق بیا بیا که خوش آمدی ∴ از حسن اتفاقات است ∴ این غیرت ماه منتظر بود ∴ دل جمعدار ∴ پریشان گوی مکن ∴ آنطرف آب فرود می آئی ∴ واصل مطلوب میشوی ∴ بهمکنار محبوب میشوی ∴ داد عشق میدهی ∴ از غم و رنج رهایی ∴ شراب عشرت میکشی ∴ بکام دل خود میرسی ∴ نیت بجا است ∴ کامت بکام است ∴ حاجت روا است ∴ اضطراب چرا است ∴ آن دل باخته بسخن های ساختهٔ او گونه تسلی شده، لب از فریاد و زاری بست ∴ و روی جبین را که بناخن نخسته بود ∴ دست ازان کار باز داشت ∴ آلب آب خاموش دنباله کرد ∴ محافه آن غزاله سیاه چشم شد ∴ چون برکنارهٔ دریا آسمان رنگ رسیدند ∴ کشتی چون هلال نو دار شد ∴ آوردند محافه را درون بردند ∴ این دیوانه برسر چون دریا جوشان و خروشان میدان کشید ∴ و بیک جست در سفینه رسید و نشست ∴ وقتیکه بقعر دریا کشتی رسید ∴ دایهٔ مکاره کفشی از پای آن گلرخسار پرده نشین برآورده بر سطح آب که چون آئینه بود، برتافت ∴ و گفت کای کشتهٔ عشق بی محابا ∴ وای دیوانهٔ پریرخساران رعنا ∴ پاپوش آن تمنای جان که تو رفتهٔ آنی، در آب افتاد ∴ و با مواج گوناگون دریا همکن راست ∴ غیرتت کجا رفت ∴ بگیر آخر پاپوش یار است ∴ برو و بیار ∴ و خود را معاف مدار ∴ پای نگارینش آلوده و برهنه خواهد ماند ∴ آزردی آب فرود آمدنست ∴ و دران نواح برای سیر شدنست ∴ مبادا بکف پایش آسیب خاری رسد ∴ یا آن رشک گلبرگ تر غباری رسد ∴ پای رنگینی که برسرش باید داشت ∴ حیف است که باد گرد ناپاک بوسه دهد ∴ و قدم حنائی که بچشم باید گذاشت ∴ افسوس که بخاک گرم راه رود ∴ چه میسگالی ∴ در چه خیالی ∴ آن عاشق ناشکیب بیتاب شده خود را بآب انداخت ∴ و بگل کفش آن سرمایهٔ جان چون بلبل بیقرار رسیده جان باخت ∴ امواج دریا آغوشها کرده وکشاده بیرش تنگ گرفتند ∴ و تهٔ آب بردند ∴ شوری شد که کسی غرق گشت ∴ سعی آشنایان فایده نداد ∴ آن گوهر تر رو بخاک تهٔ دریا نهاد ∴ و دایهٔ حیله گر دلخوش شده ∴ کشتی را ازان دریای تنگ گیر از باد تیز تر روان ساخته آزردی آب رفت ∴ در بجانهٔ آشنای پدر دختر مصلحتاً اقامت کرد ∴ غافل ازین که جذب عشق درکمین است ∴ و دل آن ماه پاره بجا نیست ∴ هر روز از غم میکاهد ∴ و وحشت مغزلهٔ تنها تنها میگشت ∴ درخیال آن غریق دریا از مردمان کناره دریای بود ∴ گاهی از غم دم سرد میکشید ∴ گاهی از افسوس پشت دست میگزید ∴ بیت بلاست عشق نهان کردن، این همان برقست ∴ که سوخت خرمن مستوری زلیخا را ∴ چون

هفته بر بس نگذشت ٭ دایه از فریب حرف زن گشت ٭ که آن تنگ عالم از میان رفت ٭ بلکه بصبری کرد از جهان رفت ٭ حالی که مرا اینجا تنها بداشته اید، بهر که ٭ در خانهٔ بیگانه تنها گذاشته اید برای چه ٭ اکنون ناموس نمیرود ٭ ننگی عاید نمی شود ٭ مرا بخانه ببر ٭ ادر مهربان را به بینم ٭ با پدر مشفق ملاقات نمایم ٭ در کاشانه بازی گرایم ٭ بهمدمان سر داستان کشایم ٭ در راه از دریا گذشتن است ٭ لجه و لطمه و امواج و تری آنرا تماشا خواهم کرد ٭ این سیر از اتفاق است ٭ در خانه کجا دست بهم میدهد ٭ چون نام هوا و فضاء دریا و صحرا میشنویم ٭ بحسرت می نگریم ٭ دایه از فریب عاشق غافل بود ٭ ندانست که این ماه پاره ناشکیب است ٭ سخنهای این پرفریب ٭ گفت که سرت گردم ٭ بلا گردانت شوم ٭ مانع رفتن خانه کیست ٭ فتنهٔ خوابیده ٭ شور تهمت رفته ٭ برخیز و مهیای خانه شو ٭ بطوریکه خواسته باشی ٭ بطرفی بردن رفت ٭ و محافه را تیار کرده آورد ٭ خود و آن مایهٔ جان سوار شده راهش گرفتند ٭ نزدیک آب از دوری آن عاشق بیتاب ٭ حال دختر دگرگون شد ٭ دلش از جوش اندوه خون شد ٭ عشق در جگر آتشی بر کرد ٭ بی اختیار گریه و زاری سر کرد ٭ نفسی چند حیران کار ایستاد ٭ بانو کشتی نشست ٭ و لب کشاد ٭ که آن فرومایه بیطاقتی کرده ٭ کجا در آب غرق گردید ٭ نشان آنجا را بمن بده ٭ من هم بر جوش و خروش آب ٭ و کثرت امواج و گرداب و حباب نظری افگنم ٭ دایهٔ مکاره غافل از این کار ٭ در وسط دریا رفته گفت ٭ آن آشفته طبع پریشان گو اینجا افتاده و در آب فرو نشست ٭ این بیتاب عشق کجا کجا کرده از محافه خود را بآب انداخت ٭ و چون بیک چشم زدن کار خود ساخت ٭ امواج زنجیرهای زلفین او شده بهم کشیده بردند ٭ رفت و در کنار عاشق مرده بکام جان خوابید ٭ کشش عشق دیدی که چه کار کرد ٭ این ماجرا بسیار آب برد ٭ دایه دست و پا گم کرده ٭ افتان و خیزان رفته بوارثان او خبر داد ٭ که آن دُرِ مکنون بدریا افتاد ٭ جماعتی گریه کنان از ملاحان ملتجی گشتند ٭ و دامها انداختند ٭ بعد از تجسس و تلاش بسیار آن هردو بیجانان را اسیر دام ساختند ٭ و وصلی وار همه تن بهم چسپان اختلاطی از آب بر آمدند ٭ که بنوشتن راست نمی آید ٭ بدشواری از هم جدا کردند ٭ و برابر خاک در آوردند ٭ همه حیران کار عشق بودند ٭ دستها از افسوس میسودند ٭ میر اگر نوشتن حالات عشق هوس است ٭ همین قدر بس است ٭ بیا و ترک هوس کن ٭ خامه را بگذار و بس کن ٭ عشق شعبده باز است معروف و مشهور ٭ تصرفاتش بر السنه مذکور ٭ چون شعبده سر میکند ٭ از آب آتشی بر میکند ٭ از عاشق مرده کار میگیرد ٭ عشق برای او می میرد بیت عشق از محیط شعبده چون سر بر آورد ٭ از پردهٔ محیط سمندر بر آورد ٭

تمت بالخیر نثر دریای عشق

کلیات میر کے اس ایک نسخے میں سے صرف دیوان اول کے چند اختلافات اور اضافے دیکھ کر آپ کو اندازہ ہو گیا ہوگا کہ ان میں سے کچھ نہ کچھ ضرور قابلِ غور ہیں۔ ساتھ ہی آپ نے یہ بھی محسوس کیا ہوگا کہ میر جیسے استاد کا کلیات نہیں،

کوئی ایک دیوان بھی اس اہتمام سے شائع نہیں کیا گیا، جس کا وہ مستحق تھا۔ میر اُن استادوں میں مانے جاتے ہیں، جن کا ایک ایک لفظ زبان کے لیے سند کی حیثیت رکھتا ہے۔ لغت اور قواعد اردو کی کونسی معتبر کتاب ایسی ہوسکتی ہے جس میں ان کے کلام سے استشہاد نہ پایا جاتا ہو۔ پھر کیا بحالاتِ موجودہ یہ بات آسانی ممکن نہیں کہ جس لفظ یا محاورے کو اہلِ لغت یا صاحبانِ قواعد میر کا جان کر نقل کر رہے ہوں، وہ سرے سے میر کا رہینِ قلم ہی نہ ہو، بلکہ کاتب کا سہو یا اُس کا تصرّف ہو۔ ایسی صورت میں لغت اور قواعد دونوں سنورنے کی جگہ اُلٹے بگڑ جائیں گے۔ اور اُردو پر یہ ظلم اُردو کے دوستوں کے ہاتھوں ہوگا۔

دنیا کی کوئی ترقی یافتہ زبان ایسی نہیں جس کے اساتذہ کا کلام نظم و نثر اپنی صحیح ترین شکل میں شائع نہ ہو چکا ہو۔ اُردو باوجود ترقی یافتہ ہونے کے اس معاملے میں بڑی بدنصیب ہے۔ اُس کے دلدادہ اپنی آنکھوں کی خاطر تو دو چار خوبصورت کتابیں چھاپ چکے ہیں، لیکن خود زبان کی صحیح شکل کی بقا کے لیے کچھ کرتے نظر نہیں آتے۔ علی گڑھ، دہلی، لکھنؤ اور الہ آباد کے اُردو شعبے بڑے دیدہ ور اساتذہ کی نگرانی میں کام کر رہے ہیں۔ اگر وہ ادھر توجہ کریں، تو چند سال کے اندر میر اور سودا جیسے اساتذہ کا کلام خوب اور خوبتر نہیں، بلکہ خوب ترین صورت میں اربابِ علم کے ہاتھوں تک پہنچ سکتا ہے۔

کیا اچھا ہو اگر ان مرکزوں کے اساتذہ مل کر ایک جامع اسکیم تیار کریں، اور پھر تقسیمِ کار کر کے اپنے پی ایچ ڈی اور ڈی لٹ کے طلباء سے ایک ایک دیوان ایڈیٹ کرا کے حکومتِ ہند کی مدد سے چھاپ دیں۔ اس کے بعد اہلِ مطابع اور تاجرانِ کتب جس کو مقبول دیکھیں گے، از خود شائع کرتے رہیں گے۔

ابھی دس پانچ برس تک "وبائے تحقیق" کو پھیلانے کی ضرورت ہے۔ اگر یہ وبا نہ پھیلی، تو اربابِ نقد کے لیے صالح خام مواد ملنا دشوار ہو کر رہ جائے گا۔ ہم سب کو یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ ہوا میں محل ابھی تک بننا شروع نہیں ہوئے نیز فلک بوس عمارتوں کے لیے اور زیادہ مضبوط زمین درکار ہوتی ہے۔

قاضی عبدالودود

کلیاتِ میر کی اوّلیں اشاعت

(ا)

(۱) کلیات[1] میر کی اشاعتِ اولیں کے سرورق میں جو عبارات ہیں وہ ذیل میں مندرج ہیں ایک سطر کو دوسری سے جدا کرنے کے لیے نشان سے دیا گیا ہے،

"کلیات[2] میر تقی مدرسۂ عالیہ کے لیے نوازش و تفضلات سے صاحبان / کالج کونسل کے عہد حکومت میں زبدۂ نوئینان عظیم الشان مشیر / خاص شاہ کیواں بارگاہ انگلستان لارڈ منٹو گورنر جنرل / بہادر دام ظلہ کے حسب الارشاد کپتان تیلر صاحب / مدرس ہندی دام اقبالہ اور / اعانت و پرورش سے ڈاکٹر / ولیم ہنتر صاحب / دام حشمتہ / اور عنایت و کرم سے کپتان گالوی صاحب دام تردتہ اور مرحمت / و امداد سے کپتان تامس روبک صاحب / دام افضالہ کی تصحیح مرزا کاظم علی جوان اور مرزا جان طپش و مولوی محمد اسلم / و تارنی چرن متر و منشی غلام اکبر / سنہ ۱۸۱۱ عیسوی میں مطابق سنہ ۱۲۲۶ ہجری ہندوستانی / چھاپے خانے میں چھاپا / کیا ہوا منشی / امداد بخش / کا کلیات کے آخری[3] ورق کا کم و بیش دو ثلث ضائع ہو گیا ہے، جو ٹکڑا باقی ہے اس میں مرقوم ہے :

COLLEGE OF FORT WILLIAM, AND EDITED BY -
LEARNED MOONSHEES ATTACHED TO THE COLLEGE.
CALCUTTA. PRINTED AT THE HINDOOSTANEE -
PRESS BY A. H. HUBBARD. 1811.

---

[1] پیشِ نظر کرم خوردہ ہے اور علیخاں لائبریری حسین آباد ضلع مونگیر سے ادارہ تحقیقات اردو پٹنہ کی ادبی نمایش کے لیے آیا ہے۔
[2] ہر لفظ ٹھیک اسی طرح جیسا کہ سرورق میں ہے۔ [3] اس ورق کا ص ۱۰۲۵ سے تعلق نہیں۔

۲) کلیات کا آغاز قصائد سے ہوتا ہے، ص۱ میں بسم اللہ الخ کے بعد پہلے "قصایدات (کذا) در منقبت وغیرہ" بطور عنوان اور پھر ایک قصیدے کے ۱۰ شعر ہیں، اس قصیدے کا مصرع اول یہ ہے: جب سے خورشید ہوا ہے چمن افروز حمل۔ قصائد، ہیں (ص۱ تا ص۱۵ صفحہ ۸ تا ص۲۵۳)، طویل ترین قصیدہ ۷۷ اشعار کا ہے اور سب سے چھوٹا ۴۰ اشعار پر مشتمل ہے۔ آخری قصیدے میں ۹ اشعار کی ایک غزل بھی شامل ہے۔ تعداد اشعار قصائد ۹ ۳ ۳۔

۳) دیوان ا (ص۱۹ تا ص۲۵۲) کے صفحۂ آخر میں ردیف ی کی آخری غزل کے بعد ردیف الف کی ۳ غزلیں تین تین ابیات کی ہیں، ایک کا مقطع اور دو کا مطلع درج ذیل ہے:

وصیت میر نے مجھ کو یہی کی   کہ سب کچھ ہونا تو عاشق نہ ہونا

اس آستانِ داغ سے میں زر لیا کیا   گل دستہ دستہ جس کو چراغی دیا کیا

بیٹا ہیوں کے جور سے میں جیکے مرگیا   ہوکر فقیر عبیر مری قبر پہ گیا

ان دو غزلوں کے بعد دو شعر ہیں، جن کا پہلا مصرع نقل کیا جاتا ہے: "کیا خط لکھوں میں رو نے سے فرصت نہیں رہی"، "سبھوں کے خط لیو پوشیدہ قاصد آج جاتا ہے"۔ ان دونوں اشعار سے قطع نظر اس دیوان میں ۶ فردیں ہیں (صفحات ۱۰۵، ۱۰۶ و ۱۱۵) اس میں ایک زمین کے دو دو شعر بھی پائی جاتی ہیں جن کی مجموعی تعداد ۸ ہے (صفحات ۱۰۶ و ۱۰۷، و ۱۱۵ و ۱۳۱)۔ تعداد اشعار دیوان ۴۲۹۶ آخر میں یہ عبارت: "تمام شد دیوان میر تقی عفی اللہ عنہ"۔

۳) دیوان ۲ (ص۲۵۵ تا ص۴۳۵) میں ایک زمین کے دو شعر ایک جگہ میں (ص۳۰۳) اور اس کی ایک غزل (۷۰ ابیات، مصرع ا: "منہ تکا ہی کرے ہے جس تس کا" ص۲۵۶+) دیوان ا (ص۲۳) میں بھی ہے۔ اس میں ۳۲ ابیات کی ایک مسلسل نظم بھی ہے جسے قطعہ کہنا چاہیے، مصرع ا: "اے صبا گر شہر کے لوگوں میں ہو تیرا گذار" ص۳۲۵ + تعداد اشعار دیوان ۳۴۲۱۔

۴) دیوان ۳ (ص۴۳۵ تا ص۵۳۵)، فردیں ۲ (صفحات ۴۷۴ و ۵۰۴)، ایک زمین کے دو دو شعر ہیں (صفحات ۴۷۴ و ۵۰۹)۔ تعداد اشعار دیوان ۲۳۶۰۱۔ آخر میں یہ عبارت: "تمام شد دیوان سوم میر تقی عفی اللہ عنہ"

۵) دیوان ۴ (ص۵۳۵ تا ص۶۱۱) ۹ فردیں (صفحات ۵۶۰، ۵۶۲ و ۵۶۶، ۵۶۸ و ۵۶۹ و ۵۹۴) اور ۱۲ ایک زمین کے دو دو شعر، صفحات ۵۴۶ و ۵۵۲ و ۵۶۱ و ۵۶۹ و ۵۷۵) میں۔ تعداد

اشعار دیوان ۱۵۱۲

۶) دیوان ۵ (ص۶۱۱ تا ص۶۵۰) میں ۸ فردیں (صفحات ۶۲۶، ۶۳۵، ۶۳۶، ۶۵۰، ۶۵۳ و ۶۷۱) اور ایک زمین کے دو دو شعر ۱۰ (صفحات ۶۳۲، ۶۳۴، ۶۳۶، ۶۴۴، ۶۴۸) ہیں۔

ص۶۱۱ میں ۳ اشعار کی ایک غزل "ای بگیلا یہ تمی کہاں کی ادا الخ" ہے، دیوان ۲ ص۳۰۱ میں اس زمین کے ۵ اشعار جن میں یہ ۳ بھی موجود ہیں۔ ص۶۱۲ میں ۶ اشعار کی ایک غزل جس کا ایک شعر یہ ہے:

تو تمکین سے کچھ نہ بولا وگرنہ تو کاہیکو الفت سے میں ساز کرتا

دیوان ۲ ص۳۰۲ میں اس زمین کے ۷ اشعار ہیں، جن میں سے ۲ یہ ہیں:

جو جانوں کہ در پہ ہے استادہ دشمن تو کاہیکو الفت سے میں ساز کرتا

تو تمکین سے کچھ نہ بولا وگرنہ مسیحا صنم ترک اعجاز کرتا

دیوان ۵ کے شعر تو تمکین الخ کو دو شعر سمجھنا چاہیے، دونوں کا ایک ایک مصرع جو اس دیوان سے غیر حاضر ہے۔ دیوان ۲ میں موجود ہے۔ اس غزل کے باقی شعر (بعض مصرعوں میں خفیف فرق) بھی دیوان ۲ میں ہیں۔ ص۶۱۸ کی غزل "عید آئندہ تک رہیگا گلہ الخ" کے تینوں شعر دیوان ۲ میں بھی (ص۳۰۲) پائے جاتے ہیں۔ ص۶۱۹ میں یہ غزل ہے:

سمندر کا میں کیوں احسان سہونگا نہیں کیا سیل اشک اس پر بہونگا

تیرے غم کے ہیں خواہاں سب کھا غم کمی کیا ہوگی جو اک میں نہ ہونگا

نہ وہ آوے نہ جاوے بیقراری کسو دن میر یوں ہی مر رہونگا

دیوان ۲ کے ص۳۰۳ میں یہ تینوں شعر (دو میں کسی قدر اختلاف) اس زمین کے ایک اور شعر کے ساتھ ملتے ہیں۔ ص۶۲۱ میں ۵ اشعار کی ایک غزل ہے جس کا مصرع ۱ یہ ہے: "دل گیا مفت اور دکھ پایا" یہ غزل باستثنائے مقطع دیوان ۲ کے ص۳۰۳ میں بھی ہے۔ ص۶۲۱ میں ۴ اشعار کی ایک غزل ہے: "بیتابیوں کے جور سے میں جیب کے ذکہ مرگیا الخ" یہ باستثنائے شعر ۳ دیوان ۱ کے صفحہ آخر میں ہے۔ ص۶۲۳ میں ۵ اشعار کی ایک غزل ہے، اس کا ایک شعر دیوان ۱ کے صفحہ آخر سے نقل ہو چکا ہے: وصیت میر الخ۔ ص۶۸۴ کی ایک غزل کا مطلع "کیا خط الخ" دیوان ۱ کی بحث میں نظر سے گزرا ہوگا، یہ اس دیوان میں بھی ہے۔ تعداد اشعار دیوان ۲۰۳۷۔

۷) دیوان ۶ (ص۶۰۰ تا ص۶۶۸) کے ص۶۳۹ و ص۶۴۲ میں ایک زمین کے دو دو شعر ہیں، تعداد اشعار دیوان ۱۲۲۹۔ کل دواوین کے اشعار کی مجموعی تعداد ۱۴۳۴۱ ہے، اس میں ۱۳۱ اشعار جو مکرر ہیں، اور پیام کا دو شعروں کا قطعہ ص۴۲، شامل ہیں۔ فردیات ۲۷، ایک زمین کے دو دو شعر ۴۰، قطعہ ۳۲، اشعار۔ واضح ہے کہ ایک غزل قصیدے ہیں اور ۱۲ مثنویوں میں شامل ہیں، اور ایک غزل کی جو غالباً میر ہی کی ہے اور دواوین میں نہیں، تضمین ہوئی ہے۔

۸) "فردیات" (ص۶۹۱ تا ص۶۹۶) کے تحت ۸۳ اشعار درج ہیں جن میں سے صرف ۶۳ پر "فرد" کا اطلاق ہو سکتا ہے۔ دواوین میں فردیں ہیں، ان کا ذکر آچکا ہے۔ باقی ۲۰ اشعار فرد نہیں کہے جا سکتے اس لیے کہ ایک زمین میں دو دو شعر ہیں۔ دواوین میں جو ایسے اشعار ہیں ان کی تعداد بتائی جا چکی ہے۔ کلیات میں حسبِ ذیل اشعار اس طرح لکھے ہیں کہ اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ مرتبین کے نزدیک مختلف زمینوں میں ہیں، مگر میری رائے میں یہ صحیح نہیں۔ مصرع چہارم "دلبر دلی لاؤبالی تھی" کی جگہ "دلبران لاابالی تھے" چاہیے:

مہیا جس کنے اسباب ملکی اور مالی تھے ... وہ اسکندر گیا یاں سے تو دونوں ہاتھ خالی تھے

کلاہ کج سے ہر غنچے کی پیدا ہے گلستاں میں ... کہ کیا کیا اس چمن میں دلبر دلی لاؤبالی تھی

ذیل کے دو شعروں کا بھی یہی حال ہے، کلیات میں "چکیو" کو "چھکیو" لکھا ہے، اس سے کام نہ چلیگا، قافیہ غلط ہے اور دونوں شعر ایک ہی زمین کے ہیں:

راہ آنسو کی کب تلک تکیے ... خونِ دل ہی کا اب مزا چکیے

بید سا کانپتا تھا مرتے وقت ... میر کو رکھیے مجنوں کے تکیے

ذیل کے دو شعر دیوان ۶ کی ایک غزل (ص۶۵۹) میں بھی شامل ہیں انھیں ملا کر مکررات کی تعداد ۱۳۳ ہو جاتی ہے:

ہم رو رو کے دردِ دلِ دیوانہ کہینگے ... جی میں ہے کہو حال غریبانہ کہینگے

موقوف غم میر کہ شب ہو چکی ہمدم ... کل رات کو پھر باقی یہ افسانہ کہینگے

ایک زمین کے دو دو شعر رباعی اور مربع کی حیثیت سے بھی پیش ہوئے ہیں۔

۹) ۱۷ مربع "تضمین مطلع خود با مطلع استاد" (ص۶۷۶ تا ص۶۸۰) ہر مربع کی دونوں بیتیں

مصرع ہیں اور مختلف زمینوں میں ہیں، پہلی الترا ما، دو اردو دوسری فارسی میں ہے۔ عنوان سے واضح ہو کہ جن فارسی ابیات کا اردو ابیات سے جوڑ ملایا ہے، وہ اس شخص کے نزدیک جو اس عنوان کا ذمہ دار ہے، میر کے نہیں، مگر اس کے باوجود ہر بیت کے قبل "لہ" مرقوم ہے اس کی بدولت شعر اردو کا شعر فارسی سے کچھ سروکار باقی نہیں رہتا، اور خواہ مخواہ شعر فارسی میر کی طرف منسوب ہو جاتا ہے۔ ایک مربع جس کی بیت فارسی بیدل کی ہے، یہ ہے:

مشہور ہیں عالم میں تو کیا ہیں بھی کہیں ہم　　　القصہ نہ در پے ہو ہمارے کہ نہیں ہم

ص۹۵ میں دو شعر از "غزل مربع" کے عنوان سے درج ہیں، لیکن ان میں ربط نہیں، اور انھیں مربع نہیں کہا جا سکتا۔

قصہ تمام میر کا شب کو سنا گیا　　　بے درد سر بھی صبح تلک سر دھنا گیا
مل چشم بھی نگہ نے دھتورا دیا مجھے (کذا)　　　جس پر نہ چھوڑا دل کو ہیں تنکے چنا گیا

۱۰) "رباعیات" (ص۸۰ تا ص۹۵) کے تحت ۱۰۴ نظمیں دو دو شعروں کی ہیں جن میں سے ۱۰۳ واقعی رباعیاں ہیں لیکن ایک جس کا مصرع اول یہ ہے: "اللہ کیا جگر تھا حضرت حسین کا" (ص۸۱) قطعہ ہے رباعی نہیں "مستزاد ہندی" (ص۹۵ تا ص۹۷) کے عنوان سے جو ۶ نظمیں ہیں، یہ بھی رباعیاں ہیں اور انھیں رباعیوں ہی کے ساتھ درج کرنا تھا۔ ص۹۸ میں رباعیوں کے بعد غزل کے یہ دو شعر بعنوان "رباعی از غزل" مرقوم ہیں، یہ نہ ایک دوسرے سے مربوط ہیں اور نہ رباعی کے وزن میں ہیں، انھیں رباعی نہیں کہہ سکتے:

جو اے قاصد وہ پوچھے میر بھی ایدھر کو چلتا تھا　　　تو کہیو جب چلا ہوں میں تب اس کا دم نکلتا تھا
سماں افسوس بیتابی سے تھا کل قتل میں میرے　　　تڑپتا تھا ادھر میں یار ادھر ہاتھ ملتا تھا

ایک رباعی مثنوی ۲۴ کے بعد بھی ہے۔

۱۱) ترجیع بند صرف ایک ہے اور یہ بدون عنوان درج ہے۔ ۵ بند، ابیات ۳۴ (ایک بیت ۵ بار شمار میں آئی ہے اور اس کی ہر بند کے آخر میں تکرار ہوئی ہے۔ (ص۹۷ تا ص۹۹)

۱۲) ترکیب بند ۳ ہیں۔ پہلا "ایضاً ترکیب بند" کے عنوان سے مرقوم ہے (ص۱۳۸ تا ص۱۴۸) اس سے قبل جو مخمس ہے وہ منقبت میں ہے اور اس کا عنوان بھی اس پر مشعر ہے۔ اس بنا پر لفظ "ایضاً" سے یہ خیال ہوتا ہے کہ یہ بھی منقبت میں ہے، لیکن یہ عاشقانہ ہے، ۹ بند، ۳۰ ابیات، ہر بند

کے کل اشعار ایک ہی زمین میں ہیں، مگر درج اس طرح پر ہیں کہ گویا بعد کے بند کی بیت اول قبل کے بند کی بیت آخر ہے؛ ظاہر ہے کہ آخری بند کی یہ کیفیت نہیں ہوسکتی۔ دوسرا بھی عاشقانہ ہے ص ۸۱۹ تا ص ۸۲۰، ۷ بند، ۴۲ ابیات۔ ہر بند کے آخر میں ایک فارسی شعر ہے جو اشعار ما قبل کا ہم وزن تو ہے، لیکن مختلف زمین میں ہے۔ یہ فارسی اشعار یقین ہے کہ میر کے نہیں۔ تیسرا ترکیب بند جو ۷ بندوں کا ہے (۴۸ ابیات) "ہفت بند" کے عنوان سے درج ہے، یہ حسن کے ہفت بند کا جواب ہے اور اس کی طرح اس کے ہر بند کا آخری شعر کی زمین اس بند کے دوسرے اشعار سے مختلف ہے (ص ۸۵۹ تا ص ۸۶۰) کل ترکیب بندوں کے اشعار کی مجموعی تعداد ۲۰۹ ہے۔

۱۳) مسدس ۸ ہیں، تین (۱۲ بند ص ۸۵۰ تا ص ۸۵۲، ۱۲ بند ص ۸۵۳ تا ص ۸۵۵، ۱۰ بند ص ۸۶۹ تا ص ۸۷۱) اس طور کے ہیں کہ ہر بند کے آخر میں ایک فارسی شعر کی تکرار ہوتی ہے، یہ تین فارسی شعر کس کے ہیں، میں اس وقت بتانے سے قاصر ہوں، چوتھا (۱۳ بند (ص ۸۷۱ تا ص ۸۷۳) بھی انھیں کی طرح ہے، فرق یہ ہے کہ اس میں اردو شعر کی تکرار ہوتی ہے۔ یہ چاروں منقبت میں ہیں ۴ مسدس عاشقانہ ہیں۔ (۲۷ بند ص ۸۵۵ تا ص ۸۶۰، ۹ بند ص ۸۶۰ تا ص ۸۶۲، ۲۰ بند ص ۸۶۲ تا ص ۸۶۶، ۵ بند ص ۸۶۶ تا ص ۸۶۹) جن میں ۳ واسوخت ہیں۔ کل مسدسوں کے اشعار ۷۰۸۔

۱۴) مخمس ۱۹ ہیں، ۲ میں دوسروں کی فارسی غزلوں کی تضمین (بند ۱۳ و ۷، ص ۸۲۶ تا ص ۸۲۹) ہے، تیسرے میں اردو غزل کی تضمین ہے جس کا مقطع تخلص سے خالی ہے لیکن قرینہ ہے کہ انھیں کی ہے (بند ۱۰ ص ۸۲۹ و ص ۸۳۰)۔ مخمس ۴ تا ۶ منقبت میں ہیں، ان کے ہر بند کے آخر میں ایک مصرع کی تکرار ہوتی ہے (۱۴ ص ۸۰۸ تا ص ۸۱۰، ۱۴ ص ۸۱۱ تا ص ۸۱۳، ۱۴ ص ۸۴۵ تا ص ۸۴۷) مخمس ۷ تا ۱۴ بھی منقبت میں ہیں مگر اس میں کسی مصرع کی تکرار نہیں (۱۹ ص ۷۹۹ تا ص ۸۰۲، ۱۲ ص ۸۰۲ تا ص ۸۰۴، ۱۱ ص ۸۰۴ تا ص ۸۰۶، ۷ ص ۸۰۶ و ص ۸۰۷، ۱۲ ص ۸۰۷ و ص ۸۰۸، ۱۴ ص ۸۲۰ تا ص ۸۲۲، ۲۱ ص ۸۴۷ تا ص ۸۵۰، ۲۲ ص ۸۳۰ تا ص ۸۳۳) ایک مخمس (۱۳ ص ۸۳۴ و ص ۸۳۵) کا عنوان ہے "مخمس در شہر کاما نوشتہ شد" ۴ مخمس ہجو میں ہیں (۲۹ ص ۸۲۲ تا ص ۸۲۶، ۱۹ ص ۸۳۵ تا ص ۸۳۸، ۳۹ ص ۸۳۸ تا ص ۸۴۲۔ ۹ ص ۸۴۴ و ص ۸۴۵۔ کل مخمسوں کے ۲۹۹ بند اور ۱۴۹۵ مصرع۔

۱۵) مثلث ۱۲ (۳۶ مصرع) ہیں، اوروں کے فارسی اشعار کی تضمین کی ہے (ص ۸۴۳ و ص ۸۴۴)

(۱۶) مثنویاں ۱/۲۴۲ "شعلۂ شوق" "محبت نے ظلمت سے کاڑھا ہے نور" ص۸۸۸ تا ص۸۹۶

۲/۲۹۲ دریائے عشق "عشق ہے تازہ کار و تازہ خیال" ص۸۹۷ تا ص۹۱۰

۳/۳۷۴ شکار نامہ "چلا آصف الدولہ بہر شکار" اس مثنوی میں مختلف اوزان کی ۷ غزلیں (۵۸ اشعار) شامل ص۹۱۰ تا ص۹۲۹

۴/۳۲۴ "شکار نامہ" (آخر میں "صید نامہ" نام درج) "مکرر ہے نواب کو قصد صید" ۱۱ غزلیں (۹۷ اشعار) اور ایک رباعی شامل ص۹۲۹ تا ص۹۴۶

۵/۹۱ "در بیان کدخدائی.. آصف الدولہ.." "ہے جہان کہن تماشا گاہ" ایک غزل (۷ اشعار) شامل ص۹۴۶ تا ص۹۴۹

۶/۵۴ "دربیان مرغبازان" "دہلی سے ہم جو لکھنو آئے" ص۹۴۹ تا ص۹۵۱

۷/۵۰ "درمذمت دنیا گوید" "سنو اے عزیزان ذی ہوش و عقل" ص۹۵۲ تا ص۹۵۴

۸/۵۴ "ہولی کھیلا آصف الدولہ وزیر" ایک غزل (۷ اشعار) شامل، ص۹۵۴ تا ص۹۵۷

۹/۲۷ "کہتے ہیں جو غم نداری بز بخر" ص۹۵۷ و ص۹۵۸

۱۰/۱۶۵ "چمن سے عنایت کے باد اسوار" ص۹۵۸ تا ص۹۶۶

۱۱/۱۲۷ "آؤ ساقی شراب نوش کریں" ایک غزل (۱۰ اشعار) شامل، آخر میں "تمام شد ساقینامہ" ص۹۶۷ تا ص۹۷۳

۱۲/۵۰ "اے جھوٹ آج شہر میں تیرا ہی دور ہے" ص۹۷۳ تا ص۹۷۵

۱۳/۲۱۴ نسنگنامہ "پاؤ توفیق تک تو سر کو دھنو" ص۹۷۶ تا ص۹۸۶

۱۴/۳۴ "تھا کپی کا بچہ اک درویش پاس" ص۹۸۶ تا و ص۹۸۷

۱۵/۷۱ "ایک بلی موہنی تھا اس نام" ص۹۸۷ تا ص۹۹۱

۱۶/۱۱۹ "کیا لکھوں میر اپنے گھر کا حال" ص۹۹۱ تا ص۹۹۷

۱۷/۲۳۹ "معاملات عشق" "کچھ حقیقت نہ پوچھو کیا ہے عشق" ص۹۹۷ تا ص۱۰۰۹

۱۸/۵۸ "مثنویات (کذا) اژدر نامہ" "یہ موذی کئی ناخبردار فن" ص۱۰۰۹ تا ص۱۰۱۱

۱۹/۷۱ "تنبیہ الجہال" "صحبتیں جب تھیں تو یہ فن شریف" ص۱۰۱۱ تا ص۱۰۱۵

۲۰/۱۱۰ "در ہجو نااہل مسمیٰ بزبان زد عالم" "سنو اے اہل سخن بعد از سلام" ص۱۰۱۵ تا ص۱۰۲۰

۲۱/۵۴ "مذمت آئینہ دار" "آج سے مجھ کو نہیں رنج و نکال" ص۱۰۲۰ تا ص۱۰۲۳

۲۲/۴۴ "ہجو عاقل نام ناکسیکہ بسگان انس تمام داشت" "اک جو لچر کو رزق کی وسعت سی ہوگئی" ص۱۰۲۳ تا ص۱۰۲۵

۲۳/۴۹ "در ہجو خانۂ خود کہ سبب شدت باراں خراب شدہ بود" "جسم خاکی میں جس طرح جاں ہے" ص۱۰۲۵ تا ص۱۰۲۷

۲۴/۴۷ "در تعریف سگ و گربہ کہ در خانۂ فقیر بودند و باہم ربط داشتند" "سگ و گربہ ہیں دو ہمارے ہاں" عبید زاکانی کے دو فارسی شعر شامل ص۱۰۲۷ تا ص۱۰۲۹

۲۵/۴۸ "در مذمت برشکال کہ باراں دراں سال بسیار شدہ بود" "کیا کہوں اب کے کیسی ہے برسات" ص۱۰۲۹ تا ص۱۰۳۲

۲۶/۴۶ "در ہجو اکول" "ایک پُرخور (کذا) آشنا بے پیر" ص۱۰۳۲ تا ص۱۰۳۴

۲۷/۲۴ "مرثیۂ خروس کہ در خانۂ فقیر بود" "کئی برس سے ہمارے کنے تھا ایک خروس" ص۱۰۳۴ و ص۱۰۳۵

۲۸/۱۷ "تعریف آغا رشید.. خطاط.. بفرمایش میاں اعزالدین کہ فقیر و خوشنویس بودند" "میر خطاط یکقلم دیکھے" ص۱۰۳۵ و ص۱۰۳۶

۲۹/۱۰۴ "ساقینامہ" "ہے قائل حمد وہ سر اندازہ" ایک غزل (۷ ابیات) شامل ص۱۰۳۶ تا ص۱۰۴۱

۳۰/۱۵۹ "جوش عشق" "ضبط کروں میں کب تک آہ اب" ص۱۰۴۱ تا ص۱۰۴۹

۳۱/۲۸۳ "اعجازِ عشق" "ثنائے جہاں آفریں ہے محال" ص۱۰۴۹ تا ص۱۰۶۳

۳۲/۱۴۰ "خواب خیال" (کذا) "خوشا حال اس کا جو معذور ہے" ص۱۰۶۳ تا ص۱۰۶۹

مثنویوں کے کل ابیات ۳۷۱۰ ہیں، ان میں عبید زاکانی کے دو شعر، ایک رباعی اور غزلوں کے ۸۶+۱ اشعار شامل۔

۱۷) قطعات ص۸۸۳ و ص۸۸۴ میں تین ہیں: مدح اسپ آصف الدولہ (۱۰) "تہنیت صحت" (۳) "در ہجو خواجہ بسرائے" (۲۱) کل اشعار ۳۴۔ (رجوع بہ مجسّعہ دیوان اول و رباعیات)

۱۸) کلیات کے کل مصرع ۲۸۷۰۴ ہیں، ان میں ۳۳ اشعار (۶۶ مصرع) جو مکرر آئے ہیں اور

دوسروں کے ۱۸ فارسی اور ۱۲ اردو اشعار شامل۔

(۱۹) ص ۱۰۶۹ کی آخری سطر یہ ہے: "بعون اللہ تعالیٰ در ساعت مسعود ۔۔ کلیات میر تقی تمام شد" اس کے بعد "فہرست" (ص ۱۰۰ تا ص ۱۰۷۳) اس میں آخری مثنوی کے متعلق مرقوم ہے "۔۔خواب و خیال زبانی (کرمخوردہ) درویش دلریش کہ ایں بلا بہ سر آمد" غلط نامہ ص ۱۰۷۳ کے آخر سے شروع ہو کر ص ۱۰۸۵ میں ختم ہوتا ہے، اس کے آخر میں یہ عبارت ہے: "ناظرین پر ظاہر ہو کہ جہاں جہاں مرکز کاف گاف کے اور نقطے ٹوٹ گئے ہیں اور عبارت کے قرینے سے وے لفاظ (الفاظ) پڑھے جاویں ان کو غلط نامے میں داخل نہ کیا۔"

(۲)

(۱) میر کی وفات شعبان ۱۲۲۵ھ میں ہوئی اور کلیات ۱۲۲۶ھ میں چھپ کر شائع ہوا عجب نہیں اگر میر کے دوران حیات ہی میں اس کا انطباع شروع ہو گیا ہو۔ مرتبین اگر چاہتے تو اودھ کے برطانی رزیڈنٹ اور سفیر اودھ مقیم کلکتہ کے ذریعے میر کے متعلق بہت کچھ معلومات فراہم کر سکتے تھے۔ یہ لوگ میر کے بارے میں اس قدر بھی لکھتے جتنا افسوس نے دیباچہ سحر البیان میں میر حسن کی نسبت تحریر کیا ہے، تو آج بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا۔

(۲) مرتبین نے یہ بتانا ضروری متصور نہیں کیا کہ مطبوعہ نسخہ کس نسخے پر مبنی ہے۔ دیوان ا و ۳ کے خاتمے پر جو عبارت ان دواوین کی بحث میں نقل ہوئی ہے، وہ اس پر مشعر ہے کہ یہ دیوان یا تو خود میر کے لکھے ہوئے تھے، یا منقول عنہ میر کا لکھا ہوا تھا۔

(۳) کلیات میں ۳۳ اشعار کا مکرر پایا جانا مرتبین کی غفلت پر دال ہے۔

(۴) بعض جگہ ضروری عنوانات نہیں، یا ہیں تو گمراہ کن ہیں۔

(۵) ہر صنف سخن کے اشعار (مثنویوں میں جو غزلیں شامل ہیں، یا جو رباعی خود میر نے مثنوی کے آخر میں لکھی تھی، اس سے بحث نہیں) ایک جگہ ہونے تھے، مرتبین نے اس کی پروا نہیں کی۔

(۶) کلیات میر کے کل اردو اشعار پر حاوی نہیں اور بظاہر مرتبین نے اس کی کوشش بھی نہیں کی کہ کل اشعار یکجا کر دیے جائیں۔ ۶ دواوین اردو کے علاوہ میر کا ایک دیوانچہ تھا جس کا

ذکر صاحب دستور الفصاحت نے کیا ہے۔ یہ ناپید ہے، لیکن مرتبین چاہتے تو انھیں اس کی نقل حاصل ہو سکتی تھی؛ کلیات اس دیباچے سے خالی ہے۔ میر کی دو مثنویاں جو آسی مرحوم کے مرتبہ کلیات میر کے مقدمے میں شامل ہیں (ص۵۹ تا ص۶۶) اور ڈاکٹر گیان چند کی شائع کردہ مثنویاں بھی کلیات سے غیر حاضر ہیں۔ بعض قصائد جن کا ذکر ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی کی کتاب متعلق میر میں ہے، اس میں موجود نہیں۔ میر کے مراثی کی بھی یہی کیفیت ہے۔ ان کا مجموعہ سید مسیح الزماں صاحب نے شائع کر دیا ہے۔ یہ فہرست جامع نہیں، میر کی اور چیزیں بھی کلیات سے غائب ہیں۔

(۷) کلیات جامعیت سے محروم ہے، لیکن، کوئی ایسا شعر جو میر کا نہیں (تضمینات سے بحث نہیں) اس میں شامل نہیں۔ میں اس موقع پر ایسے اشعار کی جو غلطی سے میر کی طرف منسوب کیے گئے ہیں، کوئی فہرست دینا نہیں چاہتا، صرف یہ کہنے پر اکتفا کروں گا کہ حسب ذیل اشعار اس میں نہیں:-۱۔ وہ شعر جس کا مصرع آخر یہ ہے: "مقابلہ تو دل ناتواں نے خوب کیا" (یہ دراصل محمد یار خاں میر شاگرد قائم کا شعر ہے جیسا کہ تذکرۂ شوق سے معلوم ہوتا ہے)۔ ۲۔ وہ شعر جس کا خاتمہ ان الفاظ پر ہوتا ہے: "ستاروں میں روشنی نہ رہی" یہ زمانۂ حال کے کسی شاعر کا شعر ہے، کسی قدیم کتاب میں نظر سے نہیں گزرا۔ ۳۔ یہ جو چشم پُر آب ہیں دونوں الخ" یہ دراصل حضور کا ہے، رجوع بہ تذکرہ قائم، حالی اور ان کی تقلید میں ڈاکٹر عبد الحق اسے میر کی ملک قرار دیتے ہیں۔ ۴۔ وہ شعر جس کا مصرع آخر یہ ہے: "کفن دینا تمھیں بھولے تھے ہم اسباب شادی میں" یہ امیر اللغات میں نادر کے نام سے ہے۔ غالب نے اردوے معلی میں شعر ذیل میر کی طرف منسوب کیا ہے، لیکن، کسی اور کتاب بشمول کلیات نہیں ملتا۔ اس کے باوجود قطعی طور پر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ میر کا طبعزاد نہیں، رنگ بالکل انھیں کا ہے:

بدنام ہو گے جانے بھی دو امتحان کو   رکھے گا کون تم سے عزیز اپنی جان کو

(۸) کتاب کی تقطیع × اور سطر ۲۱ سطری، مزید یہ کہ کتاب ٹائپ (نستعلیق) میں چھپی ہے، اس صورت میں نمونوں (پروف) کی تصحیح چنداں دشوار نہ تھی، لیکن کتاب میں طویل غلط نامہ شامل ہے، اور ایسے اغلاط بھی ہیں جن کی طرف غلط نامے میں توجہ نہیں ہوئی؛ مثلاً زور باقی نہ اسپ و اشتر میں ص۸۳۶ (اشتر قافیہ سر و لشکر، استر چاہیے۔ رنگ اڑ جاتا ہے کمبخت چہرہ تو دیکھو میر کا

ص۱۲ 'اڑا جاہے' جیسا کہ نکات الشعرا میں ہے، ورد نی قطعہ پیام کیا ص۴۲، 'نی نہیں پی (یہ) صحیح ہے۔ ہوں اختصار ہیں میں آئینہ روشتاب آ ص۱۹۴، 'اختصار کا محل ہے' اختصار کا نہیں۔ کچھ آب دیدہ رات سے خوننناب سا ہوا، ص۲۶۳ یہ غلطی کہ خوناب کے عوض خوننناب یا خوں ناب لکھا جائے کئی جگہ ہوئی ہے۔" ایسی کہانی گر یہ بندھی ہے توسو چکے " ص۴۰۴ "ندھی" جیسا کہ کلیات مرتبۂ آسی میں ہے۔ مطلع ذیل میں صریحاً ایطا جلی ہے۔ دوسرے شعر میں جو اس کے ساتھ ہے، قافیہ مطلوب ہے ص۱۶:

ہنس دے ہے دیکھتے ہی کیا خوب آدمی ہے ‏ ‏ معشوق بھی ہمارا کیا خوب آدمی ہے

جوشِ عشق کے اشعار ذیل میں پہلا مصرع موزوں ہے مگر جوشِ عشق کے وزن میں نہیں۔ دوسرے میں دانہ کے عوض دانا چاہیے، تیسرے میں سار قوادی کی جگہ صار فوادی صحیح ہے۔ دوسرا شعر عربی ہے شفقا، حقا میں تنوین ہے اور ممکن ہے کسی اور شاعر کا ہو:

رکھتا تھا سدا وہ دیوانہ ‏ ‏ ورد زباں یہ شعر دانہ ص۱۰۴۲

سار قوادی شقا شقا ‏ ‏ حقا حقا حقا حقا

(۹) سنہ ۱۲۲۶ھ کے بعد کلیات میر کا کوئی نسخہ شائع ہوا ہے تو تجارتی اغراض سے؛ ہندوستان و پاکستان کے کسی ادبی ادارے کو اس کی طرف توجہ کرنے کی توفیق نہیں ہوئی۔ یہ جس قدر شرمناک ہے، اسی قدر یہ امر قابلِ ستایش ہے کہ فورٹ ولیم کالج کے اربابِ حل و عقد کو آج سے کم و بیش ڈیڑھ سو برس قبل کلیات کی اشاعت کا خیال آیا۔ یہ بات دوسری ہے کہ اس کی تصحیح و ترتیب کے لیے جو لوگ منتخب ہوئے انھوں نے یہ کام اس طرح انجام نہیں دیا کہ اس سے کامل طور پر اطمینان ہو سکے۔

نثار احمد فاروقی

نکات الشعراء کی ایک اور روایت

آزاد لائبریری علی گڑھ کے ذخیرۂ سر سلیمان میں کشکول متفرقات فارسی کے تحت ایک بیاض ہے جس میں احمد یار خاں یکتا کی "مشتاق عشق" نیز میر علی رفعت کا رسالہ "می باید شنید" مکتوبہ ۱۹ جمادی الاول ۱۲۰۲ھ بھی شامل ہے۔ اسی میں ایک تذکرے کے کچھ متفرق اوراق بھی ہیں۔ یہ دراصل میر کا تذکرۂ نکات الشعراء ہے، اسے غور سے پڑھنے پر اندازہ ہوتا ہے کہ متداول تذکرہ بہت سی تبدیلیوں سے گزر چکا ہے۔ اس نسخے میں شعرا کے حالات کہیں نسخۂ مطبوعہ (مرتبہ حبیب الرحمن شروانی) سے مختلف ہیں، اور کہیں ان میں اضافہ بھی ہے۔ یہاں ایسے چند اہم اختلافات کی نشان دہی کی جائے گی۔

(۱) میرزا مظہر کا حال نسخہ مطبوعہ کے مقابلے میں مختصر ہے، مگر اس سے مختلف نہیں۔ انتخاب میں یہ اشعار نسخۂ مطبوعہ سے غیر حاضر ہیں۔ یہ کسی اور تذکرے میں بھی نہیں ملتے:

خورشید کے بدن میں غیرت سوں تھرتھری ہے — شاید سجن کے بر میں بسنے کی بکتری ہے
میری فغاں کی دھن میں بیراگ چھا رہا ہے — مجھ آہ کی بغل میں موہن کی بنسری ہے
ان شوخ گلرخاں کے ہاتھوں سوں جل رہا ہوں — طفلاں کو خاک میری سامان پھلجھری ہے
ٹکڑے کیا ہے دل کو آشفتہ ابرواں نے — اُس تیغ مغربی کی کیا آب ذردری ہے
ہر چاک جیب تیرا گلدام ہے پری کا — مظہر ترے جنوں میں کیا سحر سامری ہے

ایک غزل کے ان پانچ اشعار کے علاوہ یہ شعر بھی نسخۂ مطبوعہ میں نہیں ہے:

پشت بام اوپر کھڑا ہے وہ ستمگر بے نقاب — ایک نیزے پر قیامت ہے کہ آیا آفتاب

اس طرح مطبوعہ میں تعداد اشعار (۷) اور اس بیاض میں (۱۲) ہے۔ مطبوعہ میں یہ شعر موجود ہے:

گر گل کو گل کہوں تو ترے رو کو کیا کہوں
یوں نگہ کو تیغ تو ابرو کو کیا کہوں (صفحہ ۹)

یہ اس نسخے میں نہیں ہے۔

(۲) میاں سعادت علی سعادت امروہوی کے حال میں کچھ اختلاف نہیں مگر انتخاب میں یہ اشعار بھی ہیں جو نسخہ مطبوعہ (ص۲۷ و ص۲۸) سے غیر حاضر ہیں۔

جھمکے دکھانین کے دل چھین لے چلے ہو
انکھیوں کو تیری کن نے سکھلا دیا چھنالا

یہ شعر باندک اختلاف میرزا مظہر کا ہے مگر زیر نظر بیاض میں سعادت سے منسوب ہوا ہے:

نہ تو ملنے کے اب قابل رہا ہے نہ وہ مجھکو دماغ و دل رہا ہے

(۳) اس میں شاہ قلندر، قلندر تخلص کا بھی ترجمہ شامل ہے۔ یہ نسخہ مطبوعہ میں نہیں ملتا،

"شاہ قلندر، قلندر تخلص، شاگرد میرزا مظہر متوطن کنوج۔ در شاہجہاں آباد آمد.... ریختہ ہم می کرد۔ مرد درویش متوکل است، طاقت بیانش نیست.... (کذا)

ہائے دل جو اپنا تھا بے گانہ ہو گیا (کذا) ان پری رویوں کے سائے سے دوانا ہو گیا

یار جب تک نظر نہیں آتا مدعا دل کا بر نہیں آتا

(۴) انعام اللہ خاں یقین کا حال اس میں نسخۂ مطبوعہ سے بالکل مختلف ہے۔ نسخۂ مطبوعہ میں جو کچھ ہے (ص۸۶ و ص۸۰) میرا قیاس ہے کہ وفات مظہر کے بعد اس میں ترمیم و اضافہ کیا گیا ہے۔ اس بیاض میں کلام یقین کا انتخاب بھی مطبوعہ کی نسبت بہت طویل ہے۔ ترجمہ یقین یہ ہے:

"انعام اللہ خاں یقین پسر اظہر الدین خاں، اولاد حضرت مجدد الف ثانی رضی اللہ تعالے عنہ، نبیرۂ حضرت ایشاں محمد معصوم "عزوۃ الوسقا" (عروۃ الوثقی)، شاگرد میرزا مظہر جان جاناں۔ خوش طبع، خوش خلق و خوش خو، گرم جوش، یار باش، شگفتہ روے، جوش بہار گلستان سخن، عندلیب خوش خوان چمنستان ایں فن۔ زبان گفتگویش گرہ کشاے زلف شام مدعا، مصرعہ نوشتہ اش بر صفحہ کاغذ از کاکل صبح خوش نما۔ طبع

سخن پرداز او سرو مائل چمنستان انداز است۔ گاہے در کوچۂ باغ تلاش بطریق گلگشت قدم رنجہ می فرماید، در چمن بندی شعرش رنگین چمن۔ گلچیں خیال او را گل معنی دامن (دامن)۔ شاعر زور آور ریختہ، در کمال علاقگی وارستہ، متواضع، آشنائے درست، بندہ اکثر ملاقات کردم، فقیر را اخلاص دلی است، ہمیشہ اتفاق باہم نشستن و فکر کردن، کہ در عہد عالمگیر بادشاہ باشد خدا مغفرت کند (کذا)"

منقولہ بالا عبارت کے کچھ جملے بادنیٰ اختلاف نسخۂ مطبوعہ کے ترجمہ میر درؔد (ص۵۳) میں ملتے ہیں۔

(۵) ایسے ہی الفاظ سوؔدا کے ترجمے میں لکھے گئے ہیں۔ نسخۂ مطبوعہ سے اس بیاض میں صرف اتنی بات زائد ملتی ہے کہ سوؔدا کو "نوکر نواب وزیر عماد الملک" بتایا ہے۔ ترجمہ سوؔدا یہ ہے:

"مرزا محمد رفیع سوؔدا تخلص، بسیار خوش خلق و خوش خوی، گرم جوش یار باش شگفتہ، جوش بہار گلستان سخن، عندلیب خوش خوان چمن این فن۔ زبان گفتگویش گرہ کشائے زلف شام مدعا، مصرعہ نوشتہ اش بر صفحہ کاغذ، از کاکل صبح خوش نما۔ طبع سخن پرداز او مائل چمنستان انداز است، مولد او شاہ جہاں آباد است۔ نوکر نواب وزیر عماد الملک (سپاہی) پیشہ، غزل و قصیدہ و مثنوی و قطعہ و رباعی و مرثیہ ہمہ را خوب می گوید، سر آمد شعرائے زبان ہندی، چناں چہ باید ملک الشعرائی ریختہ است۔ اکثر شعر فارسی می گوید، مردے خوب است"

سوؔدا کے انتخاب کلام میں بھی نسخۂ مطبوعہ سے کچھ اختلافات ہیں۔

(۶) نسخۂ مطبوعہ میں میر قمر الدین منتؔ کا ترجمہ نہیں ہے مگر اس بیاض میں موجود ہے۔ اور انھیں بھی "نوکر نواب صاحب نواب وزیر عماد الملک" لکھا ہے۔

(۷) منتؔ کے علاوہ اس میں مہرباں علی خاں رندؔ، فتح علی شیداؔ اور قلندؔر وغیرہ چند ایسے شعرا کے تراجم بھی شامل ہیں جو نسخۂ مطبوعہ سے غیر حاضر ہیں۔ میر جعفر زٹلی کے ذیل میں ایک نسخہ چیزن (اردو نثر) بھی بطور نمونہ شامل کیا ہے جیسا کہ نسخہ "تذکرۂ مجمع الانتخاب میں حاتمؔ دہلوی سے منسوب ہوا ہے۔ (مخطوطہ سالار جنگ) اگر یہ میر جعفر ہی کا زائیدہ فکر ہے تو اُس دور کی اردو نثر

کا قابل قدر نمونہ ہے۔ لیکن کلیات جعفر کا جو مصور خطی نسخہ کتاب خانہ دانش گاہ دہلی میں محفوظ ہے اس میں یہ نثر نہیں ملتی۔

پروفیسر مسعود حسن رضوی لکھنوی نے یہ شبہ ظاہر کیا تھا کہ نکات الشعراء کا جو نسخہ اس وقت ہمیں دستیاب ہے وہ اصل تالیف کا ملخص یا ترمیم کیا ہوا نسخہ معلوم ہوتا ہے کیوں کہ قدیم روایتوں سے اس کے بعض بیانات نہیں ملتے۔ مطبوعہ نسخہ چوں کہ متعدد نسخوں سے مقابلے کے بعد مرتب نہیں ہوا ہے اس لیے نکات الشعرا کی مختلف روایتوں کے اختلافات سامنے نہیں آسکے ہیں اور صرف متد اول تذکرے ہی کو معتبر مان لیا جاتا ہے۔ اس میں شک و شبہ کی گنجایش نہیں کہ میر نے نکات الشعرا کی تالیف کا آغاز خواہ ۱۱۶۵ھ ہی میں کیا ہو، لیکن اس میں اضافے اور ترمیمیں بعد تک بھی ہوتی رہی ہیں۔ اس کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ میر نے دیباچۂ نکات الشعرا میں لکھا ہے:

"درفن ریختہ .... کتابے تا حال تصنیف نشدہ کہ احوال شاعران ایں فن بصفحۂ روزگار بماند۔" (ص۱)

لیکن اسی تذکرے میں محمد یار خاکسار کے سلسلے میں یہ عبارت ملتی ہے:

"خاکسار تخلص عرف کلّو، شخصے است خادم درگاہ شریف .... بسیار سفلگی می کند، بلکہ از تنک آبی بنائے ریختہ را بآب رسانیدہ چناں چہ علی الرغم ایں تذکرہ تذکرۂ نوشتہ است بنام معشوق چہل سالۂ خود۔ احوال خود را اوّل از ہمہ نگاشتہ و خطاب خود سید الشعرا، پیشِ خود قرار دادہ۔ آتش کینہ کہ بے سبب افروختہ است چوں کباب بو می دہد ...." (ص۱۲۱ و ص۱۲۲)

سوال یہ ہے کہ اگر میر کا تذکرہ سب سے پہلا ہے تو خاکسار نے اپنے "معشوق چہل سالہ" کے نام سے جو تذکرہ لکھا تھا اس کا حوالہ اس میں کیسے آگیا؟ ظاہر ہے کہ ترجمۂ خاکسار بعد میں لکھا گیا یا یہ عبارت بڑھائی گئی۔

علاوہ ازیں ایک اہم نکتہ اور بھی ہے جس کی طرف میں اس وقت صرف سرسری اشارہ کروں گا تفصیلی بحث کسی اور موقع پر ہوگی، وہ یہ کہ قائم چاند پوری نے بھی مخزن نکات میں اوّلیت کا دعویٰ کیا ہے، اور تذکرے کے داخلی قرائن ان کے خلاف بھی نہیں جاتے۔ مخزن نکات کا مطبوعہ نسخہ

بھی دوسرے نسخوں سے مقابلہ و تصحیح کے بعد مرتب نہیں ہوا ہے۔ اس لیے صرف اس کے متن پر بھروسا نہیں کیا جا سکتا۔ انڈیا آفس لائبریری میں مخزن نکات کا ایک نسخہ محفوظ ہے، جو نسخہ مطبوعہ کے مقابلے میں قطعاً مختلف روایت ہے اور بعض اہم باتیں اس سے معلوم ہوتی ہیں۔ یہ ہماری نظر سے گزرا ہے[1]۔ اس میں قائم نے یہ بھی لکھا ہے کہ محمد تقی میر دہلی میں اُن کے ہمسائے تھے۔ میرا خیال ہے کہ میر کو تذکرۂ مخزن نکات کی تالیف کا علم ہو گا لیکن انھوں نے عمداً اس سے چشم پوشی کی اور تقدّم کا شرف خود حاصل کرنا چاہا۔ نکات الشعرا کے زمانۂ تالیف کے سلسلے میں دیباچۂ دستور الفصاحت (ص ۴۳ و بعد) اور مخزن نکات کے بارے میں (ص ۵۰ و بعد) دیکھے جائیں۔ مخدومی مولانا امتیاز علی عرشی نے مخزن نکات کے زمانۂ تالیف پر جو بحث کی ہے اس سے مجھے اتفاق ہے۔ اور میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ قائم کا تذکرہ یقیناً نکات الشعرا سے پہلے مدوّن ہو چکا تھا اگرچہ اس کی اشاعت ۱۱۶۸ھ سے پہلے نہیں ہو سکی۔

---

[1] محبِّ مکرم ڈاکٹر مختار الدین احمد (ریڈر شعبۂ علوم اسلامی) علی گڑھ کا ممنون ہوں جنھوں نے یہ نسخہ کتب خانہ انڈیا آفس لندن سے مستعار منگا کر مجھے مطالعے کا موقع دیا۔

نصیر الدین ہاشمی

حیدرآباد کے کتب خانوں میں تصانیفِ میر کے مخطوطات

جس طرح عہد حاضر میں خدائے سخن میر تقی میر کا کلام سوز و گداز اور اثر آفرینی کے باعث شہرت رکھتا ہے، آج سے سو ڈیڑھ سو سال پہلے بھی ان کا کلام اسی طرح مقبول اور معروف تھا۔ اس کا ثبوت اس سے مل سکتا ہے کہ طباعت و اشاعت کے وسائل نہ ہونے کے باوجود ان کی تصانیف کے درجنوں قلمی نسخے مختلف کتب خانوں کی زینت بنے ہوئے ہیں۔ یہاں ہم صرف حیدرآباد کے مشہور کتب خانوں میں میر کی تصانیف کے جو مخطوطات موجود ہیں اُن کا مختصر تعارف کراتے ہیں۔

(الف) کتب خانہ نواب سالار جنگ۔

نواب سالار جنگ کے کتب خانے میں کلیاتِ میر کے دو نسخے ہیں۔ ان کے علاوہ مثنوی "دریائے عشق" کے چار نسخے اور ساقی نامہ کا ایک نسخہ بھی محفوظ ہے۔

(۱) دیوان میر کا پہلا نسخہ (۸½ × ۵½) سائز کے (۳۷۶) صفحات پر مشتمل ہے۔ ہر صفحہ پر (۱۵) سطریں ہیں۔ خط نستعلیق مائل بہ شکستہ ہے۔ کتابت کا سنہ درج نہیں۔ اس کلیات میں اولاً ردیف وار غزلیات ہیں۔ اس کے بعد مستزاد۔ پھر تضمین۔ قطعات۔ مسدس۔ مخمس۔ واسوخت ہیں۔ پھر مخمس۔ مثنوی اژدر نامہ۔ مثنوی تنبیہ الجہال اور اس کے بعد امام زین العابدین کی منقبت میں ایک قصیدہ ہے اس پر کلیات ختم ہوتا ہے۔ یہ نسخہ ناقص الاول ہے۔

آغاز: کہا میں بھی پریشانیٔ خاطر سے قریں تھا — آنکھیں تو کہیں تھیں دلِ غم دیدہ کہیں تھا

اختتام: سبھوں نے ورد کیا یہ قصیدہ اس خاطر — رکھا ہے نام کو میں نے خلاصۃ الاوراد

(۲) دوسرا نسخہ (۸ × ۵½) سائز کے (۳۸۸) صفحات کا ہے۔ ہر صفحے میں (۱۴) سطریں ہیں

بھی دوسرے نسخوں سے مقابلہ و تصحیح کے بعد مرتب نہیں ہوا ہے۔ اس لیے صرف اس کے متن پر بھروسا نہیں کیا جا سکتا۔ انڈیا آفس لائبریری میں مخزن نکات کا ایک نسخہ محفوظ ہے، جو نسخۂ مطبوعہ کے مقابلے میں قطعاً مختلف روایت ہے اور بعض اہم باتیں اس سے معلوم ہوتی ہیں۔ یہ ہماری نظر سے گزرا ہے[1]۔ اس میں قائمؔ نے یہ بھی لکھا ہے کہ محمد تقی میرؔ دہلی میں اُن کے ہمسائے تھے۔ میرا خیال ہے کہ میرؔ کو تذکرۂ مخزن نکات کی تالیف کا علم ہو گا لیکن انھوں نے عمداً اس سے چشم پوشی کی اور تقدم کا شرف خود حاصل کرنا چاہا۔ نکات الشعرا کے زمانۂ تالیف کے سلسلے میں دیباچۂ دستور الفصاحت (ص ۴۳ و بعد) اور مخزن نکات کے بارے میں (ص ۵۰ و بعد) دیکھے جائیں۔ مخدومی مولانا امتیاز علی عرشیؔ نے مخزن نکات کے زمانۂ تالیف پر جو بحث کی ہے اس سے مجھے اتفاق ہے۔ اور میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ قائمؔ کا تذکرہ یقیناً نکات الشعرا سے پہلے مدوّن ہو چکا تھا اگرچہ اس کی اشاعت ۱۱۶۸ھ سے پہلے نہیں ہو سکی۔

---

[1] محبِ مکرم ڈاکٹر مختار الدین احمد (ریڈر شعبۂ علوم اسلامی) علی گڑھ کا ممنون ہوں جنھوں نے یہ نسخہ کتب خانۂ انڈیا آفس لندن سے مستعار منگا کر مجھے مطالعے کا موقع دیا۔

نصیر الدین ہاشمی

حیدرآباد کے کتب خانوں میں تصانیف میر کے مخطوطات

جس طرح عہد حاضر میں خدائے سخن میر تقی میر کا کلام سوز و گداز اور اثر آفرینی کے باعث شہرت رکھتا ہے، آج سے سوڈیڑھ سو سال پہلے بھی ان کا کلام اسی طرح مقبول اور معروف تھا۔ اس کا ثبوت اس سے مل سکتا ہے کہ طباعت و اشاعت کے وسائل نہ ہونے کے باوجود ان کی تصانیف کے درجنوں قلمی نسخے مختلف کتب خانوں کی زینت بنے ہوئے ہیں۔ یہاں ہم صرف حیدرآباد کے مشہور کتب خانوں میں میر کی تصانیف کے جو مخطوطات موجود ہیں اُن کا مختصر تعارف کراتے ہیں۔

(الف) کتب خانہ نواب سالار جنگ۔

نواب سالار جنگ کے کتب خانے میں کلیاتِ میر کے دو نسخے ہیں۔ ان کے علاوہ مثنوی "دریائے عشق" کے چار نسخے اور ساقی نامہ کا ایک نسخہ بھی محفوظ ہے۔

(۱) دیوان میر کا پہلا نسخہ (۸ ½ × ۵ ½) سائز کے (۳۷۶) صفحات پر مشتمل ہے۔ ہر صفحہ پر (۱۵) سطریں ہیں۔ خط نستعلیق مائل بہ شکستہ ہے۔ کتابت کا سنہ درج نہیں۔ اس کلیات میں اولاً ردیف وار غزلیات ہیں۔ اس کے بعد مستزاد۔ پھر تضمین۔ قطعات۔ مسدس۔ مخمس۔ واسوخت ہیں۔ پھر مخمس۔ مثنوی اژدر نامہ۔ مثنوی تنبیہ الجہال اور اس کے بعد امام زین العابدین کی منقبت میں ایک قصیدہ ہے اس پر کلیات ختم ہوتا ہے۔ یہ نسخہ ناقص الاول ہے۔

آغاز: کیا میں بھی پریشانیٔ خاطر سے قریں تھا   آنکھیں تو کہیں تھیں دل غم دیدہ کہیں تھا

اختتام: سبھوں نے ورد کیا یہ قصیدہ اس خاطر   رکھا ہے نام کو میں نے خلاصۃ الاوراد

(۲) دوسرا نسخہ (۸ × ۵ ½) سائز کے (۳۸۸) صفحات کا ہے۔ ہر صفحے میں (۱۴) سطریں ہیں

نستعلیق خط ہے اور یہ ۱۲۴۱ھ میں لکھا گیا ہے۔ آغاز ان اشعار سے ہوتا ہے :

ہر ذی حیات کا ہے سبب جو حیات کا — نکلے ہے جی ہی اوس کے لیے کائنات کا
بکھرے ہے زلف اوس رخ عالم فروز پر — ورنہ بناؤ ہووے نہ دن اور رات کا

اس نسخے میں پہلے ردیف وار غزلیات ہیں، پھر رباعیات اور فردیں۔ پھر قطعات۔ اس کے بعد مثلث پھر تضمین اور مخمس جن میں سے بعض ہجویں ہیں اور کئی مخمس منقبت میں ہیں چند مسدس میں پھر ترکیب بند۔ گھوڑے کی تعریف کا قطعہ۔ مثنوی بہادر نامہ، مثنوی ہجو آئینہ دار۔ مثنوی سگ نامہ۔ ہجو خانہ خود، مثنوی سگ و گربہ۔ تعریف مادہ سگ۔ اس کے علاوہ کئی اور مثنویاں ہیں۔ مثنوی جوش یاراں۔ مثنوی ہجو اکول۔ مثنوی ذم الفضول۔ مرثیہ مرغ۔ مثنوی کدخدائی بشن سنگھ اس کے بعد ساقی نامہ پھر مثنوی جوش عشق۔ مثنوی ہجو خانہ۔ مثنوی تعریف بچہ گیتی۔ پھر مثنوی گربہ خود اس کے بعد قصیدے ہیں۔ پہلا قصیدہ حضرت علیؑ کی مدح میں ہے۔ دوسرا قصیدہ در مدح امام رضاؑ۔ تیسرا اور چوتھا در منقبت حضرت علیؑ۔ پانچواں در مدح بادشاہ۔ چھٹا قصیدہ در مدح وزیر الممالک ساتواں قصیدہ در شکایت نفاق یاران زماں[1]۔ اسی پر یہ کلیات ختم ہوتا ہے۔

خاتمہ: کہاں تلک میں کروں اس نفاق کا شکوہ — خموشی اب تو ہے اولیٰ کہ اس میں راحت ہے

ان دونوں نسخوں میں کچھ کلام مشترک ہے مگر ایسا کلام بھی ہے جو ایک کلیات میں ہے اور دوسرے میں نہیں۔

اس کلیات کے آغاز میں تین مہریں ثبت ہیں۔ ایک تو مٹا دی گئی ہے۔ دوسری مہر نواب سالار جنگ کی ہے۔ تیسری مہر سید محمد علی خاں بہادر کی ہے جو سالار جنگ کے پردادا یعنی نواب مختار الملک کے والد تھے۔ اختتام پر بھی دو مہریں ہیں۔ ایک سالار جنگ کی اور دوسری محمد علی خاں بہادر کی۔ یہ صاف پڑھی نہیں جاتی۔ اختتام کی عبارت یہ ہے:

"تمام شد دیوان میر تقی میر تخلص بتاریخ شانزدہم ربیع الثانی ۱۲۴۱ھ ہجری۔"

(۳) **مثنوی دریائے عشق** کے چار نسخے کتب خانہ سالار جنگ میں موجود ہیں۔ ان کی

---

[1] یہ قصیدہ کلیات میر کے کسی نسخے میں نہیں ملتا، یہ مخدومی قاضی عبدالودود صاحب کے ایک نوٹ کے ساتھ اس کتاب میں شامل ہے۔ (مدیر)

تفصیل یہ ہے:

(۱) سائز (۷½ × ۴½) صفحے (۲۰) سطر (۱۳) خط نستعلیق ۔کتابت پنجم جمادی الثانی ۱۲۱۵ھ

(۲) سائز (۸ × ۵) صفحے (۳۶) سطر (۱۱) خط نستعلیق کتابت ہیجدہم ربیع الاول ۱۲۴۳ھ

نسخے کے آغاز و اختتام پر مرزا اسد علی بیگ کی مہر ثبت ہے۔ یہ غالباً وہی ہیں جو تمنا تخلص کرتے تھے۔

(۳) سائز (۸½ × ۵½) صفحے (۱۹) سطر (۱۵) خط نستعلیق مائل بہ شکستہ کتابت نوزدہم ربیع الاول ۱۲۵۹ھ کاتب میر حبیب علی۔

(۴) سائز (۷½ × ۴½) صفحے (۲۱) سطر (۱۱) خط نستعلیق کتابت ہیجدہم ربیع الاول ۱۲۷۶ھ

ان میں سے پہلا نسخہ اس لیے اہم ہے کہ میر کی زندگی میں نقل ہوا ہے۔ میر کی وفات ۱۲۲۵ھ میں ہوئی اور یہ ان کے انتقال سے دس سال پہلے کا لکھا ہوا نسخہ ہے۔

ان چاروں نسخوں میں سے (۱۔ ۳۔ ۴) کا آغاز اس شعر سے ہے ؎

عشق ہے تازہ کار تازہ خیال
ہر جگہ اس کی ہے نئی اک چال

مگر نسخہ (۲) میں اس شعر کے پہلے ایک فارسی شعر ہے یعنی ؎

نامۂ عشق را کنم آغاز
کہ شوند عاشقانِ محرم راز

چاروں نسخوں کے اختتام کا شعر ایک ہی ہے یعنی ؎

لب پہ اب مہرِ خامشی بہتر
اس سخن کی فراموشی بہتر

عام طور سے یہ خیال کیا جاتا ہے کہ میر کی یہ مثنوی طبع زاد داستان ہے۔ مگر میری رائے میں یہ صحیح نہیں بلکہ اس مثنوی کا بڑا حصہ سید محمد وآلہ کی مثنوی "طالب و موہنی" سے ماخوذ ہے۔ چناں چہ میں نے یورپ میں "دکھنی مخطوطات" میں اس کی تفصیل درج کی ہے۔ اب ڈاکٹر زور نے "طالب اور موہنی" کو شائع کر دیا ہے۔ انھوں نے بھی اپنے مقدمہ میں میری تائید کی ہے۔

(۴) ساقی نامہ ۔ سائز (۸ × ۶) صفحے (۸) سطر (۱۷) کتابت ۱۳۲۶ھ کاتب

سید محمد علی عرش ملیح آبادی۔

عرش صاحب حیدر آباد میں آکر بس گئے تھے کئی کتابیں ان کی قلمی ملتی ہیں جنھیں عرش نے اپنے کتاب خانہ کے لیے نقل کرایا تھا۔ چناں چہ دیوان میر حسن کا بھی ایک قلمی نسخہ ان کا لکھا ہوا ملتا ہے۔

ساقی نامہ کے اختتام پر یہ عبارت درج ہے:

"ساقی نامہ میر تقی میر دہلوی ۱۲۲۵ھ جس کو حقیر فقیر سید محمد علی ملیح آبادی نے اپنے کتب خانہ خانگی کے لیے ایک قدیم نسخہ سے نقل کیا۔ مرقوم ۱۶ رجب ۱۳۲۸ھ شوکت منزل بیرون یاقوت پورہ حیدر آباد۔"

آغاز: ہے قابل حمد وہ سر انداز   جو سب میں ہوا ہے جلوہ پرداز

(ب) سنٹرل لائبریری (کتب خانہ آصفیہ)

یہاں کلیات میر کا صرف ایک نسخہ ہے جو (۱۸×۸) سائز (۷۳۱) صفحات پر مشتمل ہے یہ خوش خط نستعلیق میں ہے۔ تاریخ کتابت درج نہیں مگر خاتمے کی عبارت سے واضح ہوتا ہے کہ میر کی زندگی میں لکھا گیا ہے کیوں کہ میر کے نام کے ساتھ "سلمہ اللہ تعالیٰ" لکھا ہوا ہے:

"تمت بالخیر بعون الملک الوہاب بدستخط ذو الفقار علی[1] باتمام رسید دیوان کلیات میر تقی سلمہ اللہ تعالیٰ۔"

آغاز: تھا مستعار حسن سے اس کے جو نور تھا   خورشید میں بھی اوس کا ہی ذرہ ظہور تھا
ہنگامہ گرم کن جو دلِ ناصبور تھا   پیدا ہر ایک نالہ سے شورِ نشور تھا

اس کلیات میں اولاً ردیف وار غزلیں درج ہیں۔ اس کے بعد تین مخمس اور دو مسدس منقبت میں ہیں۔ پھر فرخ آباد میں لشکر شاہی میں ہنگامہ ہونے کے متعلق ایک مخمس ہے جس میں میر نے اپنا موجود ہونا بھی بیان کیا ہے۔ اس مخمس کے بعد رباعیات ہیں۔ پھر فرد ہیں۔

[1] میرا قیاس ہے کہ یہ ذو الفقار علی صفا لکھنوی ہیں۔ جنھیں میر کا شاگرد بتایا جاتا ہے۔ یہ بارہویں صدی ہجری میں حیدر آباد پہنچے تھے۔ ان کی مثنوی حیو منتر کا ایک قلمی نسخہ ادارہ ادبیات اردو میں اور تین نسخے کتب خانہ انجمن ترقی اردو علی گڑھ میں محفوظ ہیں۔ دیوان قلمی کتب خانہ سالار جنگ میں ملتا ہے۔ (ایڈیٹر)

اس کے اختتام پر مثنویاں شروع ہوتی ہیں۔ اس میں ہجویں بھی شامل ہیں۔ اس کے بعد ساقی نامہ پھر مثنویات جوش عشق اور دریائے عشق ہیں۔ پھر دو مخمس ہیں اور مثنوی اژدر نامہ وخواب و خیال نیز شعلۂ شوق۔ ان مثنویوں کے بعد چند ہجویں ہیں۔ آخر میں مرثیے اور سلام درج ہیں۔ اس پر کلیات ختم ہوتا ہے۔

جیسا کہ تذکرہ کیا گیا ہے یہ نسخہ اس لیے خاص اہمیت رکھتا ہے کہ میر کی زندگی میں لکھا گیا ہے۔ لیکن قاضی عبدالودود صاحب کا خیال ہے کہ اس کلیات میں میر کا سارا کلام شامل نہیں ہے۔

خواجہ احمد فاروقی نے اپنی کتاب "میر تقی میر: حیات اور شاعری" میں کلیات میر فارسی کے ایک قلمی نسخے کا ذکر کیا ہے (ص ۴۹۵ وبعد) جس کے کاتب کا نام "اللہ رکھا ابن قاضی جان محمد" ہے اور اس نے "روز پنجشنبہ ہنگام برآمدن آفتاب، بقدر نیزہ" اس کی کتابت تمام کی ہے اس کے حاشیہ پر یہ عبارت ہے:

"مقابلہ نمودہ شد باصل نسخہ کہ بخط مصنف علیہ الرحمہ بود با حضرت شاہ عبداللطیف روز چہارشنبہ بقدم شہر ربیع الآخر ۱۲۱۴ھ۔"

اس میں ایک قصیدہ "فی مدح الشیخ علیہ الرحمہ" بھی ہے اور ایک قطعے کا عنوان ہے:

"در صفت مے خانہ و بعہد ملازمت مرشد کامل ہادی آگاہ دل شیخ زمانہ شاہ عنایت اللہ القادری قدس سرہٗ"

ساتھ ہی یہ بھی کہتے ہیں کہ ممکن ہے قصیدہ بھی شاہ عنایت اللہ قادری کی منقبت میں ہو۔ خاتمہ میں تاریخ ۲۰ ربیع الاول ۱۲۱۴ھ لکھی ہے۔

داخلی قرائن سے بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ کلام میر محمد تقی میر (شاعر معروف ریختہ گو) کا ہرگز نہیں کسی دوسرے شخص کا ہے جو میر تخلص کرتا تھا؛ اور کوئی خارجی قرینہ بھی ایسا نہیں۔ حیرت ہے کہ خواجہ احمد فاروقی صاحب نے اسے میر کا دیوان کیسے تسلیم کر لیا۔ اس کے خلاف یہی ایک شبہ کافی تھا کہ کاتب ۱۲۱۴ھ میں مصنف کو علیہ الرحمۃ لکھ رہا ہے اور اس کے علاوہ یہ بھی قابل غور ہے کہ میر غالی شیعہ تھے قادری سلسلے کے کسی شخص کو اپنا مرشد بتانا اور اس کی مدح کرنا ان سے

بعید تھا۔ قاضی عبدالودود صاحب کا بھی یہی خیال ہے کہ یہ دیوان میر تقی میر کا نہیں ہو سکتا۔

(ج) ادارہ ادبیات اردو

ادارہ ادبیات اردو میں اردو دیوان میر کے دو نسخے ہیں اور ایک نسخہ دیوان فارسی کا ہے پہلا نسخہ (۹ × ۵ ½) سائز کے (۳۵۰) صفحوں پر مشتمل ہے اور اس میں (۱۵) سطریں ہیں یہ ۱۱۹۲ھ میں لکھا گیا ہے یعنی میر کی زندگی ہی میں مرتب ہوا ہے اور ترقیمے کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ نقل کا کام صرف ۱۸ دن میں تمام ہو گیا تھا۔ ابتدائی (۱۱۰) صفحوں میں غزلیات ہیں۔ ان کو میر محمد علی نے نقل کیا ہے۔ اس کے بعد رباعیات اور مخمس ہیں۔ پھر فردیات تضمین، مثلث، ترکیب بند، مسدس واسوخت، ان کے بعد گیارہ مثنویاں ہیں یعنی (۱) تنبیہ الجہال (۲) زبان زد عالم۔ ہجو بے ادبے (۳) ہجو آئینہ دار (۴) سگ نامہ (۵) ہجو خانہ خود (۶) سگ و گربہ (۷) مادہ سگ (۸) جوش باراں (۹) ہجو اکول (۱۰) دم الفضول (۱۱) مرثیہ مرغ۔

ان مثنویوں کے بعد قطعات ہیں یعنی تعریف اسپ۔ ہجو خواجہ سرا۔ مبارکباد صحت وزیر۔ ان قطعات کے بعد پھر گیارہ مثنویاں ہیں (۱) تعریف آغا رشید (۲) مبارکباد کدخدائی بشن سنگھ (۳) ساقی نامہ (۴) جوش عشق (۵) دریائے عشق (۶) اعجاز عشق (۷) خواب و خیال (۸) شعلۂ عشق (۹) ہجو نامہ (۱۰) تعریف بچہ کپتی (۱۱) تعریف گربہ موہنی۔

ان مثنویوں کے بعد سات قصیدے ہیں۔

یہ کلیات دو کاتبوں کا لکھا ہوا ہے پہلا حصہ میر محمد علی نے اور دوسرا رادھا کشن نے (ورق ۶۳ تا ۱۷۵) نقل کیا ہے۔ میر محمد علی نے دو جگہ خاتمہ کی عبارت لکھی ہے یعنی:

"تمام شد بتاریخ دویم روز دوشنبہ شہر ذیقعدہ ۱۱۹۲ھ ہجری نبوی بحسب فرمایش شیخ محمد شاکر حیوسلمہ ربہ بدست میر محمد علی تحریر پذیر یافت بسنہ ۲۰ جلوس عالم بادشاہ۔"

اور دوسرا ترقیمہ یہ ہے:

"تمت تمام شد دیوان میر تقی بتاریخ چہارم شہر ذیقعدہ روز سہ شنبہ بحسب فرمایش میاں محمد شکر اللہ بدست میر محمد علی رضوی موافق ۱۱۹۲ھ ہجری تحریر یافت سنہ ۲۰ جلوس شاہ عالم بادشاہ غازی۔"

رادھا کشن نے اس پر یہ عبارت لکھی ہے:

"تمت تمام شد دیوان میر تقی بتاریخ بست نہم شہر شوال روز پنجشنبہ سنہ ۲۰ جلوس شاہ عالم مطابق سنہ ۱۱۹۲ھ بحسب فرمایش میاں محمد شکر اللہ بمقام دار الخلافہ شاہ جہاں آباد۔ بخط احقر العباد بندہ رادھا کشن کاتب تحریر یافت۔"

اسے دیکھ کر قیاس ہوتا ہے کہ دیوان کے اجزا کی ترتیب جلد بندی کے وقت بدل گئی ہے میر محمد علی نے ذیقعدہ میں سنہ ۱۱۹۲ھ لکھا ہے اور رادھا کشن نے شوال سنہ ۱۱۹۲ھ ۔

دیوان کا آغاز ان اشعار سے ہوا ہے:

ہر ذی حیات کا ہے سبب جو حیات کا	نکلے ہے جی ہی اس کے لیے کائنات کا
بکھرے ہے زلف اس رخِ عالم فروز پر	ورنہ بناؤ ہووے نہ دن اور رات کا

اس دیوان کا اختتام یہ ہے:

اگر یہ عذر ہو مقبول تو تو خیر ارنہ	حریف ہونے کا میرے نتیجہ خفت ہے
کہاں تلک میں کروں اس نفاق کا شکوہ	خموشی اب تو ہے اولیٰ کہ اس میں راحت ہے

ڈاکٹر زور نے اس کی تفصیل تذکرۂ اردو مخطوطات جلد اول کے صفحہ (۱۰۸ تا ۱۱۷) میں لکھی ہے۔

(۲) ادارہ ادبیات اردو کا مملوکہ دوسرا دیوان (۹ ½ × ۶) سائز کے (۱۸۰) صفحات کو محیط ہے۔ اس دیوان میں صرف غزلیات ہیں اور تقریباً تین ہزار شعر ہیں ۔ یہ دیوان میر صاحب کے انتقال کے چار سال بعد سنہ ۱۲۲۹ھ میں لکھا گیا ہے۔

آغاز: تھا مستعار حسن سے اس کے جو نور تھا — خورشید میں بھی اس کا ہی ذرہ ظہور تھا

اختتام: بھرا ہے دل مرا جام لبالب کی طرح ساقی — گلے لگ خوب روؤں میں جو مینائے شراب آوے

ترقیمہ: "دیوان حضرت میر صاحب سلمہ الرحمان[1] بتاریخ بست و چہارم شہر صفر المظفر سنہ ۱۲۲۹ھ بروز آخری چہار شنبہ بدست امیر بیگ منصب دار ملازم سرکار نواب صاحب شمشیر بہادر بوقت یک پاس گھڑی روز برآمدہ بانصرام رسید تمام شد۔"

---

[1] غالباً کاتب دیوان کو میر کے انتقال کا علم نہ ہوگا ورنہ سنہ ۱۲۲۹ھ میں انھیں سلمہ الرحمن نہ لکھتا۔ (ایڈیٹر)

(۳) انتخاب کلام

ادارہ میں میرؔ کے کلام کا ایک انتخاب بھی ہے جو ۱۳۰۷ھ لکھا گیا ہے۔

آغاز: اے قیامت نہ آئیو جب تک وہ مری گور پہ نہ ہو جائے

اختتام: جدائی سے تری اے صندلی رنگ مجھے یہ زندگانی دردِ سر ہے

(۴) دیوان میرؔ فارسی

میرؔ کے دیوان فارسی کا یہ مخطوطہ (۸۸) اوراق پر مشتمل ہے۔ اس میں ایک "مثنوی در فراق شہر ہند" بھی شامل ہے۔ اس کے ترقیمے سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف کی حیات میں لکھا گیا ہے:

"تمام شد دیوان فارسی از میر تقی میرؔ بدست لالہ دولت رائے بتاریخ چہارم ذی قعدہ ۱۱۹۲ھ موافق ۲۰ جلوس والا بحسب فرمایش (کذا) شیخ محمد شکر اللہ تحریر پذیرفت۔

(د) کتب خانہ جامعہ عثمانیہ میں میرؔ کا کوئی قلمی کلیات نہیں ہے البتہ مثنوی شعلۂ عشق کا ایک قلمی نسخہ موجود ہے۔

قاضی عبدالودود

غیر مطبوعہ کلامِ میر

قصیدہ در شکایتِ نفاقِ یارانِ زماں

میر کا کلیات سنہ ۱۲۲۶ھ میں فورٹ ولیم کالج کی طرف سے چھپ کر شائع ہوا۔ یہ الحاقی کلام سے معرّا تھا، لیکن اس میں میر کا کل اردو کلام موجود نہیں۔ ذیل میں میر کا ایک قصیدہ درج کیا جاتا ہے جو کلیات کے کسی مطبوعہ نسخے میں نہیں ہے اور کتب خانۂ سالار جنگ کے نسخۂ کلیاتِ میر (۱۶۳) سے لیا گیا ہے۔ میر پر کسی شخص نے الزام لگایا تھا کہ انھوں نے کسی شخص کے بارے میں کوئی ایسی بات کہی تھی جو انھیں نہ کہنی چاہیئے تھی۔ میر اس سے انکار کرتے ہیں لیکن ساتھ ساتھ یہ بھی فرماتے ہیں کہ میرے مقابلے کا نتیجہ خفت کے سوا کچھ نہ ہوگا۔ یہ معلوم نہ ہو سکا کہ یہ لوگ کون تھے اور قصیدے کے زمانہ تصنیف کے بارے میں فی الحال اس سے زیادہ نہیں کہہ سکتا کہ لکھنؤ جانے سے پیشتر میر کے قلم سے نکلا تھا۔ اب قصیدہ ملاحظہ ہو:

جہاں میں کون ہے جس کو کسی سے اُلفت ہے — خراب کوچہ و بازاریاں محبّت ہے
نفاقِ خانہ برانداز بس کہ ہے رائج — دل اتفاق کا زیرِ غبار کلفت ہے
باتفاق اگر دو عزیز مل بیٹھیں — زبان مردم بد سے انھوں پہ آفت ہے
کروں میں ہجو اگر روز ایسے عالم کی — بجا ہے ان سے کہ میرے[1] تئیں شکایت ہے
دروغ گوئی سے دو آشنا لڑا دینا — کہاں کی رسم[2] ہے یہ گر یہی مروّت ہے

[1] کذا [2] اصل میں "یہ ہے"

تو چھوڑ شہر کی یہ تنگنا نکل جاویں — کہ گوشہ ملے بیاباں میں بس کہ وسعت ہے
نہ دیکھوں منھ میں انھوں کا اگر ہوں آئینہ — اِسی لیے تو مرے دل نشین عزلت ہے
کہوں میں مطلع ثانی کہ طورِ یاراں سے — دل شکستہ مرا تنگ اب نہایت ہے
منھوں پہ صاف ہیں لیکن نہ حفظ غیبت ہے — مثال آئینہ دیکھے ہی کی یہ ملت ہے
اگر سخن کی مرے[1] رشک ان کی ہے جانسوز — وگر دلوں میں انھوں کے غرور دولت ہے
حریف میرے یہ ان باتوں سے نہیں ہوتے — کہ راہ راست پہ ہوں ہیں انھیں ضلالت ہے
سخن کی خوبی کے میدان کا ہوں میں رستم — مقابلے کو مرے ان میں کس کی طاقت ہے
رہا غرورِ زر و مال ان کا اب باقی — سوا اس کا ہونے[2] کو رکش مری شرافت ہے
بخالقیکہ زمیں اور آسماں کی بنا — نظر میں سب کی اسی کا ظہور قدرت ہے
باحمدیکہ بلا میم اس کو کہتے ہیں — اسی کی شرق سے لے تا بغرب امت ہے
بمرتضیٰ کہ پیمبر سے اس کو ہے خویشی — بفاطمہ کہ کنیز اس کی ایک عصمت ہے
بآں امام کہ قسمت میں اس کی زہر ہوا — بآں حسین کہ وہ بیکسِ شہادت ہے
بذوالفقار کہ وقت نبردِ غازی کے   ق — زباں میں نام سے اسکے ہوئی یہ حالت[3] ہے
کہ گر وہ بات کہے صف میں کافروں کی جا — تو سر کو تن پہ خوارج کے کب یہ فرصت ہے
کہ ایک دم میں نہ پیوند ہو جدا اس کا — ملے نہ خاک میں جب تا کہاں فراغت ہے
کہوں میں مطلع ثالث کہے ہے ہاتف غیب — کہ تیرے صدق کی شاہد تری ہی ہمت ہے
بزلفِ یار کہ مجھ پر اسی سے شامت ہے — بزہر مار جو جینے میں کچھ حلاوت ہے
بذوق وصل کہ اکدم نہیں ہے مجھ کو قرار — باضطراب کہ وہ خانہ زادِ فرقت ہے
بسوز شمع کہ جلتی ہے وہ بھی میری طرح — بانجمن کہ وہ کثرت میں رشکِ خلوت ہے
بانتظار کہ آنکھیں سفید اس میں ہوئیں — بنور شمع کہ وہ پائمال حیرت ہے
بطوف کعبہ کہ بے سعی واں نہیں ہے گذار — بعشق دیر کہ واں برہمن سعادت ہے

---

[1] تا [3] کذا

بعزّتیکہ ہے دوری راہ اس میں رفیق — بمنزلیکہ پہنچنا وہاں قیامت ہے
بطاقتیکہ اسے ضعف سے ہے ربط قدیم — بخاطریکہ وہ منّت کش مصیبت ہے
بمشہدیکہ چراغ اس کا چشم آہو ہو — بچشمکے کہ وہ خونریز اہل حسرت ہے
بہمّتیکہ نہ دیکھا ہو ان نے خسّت کو — بخستیکہ سراپا عدوے ہمت ہے
بزورقیکہ جو وہ نوح کی پناہ ہوئی — بملّتیکہ وہ طوفاں سے غرق خجلت ہے
بمحنتیکہ وہ آزردہ ہوئے راحت سے — براحتیکہ حقیقت میں رنج و محنت ہے
بعزّتیکہ جو سنتی ہو شیخ نام ذلّت کا — بذلّتیکہ وہ کہتی ہو کیسی عزّت ہے
قسم ہے میرے تئیں ان تمام قسموں کی — جو میں نے کچھ بھی کہا ہو یہ مجھ پہ تہمت ہے
جو کچھ کہا ہے کنھوں نے غلط کہا ہیگا — کسو سے رنجش بے جا نہ میری طینت ہے
اگر یہ عذر ہو مقبول تو تو خیر ارنہ — حریف ہونے کا میرے نتیجہ خفّت ہے
کہاں تلک میں کروں اس نفاق کا شکوہ — خموشی اب تو ہے اولیٰ کہ اس میں راحت ہے

سید مبارز الدین رفعت*

کلامِ میر کا ایک کمیاب انتخاب

خدائے سخن میر تقی میر نے ماشاء اللہ کافی لمبی عمر پائی اور لکھا بھی بہت۔ انھوں نے غزلیات کے چھے دیوان اور فردیات، رباعیات، مخمسات، مثنویات اور دوسرے اصنافِ سخن پر مشتمل ایک اور دیوان یادگار چھوڑا۔ ان دواوین کا یہ حال ہے کہ پورا کلام ہموار اور یکساں طور پر خدائے سخن کی شاعرانہ عظمت کا آئینہ دار نہیں۔ بعض شعر سچ مچ تیر و نشتر ہیں اور پڑھنے والے کے قلب و جگر میں تل جاتے ہیں۔ لیکن ان ہی اشعار کے پہلو بہ پہلو ایسے شعر بھی ہیں جو پامال، بے جان رکیک اور مبتذل ہیں۔ یوں تو ہمارے سب ہی تذکرہ نگاروں نے میر کے احوال کے ذیل میں ان کے اشعار کا انتخاب بھی درج کیا ہے، لیکن یہ ان کے پورے کلام کا انتخاب نہیں۔ مستقل انتخاب بعد کی پیداوار ہیں۔ اب تک کلامِ میر کے متعدد انتخابات شائع ہو چکے ہیں اُن میں سے چند یہ ہیں:

(۱) انتخاب کلام میر از عماد الملک سید حسین بلگرامی
(۲) انتخاب کلام میر از ڈاکٹر مولوی عبدالحق
(۳) مزامیر (دو حصے) از جعفر علی خاں اثر لکھنوی
(۴) انتخاب کلام میر: از عبدالمنان بیدل
(۵) میر کے سو شعر: از عارف ہسوی
(۶) انتخاب کلام میر: نور الرحمٰن
(۷) انتخاب کلام میر: احسن حامد
(۸) مثنویاتِ میر: سر شاہ سلیمان
(۹) مثنویاتِ میر: سید محمد
(۱۰) انتخاب میر (ہندی)
(۱۱) مراثیِ میر: مسیح الزماں
(۱۲) دیوانِ میر (انتخاب) مرتبہ سردار جعفری
(۱۳) میر کے بہتر نشتر:
(۱۴) سوزِ میر مرتبہ مسلم احمد نظامی

ان کے علاوہ اور بھی چند انتخابات ہیں۔ ہم یہاں نواب عماد الملک کے انتخاب کا تعارف پیش کرنا چاہتے ہیں کیونکہ یہی سب سے زیادہ کمیاب ہے اور اپنی بعض خصوصیات کی وجہ سے قابلِ ذکر ہے۔

مختار اشعار۔ انتخاب دیوانِ میر تقی میر اکبر آبادی۔ از نواب عماد الملک سید حسین بلگرامی

نواب عماد الملک سید حسین بلگرامی (۱۸۴۲ء - ۱۹۲۶ء) اپنے عہد کے ایک ممتاز عالم، سیاس اور مدبر تھے

---

* اُستاد شعبۂ اردو و فارسی، گورنمنٹ سائنس اینڈ آرٹس کالج، گلبرگہ (میسور)

بلگرام کے ایک ممتاز گھرانے سے تعلق رکھتے تھے جو بہار میں اعلیٰ عہدوں پر فائز تھا۔ نواب سر سالار جنگ اول نے انھیں حیدر آباد دکن طلب کر کے اپنا سکریٹری مقرر کیا تھا۔ پھر وہ ریاست کے ناظم تعلیمات بنے اور شہزادوں کی اتالیقی کے فرائض بھی انجام دیے۔ حکومت ہند نے ایک جامعاتی کمیشن مقرر کیا تھا۔ وہ اس کے بھی رکن رہے۔ "وہ پہلے ہندوستانی مسلمان ہیں جنھیں انڈیا کونسل کی ممبری پر فائز کیا گیا۔ حیدر آباد میں بہت سے علمی سرچشموں کی آبیاری میں ان کا بہت بڑا حصہ رہا۔ ان میں کتب خانۂ آصفیہ، دائرۃ المعارف اور جامعۂ عثمانیہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان کے علم و فضل اور تعلیمی امور سے ان کی غیر معمولی دلچسپی کی بنا پر اسکولوں اور کالجوں میں پڑھانے کے لیے "مدراس اسکول بکس اینڈ لٹریچر سوسائٹی" نے ان سے اردو کے بڑے بڑے شاعروں کے دواوین کے انتخابات مرتب کرنے کی درخواست کی۔ چنانچہ نواب صاحب نے اس سلسلہ میں 'مختار اشعار' کے نام سے شیر علی افسوس، عبدالحی تاباں، نظام الدین ممنون، نظیر اکبر آبادی، قائم چاند پوری شاہ نصیر، مرزا رفیع سودا اور میر تقی میر کے دواوین کے انتخابات مرتب کیے۔ یہ انتخابات ۱۸۹۶ء میں الگ الگ کتابی صورت میں مطبع مفید عام آگرہ نے لیتھو میں چھاپے اور مدراس بکس اینڈ لٹریچر سوسائٹی نے انھیں شائع کیا۔ پھر ۱۹۰۱ء میں اسی سوسائٹی نے دو دو تین تین دیوانوں کے انتخابات کو ملا کر مطبع ایس، پی، سی مدراس سے ٹائپ میں چھپوا کر شائع کیا۔ میر کے کلام کے انتخابات کو تیسری مرتبہ نواب صاحب کی اجازت سے اردو کے مشہور شاعر اور غالب کے شارح سید علی حیدر نظم طباطبائی نے ۱۳۲۷ھ میں حیدر آباد دکن سے شائع کیا۔ نواب عماد الملک کا مرتب کردہ میر کے کلام کا یہ انتخاب کتابی صورت میں میر کے کلام کا پہلا انتخاب ہے جو درسی ضروریات کے علاوہ عام قاریوں کے لیے تیار کیا گیا تھا۔ اس مضمون کے لکھتے وقت راقم کے پیش نظر نظم طباطبائی کا شائع کردہ اڈیشن ہے۔ سرورق کی عبارت ہے

"مختار اشعار۔ جلد اول۔ انتخاب دیوان میر تقی میر اکبر آبادی۔ جس کو عالی جناب نواب عماد الملک بہادر مولوی سید حسین بلگرامی، سی، ایس، آئی، رکن مجلس وزیر ہند دام اقبالہٗ نے انتخاب فرمایا اور ان کی اجازت سے اس خاکسار ربیے مقدار علی حیدر طباطبائی نے مطبع انوار اسلام (کوٹلہ اکبر جاہ۔ روبرو عدالت دیوانی بلدہ۔ حیدر آباد دکن) میں چھپوا کر شائع کیا۔ صفر ۱۳۲۷ھ۔ قیمت ۸ ر"

یہ انتخاب رائل سائز کے (۱۰۹) صفحات میں آیا ہے۔ سرورق کی عبارت "انتخاب دیوان میر تقی میر اکبر آبادی" سے شبہ ہوتا ہے کہ یہ ان کے کسی ایک دیوان کا انتخاب ہے۔ مثنویات، رباعیات، مخمسات اور دوسرے اصناف سخن کا انتخاب نہیں کیا ہے۔ اپنے دوسرے انتخابات کی طرح اس انتخاب پر بھی نواب صاحب نے کوئی مقدمہ یا دیباچہ

نہیں لکھا ہے۔ الگ الگ ہر دیوان کا ردیف وار انتخاب درج کرنے کی بجائے میر کے چھے دواوین کی غزلوں کو یکجا کر کے انتخاب کیا ہے۔ اس بات کی بھی کوئی صراحت درج نہیں کہ انھوں نے یہ انتخاب کسی مطبوعہ کلیات میر سے کیا ہے یا قلمی نسخے سے منتخب اشعار کی تعداد (۱۹۴۳) ہے اور اس کی تفصیل درج ذیل ہے:

ردیف الف (۲۶۱) شعر۔ ردیف ب (۲۸) شعر۔ ردیف ج (۲) شعر۔ ردیف چ (۱۰) ردیف ح (۴۳) شعر۔ ردیف دال (۲۳)۔ ردیف ر (۷۰) ردیف ز (۱۱) ردیف س (۱۰) ردیف ش (۸)۔ ردیف ص (۱)۔ ردیف ط (۲)۔ ردیف ع (۱)۔ ردیف غ (۶) ردیف فا (۱۱)۔ ردیف ق (۶)۔ ردیف ک (۲۲) ردیف گاف (۱۱) ردیف ل (۲۰) ردیف م (۶۹)۔ ردیف ن (۳۲۵)۔ ردیف و (۲۳۱) ردیف ہ (۷۱) ردیف ی (۷۳۱) شعر۔ ردیف یا کے اشعار تعداد میں سب سے زیادہ ہیں۔ (۶۹) سے شروع ہو کر صفحہ (۱۰۹) پر ختم ہوتے ہیں۔ گویا نصف کتاب ردیف یا کے اشعار ہی سے بھری ہوئی ہے کہیں کہیں حواشی بھی لکھے ہیں۔ بطور نمونہ کچھ حواشی نقل کیے جاتے ہیں:

رہتا نہیں تڑپنے سے ٹک ہاتھ کے تلے   کیا جانوں میر دل کو مرے کیا بلا ہوا

لفظ "بلا" پہ حاشیہ لکھا ہے: "لفظ "بلا" مونث ہے لیکن "کیا بلا ہوا" محاورہ ہے جواب بھی زبان زد ہے۔"

یاں میر ہم تو پہنچ گئے مرگ کے قریب   واں دلبروں کو ہے وہی قصدِ جفا ہنوز

لفظ "پہنچ" پہ نوٹ لکھا ہے: "پہنچ کا بسکون ہا باندھنا اب متروک ہے۔"

خلط غلط کہ رہیں تم سے ہم تنک غافل   وہ اور اس کو کسو پہ نظر دروغ دروغ

لفظ "تنک" کے بارے میں لکھا ہے "تنک کا لفظ ہندوستان کے گانوٗ والے اب بھی بولتے ہیں۔"

جان آخر تو جانے والی تھی   اوس پہ کی ہوتی میں نثار رہے کاش

اس شعر پہ حاشیہ لکھا ہے: "میں اوس پہ جان نثار کی ہوتی" زمانہ سابق میں بغیر (نے) کے بھی بول جاتے تھے اور (نے) کو ترک کر کے بھی فعل کو مونث ہی رہنے دیتے تھے۔ اس سبب سے جان مونث ہے۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ جان کا لفظ اوس زمانے میں بتذکیر بھی مستعمل تھا۔ میر سوز کی غزل گائی جاتی ہے ع مرا جان جاتا ہے یارو سنبھالو۔ اور خود میر صاحب کے کلام میں بھی بتذکیر آیا ہے۔"

نواب صاحب کے مرتب کردہ اس انتخاب کا پہلا شعر ہے ؎

تھا مستعار حسن سے اوس کے جو نور تھا   خورشید میں بھی اوس ہی کا ذرہ ظہور تھا

اور آخری شعر ہے ——— دیکھو تو میر کیونکر ہجراں میں ہم جیے ہیں   ہے اضطراب دل کا بے طاقتی جو جاں کی

عام طور سے ہر غزل سے چار چار پانچ پانچ شعر منتخب کیے ہیں۔ کم ہی غزلیں ایسی ہیں جن کے ایک ایک یا دو دو شعر چنے ہیں۔ اپنی اہمیت اور افادیت کے اعتبار سے یہ انتخاب اس قابل ہے کہ اسے دوبارہ شائع کیا جائے۔

باب چہارم

خراجِ عقیدت

باتیں ہماری یاد رہیں، پھر باتیں ایسی نہ سنیے گا
پڑھتے کسی کو سنیے گا تو دیر تلک سر دُھنیے گا

مرزا محمود بیگ

میر جی

[ریڈیائی فیچر]

اوّلِ کارِ محبت تو بہت سہل ہے میرؔ
جی سے جاتا ہے ولے صبر و قرار آخر کار

راوی : آج سے پورے دو سو چھتیس (۲۳۶) برس پہلے جب ہندوستان کی سیاسی قسمت بدل رہی تھی، جب ہندوستانی حکومتیں آئے دن کی خانہ جنگیوں سے ایک دوسرے کو کمزور اور عوام کو پریشان کر کے فرنگیوں کی کامیابی کے لئے زمین تیار کر رہی تھیں، جب نہ دن چین تھا اور نہ رات آرام؛ آگرہ شہر میں میر محمد علی المخاطب بہ علی متقی کے گھر ایک بیٹا پیدا ہوا جس نے میر محمد تقی نام پایا، اور میرؔ تخلص جس کی زندگی دکھوں سے بھری ہوئی تھی؛ اور جس کو کبھی غموں سے فراغ نصیب نہیں ہوا، مگر جس نے غمِ دوراں کو غمِ جاناں بنا کر غزل کو سوز و گداز کا آتش کدہ بنا دیا اور اس میں سینکڑوں دلوں کی دھڑکنیں اور سینکڑوں نگاہوں کی تشنگی چھپا کر درد و سوز کا ایسا نغمہ چھیڑا کہ ع

ہر ورق ہر صفحے میں اک شعرِ شور انگیز ہے

جس کو اقلیم سخن کے تاجدار ہونے کا احساس اور تغزل کے میدان میں کسی ہم سر کے پیدا نہ ہونے کا ایسا یقین تھا کہ فرمایا :

برسوں لگی رہی ہیں جب مہر و مہ کی آنکھیں
تب کوئی ہم سا صاحب، صاحب نظر بنے ہے

اور : سارے عالم پر ہوں میں چھایا ہوا
مستند ہے میرا فرمایا ہوا
باتیں ہماری یاد رہیں پھر باتیں ایسی نہ سنیے گا
پڑھتے کسی کو سنیے گا تو دیر تلک سر دھنیے گا

ہم آج تک میر کو پڑھتے ہیں اور سر دھنتے ہیں۔ اُن کی باتیں، ان کی وارداتیں یاد آتی ہیں۔ اُن کا بچپن، ان کی جوانی، ان کا جنون، اُن کی پریشانی، ان کا دلّی اور لکھنؤ میں اُستادِ فن تسلیم ہونا، نازک مزاجی کی وجہ سے بددماغ مشہور ہو جانا، نوّے برس کی عمر اور سخن فہموں کی نگاہ میں عزّت پانا سب یاد آتا ہے۔

[فلیش بیک]

راوی: ۱۷۳۲ء ہے، میر کی عمر دس برس کی ہے، درویش صفت باپ سخت بیمار ہے، بچنا محال ہے۔

میر محمد علی: (بہت ہی کمزور اور درد انگیز آواز) بیٹے تقی شاید اب تمھارا باپ چند لمحوں کا مہمان ہے۔

میر : آباجان۔ یہ آپ کیا فرماتے ہیں، چچا امان اللہ ابھی عید کے مہینے ہم سے روٹھ کر خدا کو پیارے ہوئے، آپ اچھے ہو جائیے، آپ مجھے بے سہارا چھوڑ کر نہ جائیے۔

میر محمد علی: بیٹے سہارا خدا کا ہے، اُس سے لو لگاؤ۔ عالم میں جو کچھ ہے عشق کا ظہور ہے، آگ سوزِ عشق، پانی رفتارِ عشق، خاک قرارِ عشق، ہوا اضطرارِ عشق، موت عشق کی مستی ہے، حیات عشق کی ہوشیاری ہے، رات عشق کا خواب ہے، دن عشق کی بیداری ہے، تقویٰ قُربِ عشق ہے، گناہ بُعدِ عشق ہے۔

میر : مگر آباجان!

میر محمد علی: دیکھو بیٹا۔ عالم کی حقیقت ایک ہنگامے سے زیادہ نہیں ہے، اس سے دل نہ لگانا۔ عشقِ الٰہی اختیار کرو، اور خدا سے لو لگاؤ۔ آخرت کی فکر لازم ہے، یہ دنیا گزرنے والی ہے اور زندگی وہم ہے اور وہم کے پیچھے دوڑنا عبث ہے، چل چلاؤ لگا ہے۔ اچھا ذرا اپنے بڑے بھائی محمد حسن کو تو بلاؤ۔

میر : (آواز دیتے ہوئے۔ مگر آواز میں بے حد درد ہے) بھائی جان! بھائی جان!!

محمد حسن: (دوسرے کمرے سے) کیوں!

میر: ابا بلاتے ہیں۔

محمد حسن: آیا۔

(وقفہ)

میر محمد علی: دیکھو بیٹا محمد حسن۔ یہ میرا آخری وقت ہے، میں نفیر ہوں کچھ نہیں رکھتا، یہ تین سو کتابیں ہیں، انہیں کو آپس میں بانٹ لو۔

محمد حسن: ابا میں طالب علم ہوں۔ ان کتابوں کی مجھے ضرورت ہے، ان بھائیوں کو ان سے کیا واسطہ سوائے اس کے کہ ان کو پتنگ بنا کر اڑائیں یا پھاڑ ڈالیں۔

میر محمد علی: محمد حسن! اگرچہ تو نے فقیری اختیار کی ہے لیکن تیرے نفس کی برائی نہیں گئی ان کتابوں کو تو ہی لے لے، لیکن یاد رکھ۔ اللہ تعالیٰ غیور ہے اور غیور کو دوست رکھتا ہے، محمد تقی تیرا دست نگر نہیں ہوگا۔ اور تو اس کا کچھ نہ بگاڑ سکے گا۔

اور دیکھو محمد تقی مجھ پر تین سو روپے بازار کے قرض ہیں جب تک وہ ادا نہ ہولیں میری نعش نہ اٹھانا۔

میر: ابا جان

میر محمد علی: گھبراؤ نہیں، خدا کریم ہے، ہنڈی راستے میں ہے، پہنچا ہی چاہتی ہے یا اللہ! (اس کے بعد ایک ہچکی کی آواز آتی ہے۔ تھوڑی دیر سکوت رہتا ہے۔ پھر دونوں بچوں کی گریہ وزاری، ایک بہت مختصر وقفہ کے بعد دروازے پر دستک ہوتی ہے) وقفہ۔ (پھر دستک ہوتی ہے)۔

حسن: (روتے ہوئے) تقی دروازہ کھولو۔

تقی: اچھا (دروازہ کھولنے کی آواز) چچا کمل خاں (عزیز کو دیکھ کر ایک دم رونا آجاتا ہے) چچا جان آپ نے دیر کردی۔ ابا جان تو۔

کمل خاں: (ضبط سے کام لے کر۔ بچوں کو دلاسا دیتے ہوئے) خدا کی مرضی میں کسی کو دخل نہیں۔ یہ پانچسو روپیہ کی ہنڈی ہے، تجہیز و تکفین میں دیر نہ کرنی چاہیئے۔

(حزنیہ موسیقی)

راوی: کم سن تیر بے یار و مددگار تلاش معاش میں سرگرداں دہلی پہونچے اور صمصام الدولہ امیر الامراء کے بھتیجے

خواجہ محمد باسط کے ساتھ امیرالامرا کی خدمت میں حاضر ہوئے۔

خواجہ محمد باسط: محمد تقی! تم دلّی کیسے آئے۔ اور اکیلے! اور یہ حال کیا بنا رکھا ہے؟

میر: (دس گیارہ سال کی عمر ہے۔ پریشانی۔ مایوسی لہجے سے عیاں ہے) خواجہ صاحب۔ ابا۔ خدا کو پیارے ہوئے۔ معاش کی تلاش میں یہاں تک پہنچا ہوں۔

خواجہ: خدا پر بھروسا رکھو تقی۔ وہ بڑا کارساز ہے۔ میرے ساتھ آؤ میں ابھی تمھیں امیرالامرا سے ملاتا ہوں۔

(وقفہ)

خواجہ: بندہ آداب بجالاتا ہے۔

صمصام الدولہ: کیوں خواجہ کیسے آئے۔ اور یہ ساتھ کس کو لائے۔ کس کا لڑکا ہے۔

خواجہ: میر محمد علی کا (آواز میں درد ہے کچھ آگے کہنا چاہتے تھے مگر.......)

امیرالامرا: اس کے یہاں آنے سے ظاہر ہوتا ہے وہ راہئی ملک عدم ہوئے، خدا غریقِ رحمت کرے، خوب آدمی تھے۔ اُن کے مجھ پر بہت حقوق ہیں۔ اس لڑکے کو ایک روپیہ روز ہماری سرکار سے دیا جائے۔

میر: نواب صاحب۔ ازراہِ کرم تحریری حکم صادر فرمادیں تاکہ متصدیوں کو اعتراض کی گنجائش نہ رہے، یہ درخواست حاضر ہے، دستخط فرمادیں۔

امیرالامرا: صاحبزادے! یہ قلمدان کا وقت نہیں۔

میر: (ہنستے ہوئے۔ تعجب سے دہراتے ہوئے) قلمدان کا وقت نہیں!

امیرالامرا: کیوں میاں تم ہنسے کیوں؟

میر: معاف فرمائیے گا، میں آپ کے ارشاد کا مطلب نہ سمجھا، اگر آپ فرماتے قلمدان بردار حاضر نہیں ہے تو مضائقہ نہ تھا۔ یا یہ فرماتے کہ دستخط کا وقت نہیں تو صحیح تھا لیکن یہ فرمانا کہ وقتِ قلمدان نہیں، نیا محاورہ ہے۔ قلمدان تو لکڑی کا ہے وقت اور غیر وقت کو نہیں جانتا جس سے کہیے وہ اُٹھا لائے۔

امیرالامرا: (ہنستے ہوئے) ٹھیک کہتے ہو صاحبزادے، لاؤ میں دستخط کر دیتا ہوں (خواجہ صاحب مخاطب ہوکر) بچہ ہونہار ہے، خواجہ صاحب۔ اگر اس کی بخوبی تربیت ہوئی تو ایک ہی پرواز میں آسمان کے اُس طرف پہنچ جائے گا۔

(وقفہ۔ موسیقی)

راوی: ۱۷۳۹ء ہے۔ میر کی عمر سترہ برس کی ہے صمصام الدولہ کے روزینہ نے فکر معاش سے آزاد کیا تو انھوں نے پڑھائی کی طرف توجہ کی۔ مگر ان کی زندگی میں چین کہاں، نادر شاہی حملہ ہوا صمصام الدولہ مارے گئے دلی لُٹی اور میر واپس آگرہ گئے۔ وہاں ایک پری تمثال عزیزہ کے ساتھ چوری چھپے عشق ہوا۔ افشائے راز اور رسوائی کے ڈر سے پھر دلی آئے۔ اور اس دفعہ اپنے سوتیلے ماموں سراج الدین علی خان آرزو کے یہاں قیام رہا۔ مگر ان کے بھائی محمد حسن کا خط ملنے پر کہ "تقی آوارہ اور فتنۂ روزگار ہے اس کی تربیت کی طرف توجہ نہ کی جائے"، خان آرزو نے بہت خفگی کے ساتھ گھر سے نکال دیا جس کے صدمے سے دیوانگی پیدا ہو گئی۔

(فلیش بیک)

بیگم فخر الدین: محمد تقی! محمد تقی!! اُٹھتے کیوں نہیں۔ یہ تم نے کیا حال بنا رکھا ہے دروازہ بند کئے پڑے رہتے ہو۔ نہ کھانا ہے نہ پینا بہکی بہکی باتیں کرتے ہو۔

میر: (غنودگی کے عالم میں) ہوں!

بیگم فخر الدین: اُٹھو۔ میں ہوں فخر الدین کی بیوی، تمھاری پھوپھی — پیر جی نے یہ تعویذ دیا ہے۔ یہ بازو پر باندھ لو۔ خدا اپنا فضل کرے گا۔

میر: تعویذ! تعویذ!! (پھر خود ہی گنگناتے ہیں) ؏ نظر آئی ایک شکل مہتاب میں

بیگم فخر الدین: یہ کیا دیوانگی ہے۔ چاند میں شکلیں۔ کیا معنی، لو اُٹھو۔ یہ تعویذ باندھ لو۔

میر: تعویذ! تعویذ!!

(وقفہ۔ موسیقی)

راوی: ۱۷۵۴ء ہے۔ میر کی عمر پورے بتیس برس کی ہے۔ ان کی شاعری کی شہرت ہو چکی ہے۔ خان آرزو کی ہمسائیگی چھوڑ کر اب امیر خاں مرحوم کی حویلی میں رہتے ہیں۔ ہر مہینے کی پندرہ تاریخ کو پابندی سے مشاعرہ ہوتا ہے جس میں ان کے ہم عصر حصہ لیتے ہیں۔ آج مشاعرہ ہے۔ مرزا جان جاناں مظہر۔ میر عبدالحی تاباں۔ مرزا محمد رفیع سودا۔ خواجہ میر درد۔ سید محمد میر سوز۔ خاکسار۔ عاجز۔ بقا۔ سب موجود ہیں۔ خوش گپیاں ہو رہی ہیں۔

(فلیش بیک)

میر: بقا صاحب۔ کل آپ نے سر مشاعرہ کہہ دیا تھا ؎

اور بستی نہیں یہ دلی ہے   پگڑی اپنی سنبھالیے گا میر

بقا : وہ تو مشاعرہ کی محفل تھی میر صاحب۔ وہاں سب جائز ہے۔

میر : اچھا تو یہ مشاعرہ کی محفل نہیں ہے کیا۔

بقا : کیوں نہیں یہ محفل مشاعرہ ہے۔ مگر کل کی بات کل کے ساتھ گئی۔ آج خواجہ میر درد میر مشاعرہ ہیں۔

خواجہ میر درد : (تعجب سے) میں؟

سب : (ایک آواز ہو کر) جی ہاں۔ آپ

خواجہ میر درد : اچھا تو پھر میر صاحب آپ ہی بسم اللہ کیجیے۔

میر : عرض کیا ہے:

عمر بھر ہم رہے شرابی سے   دلِ پر خوں کی ایک گلابی سے

ایک : (واہ واہ! کیا محاورہ ہے)

میر : رات گزرے گی کس خرابی سے   جی ڈھہا جائے ہے سحر سے آج

دوسرا : (ہاں بھئی خطرہ ہی نظر آتا ہے، خدا خیر کرے۔)

میر : اُس کی آنکھوں کی نیم خوابی سے   کھلنا کم کم کلی نے سیکھا ہے

تیسرا : (بھئی ماشاء اللہ کیا تشبیہ ہے۔ کمال کر دیا)

میر : ہم ہی فارغ ہوئے شتابی سے   کام تھے عشق میں بہت پر میر

خواجہ میر درد : ماشاء اللہ۔ ماشاء اللہ۔ اب سوز صاحب آپ فرمائیے۔

سید محمد میر سوز : بھلا رے عشق تیری شوکت و شان   بھائی میرے تو اُڑ گئے اوسان!

(ایک عام قہقہہ پڑتا ہے۔)

ایک : (ہنستے ہوئے) ہاں بھائی میرے بھی اوسان گئے۔

میر سوز : دوسرے غم نے کھائی میری جان   ایک ڈر تھا کہ جی بچے نہ بچے

دوسرا : گر جی تو بے چارہ ....

میر سوز : اس سے زیادہ نہ ہو جیو مہمان   بس غم یار ایک دن دو دن

خواجہ میر درد : ٹھیک تو ہے۔ ایک دن مہمان۔ دو دن مہمان۔ تیسرے دن بلائے جان۔ ہاں سودا صاحب

آپ فرمائیے۔

مرزا محمد رفیع سودا: عرض کیا ہے۔

جو گزری مجھ پہ مت اُس سے کہو ہوا سو ہوا   بلا کشانِ محبت پہ جو ہوا سو ہوا

ایک: واہ واہ۔ کیا ایثار ہے۔

سودا: کہے ہے سُن کے مری سرگزشت وہ بے رحم   یہ کون ذکر ہے جانے بھی دو ہوا سو ہوا

دوسرا: ٹھیک تو ہے۔ ہوا سو ہوا۔

سودا: دیا اُسے دل و دیں اب یہ جان ہے سودا   پھر آگے دیکھیے جو ہو سو ہو، ہوا سو ہوا

خواجہ میر درد: اب جان بچا کے کیا رکھنی، جو ہو سو ہو، ہاں تاباں صاحب۔ اب آپ فرمائیے۔

میر عبدالحئی تاباں: نہیں ہے دوست اپنا یار اپنا مہرباں اپنا
سناؤں کس کو غم اپنا الم اپنا بیاں اپنا

ایک: واہ واہ۔ کیا مایوسی کا عالم ہے۔

تاباں: بہت چاہا کہ آوے یار یا اس دل کو صبر آوے
نہ یار آیا نہ صبر آیا دیا جی میں نے ناداں اپنا

دوسرا: (افسوس کرتے ہوئے جان جاتے جاتے رہ گئی۔ بچ! بچ!!)

تاباں: مجھے آتا ہے رونا ایسی تنہائی پر اے تاباں
نہ یار اپنا نہ دل اپنا نہ تن اپنا نہ جاں اپنا

خواجہ میر درد: (افسوس کرتے ہوئے) واقعی تنہائی کی انتہا ہے۔ اب جناب مظہر ارشاد فرمائیں گے۔

مرزا جانِ جاناں مظہر: چلی اب گل کے ہاتھوں سے لٹا کر کارواں اپنا
نہ چھوڑا ہائے بلبل نے چمن میں کچھ نشاں اپنا

ایک: واہ! واہ!! کیا نازک بیانی ہے۔

مرزا مظہر: یہ حسرت رہ گئی کیا کیا مزے سے زندگی کرتے
اگر ہوتا چمن اپنا گل اپنا باغباں اپنا

دوسرا: (حسرت سے) کہاں حسرتیں پوری ہوتی ہیں۔ مظہر صاحب اس دور میں۔

مرزا مظہر: کوئی آزردہ کرتا ہے سجن اپنے کو ہے ظالم
کہ دولت خواہ اپنا مظہر اپنا جانِ جاں اپنا

سودا: ماشاء اللہ ماشاء اللہ۔ کیا کلام ہے۔ اب خواجہ صاحب آپ فرمائیے خالی میر مشاعرہ بننے سے کام نہیں چلے گا

سب: جی ہاں اب خواجہ صاحب فرمائیں گے۔

میر درد: میں حاضر ہوں عرض کیا ہے۔

سب: ارشاد۔ ارشاد۔

میر درد: تہمتیں چند اپنے ذمے دھر چلے کس لئے آئے تھے ہم کیا کر چلے

ایک: (افسوس) واقعی!

میر درد: زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے

(ایک دم محفل پھڑک اُٹھتی ہے۔ جیسے ہر ایک کے دل کے تار چھیڑ دیئے گئے ہوں کوئی دہراتا ہے ع
زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے۔ اور کوئی واقعیت کے احساس سے بول پڑتا ہے ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے۔

خواجہ میر درد: ساقیا یاں لگ رہا ہے چل چلاؤ جب تلک بس چل سکے ساغر چلے

(وقفہ، موسیقی)

راوی: چل چلاؤ تو لگا ہی رہتا ہے۔ مگر اُس پُر آشوب زمانے میں جیسا چل چلاؤ تھا خدا کسی کو نہ دکھائے۔ ۱۷۶۱ء تک احمد شاہ ابدالی نے چھ حملے کئے۔ چھٹے حملے میں دلی کو ایسا لوٹا کہ کھانے اور پینے کی چیز تک نہ چھوڑی میر چالیس برس کی عمر میں ہی غریب سے زیادہ غریب ہو گئے۔ ان کا تکیہ سڑک کے کنارے تھا، وہ بھی خاک برابر ہوا۔ دلی سے نکل کھڑے ہوئے، خدا کے توکل پر دن بھر چل کر آٹھ نو میل کے فاصلے پر ایک درخت کے نیچے ٹھہرے، وہاں راجہ جگل کشور کی بیوی انھیں برسانہ اور پھر کاماں لے گئیں۔ دلی سے پھر پہنچے جہاں صفدر جنگ کے خزانچی لالہ رادھا کشن کے بیٹے بہادر سنگھ نے ان کی مدد کی۔

[فلیش بیک]

بہادر سنگھ: میر صاحب۔ آپ روز جانے جانے کا نام نہ لیا کیجئے، آپ کا گھر ہے اطمینان سے رہیے۔ ابھی اتنا امن وامان نہیں ہے کہ آپ آسانی سے سفر کر سکیں۔

میر: یہ ٹھیک ہے، میں بھی جانتا ہوں۔ مگر اب کب تک آپ پر اپنا اور اپنے اہل و عیال کا بار ڈالوں، ہاں یاد

آیا سنا ہے یہاں اعظم یار خاں صاحب آئے پڑے ہیں۔

بہادر سنگھ : کون اعظم خاں صاحب

میر : اعظم خاں کلاں کے بیٹے جو فردوس آرام گاہ کے عہد میں شش ہزاری امیر تھے۔

بہادر سنگھ : اچھا وہ اعظم خاں۔ بھئی اُن پر سخت وقت پڑا ہے۔ بیچارے سورج مل کے طویلے میں رہتے ہیں۔ جو آجکل خانہ خرابانِ دہلی کی اقامت گاہ ہے۔

میر : ہاں بھئی قسمت کا پھیر ہے ؎

شہاں کہ کحل جواہر تھی خاک پا جن کی — اُنھیں کی آنکھوں میں پھرتے سلائیاں دیکھیں

اچھا میں چلتا ہوں۔ ذرا مل آؤں۔

(وقفہ)

میر : سلامٌ علیکم۔ خاں صاحب

اعظم خاں : او ہو میر صاحب آپ۔ خدا خیر کرے۔ آپ یہاں ؟ دلّی چھوڑ آئے ؟

میر : دلّی نہ چھوڑتا تو کیا کرتا ؎

دلّی میں آج بھیک بھی ملتی نہیں اُنھیں — تھا کل تلک دماغ جنھیں تاج و تخت کا

مگر خانصاحب آپ بھی مجھے متفکر نظر آتے ہیں، خیر تو ہے۔

اعظم خاں : کچھ نہیں۔ کوئی خاص بات نہیں۔

میر : پھر بھی کوئی تو بات ہے۔

اعظم خاں : میر صاحب آپ جب دلّی میں آتے تھے تو قسم قسم کی مٹھائیاں اور حلوے ساتھ بیٹھ کر کھاتے تھے آج عجیب اتفاق ہے کہ ہمارے پاس کچی شکر تک نہیں کہ آپ کے لئے شربت بھی بنالیں۔

میر : خاں صاحب، یہ باتیں تو انبساط کے ساتھ تھیں، آپ خوب جانتے ہیں کہ میں شکم بندہ نہیں ہوں، زمانہ بدلتا رہتا ہے، وہ شکر و شیرینی کا وقت تھا، یہ زمانہ تلخی کا ہے (کسی کو آتا دیکھ کر) یہ کون آرہا ہے خوان لئے ہوئے۔

اعظم خاں : کسی کی ماما معلوم ہوتی ہے۔

ماما : کھان صاحب۔ سعید الدین کھانساماں صاحب کی بہن نے آپ کو دعا کہی ہے۔ اور کچھ حلوہ نبات اور شیرینی بھیجی ہے۔

اعظم خاں: اچھا رکھ دو۔ میری طرف سے بھی سلام کہنا اور کہنا اس تکلف کی کیا ضرورت تھی۔ (میر صاحب کی طرف مخاطب ہو کر) میر صاحب یہ روسیاہ اپنی قدر خوب جانتا ہے۔ ایک مدت سے فاقہ کشی میں گذری ہے۔ پانی کا گھونٹ اور روٹی کا ٹکڑا تک میسر نہیں آیا۔ شیرینی اور حلوہ کا کیا ذکر ہے، آپ آن کر بیٹھے اور خدا نے یہ خوان یغما بھیج دیا۔ یہ سب آپ کا ہے مجھے میرا حصہ دے دیجئے اور باقی اپنے گھر بھجوا دیجئے۔

میر: خاں صاحب۔ کیا فرماتے ہیں۔ سعیدالدین کی بہن نے آپ کے لئے بھیجا ہے میں بھلا اتنا کیا کروں گا۔

اعظم خاں: بھئی آپ کے بیٹے میر فیض علی بھی تو ہیں۔ بس میرے لئے اتنا کافی ہے یہ باقی آپ لے جائیے۔

(وقفۂ موسیقی)

راوی: ۲۰ مارچ ۱۷۶۱ء احمد شاہ ابدالی نے دلی کو چھوڑا۔ میر راجہ ناگرمل کے ساتھ دلی آئے۔ مگر دلی کہاں۔ مکان پہچانے نہ جاتے تھے۔ مکینوں کا کہیں پتہ نہیں۔ مکان ٹوٹے ہوئے، دیواریں بیٹھی ہوئیں، خانقاہیں بے صوفی کے اور خرابات بے مست کے ویران پڑے تھے۔ بازار کہاں کہ دیکھیں، طفلانِ تہ بازار کہاں جو ان کو پوچھیں۔ جوانانِ رعنا چل بسے، پیرانِ پارسا گزر گئے۔ محلے خراب، کوچے برباد ہر طرف وحشت ہویدا اور انس ناپیدا۔ ناگاہ اس محلے میں پہنچے جہاں ان کا گھر تھا۔ دن رات صحبتیں گرم رہتی تھیں شعر پڑھتے اور عاشقانہ بسر کرتے تھے۔ وہاں کوئی شناسا تک نہ ملا کہ دو گھڑی باتیں کر لیں۔ کچھ دیر کھڑے حیرت سے تکتے رہے سخت صدمہ ہوا اور عہد کیا کہ اب پھر نہ آئیں گے۔ اور ۱۷۸۲ء میں کہ عمر ساٹھ کے لگ بھگ تھی دلی نہ چھوڑ سکے۔ چھوڑتے کیسے بے سامانی کی وجہ سے معذور تھے۔ خدا نے ان کی سُن ہی لی اور نواب آصف الدولہ بہادر نے زادِ راہ بھیج کر انھیں لکھنؤ بلایا۔ دلی میں شاہ عالم کا دربار اور امرا و شرفا کی محفلوں میں ادب ہر وقت ان کے لئے جگہ خالی کرتا تھا۔ اور ان کے جوہر کمال اور نیک اطوار و اعمال کے سبب سے سب عظمت کرتے تھے۔ مگر خالی آدابوں سے خاندان تو نہیں پل سکتے اور وہاں تو خود خزانۂ سلطنت خالی پڑا تھا۔ دلی چھوڑی۔ جب لکھنؤ کے لئے چلے ہیں تو ساری گاڑی کا کرایہ بھی پاس نہ تھا۔ ناچار ایک شخص شریک ہو گئے اور دلی کو خدا حافظ کہا۔

فلیش بیک

رتھ چلانے والے کی ٹخ ٹخ۔ گھوڑے کے ٹاپوں کی آواز۔ لوہے کے پہیئے کی سڑک پر چلنے کی آواز۔ یہ سب پس منظر میں رہتی ہے جب تک یہ مکالمہ ختم نہیں ہو جاتا)

شخص: آپ لکھنؤ کس کے پاس جا رہے ہیں۔

میر: جی میں کسی کے پاس نہیں۔

شخص: مگر پھر بھی۔ آخر کسی کے پاس تو جاتے ہوں گے۔

میر: صاحب قبلہ۔ آپ نے کرایہ دیا ہے وہ بیشک گاڑی میں بیٹھئے مگر باتوں سے کیا تعلق۔

شخص: حضرت کیا مضائقہ ہے، راستے کا شغل ہے، باتوں میں ذرا جی بہلنا ہے۔

میر: ہاں صاحب۔ آپ کا شغل ہے۔ میری زبان خراب ہوتی ہے۔

(یکے کی آواز برابر پس منظر میں رہتی ہے)

(وقفہ موسیقی)

شخص: لیجئے لکھنؤ آگیا۔ آپ نے راستے میں بات نہ کی۔ اب بتائیے کسی کے گھر جائیں گے یا سرائے۔ آپ یہاں سے ناواقف ہیں۔ سرائے میں چلنا ہو تو میرے ساتھ چلئے۔

میر: کبھی معاف کیجئے گا۔ دراصل زندگی سے پریشان ہوں، خاموش رہنا چاہتا ہوں، میں آپ کا ممنون ہوں گا اگر کسی ٹھکانے کی سرائے میں چلے چلیں۔

شخص: آئیے یہیں حافظ جی کی سرائے میں چلتے ہیں۔ آج رات کو ایک جگہ مشاعرہ ہے۔ آپ بھی چلئے۔ دلّی سے آرہے ہیں۔ ضرور آپ شعر کہہ لیتے ہوں گے۔

میر: شعر۔ یونہی تک بندی کر لیتا ہوں مگر مشاعرہ میں ضرور چلوں گا

[ایسا معلوم ہوتا ہے گویا مشاعرہ کے لئے سب لوگ جمع ہیں، ایک دوسرے سے کہہ رہے ہیں]

ایک: آپ یہاں تشریف رکھئے۔

دوسرے: نہیں قبلہ پہلے آپ۔

ایک: دیکھئے بندہ پرور۔ یہ بندے سے کبھی نہ ہوگا، پہلے آپ،

دوسرے: (میر کو دیکھ کر) قبلہ یہ کوئی نئے صاحب تشریف لائے ہیں۔ ذرا وضع قطع ملاحظہ ہو۔

ایک: ماشاء اللہ کھڑکی دار پگڑی، مشروع کا پاجامہ، ناگ پھنی کی انی دار جوتی، کمر میں سیف، ہاتھ میں جریب۔ کون ذات شریف ہیں؟

تیسرے: خدا جانے کون ہیں؟ مشاعرہ میں آئے ہیں۔ ضرور کوئی شاعر ہیں (طنزیہ۔ میر سے مخاطب ہو کر)

میں نے کہا قبلہ آداب بجالاتا ہوں۔ آپ نے کرم کیا۔ تشریف لائے، یہ شمع حاضر ہے، کلام سے مستفیض فرمائیے۔

ایک: قبلہ آپ کا وطن؟

میر:
کیا بود و باش پوچھو ہو پورب کے ساکنو — ہم کو غریب جان کے ہنس ہنس پکار کے
دلّی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب — رہتے تھے منتخب ہی جہاں روزگار کے
اس کو فلک نے لوٹ کے ویران کر دیا — ہم رہنے والے ہیں اُسی اجڑے دیار کے

ایک: دوسرے سے (چپکے چپکے) میر صاحب ہیں!

دوسرا: میر محمد تقی میر؟؟

ایک: وہی، غضب ہو گیا، کسی نے بھی نہیں پہچانا۔

(اب سب ایک دوسرے سے سبقت کرتے ہیں۔ معافی مانگتے ہیں)

ایک: قبلہ میر صاحب۔ معاف فرمائیے گا، اگر پہچانا ہو تو روسیاہ!

دوسرا: قبلہ میر صاحب۔ آپ کی تشریف آوری لکھنؤ والوں کو مبارک ہو، یہاں تو سب آنکھیں بچھانے کے لئے تیار بیٹھے ہیں۔

ایک: وزیر الممالک آصف الدولہ بہادر آپ کو اکثر یاد فرماتے ہیں۔

میر: میں بھی دربار میں حاضر ہو کر آداب بجالاؤں گا۔

دوسرا: نواب بہادر کل ہی اس طرف مرغوں کی لڑائی دیکھنے تشریف لائیں گے۔ آپ کی وہیں اُن سے ملاقات ہو جائے گی۔

میر: بہت خوب

(وقفۂ موسیقی)

[مرغوں کی لڑائی ہو رہی ہے۔ ایک ہنگامہ ہے، مرغ والے اپنے اپنے جانوروں کو شہہ دے رہے ہیں]

ایک: ہاں بیٹے۔ قربان۔ دے لات۔ دے لات۔

دوسرا: وہ مارا۔ وہ مارا———— پا پڑ والے کو۔

تیسرا: ہوں۔ ہوں۔ دے۔ دے۔

چوتھا: اب خاموش رہو نواب بہادر تشریف لا رہے ہیں۔

میر: خاکسار آداب بجا لاتا ہے۔

آصف الدولہ: میر تقی ہو۔

میر: بندگانِ عالی کی فراست کا شہرہ سنا تھا، آج خود دیکھ لیا۔ یہ خاکسار حقیر فقیر میر محمد تقی میر ہے۔

آصف الدولہ: خدا کا شکر ہے آپ نے لکھنؤ کا رخ تو کیا (سالار جنگ سے مخاطب ہوکر) سالار جنگ۔

سالار جنگ: ارشاد۔

آصف الدولہ: میر صاحب کے لئے مناسب انتظام کیا جائے۔

سالار جنگ: بندگان عالی مختار ہیں۔ انھیں کوئی جگہ عنایت کردی جائے، جب مرضی مبارک ہو یاد فرمادیں۔

آصف الدولہ: میں کچھ مقرر کرکے آپ کو اطلاع کردوں گا۔

سالار جنگ: بندگان عالی مختار ہیں۔

(وقفۂ موسیقی)

میر: خاکسار۔ بندگان عالی کو آداب بجا لاتا ہے، یہ آپ حوض کے کنارے کھڑے کیا شوق فرما رہے ہیں؟

آصف الدولہ: اخاہ، میر صاحب ہیں، بھئی خوب آئے۔ میں ذرا یونہی چھڑی سے ان مچھلیوں سے کھیل رہا تھا، میر صاحب آپ خوب اچھے وقت آئے، کیا اچھا ہو اگر کوئی تازہ کلام سنائیں۔

میر: خاکسار نے آج ہی ایک غزل کہی ہے، عرض کرتا ہوں۔

آصف الدولہ: ارشاد

میر: عرض کیا ہے ؎

سخن مشتاق ہے عالم ہمارا بہت عالم کرے گا غم ہمارا

(وقفہ)

آصف الدولہ: جی ہاں۔ پڑھئے۔

پڑھیں گے شعر رو رو لوگ بیٹھے رہے گا دیر تک ماتم ہمارا

(وقفہ)

آصف الدولہ: پڑھیے، پڑھیے، میر صاحب:

زمین و آسماں زیر و زبر ہیں   نہیں کم حشر سے اُودھم ہمارا

(وقفہ)

آصف الدولہ: جی ہاں پڑھیے، پڑھیے،

میر: پڑھوں کیا۔ بندگانِ عالی تو مچھلیوں سے شوق فرما رہے ہیں۔ متوجہ ہوں تو پڑھوں۔

آصف الدولہ: میر صاحب، جو شعر ہوگا وہ خود متوجہ کر لے گا۔

میر: خاکسار اجازت چاہتا ہے۔

آصف الدولہ: میر صاحب۔ میر صاحب۔ ذرا سنیئے تو.......

(وقفہ، موسیقی)

راوی: نواب کی بے توجہی ایسی شاق گزری کہ دربار کا جانا چھوڑ دیا، آصف الدولہ کا انتقال ہوا اور سعادت علی خاں کا دور ہوا تو یہ جانا چھوڑ چکے تھے وہاں کسی نے طلب نہ کیا۔ ایک دن نواب کی سواری جاتی تھی، میر صاحب تحسین کی مسجد پر سرِ راہ بیٹھے تھے۔ سواری سامنے آئی۔ سب اُٹھ کر کھڑے ہوئے، میر صاحب اُسی طرح بیٹھے رہے۔ سید انشا خواص میں تھے۔ نواب نے پوچھا۔

سعادت علی خاں: انشا۔

انشا: جی۔

سعادت علی خاں: یہ کون شخص ہے کہ جس کی تمکنت نے اُسے اُٹھنے بھی نہ دیا۔

انشا: جنابِ عالی یہ وہی گدائے متکبر جس کا ذکر حضور میں اکثر آیا ہے۔ گزارے کا وہ حال اور مزاج کا یہ عالم ہے آج بھی فاقے سے ہی ہوگا۔

سعادت علی [illegible]: [illegible]، یہ تاجدارِ سخن ہیں۔ آج ہی خلعتِ بحالی اور ہزار روپیہ دعوت کا چوبدار کے ہاتھ بھیجا جائے۔

(وقفہ)

انشا: جناب [illegible] مطابق خلعت اور ہزار روپیہ لے کر گیا تھا۔ میر صاحب نے فرمایا کہ "مسجد میں بھجوائیں۔ یہ گنہگار اتنا محتاج نہیں۔"

سعادت علی خاں: (سوچتے ہوئے) کوئی بات نہیں۔ زمانے کے زخم کھا کر دل ایسا ہی حساس ہو جاتا ہے۔ دیکھو انشا تم خود لے کر جانا۔

(وقفہ ——— پھر دستک کی آواز)

میر: کون ہے؟

انشا: میر صاحب میں ہوں۔ انشا۔

میر: آئیے انشا صاحب، آئیے، آج کیسے تکلیف کی؟

انشا: میر صاحب آپ نے کیا غضب کیا۔ بادشاہِ وقت کا ہدیہ واپس کر دیا۔ یہ خلعت اور ہزار روپیہ حاضر ہے۔ اپنے حال پر نہیں تو عیال پر رحم کیجیے۔

میر: انشا صاحب۔ وہ اپنے ملک کے بادشاہ ہیں میں اپنے ملک کا بادشاہ ہوں۔ کوئی ناواقف اس طرح پیش آتا تو مجھے شکایت نہ تھی۔ وہ مجھ سے واقف۔ میرے حال سے واقف۔ اس پر اتنے دنوں کے بعد ایک دس روپے کے خدمت گار کے ہاتھ خلعت بھیجا مجھے اپنا فقر و فاقہ قبول ہے۔ مگر یہ ذلت اٹھائی نہیں جاتی ؎

خرابہ دلّی کا وہ چند بہتر لکھنؤ سے تھا
وہیں میں کاش مر جاتا سراسیمہ نہ آتا یاں

انشا: میر صاحب جو ہوا سو ہوا، آپ اسے قبول فرمائیے۔

(وقفہ، موسیقی)

راوی: سید انشا کی لسانی اور لفاظی کے سامنے کس کی پیش جا سکتی تھی۔ میر صاحب نے قبول فرمایا، اور دربار میں کبھی کبھی جانے لگے۔ نواب سعادت علی خاں اُن کی ایسی خاطر کرتے تھے کہ اپنے سامنے بیٹھنے کی اجازت دیتے تھے اور اپنا پیچوان پینے کو عنایت فرماتے تھے۔ میر باوجود قدر و منزلت کے لکھنؤ میں خوش نہیں رہے اور برابر دلّی کو یاد کرتے رہے۔ ایک دفعہ چند عمائد و اراکین لکھنؤ جمع ہو کر آئے کہ میر صاحب سے ملاقات کریں اور اشعار سنیں۔

(دروازے پر دستک)

ماما: کون ہے بھئی۔

ایک : میر صاحب سے ملاقات کرنے آئے ہیں۔ ذرا خبر کر دیجئے۔

ماما : لیجئے یہ بوریا یہاں ڈیوڑھی میں بچھا دیتی ہوں۔ آپ تشریف رکھئے میں ابھی اطلاع دیتی ہوں۔

(وقفہ)

میر : آئیے آئیے، آپ حضرات نے اس وقت کیسے تکلیف کی۔

ایک : میر صاحب۔ ملاقات کا شوق اور اشعار کا ذوق آپ کی خدمت میں کھینچ لایا ہے، دیدار نصیب ہوئے زہے قسمت۔

دوسرا : اگر کچھ کلام ارشاد فرمائیں تو اپنے کو خوش قسمت سمجھیں۔

میر : بھئی آپ اتنی دور سے چل کر آئے ہیں، شربت پیجئے، حقہ حاضر ہے نوش فرمائیے۔

ایک : میر صاحب اگر چند شعر فرما دیں تو ہم سب پر کرم ہوگا۔

میر : دیکھئے صاحب۔ آپ کی تشریف آوری کا شکریہ۔ مگر میرے اشعار آپ کی سمجھ میں نہیں آئیں گے۔

دوسرا : آپ نے بجا فرمایا، میر صاحب قبلہ۔ طبع کی نارسائی کا اعتراف بھی ہے اور شدید احساس بھی پھر بھی دست بستہ درخواست ہے کہ آپ مایوس نہ کریں۔ صرف چند اشعار۔

میر : جانے دیجئے صاحب۔ شعر سن کر کیا کریں گے۔

دوسرا : میر صاحب قبلہ۔ آخر انوری و خاقانی کا کلام سمجھ لیتے ہیں تو آپ کا ارشاد کیوں نہ سمجھیں گے۔

میر : درست ہے صاحب۔ مگر ان کا کلام سمجھنے کے لئے شرحیں، فرہنگیں موجود ہیں۔ اور میرے کلام کے لئے فقط محاورۂ اہلِ اُردو ہے یا دلّی کی جامع مسجد کی سیڑھیاں اور اس سے آپ محروم۔ اچھا سنیے۔

عشق بُرے ہی خیال پڑا ہے ۔۔۔ چین گیا آرام گیا
دل کا جانا ٹھہر گیا ہے ۔۔۔ صبح گیا یا شام گیا

سب : واہ واہ کیا کلام ہے۔

میر : داد کا شکریہ، مگر آپ بموجب اپنی کتابوں کے کہیں گے خیال کی "ی" کو ظاہر کرو۔ پھر کہیں گے کہ "ی" تقطیع میں گرتی ہے مگر یہاں اس کے سوا جواب نہیں کہ محاورہ یہی ہے۔"

ایک : میر صاحب۔ یہاں تو ہم سب قائل۔ لیکن اگر شاعری کا یہی معیار ہے تو پھر ہندوستان میں

ایک دو ہی شاعر نکلیں گے۔

میر: آپ نے بالکل درست فرمایا، شاعر ہی صرف دو ہیں۔ ایک سودا دوسرا یہ خاکسار۔ (تامل کر کے وقفے کے بعد) اچھا خیر آدمے خواجہ میر درد۔

دوسرا: اور حضرت! میر سوز صاحب

میر: میر سوز بھی شاعر ہیں؟

ایک: جی۔ آخر اُستاد نواب آصف الدولہ کے ہیں۔

میر: خیر یہ ہے تو چلو پاؤ یہ بھی سہی کُل پونے تین شاعر ہوئے مگر بھئی شرفا میں ایسے تخلص ہم نے کبھی نہیں سنے۔ سوز۔ گوز، کیا تخلص ہے۔

دوسرا۔ ان بچارے نے میر تخلص کیا تھا، وہ آپ نے چھین لیا، ناچار اب انھوں نے ایسا تخلص اختیار کیا ہے کہ نہ آپ کو پسند آئے نہ آپ اُسے چھینیں۔

ایک: میر صاحب قبلہ، اب آپ ہمیں مایوس واپس نہ کریں۔ آپ ایسے ہی شعر ارشاد فرما دیں جو ہماری سمجھ میں آ جاویں۔

دوسرا: جی ہاں آپ نے ایک دفعہ اپنے گھر کے بارے میں ایک مثنوی ارشاد فرمائی تھی اُس کے ہی چند شعر عطا فرمائیں۔

میر: اب آپ حضرات مصر ہیں تو لیجئے سنیئے:

کیا لکھوں میر اپنے گھر کا حال اس خرابے میں میں ہوا پامال
لونی لگ لگ کے جھڑتی ہے ماٹی آہ کیا عمر بے مزہ کاٹی

ایک: سچ ہے، سچ ہے۔

میر: کہیں سوراخ ہے کہیں ہے چاک کہیں جھڑ جھڑ کے ڈھیر سی ہے خاک
کہیں گھونسوں نے کھود ڈالا ہے کہیں چوہے نے سر نکالا ہے

دوسرا: (ہنستے ہوئے) کیا حسنِ بیان ہے

ایک: میر صاحب قبلہ، کیا یہ بیان واقعہ ہے؟

میر: بالکل بالکل۔

کہیں گھر ہے کسو چھچھوندر کا — شور ہر کونے میں ہے مچھّر کا
کہیں کڑی کے ٹیکے ہیں جالے — کہیں جھینگر کے بے مزہ نالے

ایک: (ہنستے ہوئے) سب ہی چیزیں جمع ہیں۔

میر: کونے ٹوٹے ہیں طاق پھوٹے ہیں — پتھر اپنی جگہ سے چھوٹے ہیں
کوئی تختہ کہیں سے ٹوٹا ہے — کوئی دا سا کہیں سے چھوٹا ہے
دب کے مرنا ہمیشہ مدِ نظر — گھر کہاں صاف موت کا ہے گھر

دوسرا: (افسوس کرتے ہوئے) جی ہاں، ایسے بھی گھر ہوتے ہیں۔

میر: ہوتے نہیں ہیں صاحب، میں ایسے گھر میں رہ رہا ہوں۔

اینٹ مٹی کا در کے آگے ڈھیر — گرتی جاتی ہے ہولے ہولے منڈیر
ایک دن ایک کوا آ بیٹھا — بے گماں جیسے ہوا آ بیٹھا
اچھے ہوں گے کھنڈر بھی اس گھر سے — برسے ہے اک خرابی گھر در سے

ایک: جی بجا فرمایا۔

میر: ہاں جھینگر تمام چاٹ گئے — بھیگ کر بانس بھاٹ بھاٹ گئے
کیڑا ایک ایک سیر کوڑا ہے — سانجھ سے کھانے ہی کو دوڑا ہے
گرچہ بہتوں کو میں مسل مارا — پر مجھے کھٹملوں نے کُل مارا

دوسرا: ماشاء اللہ کھٹمل بھی چین نہیں لینے دیتے۔

میر: صرف کھٹمل ہی نہیں صاحب!

دو طرف سے ہے کتوں کا رستا — کاش جنگل میں جا کے میں بستا
ہو گھڑی دو گھڑی تو دیکھا روں — ایک دو کُتے ہوں تو میں ماروں
چار جاتے ہیں چار آتے ہیں — چار عف عف سے مغز کھاتے ہیں

(سب ہنستے ہیں اور خوب ہنستے ہیں)۔

ایک: میر صاحب کیا یہ بھی واقعہ ہے

میر: اور کیا

دن کو ہے دھوپ رات کو ہے اوس — خواب راحت یہاں سے سو سو کوس
قصہ کوتہ دن اپنے کھوتا ہوں — رات کے وقت گھر میں ہوتا ہوں
نہ اثر بام کا نہ کچھ در کا — گھر ہے کا ہے کا نام ہے گھر کا

(وقفۂ موسیقی)

راوی: مصائب تھے مگر دل زندہ تھا، غم دوراں کو غم جاناں بنا کر غزل کو نغمہ بنایا مگر ذاتی تکلیفوں پر ہنس بھی سکتے تھے۔ عمر تقریباً ۸۵، ۸۶ کی ہو چکی تھی، کمزور تھے، معذور نہ تھے۔ اپنے تمام فرائض زندگی آسانی سے ادا کرتے تھے

اور شعر و سخن میں بھی حصہ لیتے تھے۔ عمر کے آخری تین برس قیامت کے برس تھے۔ جن کی وہ تاب نہ لا سکے۔ ایک سال میں اُن کی لڑکی کا، دوسرے میں ایک لڑکے کا، تیسرے میں اُن کی بیوی کا انتقال ہوا۔ پے در پے ان غموں نے دل شکستہ کر دیا، مشاعروں اور دوسری رنگین مجلسوں میں جانا چھوڑ دیا، نظام صحت میں اختلال پیدا ہو گیا، پرانے مرضوں نے ترقی کی اور مرض موت کی شکل اختیار کر لی۔ تمام شاہی طبیب اور مشہور معالج میر کے شناسا اور دوست تھے۔ علاج معالجے شروع کیے اور سب کی یہ رائے ہوئی کہ ڈٹ کر اور جم کر علاج کرنا چاہیئے۔ اور فی الحال ایسی دوا دینی چاہیئے کہ قبض نہ رہنے پائے۔ اس کے بعد ایک تلین دی گئی، جس نے زہر قاتل کا کام کیا۔ ایک ایک دن میں ڈیڑھ ڈیڑھ سو اجابتیں ہوئیں۔ ۲۰ شعبان المکرم ۱۲۲۵ھ مطابق ۱۸۱۰ء وقت شام نوے سال کی عمر پوری کر کے اس تاجدار سخن نے دنیائے فانی کو خیرباد کہا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون

مجلس آفاق میں پروانہ ساں
میر بھی شام اپنی سحر کر گیا

[بہ تسلیمات آل انڈیا ریڈیو، نئی دہلی]

سید مقبول حسین احمد پوری

میر و غالب

غالب :

پوشیدہ تیرے سوز میں ہے سازِ زندگی | اور دل کی خستگی میں نہاں رازِ زندگی
پیمانۂ دل کا ٹوٹ کے گر چور چور ہو | تیرے لیے یہ باعثِ کیف و سرور ہو
دل کا کمال سوزِ دروں کا وفور ہے | شعلے اٹھیں نہ دل سے تو دل کا قصور ہے
وہ درد ننگِ عشق ہے جو لا دوا نہ ہو | وہ عشق ننگِ حسن ہے جس میں حیا نہ ہو

جامِ کہن میں بادۂ نو تو نے بھر دیا
اُردو غزل سے فلسفے کو عام کر دیا

میر :

دنیا تری نظر میں سراب امید ہے | یاں ذکرِ عیش عقل سے بالکل بعید ہے
تیرا خمیر یاس و غم و تنکر و صبر ہے | تعلیم تیری عبرت و تشکیک و جبر ہے
شیوہ ترا خوشامدِ اہلِ دوَل نہیں | کافی ہے فقر و فاقہ جو راہِ عمل نہیں
جذبات تیرے نالۂ دل کا ترانہ ہیں | اشعار تیرے یاس و الم کا فسانہ ہیں

ہنستے ہوئے کو آہ سے اپنی رُلا دیا
روتے ہوئے کو تو نے تھپک کر سلا دیا

عزیز لکھنوی (مرحوم)

میر تقی میر

شاہدِ بزمِ سخن ناظورۂ معنی طراز — اے خدائے ریختہ پیغمبرِ سوز و گداز
یوسفِ ملکِ معانی پیرِ کنعانِ سخن — ہے تری ہر بیت اہلِ درد کو بیت الحزن
اے شہیدِ جلوۂ معنی فقیرِ بے نیاز — اس طرح کس نے کہی ہے داستانِ سوز و ساز
ہے ادب اُردو کا نازاں جس پہ وہ ہے تیری ذات — سرزمینِ شعر پر اے چشمۂ آبِ حیات
تفتہ دل آشفتہ سر آتش نوا بے خویشتن — آہ تیری سینہ سوزی اور نالہ تیرا دل شکن
ختم تجھ پر ہو گیا لطفِ بیانِ عاشقی — مرحبا اے واقفِ رازِ نہانِ عاشقی
سرزمینِ شعر کعبہ اور تو اُس کا خلیل — شاخِ طوبائے سخن پہ ہم نوائے جبرئیل
جوشِ استغنا ترا تیرے لیے وجہِ نشاط — شانِ خودداری تری آئینہ دارِ احتیاط
بزم سے گزرا کمالِ فقر دکھلاتا ہوا — تاجِ شاہی کو چلا قدموں سے ٹھکراتا ہوا
تھا دماغ و دل میں صہبائے قناعت کا سرور — تھی جوابِ سطوتِ شاہی تری طبعِ غیور
موجۂ بحرِ قناعت تیرے ابرو کی شکن — تختِ شاہی پہ حصیرِ فقر تیرا خندہ زن
تھا یہ جوہر ترا فطری شاعری کے رتبہ داں — عزتِ فن تھی تری نازک مزاجی میں نہاں
ملتفت کرتا تجھے کیا اغنیا کا کرّ و فر — تھا تری رگ رگ میں درویشوں کی صحبت کا اثر
دل ترا زخموں سے بزمِ عاشقی میں چور ہے — جس سخن کو دیکھیے رِستا ہوا ناسور ہے
بزم گاہِ حسن میں اک پرتوِ فیضِ جمال — صید گاہِ عشق میں ہے ایک صیدِ خستہ حال
دیکھنا ہو گر تجھے دیکھے ترے افکار میں — ہے تری تصویر تیرے خوں چکاں اشعار میں

"قابلِ عبرت ہے دل صد پارہ اُس نخچیر کا
جس کے ہر ٹکڑے میں ہو پیوست پیکاں تیر کا"
(میر)

آسمانِ شعر پہ چمکے ہیں سیّارے بہت
اپنی اپنی روشنی دکھلا گئے تارے بہت

عہدِ گل ہے اور وہی رنگینیٔ گلزار ہے
خاکِ ہند اب تک اگر دیکھو تجلّی زار ہے

اور بھی ہیں معرکے میں شہسوارِ یکہ تاز
اور بھی ہیں میکدے میں ساقیانِ دل نواز

ہیں تو پیمانے وہی، لیکن وہ مے ملتی نہیں
نغمہ سنجوں میں کسی سے تیری لے ملتی نہیں

صاحبانِ ذوق کے سینوں میں بھی جس کی کھٹک
پیرتے ہیں دل میں وہ سر تیز نشتر آج تک

کاروانِ رفتہ کو تھا تیری یکتائی پہ ناز
عصرِ موجودہ نے بھی مانا ہے تیرا امتیاز

ہو گئے ہیں آج تجھ کو ایک سو بائیس سال
تو نہیں، زندہ ہے دنیا میں مگر تیرا کمال

حق ہے ہم پر یاد کر کے تجھ کو رونا چاہیئے
ماتم اپنی ناشناسی کا بھی ہونا چاہیئے

ڈھونڈتے ہیں قبر کا بھی اب نشاں ملتا نہیں
اے زمیں تجھ میں ہمارا آسماں ملتا نہیں

(فروری ۱۹۲۸ء)

رضا علی وحشت کلکتوی

میر تقی میر

خوشا وہ دل کہ جس میں قلزمِ غم کی ہے طغیانی
قلق جس کا ہے بے پایاں، الم جس کا ہے طولانی
جہاں ہے عیش کی تقلیل، کلفت کی فراوانی
برستی ہو اداسی اور ٹپکتی ہو پریشانی

وہیں قدرِ کلامِ خوں چکانِ میر ہوتی ہے
وہیں اس مصحفِ اندوہ کی تفسیر ہوتی ہے

سوادِ ہند میں خورشید سا روشن ہے نام اس کا
حلاوت دستگاہوں کی زباں پر ہے کلام اس کا
ہے فکرِ شعر میں کیفیت آمیز اہتمام اس کا
شرابِ عشق غم پرور سے ہے لبریز جام اس کا

سخن مشتاق ہے عالم۔ عجب جادو بیانی ہے
بہا آتا ہے دریا۔ اللہ اللہ کیا روانی ہے

سبک اس کو بنا سکتی نہیں غم کی گراں باری
اسے رسوا کرے آسانی کیا اس کی دشواری
فغان و نالہ ہے ہر چند آئینِ گرفتاری
چھپی ہوتی ہے اس کی عرضِ اندوہِ جگر خواری

نکلتی ہے صدائے درد اس کے پردۂ دل سے
تراوش جس طرح کرتی ہو حسرت چشمِ بسمل سے

زہے حسنِ اشارت، اس نوا سنجی کو کیا کہیے
روش یہ ہے تو رنگِ لالہ و گل کی ادا کہیے
خوشا رنگیں بیانی، اس کو گلشن کی فضا کہیے
روانی کو سخن کی مستیٔ بادِ صبا کہیے

ریاض خلد ہے اس کے چمن کا خوشہ چیں گویا
رواقِ آسماں اس کی غزل کی ہے زمیں گویا

طریق شعر سے رنگ چمن پرداز ہے پیدا
بہار جلوۂ نقش و نگار راز ہے پیدا
روش مستانہ ہے، معشوق کا سا ناز ہے پیدا
ادا سے ہے ادا، انداز سے انداز ہے پیدا

پری خانہ ہے دیوانِ سخن حسنِ مضامیں سے
مرصّع صفحۂ قرطاس ہے طغرائے مشکیں سے

دفا دہر کا ایسا نہ ہوگا رازداں ہرگز
لکھے گا یوں نہ کوئی درد و غم کی داستاں ہرگز
نہ آئی ہے نہ آئے گی کسی کو یہ زباں ہرگز
میسر ہو نہیں سکتا یہ اندازِ بیاں ہرگز

جو اس کا رنگ ہے وہ کسب سے حاصل نہیں ہوتا
الم پرورد اس کا سا، کسی کا دل نہیں ہوتا

نہ گزرا وادیٔ الفت کا ایسا رہنما کوئی
دلوں کے راز سے نکلا نہ اتنا آشنا کوئی
حریف اس کا بیانِ عشق میں وحشت نہ تھا کوئی
زمین ہند کیا، ایران میں بھی کب ہوا کوئی

ہوا تغیر رنگ ایک ایک کی شیوا بیانی کا
ہلالی کا، نظیری کا، شفائی کا، فغانی کا

سروش صدیقی

میر تقی میر

زندگی کا نقاب اٹھائے ہوئے
خلوتِ دل کو جگمگائے ہوئے
ماسوا سے نظر بچائے ہوئے
دامنِ دل میں منہ چھپائے ہوئے
مرگ و ہستی کے وہم سے آزاد
پیرہن کو کفن بنائے ہوئے
غیریت کے خیال سے بیزار
نقشِ دیر و حرم مٹائے ہوئے
اپنی مجبوریوں کے پردے میں
اختیارِ بشر چھپائے ہوئے
مہ و انجم تراشنے کے لیے
اک بجھا سا دیا جلائے ہوئے
دلِ پُرخوں کی اک گلابی سے
سیکڑوں میکدے لنڈھائے ہوئے
ہر نفس غرقِ بوئے زلفِ نگار
وحشتِ عشق رنگ لائے ہوئے
اک غزالِ رمیدہ خو کے لیے
زندگی کو غزل بنائے ہوئے
شعلۂ انتظار، رگ رگ میں
کتنے آتش کدے جلائے ہوئے

شام ہو یا سحر، سرِ مژگاں
کچھ ستارے سے جھلملائے ہوئے
معتکف خلوتِ تصور میں
رُخِ جاناں سے لَو لگائے ہوئے
قشقہ آلود، لوحِ پیشانی
صبحِ ایماں کو جگمگائے ہوئے
وحدتِ حسن و عشق پر نازاں
اک صنم کو خدا بنائے ہوئے
اپنی اک اک شکست پر سو ناز
دلِ خوباں کا بھید پائے ہوئے
غم و حرماں کے تیز تر نشتر
اپنے اشعار میں چھپائے ہوئے
ہمہ تن غرقِ کیفِ بادۂ غم
عالمِ سرخوشی پہ چھائے ہوئے
ہمتِ دوشِ ناتواں لے کر
بارِ انسانیت اٹھائے ہوئے
خیر و شر کے فسوں سے بے پروا
درد کو حرزِ جاں بنائے ہوئے
جذبۂ عشق، میرؔ بن کے اُٹھا
شاعرِ خوش ضمیر بن کے اُٹھا

بر سرِ طورِ دل کلیم آمد
میرؔ آں شاعرِ عظیم آمد

شمیم کرہانی

داستانِ بے ستون و کوہ کن

[میر تقی میر]

باز آئیں بیانِ عشق سے کیا
اس میں بے اختیار ہیں ہم بھی
میرؔ نام اک جواں سُنا ہوگا
اُسی عاشق کے یار ہیں ہم بھی

جس کی باتوں میں جس کے شعروں میں
ساری مستی شراب کی سی ہے
ایسا رنگیں نوا کہ جس کی غزل
پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے

تھا وہی آفتاب سا روشن
بزم میں جو چراغ تھا گُل تھا
ہر گلستاں میں ہر بیاباں میں
اُس کی زنجیر پا ہی کا غُل تھا

تھا تو شاعر وہ گوشہ گیر مگر
اُس نے روے زمیں تمام لیا
عشق میں کی بسر سلیقے سے
اپنی ناکامیوں سے کام لیا

اُس کا ہر شعر تھا کوئی ناوک
اس کا ہر لفظ کوئی نشتر تھا
سرسری تم نے دیکھا اس کا کلام
ورنہ ہر جا جہانِ دیگر تھا

اُس کا رستہ تھا پیار کا رستہ
اُس کی منزل تھی منزلِ محبوب
میر شاعر بھی زور کوئی تھا
دیکھتے ہو نہ بات کا اسلوب

غزل اک تحفۂ گراں مایہ
بیت اک انتخاب کی سی ہے
اکثر اہلِ کلام کی آواز
اُسی خانہ خراب کی سی ہے

جس کے شعروں کی آب وتاب پوچھ
دھوم ہے جس کی خوش بیانی کی
تشنہ لب مرگیا وہ عاشقِ زار
نہ ملی ایک بوند پانی کی

روش اُس کی تو خاص ہی لیکن
واسطہ جس کو راہِ عام سے ہے
شعر جس کے ہیں سب "خواص پسند"
پر اُسے گفتگو عوام سے ہے

سادہ سادہ سی گفتگو کر کے
غنچے رنگین وہ کھلاتا ہے
میر صنّاع ہے ملو اُس سے
دیکھو باتیں تو کیا بناتا ہے

دیکھتا ہوں تو سادہ سادہ لفظ
سوچتا ہوں تو رنگ رنگ کے جام
شعر کیوں اُس کے کھینچتے ہیں دل
اُن میں کچھ طرز ہے نہ کچھ ایہام

اُس کے ہر شعر میں نظر آئیں
جھلکیاں زیست کے فسانے کی
شعر دل میں اُتر تو جاتا ہے
بات لگتی تو ہے ٹھکانے کی

عشق کی بات عقل سے نہ کہو
درد کو درد آشنا سمجھے
میر صاحب کا ہر سخن ہے رمز
بے حقیقت ہے شیخ، کیا سمجھے

آج شعر و سخن کی محفل میں
زندگی میر کے کلام سے ہے
سہل ہے میر کا سمجھنا کیا
ہر سخن اُس کا اک مقام سے ہے

اس کے اشعار ہی بتاتے ہیں
دل نے اُلفت میں چوٹ کھائی ہے
مرگیا فقر و فاقہ میں سرمست
کیا وہ اسنے نے موت پائی ہے

عمر بیتی سرور سے خالی
زیست گزری نشاط سے محروم
یہی جانا کہ کچھ نہیں جانا
سو بھی اک عمر میں ہوا معلوم

اُس کے آنسو تھے اُس کو بادۂ ناب
اُس کی قسمت میں تھی شراب کہاں
عشق کا گھر تھا میرؔ سے آباد
ایسے اب خانماں خراب کہاں

تھے حقائق جو عہدِ میرؔ میں کل
آج اِس دور میں فسانے ہیں
کیا ہیں صحرا نوردیوں کے مزے
وہی جانیں جو خاک چھانے ہیں

زندگانی گزارتا تھا وہ
اپنے خونِ گشتہ دل کے ماتم میں
بیخودی پر نہ میرؔ کی جاؤ
تم نے دیکھا ہے اور عالم میں

اس کو پروائے التفات نہیں
نہ کرے گر کوئی نگاہ تو کیا
میرؔ کیا ہے، فقیر، مستغنی،
آوے اُس پاس بادشاہ تو کیا

سوزِ غم سے ہوا جو دل روشن
تو وہ سمجھا، کوئی چراغ جلا
اہلِ دنیا سے رہتا تھا بیزار
کس سے ملتا تھا وہ دماغ جلا

تھا تو پاسِ خودی اُسے لیکن
دور تھا نشۂ غرور سے وہ
خوش ہیں دیوانگیِ میرؔ سے سب
کیا جنوں کر گیا شعور سے وہ

خاکساروں سے جھک کے ملتا تھا
سرگرانوں سے سرگرانی تھی
فقر پر بھی تھا میر کے اک رنگ
کفنی پہنی تو زعفرانی تھی

کیا قلندر تھا کیا فقیر تھا وہ
تنگ دستی میں شاد رہتا تھا
ایسا دیکھا نہ کوئی رندِ فقیر
فاقہ مستی میں شاد رہتا تھا

ایسا عاشق کہ جس کا قول یہ تھا
عشق ہے گل سے تا بہ زُہرہ و ماہ
عشق بنیاد بندگی کی ہے
عشق ہے، لا الٰہ الاّ اللہ

عیش کا گل، نشاط کا غنچہ
اس نے کب باغِ دہر سے توڑا
سوزِ غم سے مسلسل اُس کا دل
جیسے پکتا ہوا کوئی پھوڑا

جو یہ اہلِ وطن سے کہتا رہا
بلبل اس گلستاں کے ہم بھی ہیں
وجہ بیگانگی نہیں معلوم
تم جہاں کے ہو واں کے ہم بھی ہیں

دل، سحر سے نڈھال رہتا تھا
رات کٹتی تھی کس خرابی سے
غنچۂ دل مگر کھلاتا تھا
اُس کی آنکھوں کی نیم خوابی سے

دے کے دل وہ، جو ہو گیا مجبور
اس میں کیا اختیار تھا اُس کا
روتا رہتا تھا ساری ساری رات
ہائے، کیا روزگار تھا اُس کا

کر گیا، اہلِ بزم کو گریاں
حرف، جو بھی زبان سے نکلا
نامرادی کی رسم میرؔ سے ہے
طور یہ اس جوان سے نکلا

حسن ہی سے رہا سدا سروکار
عمر بھر اہلِ دل سے پیار کیا
کھینچ کے قشقہ، دیر میں بیٹھا
مذہبِ عشق اختیار کیا

شکوۂ تشنگی کیا نہ کبھی
خونِ دل سے بھرا کیا وہ سبو
بادشاہِ سخن تھا وہ، ہرچند
پیرہن میں جگہ جگہ تھا رفو

کیسی ہمت تھی کیا توانائی
غم کا سنگِ گراں، اٹھا لایا
سب پہ جس بار نے گرانی کی
اُس کو یہ ناتواں، اٹھا لایا

نہیں بھولا ہے ذکرِ مظلومی
قصۂ جور یاد ہے ہم کو
نامرادانہ زیست کرتا تھا
میرؔ کا طور یاد ہے ہم کو

ہوش میں وہ نہ آسکا تا زیست
ایک عالم تھا نیم خوابی سا
خونِ دل کی گلابیاں پی کر
عمر بھر وہ رہا شرابی سا

ایسا دیکھا نہ عشق کا مجنوں
ایسا پایا نہ عشق کا برباد
کوہکن جس کے سنگِ مدفن پر
رکھ کے تیشہ کہے ہے یا اُستاد

کب وہ پاتا نشاط کی منزل
غم جاناں نے رہنمائی کی
"بے ستوں" کوہکن سے کیا اُٹھتا
عشق نے زور آزمائی کی

آہ کیسا جنوں نصیب تھا وہ
فصلِ گُل، صورتِ غبار آئی
رہی بیچاں سی موجِ بادِ صبا
بن کے زنجیر، ہر بہار آئی

ہوگئی انتہا محبت کی
عشق میں جذب ہوگیا آخر
زندگی بھر اُسے خوشی نہ ملی
روتے روتے جو سو گیا آخر

کو بہ کو تھا غبار سا جولاں
ہائے کیا ڈھنگ تھے دوانے کے
ایسا فن کار اور سرگرداں
انقلابات ہیں زمانے کے

فضا ابن فیضی

امامِ غزل

[بیادِ میر]

اے پیکرِ سخن! شکنِ ابروئے غزل　　تیری نظر تھی، نیشترِ پہلوئے غزل
پھیلی ترے نفس سے یہاں خوشبوئے غزل
ہر "صنفِ شعر" اُس کے تہِ دام آ گئی　　تو نے سنوارے بیٹھ کے یوں گیسوئے غزل
بس شاعری ہی تیرے جنوں کا شعار تھی
جو شعر تھا ترا، ترے دل کی پکار تھی

تھا تیرا ذہن یا کوئی "مشاطۂ خیال"　　کس نے پرو دیے ہیں یہ موتی سے بال بال
مربوط ہے، نشاطِ فراق و غمِ وصال
پھیلائے تیرے بازوئے احساس و فکر پہ　　بنتِ غزل نے اپنے حسیں گیسوؤں کے جال
آنکھوں میں تو نے مستیاں بھر دیں شراب کی
تو نے لبوں کو بخشی لطافت گلاب کی

غم میں رچا ہوا یہ ترا طرزِ گفتگو　　نشتر سے چاک دل کے تو کرتا رہا رفو
اپنے ہی خون سے ہے لبالب ترا سبو
کس کو ہوئی نصیب یہ وارفتگیِ شوق　　اپنی ہی جستجو میں کہیں کھو گیا ہے تو
ذوقِ سرورِ بیخودی کچھ اس قدر رہا
"اپنا ہی انتظار" تجھے عمر بھر رہا

اپنی نگہ کو اور تغافل ادا کرے "اب وہ ہوا ہے اتنا کہ جور و جفا کرے
افسوس ہے جو عمر نہ میری وفا کرے"
"ہجرانِ یار ایک مصیبت ہے ہمنشیں مرنے کے حال سے کوئی کب تک جیا کرے"
"آہِ سحر نے سوزشِ دل کو مٹا دیا
اِس باد نے ہمیں تو دیا سا بجھا دیا"

دردِ آشنا رہی تری طبعِ جنوں مقام تو نے کیا گدازِ دلِ عاشقی کو عام
مشرب میں تیرے عیشِ تمنا رہا حرام
کتنا حسین تیرے غموں کا شعور تھا جس نے غزل کو بخش دیا "سوزشِ تمام"
"دل عشق کا ہمیشہ حریفِ نبرد تھا
اب جس جگہ کہ داغ ہے یاں آگے درد تھا"

اشعار سے خمارِ طبیعت چھلک اُٹھا سینے میں شاعری کے نیا دل دھڑک اُٹھا
ماحول تیری خوشبوئے غم سے مہک اُٹھا
جذبات کی سُلگتی ہوئی کیفیت کا جوش بن کر گداز تیری غزل سے چھلک اُٹھا
چھلکی ہے خونِ دل کی گلابی اسی طرح
تو عمر بھر رہا ہے شرابی اسی طرح

ٹوٹے ہوئے ملے تجھے ساغر شراب کے حصے میں آئے تیرے فقط غم شباب کے
پہلو تھے کچھ عجیب ترے اضطراب کے
"موسیقیِ خیال" کی وہ لے کہ جیسے دور پانی برس رہا ہو جزیرے میں خواب کے
"ہنگامہ گرم کن جو دلِ ناصبور تھا
پیدا ہر ایک نالے سے شورِ نشور تھا"

پلکوں پہ مسکراتا ہوا آنسوؤں کا نم　　جذبات کی تپش سے بکھرتا ہوا سا غم
زخمہ تھا "سازِ کاہشِ جاں" کا ترا قلم
وہ تیرے ذہن و فکر کے شاداب موڑ پر　　"زرخیزئ خیال" کے بکھرے ہوئے صنم
اللہ رے، روانئ طبعِ رسا تری
یہ غم ہے کیوں نہ شعر زبانی سنا تری

گھلتا رہا ہے زہر سا، صہبائے شوق میں　　تھی مے وہ کون سی ترے مینائے شوق میں
تو نالہ کش رہا غمِ لیلائے شوق میں
تو کس طرف ہے آ کہ ترے شہر کے غزال　　نکلے ہیں ڈھونڈھنے تجھے صحرائے شوق میں
آخر کو لے اڑا دلِ وحشت زدہ تجھے
یہ موجِ گل ہی بن گئی زنجیر پا تجھے

سہہ سہہ کے ظلم، حسن پہ الزام دھر گیا　　خود بن کے نیشتر کبھی دل میں اتر گیا
گاہے نگاہ بن کے تو رخ پہ بکھر گیا
اس "تیرِ نیم کش" کا مزا ہائے کیا کہوں　　تو اور "کاروبارِ غزل" عام کر گیا
پابند یہ کہاں روشِ عام کے ہوئے
اہلِ نظر اسیر ترے دام کے ہوئے

اپنے قدیم موڑ سے آگے نکل گئی　　تجھ تک پہنچ کے لئے ہی غزل کی بدل گئی
بیمار تھی یہ "شاہدِ رعنا" سنبھل گئی
تیری سپردگی کا فسوں تھا کہ خود غزل　　"دل سوزئ نیاز" کے سانچے میں ڈھل گئی
"عرضِ نیازِ عشق کے قابل بنا لیا
تجھ کو ملا جو درد اسے دل بنا لیا"

وہ خستگی وہ کرب وہ سوز و شگفتگی   وہ والہانہ پن وہ گداز و برشتگی
اسلوب میں رچی ہوئی جذبے کی پختگی
نوکِ قلم پہ تلتی ہوئی ندرتِ بیاں   لفظوں میں بولتی ہوئی دل کی شکستگی
تو نے کیا شراب کو کن آنسوؤں میں حل
اب تک ہے تیرے سوگ میں ڈوبی ہوئی غزل

لہجے کا یہ گداز، تغزل کا بانکپن   تپ کر خود اپنی آگ میں نکھرا ہے تیرا فن
تو نے تراشے آہوں سے، نغموں کے پیرہن
جذبے کی تیز لَو سے پگھلتا ہوا شعور   سینہ ترا ہے یا کوئی زخموں کی انجمن
پیدا نشاطِ فکر کا سامان کر لیا
غم اتنے جمع کر لیے، دیوان کر لیا

بس تجھ سے سیکھے، شوخیِٔ اسلوبِ فن کوئی   خلوت ترے خیال کی ہے، انجمن کوئی
دیکھے مذاقِ غم کا ترے بانکپن کوئی
اللہ رے! لطافتِ تخئیل کا طلسم   شبنم پہ جیسے صبح کی پہلی کرن کوئی
خود پوجتے ہیں تجھ کو تری فکر کے صنم
تیری زمینِ شعر نہیں آسماں سے کم

وہ سوزِ دل میں بھیگی ہوئی "فکرِ نازنیں"   چبھتا ہوا غزل کا وہ اسلوبِ دلنشیں
جیسے کہ نیشتر ہو کوئی روح کے قریں
چھوٹا ہے تجھ سے کون سا گوشہ خیال کا   شوخی کہیں تو سادگی و شستگی کہیں
روشن جو میرے ذہن میں ہے وہ کنول کہوں
جی چاہتا ہے تجھ کو "امامِ غزل" کہوں

خورشید احمد جامی

میر تقی میر

بڑا عجیب ہے تیرا دیارِ لوح و قلم
جہاں حسین بہاروں کے خواب رہتے ہیں
کہانیوں کی فضا جن سے جگمگا اُٹھے
دل و نگاہ کے وہ ماہتاب رہتے ہیں

ہر ایک درد سے آتی ہے پیار کی خوشبو
ہر ایک زخم ہے آئینۂ لب و رخسار
خیال و فکر کے زرکار شامیانوں میں
گلوں کی طرح مہکتے ہیں جھومتے اقرار

نہ جانے کتنی پُر اسرار آہٹوں کے چراغ
ترے شعور کی پہنائیوں میں جلتے ہیں
ترے غموں کے سُلگتے ہوئے جواں لمحے
نسیم یادِ غزالاں کے ساتھ چلتے ہیں

رہِ سخن میں تری پاس وہ سویرا ہے
ابھر کے ذہن میں جو روح تک اُتر جائے
خلش کی طرح رہے آرزو کے سینے میں
وفا کے ساز پہ اک گیت بن کے تھرّائے

ترے کلام میں اے میؔر تیرے جادو سے
ہر اک خیال ترا جیسے بات کرتا ہے
جہاں فروز و گل اندام چاندنی کی طرح
محبّتوں کے سمن زار میں نکھرتا ہے

سلام مچھلی شہری

میر

— تمہارا حکم ہے اور اس لیے عزیز نثار!
میں آج "میر" پر اک نظم لکھنے بیٹھا ہوں
ابھی سحاب کے موتی زمین پہ برسے تھے
ابھی مناظرِ فطرت کے غم میں ڈوبا ہوں

مرا خیال ہے، انساں کا اوّلیں نغمہ
بہت اداس، بہت مضطرب رہا ہوگا
یہ ایک بات — کہ غم پرتوِ مسرت ہے
خدا بھی "گنبدِ نوریں" میں سوچتا ہوگا!

میں سوچتا ہوں کہ ہر پُر بہار گیت کے بعد
نہ جانے خود دلِ مطرب پہ کیا گزرتی ہے
ذرا یہ سوچ کہ کس دل سے ایک رقاصہ
کنارِ آئینہ ہر صبح کو سنورتی ہے

ابھی ابھی جو یہ بادل برس کے گزرے ہیں
کوئی بتائے کہ دھرتی نے اُن سے کیا پایا
ہر ایک شاخِ سمن اپنے فکر میں گم تھی
برس کے ابر نے اِن کو کچھ اور اُلجھایا

میں جانتا ہوں کہ تم یہ سمجھ رہے ہو گے
"سلام" نظم کا موضوع چھو نہیں پائے
میں کیا کروں کہ مجھے "میر" کے خیالوں میں
"غمِ نشاط" کے ملتے ہیں ایسے ہی سائے

شگفتِ گُل پہ یہی سوچتا ہوں میں اکثر
جو دیکھ پاؤں تو شبنم کا حسن بہتر ہے
مجھے نشاط کی پرچھائیاں بتاتی ہیں
سمجھ سکو تو مرے دوست! غم حسیں تر ہے

تمام مستیِ صہبائے زندگی بہ نہاں ـــــ
غزل کے سادہ، حسیں، مرمریں پیالوں میں
تمام سوزِ محبت، تمام دردِ نشاط ـــــ
ہے جیسے رقص کناں "میر" کے خیالوں میں

دلِ گداختۂ "میر" ایسا بربط ہے
جو ٹوٹ کر ہی فضاؤں کو گیت دیتا ہے
شعورِ حسن سکھاتا ہے لالہ زاروں کو
خزاں کی گرم ہواؤں کو گیت دیتا ہے

نگاہِ میر کی درد آشنا بلندی نے
چمن میں عزّتِ گلہائے رنگ و بو رکھ لی
بُرا نہ مانو تو یہ بھی کہوں اشاروں میں
کلامِ میر نے غالب کی آبرو رکھ لی

سُنا ہے، آج کی تہذیب اپنے اوج پہ ہے
مگر وہ حسن کی تاثیر کیوں نہیں ملتی
خدا ہی جانے کہ دانشورانِ عالم کو
ضیائے انجمنِ میر کیوں نہیں ملتی

نثار : اور لکھوں بھی تو کیا لکھوں تم کو....
دبا دبا سا ہوں خورشید کی شعاعوں میں
میں کاش ایک کرن کو بھی چھو کے پوج سکوں
خدا کرے کہ اثر ہو مری دعاؤں میں

مخمور سعیدی

تاجدارِ غزل کی خدمت میں

اے کہ خاموش ہوئے تجھ کو زمانہ گزرا
تجھ سے ہنگامہ بپا روئے زمیں پر اب تک
منعمِ قصر نشیں ہو کہ گدائے سرِ راہ
شورِ آشفتہ نوائی ترا پہنچا سب تک
سیلِ نغمہ، متلاطم جو تری روح میں تھا
سینۂ وقت میں طوفاں نہ اٹھاتا کب تک

گوشے گوشے میں ہے گونجی ہوئی آواز تری
سارے عالم پہ فسوں چھایا ہوا ہے تیرا
معتبر کل بھی رہی تیری زباں، تیرا بیاں
مستند آج بھی فرمایا ہوا ہے تیرا
رفعتیں فکرِ رسا نے تری بخشیں یہ تمام
ریختہ رتبے کو پہنچایا ہوا ہے تیرا

رنگ و بو اُن کا جدا ہے جو چنے ہیں تو نے
پھول تو باغِ تخیل سے سبھی چُنتے ہیں
کر سکے کون وہ ترتیبِ معانی پیدا
تانا بانا تو کچھ الفاظ کا سب بُنتے ہیں
شعر گوئی پہ جنھیں ناز ہیں اپنی کیا کیا
وہ بھی سنتے ہیں ترے شعر تو سر دُھنتے ہیں

جو مقابل ترے آیا سو وہ ٹھہرا جاہل
اپنا ہم چشم کسی کو بھی نہ تو نے پایا
نہ ہوا پر نہ ہوا تیرا سا انداز نصیب
لاکھ یاروں نے ترا طرزِ سخن اپنایا
"کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا"
یہی کہتا ہوا آیا جو ترے بعد آیا

معتقد کون نہیں ہے مری استادی کا
برملا تو نے حریفوں میں یہ اعلان کیا
سامنے تیرے پڑھا میں نے غزل کا کلمہ
کافرِ شعر تھا میں، تو نے مسلمان کیا
تجھ کو شاعر نہ کہوں کیسے اگرچہ تو نے
درد و غم کتنے کیے جمع تو دیوان کیا

تو نے بیچا نہ کبھی اپنی فقیری کا بھرم
گو شہنشاہ بھی تھے تیرے خریداروں میں
خود فروشی تری غیرت کو گوارا نہ ہوئی
تو پھرا جنسِ ہنر لے کے نہ بازاروں میں
رہنما قافلۂ عظمتِ فن کے جو رہے
ہے ترا نام انھیں قافلہ سالاروں میں

اپنے لفظوں میں کہوں تیرے لیے بات کوئی
حوصلہ نطق میں اپنے یہ نہ پایا میں نے
حق ادا ہو نہ سکا تیری ثنا کا پھر بھی
ذوق و غالب کا بھی احسان اٹھایا میں نے
نذر کرنے کو تجھے نقدِ عقیدت، آخر
تیرے لفظوں ہی کا سرمایہ چرایا میں نے

شہباز صدیقی امروہوی

شہنشاہِ شاعراں

[بیادِ میر تقی میر]

میر اے ملکِ ادب کے حاکمِ عالی وقار — قلزمِ شعر و سخن کا تو ہے دُرِّ شاہوار
تیری کوشش سے ریاضِ شاعری ہے پُر بہار — تجھ سے بہتر کب ہے کوئی اس چمن کا آبیار

باغ سب مہکا ہوا ہے یہ تری مہکار سے
نغمۂ بلبل ہے شرمندہ تری گفتار سے

کاروانِ شاعری کا تو ہے میرِ کارواں — مانتا ہے اک زمانہ تجھ کو شاہِ شاعراں
لب پہ ہر استاد کے ہے تیری عظمت کا بیاں — ذوق و غالبؔ، ناسخؔ و سوداؔ ہیں تیرے مدح خواں

تیری ہستی اہلِ فن میں واجب التعظیم ہے
خم تری درگاہ میں سب کا سرِ تسلیم ہے

تیرا کردار پسندیدہ ہے آپ اپنی مثال — صاف ستھری زندگی ہو سیدھی سادی چال ڈھال
داد و تحسیں کی ہوس تجھ کو نہ حرصِ جاہ و مال — عیش و عشرت سے بری، افلاس و عسرت میں نہال

راستے میں تو توکّل کے رہا ثابت قدم
جھک سکی گردن نہ تیری پیشِ اربابِ کرم

تیری ذات پاک ہے مجموعۂ خلقِ حسن — گھر میں تو درویش ہے محفل میں میرِ انجمن
وضع دار و باحیا، پابندِ تہذیبِ کہن — نیک ذات و پارسا، نازک دماغ و کم سخن

فقر کا شکوہ نہ فاقہ کی شکایت ہے تجھے
قصرِ شاہی گوشۂ صبر و قناعت ہے تجھے

ہے تری ہستی کا اردو کے اکابر میں شمار — تیرے علم و فن کی شہرت ہے بہر شہر و دیار

تیری کلیات تیرے فن کا ہے وہ شاہکار   اہلِ دہلی کو بجا ہے جس پہ ناز و افتخار
شاعری زندہ ہوئی تجھ سے جہاں آباد کی
لاج رکھ لی تو نے اس کاشانۂ برباد کی

شاعری کا تو نے اپنے ملک میں چھیڑا وہ ساز   زمزمے جس کے فغاں ہیں جس کے نغمے سوز و ساز
ہے ترا ہر لفظ شیون آفریں، حسرت طراز   درد کی تصویر ہے تیرا کلام دل گداز
غیرتِ نشتر ترا ہر مصرعۂ جانکاہ ہے
قلبِ تفتہ جاں سے جو نکلی ہو وہ گرم آہ ہے

ہے متاعِ درد و حسرت کا جہاں میں تو امیں   چشم ہے نمناک تیری قلب ہے تیرا حزیں
یاس و حرماں کا مصور کوئی تجھ جیسا نہیں   ہے مرقع میں ترے ہر نقش تیرا دل نشیں
نسخۂ دیواں ترا غیرت دہِ ارژنگ ہے
مانی و بہزاد کی صنعت بھی جس سے دنگ ہے

کچھ عجب تاثیر رکھتا ہے ترا طرزِ فغاں   نالۂ بلبل میں بھی یہ شانِ گیرائی کہاں
ہیں ترے الفاظ نازک، دلکش اندازِ بیاں   خلد سے کوثر میں ڈھل کر آئی ہے تیری زباں
نغز گفتاری میں کوئی تیرا ثانی اب نہیں
یہ فصاحت، یہ سلاست، یہ روانی اب نہیں

شاعری سے تیری افزوں ہو گئی شانِ سخن   تیری تخلیقات کا ہر جزو ہے جانِ سخن
ہو گیا ہر سمت جاری تیرا فرمانِ سخن   قاف سے تا قاف پہنچا تیرا فیضانِ سخن
شاعری میں اس قدر بالا ترا پایا ہوا
اہلِ فن میں مستند ہے تیرا فرمایا ہوا

ہو سکے شہباز سے کیوں کر تری مدح و ثنا   عقل ہے کوتاہ اس کی تیرا منصب ہی بڑا
صرف اظہارِ عقیدت ہی تھا اس کا مدعا   ورنہ وہ کیا اور اس کی نظم کی بنیاد کیا
بوالہوس کو صرف شوقِ قافیہ پیمائی ہے
داعیہ رکھتا ہے وصفِ میر کا "سودائی" ہے

سعادت نظیر

میر تقی میر

فکر و فن کے بت کدے سے اٹھے آذر سیکڑوں — اس جہانِ شعر میں گزرے سخنور سیکڑوں
اور لاکھوں ہیں مگر تجھ سا کوئی بت گر نہیں — مختصر یہ ہے کہ کوئی بھی ترا ہم سر نہیں
اے امامِ فکر و فن تو وہ شکستہ ساز ہے — جس کے نغموں پہ زباں کو آج تک بھی ناز ہے
دل پہ جو گزری، وہی دل کی حقیقت بن گئی — زندگی خود تیری اک نقشِ محبت بن گئی
حسرتوں کے خون سے رنگیں ہے تیری داستاں — تو سراپا درد ہے اور پُر اثر تیرا بیاں
شدتِ احساس کا ردِ عمل بنتی گئی — رفتہ رفتہ زندگی تیری غزل بنتی گئی
یاس ہو، سوز و گدازِ عشق ہے، جذبات ہیں — شاعری میں تیری سب تیرے ہی محسوسات ہیں
تیری غزلوں میں ترنم، سحر ہے، اعجاز ہے — ہے بجا، جتنا بھی تجھ کو اپنے فن پہ ناز ہے
ہے کہیں تیرا سخن دل کے لیے وجہِ سکوں — اور کہیں ہیں تیری باتیں ذوق افزائے جنوں
روشنی ایسی نظر آئی ترے نغمات میں — جیسے رہرو کے لیے انجم اندھیری رات میں
چھپ نہیں سکتا، جو تیرے شعر کا انداز ہے — دل پکار اٹھتا ہے "یہ تو میر کی آواز ہے"

جو سنے اشعار تیرے، تیر و نشتر مان لے
انتہا یہ ہے کہ غالب سا سخنور مان لے

برج لال جگّی رعنا

میر

اے زبانِ غمِ دلِ انساں
ترجمانِ غمِ دلِ انساں
انجمستانِ فن کے مہرِ منیر
رہروانِ رہِ سخن کے امیر
تو نے اندازِ فن دیا ہم کو
ذوقِ شعر و سخن دیا ہم کو
ساز کو آشنائے سوز کیا
ماہ کو مہرِ نیم روز کیا
واہ کو آہ کر دیا تو نے
گل کو رنگِ شرر دیا تو نے
غمِ دل کو غمِ حیات کیا
حاصلِ روحِ کائنات کیا
غم کی تفسیر یوں ادا کر دی
دل کی تصویر آئینہ کر دی
بادۂ غم سے بھر کے شعر کے جام
زندگی کو دیا سرورِ دوام
عشق کو غرقِ رنگِ حسن کیا
دھوپ کو چاندنی کا روپ دیا
آنسوؤں کو سمو کے لفظوں میں
دل کے غم کو ڈبو کے لفظوں میں
تو نے ڈھالا غزل کے سانچے میں
خوب صورت کنول کے سانچے میں
بھر کے شعروں میں روح کی آواز
تو نے چھیڑا حیاتِ نو کا ساز
یوں سنواری غزل کی نوک پلک
آ گئی اس میں زندگی کی جھلک
حسنِ جذبات کو نزاکت دی
رنگِ تخئیل کو لطافت دی
دادِ تشبیہہ طرزِ نو سے دی
استعارے کی آبرو رکھ لی

شعر کی سادگی میں بھر کے کشش   بخش دی تیرِ نیم کش کی خلش
عظمتِ غم کو سربلند کیا   جذبۂ دل کو ارجمند کیا
آتشِ غم کو لالہ بار کیا   دھوپ کو ابرِ نوبہار کیا
یوں حقیقت کو بے نقاب کیا   ذرّے ذرّے کو آفتاب کیا
داغِ دل کو چراغِ طور کیا   موجِ ظلمت کو موجِ نور کیا
آنسوؤں کو وہ آب و رنگ دیا   ماہ و انجم کو شرمسار کیا

دل کی دھڑکن میں بھر کے سوزِ ازل
کر دیا زندگی کو سازِ غزل

ایڈیٹر

سرپرست

(تعارف)

۱۔ اثر (میرزا جعفر علی خاں لکھنوی)
سب سے بڑے سرپرست، باکمال استاد، کہنہ مشق شاعر، نکتہ رس نقاد، مستند اہلِ زبان، متعدد کتابوں کے مصنف۔ انھوں نے کلامِ میر کا انتخاب "مزامیر" دو جلدوں میں شائع کیا ہے۔
پتا: کشمیری محلہ۔ لکھنؤ

۲۔ اظہر راہی
نوجوان اہلِ قلم: "اُردو میں ہجویہ شاعری" پر پی ایچ ڈی کے لیے تحقیقی مقالہ لکھ رہے ہیں۔
پتا: بدھوارہ بھوپال

۳۔ افسر (حامد اللہ)
کہنہ مشق ادیب اور شاعر۔ اسماعیل میرٹھی کے بعد بچوں کے لیے سب سے زیادہ مفید ادب کے خالق۔

۴۔ انور (ڈاکٹر منوہر سہائے)
ادبیاتِ فارسی کے اُستاد۔ خانِ آرزو پر تحقیقی مقالہ لکھ کر پنجاب یونی ورسٹی لاہور کو پیش کیا تھا۔ اُردو کے محتاط اور مستند محقق۔
پتا: ۳/۱۲ پٹیل نگر ایسٹ، نئی دہلی ۱۲

۵۔ جامی (خورشید احمد)
حیدرآباد کے خوش فکر اور خوش تلاش شاعر ہیں۔ ان کے اشعار میں ظاہری نک سک کے علاوہ فکر کا رچاؤ پایا جاتا ہے۔

۶۔ حبیب خاں (ایم)
انجمن ترقی اُردو (ہند) علی گڑھ کے ناظم کتب خانہ۔ اُردو زبان و ادبیات سے گہرا شغف رکھتے ہیں۔
پتا: قاضی پاڑہ۔ علی گڑھ

۷۔ تیواڑی (ڈاکٹر بھولا ناتھ)
ہندی زبان و ادبیات کے مستند عالم اور ماہرِ لسانیات کروڑی مل کالج (دہلی یونی ورسٹی) میں شعبۂ ہندی کے صدر۔ ہندستانی اکادمی الہ آباد سے بھی متعلق رہ چکے ہیں۔ آج کل تاشقند یونی ورسٹی (روس) میں وزیٹنگ پروفیسر کی حیثیت سے تشریف لے گئے ہیں۔

۸۔ رعنا (برج لال جی)
غزل، نظم اور رباعی پر یکساں قدرت رکھنے والے اور فن کی نزاکتوں سے آگاہ شاعر۔
پتا: جی/۱۳۱، ای ٹائپ، پنجابی نگر، نئی دہلی ۲

۹۔ رفعت (سید مبارز الدین)
اُردو کے بے لوث اور خاموش خدمت گزار، متعدد کتابوں کے مترجم۔ ادبیاتِ اُردو و فارسی پر عالمانہ نظر رکھتے ہیں۔
پتا: گورنمنٹ سائنس اینڈ آرٹس کالج۔ گلبرگہ (میسور)

۱۰۔ روش صدیقی
ہندستان میں اُردو کے برگزیدہ شاعر۔ نغز گفتار، بلند فکر اور صاحبِ دل۔
پتا: اے/۲۲۲ پنڈارا روڈ، نئی دہلی

۱۱۔ سحر (ابو محمد)
حمیدیہ کالج بھوپال میں اُردو کے اُستاد۔ امیر مینائی پر تحقیقی مقالہ لکھ رہے ہیں۔ قصیدہ نگاری ان کا خاص موضوع ہے۔ سنجیدہ فکر اور محتاط رقم۔
پتا: ایس این ۲۔ چار بنگلا روڈ۔ بھوپال

۱۲۔ سرور (آل احمد)
صدر شعبۂ اُردو مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ، معتمد عمومی انجمن ترقی اُردو

(ہند) علی گڑھ، مشہور نقاد، صاحب طرز نثر نگار۔
پتا: ا۔شبلی روڈ، مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ۔

۱۲۔ سعادت نظیر
نوجوان شاعر اور نثر نگار، عثمانیہ یونی ورسٹی کے فارغ التحصیل ہیں۔ درخشاں مستقبل کے امین۔
پتا: سلطان شاہی حیدر آباد۔ دکن

۱۴۔ سلامت اللہ (ڈاکٹر)
اُردو کے مشہور ترقی پسند نقاد۔ انگریزی ادبیات سے عالمانہ واقفیت رکھتے ہیں۔
پتا: مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ

۱۵۔ سلام مچھلی شہری
اُردو کے مشہور شاعر۔ نظم میں ہیئت کے نت نئے تجربوں کے لیے معروف ہیں۔ پچھلی چوتھائی صدی سے برابر لکھ رہے ہیں۔
پتا: آل انڈیا ریڈیو، نئی دہلی

۱۶۔ سلیم (وحید الدین۔ مرحوم)
عثمانیہ یونی ورسٹی میں اُردو کے پہلے پروفیسر۔ ادبیات اُردو کے مستند عالم، محقق اور واضع اصطلاحات علمیہ۔ حالی کے شاگرد۔

۱۷۔ سید محمد
ارباب نثر اُردو کے مصنف۔ عثمانیہ یونی ورسٹی میں اُردو کے سابق ریڈر۔
پتا: زینب منزل۔ سلطان پورہ۔ حیدر آباد دکن

۱۸۔ شمیم کرہانی
دقیقہ رس، خوش فکر اور مقبول شاعر۔
پتا: کوچہ میر عاشق، چاوڑی بازار، دہلی

۱۹۔ شہباز امروہوی
ادبیات فارسی و عربی کے عالم، عروض پر دست گاہ رکھتے ہیں۔ اکبر کے رنگ میں ان کا مزاحیہ کلام شاعروں میں بیحد مقبول ہے۔ قادر الکلام شاعر ہیں۔
پتا: محلہ چاہ غوری، امروہہ ضلع مراد آباد

۲۰۔ صدیقی (ڈاکٹر ابواللیث)
بدایوں کے باشندے، علی گڑھ کے فارغ التحصیل، متعدد کتابوں کے مصنف۔ "لکھنؤ کا دبستان شاعری" ان کا تحقیقی مقالہ ہے۔
پتا: صدر شعبہ اُردو، کراچی یونی ورسٹی۔ کراچی

۲۱۔ صدیقی (رشید احمد)
اُردو کے صاحب طرز انشا پرداز، بے مثل ادیب، نقاد، مفکر، طنز و مزاح کے امام، متعدد زندہ جاوید کتابوں کے مصنف۔ مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ میں شعبۂ اُردو کے سابق صدر۔
پتا: ذکاء اللہ روڈ، مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ

۲۲۔ عابدی (ڈاکٹر سید امیر حسن)
زبان و ادبیات فارسی پر کامل دستگاہ رکھتے ہیں، فارسی جدید کے علاوہ زبان پاستان پر بھی عبور ہے۔
پتا: ریڈر شعبہ فارسی۔ دہلی یونی ورسٹی، دہلی

۲۳۔ عبدالحق مرحوم (ڈاکٹر مولوی)
'بابائے اُردو' کہنے کے بعد کسی تعریف یا تعارف کی احتیاج رہ جاتی ہے؟

۲۴۔ عبدالماجد دریا بادی
مشہور فلسفی، منطقی، مفسر قرآن، صاحب طرز انشا پرداز، طنز نگاری کے بادشاہ، "صدق جدید" کے مدیر، حالی و شبلی و اکبر کی آنکھیں دیکھے ہوئے، مولانا ایک مجسم ادارہ اور مشکل تاریخ ہیں، اُن کا تعارف کرانا ایسا ہی ہے جیسے سورج کا تعارف کرایا جائے۔
پتا: دریا باد ضلع بارہ بنکی

۲۵۔ عبدالودود (قاضی)
عہد حاضر میں اُردو کے بہت بڑے عالم اور محقق اُردو ہی نہیں مشرقی و مغربی کے خزانۂ علوم پر گہری نظر رکھتے ہیں اور مسلّم طور پر اس عہد کی برگزیدہ علمی شخصیت ہیں۔
پتا: ادارہ تحقیقات اُردو، بانکی پور، پٹنہ ۴

۲۶۔ عرشی (امتیاز علی)
رضا لائبریری رامپور کے ناظم، غالبیات کے ماہر دیدہ ور محقق، ادبیات عربی و فارسی و اُردو کے علاوہ جامع معقولات و منقولات۔ انکی ذاتِ گرامی زبانِ اُردو کے لیے باعثِ نازش و افتخار ہے۔
پتا: ناظم کتب خانہ سرکاری، رامپور، یو۔پی۔

۲۷۔ عزیز لکھنوی مرحوم (مرزا محمد ہادی)

اس صدی کے ربع اول میں لکھنؤ کے سب سے زیادہ نامور اور مقبول شاعر جن کے تلامذہ میں اثر، جوش اور نظر جیسے اساتذہ شامل ہیں۔

۲۸۔ فاروقی (نثار احمد)

اس صحیفے کا گرد آور اور مرتب ادب کا ایک معمولی طالب علم، "حفظتَ شیئاً و غابت عنک اشیاءُ" کا مصداق۔

پتا: اندارا کنواں، گلی قاسم جان، دہلی ۶

۲۹۔ فاضل زیدی

میر مہدی مجروح کے نواسے شعر بھی خوب کہتے ہیں اور ادب کا مطالعہ محنت سے کرتے ہیں۔

پتا: معرفت سب پوسٹ ماسٹر، چک ضلع سکھر، پاکستان

۳۰۔ فائق (کلب علی خاں)

رامپور کے باشندے۔ مومن پر ایک عالمانہ کتاب کے مصنف۔ قدیم تذکروں پر اچھی نظر رکھتے ہیں۔

پتا: مجلس ترقی ادب۔ نرسنگھ داس گارڈن، کلب روڈ، لاہور

۳۱۔ فضا ابن فیضی

زبان اردو کے خوش فکر نوجوان شاعر۔ اپنے اسلوب میں انفرادی رنگ کے مالک۔

پتا: جمال پورہ، مئو ناتھ بھنجن، اعظم گڑھ

۳۲۔ قیصر (محمود حسن امروہوی)

عربی و فارسی پر اچھی دستگاہ رکھتے ہیں، علمی صحائف میں ان کے مضامین شائع ہو کر اہل نظر سے داد حاصل کر چکے ہیں۔

پتا: انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز، مسلم یونیورسٹی علیگڑھ

۳۳۔ گیان چند (ڈاکٹر)

اردو کے جواں سال محقق اور ماہر لسانیات، ان کی علمی کاوشیں وقعت کی نظر سے دیکھی جاتی ہیں۔ "اردو کی نثری داستانیں" ان کا اہم باشان کارنامہ ہے۔ "شمالی ہند میں اردو مثنوی کا ارتقا" بھی ان کا ڈاکٹریٹ کا تھیسس ہے جو عنقریب شائع ہو رہا ہے۔ حمیدیہ کالج میں شعبہ اردو کے صدر ہیں۔

پتا: ۳۶۔ مالویہ نگر، بھوپال۔

۳۴۔ محمود بیگ (میرزا)

میر امن کے لفظوں میں "دلی کے روڑے" یہاں کی تہذیب اور شرافت کو مجسم دیکھنا ہو تو بیگ صاحب کو دیکھ لیجیے ہلکی پھلکی، شستہ و شگفتہ نثر لکھنے اور بولنے میں حسن نظامی کے بعد انھیں کا نام لیا جاسکتا ہے۔ ریڈیو کے سب سے زیادہ مقبول مقرر اور دہلی کی ثقافتی سرگرمیوں کے روح رواں۔ اقبال کے اس مصرع کی تجسیم ع نگہ بلند، نظر دل نواز، جاں پرسوز

پتا: پرنسپل دہلی کالج، دہلی ۶

۳۵۔ مختار الدین احمد (ڈاکٹر)

ادارہ علوم اسلامی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں ریڈر، مجلہ علوم اسلامیہ ایڈیٹر رسالہ فکر و نظر کے رکن ادارہ، غالبیات کے ماہر، عربی و فارسی، اردو کے ادبی سرمائے پر گہری نگاہ رکھتے ہیں۔ دورِ حاضر میں اردو کے چند ممتاز عالموں اور محققوں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔

پتا: ۵ شبلی روڈ، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

۳۶۔ مخمور سعیدی

اختر شیرانی اور بسمل سعیدی کے وطن یعنی ٹونک کے باشندے۔ اس عہد کے نوجوان شعرا میں ایک ممتاز اور مقبول شاعر۔ جدت کے ساتھ ہی فن کا پورا احترام بھی اُن کی شاعری میں موجود۔

پتا: ایڈیٹر تحریک، ۹۔ انصاری ارکیڈ۔ دریا گنج، دہلی ۶

۳۷۔ مقبول حسین احمد پوری

اُردو کے ایک مشہور شاعر، خصوصاً ان کا نعتیہ کلام اس صدی کی دوسری چوتھائی میں بہت مقبول رہا ہے۔

۳۸۔ نادم سیتاپوری

تقریباً ۲۵ برس سے لکھ رہے ہیں اور سرمیدان میں اپنا جوہر دکھا چکے ہیں۔ ادبی سرمائے خصوصاً اخبارات و رسائل پر اچھی نظر رکھتے ہیں۔

پتا: محلہ تضیارہ، سیتاپور، یوپی

۳۹۔ وحشت (رضا علی)

اب تو مرحوم ہو گئے عہد حاضر کے اساتذۂ اردو میں گنے جاتے ہیں۔ ان کے شاگردوں کا حلقہ بھی بہت وسیع ہے۔ انھوں نے غالب کے رنگ میں بھی کہا ہے۔

۴۰۔ ہاشمی (نصیر الدین)

"دکن میں اُردو" کے مصنف، دکنی ادب کے محقق، بلکہ اس کا احیا کرنے والے اسالیب میں سے ایک۔ اُردو کے مشہور اہل قلم اور مورخ۔

پتا: روبروئے درگاہ حبیب تلی کٹل منڈی، حیدرآباد دکن